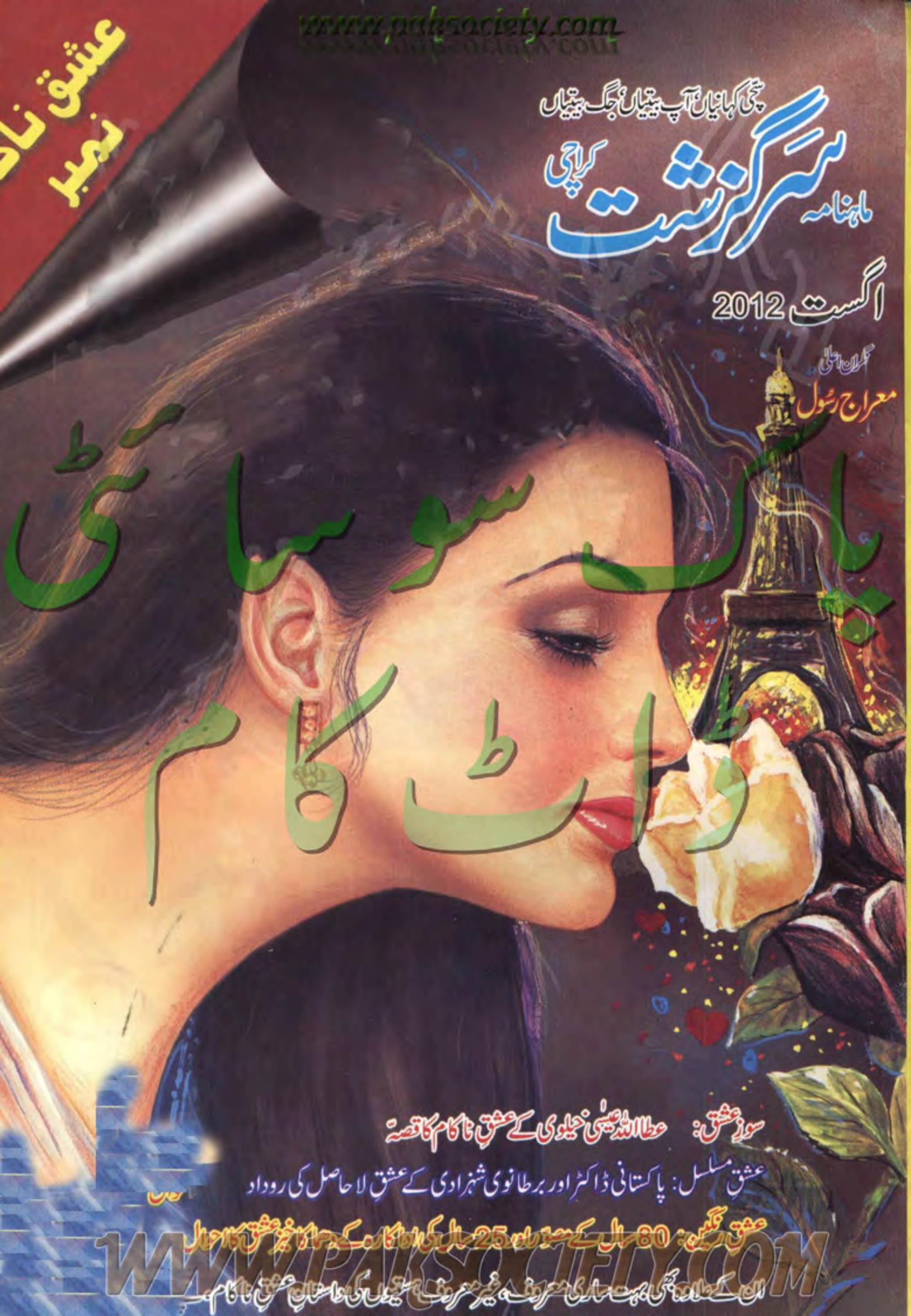

www.paksociety.com
عشق ناکام نمبر
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اگست 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
سوزِ عشق: عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی کے عشقِ ناکام کا قصہ
عشقِ مسلسل: پاکستانی ڈاکٹر اور برطانوی شہزادی کے عشقِ لاحاصل کی روداد
عشقِ رنگین: 80 سال کے مصور اور 25 سال کی اداکارہ کے دھماکا خیز عشق کا احوال
WWW.PAKSOCIETY.COM
ان کے علاوہ بھی بہت ساری معروف، غیر معروف ہستیوں کی داستانِ عشقِ ناکام

سرگزشت (15)
ناکام عاشق
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت وشنید (16)
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیتِ عشق (24)
مجذوبِ عشق
ڈاکٹر ساجد امجد
معروف فلسفی کے
ناکام عشق کی روداد قصہ بیداد

عشق پیرانہ سالی (49)
عشقِ رنگیں
مریم کے خان
اس مشہور مصور کا زندگی نامہ جس
نے پیرانہ سالی میں عشق کیا

ذکر عشق (64)
سوزِ عشق
تنویر ریاض
پاکستان کی پہچان کہے جانے
والے گلوکار کی رودادِ زیست

مانہ عشق (73)
عشقِ بے چین
منظر امام
ماضی قریب کی بیوٹی کوئین
کے عشقِ ناکام کی داستان

عشق کتھا (81)
سرابِ عشق
نسرین منصور
بالیووڈ کی معروف اداکارہ
کے ناکام عشق کی داستان

فلمی عشق (91)
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی ان کہی کہانیاں،
معروف قلمکار کے حقیقی شب وروز

احوالِ عشق (107)
عشق کم نصیب
صائمہ اقبال
امریکا کے صدر کی بیوی
کے عشق کی دلچسپ کتھا

بیان عشق (120)
شکستِ عشق
ابنِ کبیر
ایک یورپی شہزادی
کے ناکام عشق کی کتھا

روداد عشق (139)
عشقِ مسلسل
آصف ملک
ایک پاکستانی ڈاکٹر اور برطانوی
شہزادی کی داستانِ عشق

کہن سالہ عشق (145)
دو عہد دو عشق
قارئین
زمانے بدلتے رہے مگر جذبۂ عشق
میں کوئی تبدیلی نہیں آئی

اصل عشق (151)
عشقِ حقیقی
زین مہدی
عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا
سفر کرنے والے حافظ کی کہانی

روایتی عشق (161)
دشمنِ عشق
ذوالفقار ارشد گیلانی
داستانِ عشق جسے ناکامی
نے لازوال بنادیا

اقسام عشق (175)
عشقِ شش جہت
عافیہ فاروقی
عشق کی بہت ساری قسمیں
ہیں انہی میں سے چند کا تذکرہ

عشقِ ظالم (181)
پُر خطر عشق
تسنیم رضا مہکری
ہٹلر ظالم و جابر تھا مگر
وہ بھی عشق کے ہاتھوں ناکام ہوا

معاشرت (186)
سراب
کاشف زبیر
بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ
خیز داستان، لہوگرم کرنے والی تحریر

پہلی سچ بیانی (226)
عشقِ ناتمام
صبیح یار خان
مشرق ومغرب کے
دو دل مل نہ سکے

دوسری سچ بیانی (243)
اصولِ عشق
شاہینہ
اس نے محبت کی تھی اس لیے پھول
کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ گیا

تیسری سچ بیانی (253)
عشق کی انتہا
نیلوفر یاسمین
عشق دوا الگ صنف میں نہیں،
ایک صنف میں بھی ہو جاتا ہے

چھوتی سچ بیانی (261)
پیاسا عشق
احمد رضا
دو معصوم دل بچھڑنے کا کرب
جھیلنے کے لیے زندہ ہیں

پانچویں سچ بیانی (271)
عشقِ نامکمل
خرم وجاہت
اسے ایک مکمل مرد کی تلاش تھی
اور یہ خوابوں میں رہتا تھا

چھٹی سچ بیانی (277)
معراجِ عشق
ارشد علی
ایک جداگانہ انداز کی
دلچسپ سچ بیانی عشق کا الگ انداز

ساتویں سچ بیانی (285)
تقدیسِ عشق
شاہین اظہر
اس نے عشق کیا نہیں
عشق نبھا کر دکھایا

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

www.paksociety.com

جلد 22 ❖ شمارہ 10 ❖ اگست 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور افراز علی نازش 0300-4214400

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

مجھے عشق ہے اپنے وطن سے، میں عشق کا اسیر ہوں۔ کیونکہ اس کا حسن، اس کا وقار، اس کی عظمت ہمارے دل میں ہی نہیں ہماری روح میں بھی سمائی ہوئی ہے کیونکہ یہ فقط زمین کا ایک ٹکڑا نہیں، یہ عطیۂ خداوندی ہے۔ شب قدر دعاؤں کے مستجاب ہونے کی رات ہے۔ اسی رات کا یہ تحفہ ہے۔ یہ تحفہ دو سو سالہ غلامی فرنگ اور لاکھوں جانوں کے نذرانے کے بعد حاصل ہوا ہے، اس لیے بھی ہمیں پیارا ہے۔ ہم اس کے عشق میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں مگر کچھ لوگ مسلسل ہمارے عشق کو ناکام کرنے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہیں۔ یہ ٹی وی کے اینکرز، یہ سیاست کے مہرے اور خود ہم میں موجود نادان دوست اور ففتھ کالم اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ دشمنانِ وطن کی کوئی کتاب سنا رہے ہیں تو کوئی دشمنوں کے بڑے شہروں میں پھیلی بے حیائی کو ہمارے معاشرے میں ضم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ کوئی اسلام تو کوئی زبان کا نام لے کر اخوت و بھائی چارے کا گلا کاٹنے پر کمر بستہ ہے۔ گویا ایک ہم ہیں اور انبوہ رقیباں ہے۔ یہ سب کے سب رقیبِ عشق، کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی کے غلام ہیں تبھی تو ہر ایک نے سنگ اُٹھا رکھا ہے اور ہم اقبال ساجد کے یہ اشعار گنگنا رہے ہیں۔

تُلے ہوئے ہو کیوں تاریخ کو مسخ کرنے پر
سخن کے باب میں کوئی تو باب کاشت کرو
تمہارا اپنا عمل خود تمہارے بس میں ہے
ثواب کاشت کرو یا عذاب کاشت کرو

معراج رسول

ناکام عاشق

سرگزشت

عشق ناکام نمبر

1722 عیسوی میں شیخوپورہ ضلع کے گاؤں جنڈیالہ شیر خاں میں سید قطب شاہ گلیشیر شاہ کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ سید قطب شاہ بہت بڑے عالم فاضل تو نہ تھے مگر خاندان سادات سے تعلق ہونے کی وجہ سے علم کی قدر کرنا جانتے تھے۔ درس و تدریس سے خصوصی لگاؤ تھا۔ بچے کا نام اپنی پسند سے وارث علی رکھا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اسے تعلیم کی جانب راغب کیا۔ ابتدائی تعلیم خود دی۔ حرف تہجی سے روشناس کے بعد غور کیا جانے لگا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے کہاں بھیجا جائے۔ بالآخر قرعہ فال قصور کا نکلا اور اسے قصور بھیج دیا گیا تھا کہ وہ اس دور کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے یعنی کسی مستند استاد سے پڑھ سکے۔ وہاں مسجد کوٹ میں مولانا غلام محی الدین درس دیا کرتے تھے۔ دور پار کی رشتے داری بھی تھی پھر ان کے نام کی شہرت ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ وارث علی کو انہی کی شاگردی میں دیا گیا تھا۔ شاگرد میں قابلیت ہو تو استاد کو درس میں مزہ آتا ہے۔ انہوں نے وارث علی کو جرعہ جرعہ علم کا دریا پلانا شروع کر دیا۔ عمر کے ساتھ قابلیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہیں وارث علی کی دوستی بھلے شاہ سے ہوئی اور انہوں نے مولانا غلام مرتضٰی قصوری کے پاس قصور جانے کا منصوبہ بنایا۔ قصور کے مولانا غلام مرتضٰی کا بڑا شہرہ تھا۔ دور دور سے طلاب کھنچے چلے آتے تھے۔ درس میں ایک انبوہ کثیر شامل ہوتا تھا۔ قصور پہنچ کر یہ دونوں بھی ان کے درس میں شامل ہونے لگے، کئی سال کے بعد مولانا مرتضٰی قصوری نے کہا کہ اب آپ اس قابل ہو چکے ہیں کہ دوسروں کو درس دے سکیں۔ آپ فارغ ہو چکے ہیں۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پاک پتن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار پر پہنچے اور منازل سلوک طے کرنے کے جتن میں لگ گئے۔ منازل سلوک طے کرنا آسان نہیں ہے۔ روکھی سوکھی وہ بھی صرف ایک وقت کھاتے، روزے پہ روزہ رکھتے اور عبادت میں وقت صرف کرتے، جب سلوک کی منزل طے ہو گئی تو مزار مبارک کے گدی نشین دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور نئی منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان دنوں ٹھٹھہ سب سے بڑا شہر مانا جاتا تھا۔ یہاں کی بندرگاہ پر دور دور کے ممالک سے تجار آتے رہتے تھے۔ وہ ٹھٹھہ پہنچ کر ایک مسجد میں فروکش ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی درس و تدریس کے درمیان اس مشہور مگر متنازعہ فیہ قصے نے جنم لیا جس پر تاریخ داں بھی مغالطے میں ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ صرف وارث شاہ کے قلم سے نکلا ایک قصہ ہے مگر زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فرضی قصہ نہیں حقیقت ہے اور بھاگ بھری سے وارث شاہ کو عشق ہو گیا تھا۔ یہ عشق جب بڑھا اور اس کے چرچے شہر میں ہونے لگے تو لوگ وارث شاہ کے دشمن بن گئے۔ ان کا الزام تھا کہ ایک عالم دین ہو کر وہ کس طرح ایک غیر محرم عورت سے ملتا ہے، عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ یہ خبر بھاگ بھری کے والدین کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ علاقے کے لوگ طعنہ دیتے۔ عزتِ خاندان کو داؤ پر لگا دیکھ وہ سب پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے بھاگ بھری کی شادی کرا دی۔ جس لڑکے سے بھاگ بھری بیاہی گئی تھی اس کی بہن بھی وارث شاہ کی دیوانی تھی، اس نے انتقاماً جھوٹی سچی باتیں پھیلانا شروع کر دیں۔ ان باتوں نے وارث شاہ کو پریشان کر دیا اور انہوں نے علاقہ چھوڑ دیا وہ ملکہ ہانس چلے آئے۔ یہیں 1766ء میں انہوں نے قصہ ہیر رانجھا تصنیف کیا۔ ملکہ ہانس میں طویل قیام کے بعد پھر جنڈیالہ شیر خاں آ گئے۔ راستے میں قصور میں قیام کیا اور اپنے استاد کو ہیر رانجھا کا کچھ حصہ سنایا تو وہ بولے ”تم نے مونج کی رتی میں موتی پرو دیے ہیں“ جنڈیانوالہ شیر خاں میں ہی آپ نے 1798ء میں انتقال فرمایا اور گاؤں سے باہر قبر بنی۔ اسی مزار میں ان کے بھائی اور والد بھی دفن ہیں۔ وارث شاہ نے ہیر رانجھا کے علاوہ عبرت نامہ، اشتر نامہ، وارث شاہ دی سسی بھی تالیف کی۔

عشق ناکام نمبر

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

شہرِ خیال

☒ عشقِ سرگزشت کے اسیر اعجاز حسین سٹھار کی نور پور تھل سے گہرافشانی ''شاطر مصلح کے گریگ نے آخر کچھ کیا تو ہے صرف گفتار کے غازی نہیں ہیں، اِدھر ہمارے سیاست داں صرف اپنے بینک اکاؤنٹ میں اضافہ کررہے ہیں۔ سارے منصوبے اور دعوے کاغذی ہیں۔ عوام موقع محل کے مطابق ان کے رنگ بدلنے پر حیرانی کا اظہار ہی کرسکتے ہیں اس لیے ہمیں مسٹر گریگ مورٹنسن کے مثبت کارناموں پر نظر رکھنی چاہیے۔ منفی پہلو کو نظر انداز کردینا چاہیے، یوں وہ اپنی خامیاں بھی دور کرلیں گے۔ ثراپا قبائل کے لوگ دلچسپ لگے، یہاں عجیب الفطرت ہونے کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ان کی سادہ دلی اور خلوص کی اہمیت دل کو بھا گئی۔ ان کی رسمیں تو ہم سے ملتی جلتی ہیں اور توہمات میں بھی ہمارے قریب ہیں۔ ان کی جفاکشی قابلِ قدر ہے۔ ایف بی آئی کا جنم میں پولیس کس جانفشانی سے مجرموں کو تلاش کرتی رہی حتیٰ کہ ایک سیڑھی پر کتنی تحقیق کی اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کیں اِدھر ہماری پولیس پکڑے گئے مجرموں کو جیل سے بھگانے میں تعاون فراہم کرتی ہے۔ صرف اسی مضمون کو بنیاد بنالیا جائے تو ہم کسی سے نظریں نہیں ملاسکتے۔ فلمی الف لیلہ ہماری دلبستگی کا سامان نہ کرسکی۔ ہمیں انڈیا کے اداکاروں سے خاص دلچسپی نہیں ہے البتہ ماضی کے حوالے سے تصویریں اچھی لگیں۔ آفاقی بھائی غزل گائیک غلام علی پر لکھیں، میں ان کا بڑا مداح ہوں۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جال کی ثریا فطری جذبوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ محبت کی سیڑھی کو آسان جان لیا اور راستے میں رینگتے ہوئے سانپوں کو نظر انداز کردیا اور جلد بازی اور غیر احتیاط پسندی کی وجہ سے یعقوب کی سازش کا شکار ہوگئی۔ وہاں نجمہ کی آمد اور دلیری سے حالات کو سنبھالنا قابلِ قدر ہے لیکن ثریا کی خوش قسمتی کا بھی بڑا ہاتھ رہا اور بگڑی صورتِ حال قابو میں آگئی، یہاں تک کہ عزت محفوظ رہی اور رسوائی سے بھی سامنا نہ ہوا۔ سب اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ غیب میں جب ایک ساتھ دو کرداروں کے حالات چلے تو کافی اُلجھن ہوئی پھر بعد میں راستے جدا ہوئے تو بات سمجھ میں آنے لگی کہ کتنی پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی لیکن ذات باری تعالیٰ نے اپنی حکمتِ عملی سے سارے مسائل حل کردیے وگرنہ دونوں گھرانوں میں طوفان آنے میں کون سی کمی رہ گئی تھی۔ اب تمام معاملات سلجھ گئے ہیں اور ہر شخص اپنی جگہ خوش اور مطمئن ہے، اسے خصوصی کرم نوازی کہہ سکتے ہیں۔ ذرا سی بات تھی لیکن بڑھتے بڑھتے بڑی ہوگئی اور کتنے حادثوں کو جنم دے گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انور کمال سے کوئی لغزش ہوئی ہے جس کی سزا انہیں مختلف انداز میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ بھلا کون بے قصور اتنی اُلجھنوں کا شکار بنتا ہے۔ کاش کے اماں نے جب رعنا کو برباد کیا تھا تو گھر میں موجود اپنی بہن کو بھول بیٹھا تھا، وہ خطرناک عزم لیے بیٹھی تھی، ایسی خودسر لڑکی سے یہ توقع بھی کی جاسکتی تھی کہ وہ بھائی کو سزا دینے کے لیے خود کو کسی لفنگے کے حوالے کردیتی لیکن اس نے دوسری راہ اپنائی، یہ بالکل صحیح ہے، جس گھر میں ایسی لڑکیاں ہوں، کوئی مرد بھٹک نہیں سکتا۔ ڈیڈی، پاپا اور میں، میں رشتوں میں جتنا خلوص ہو اور نیک نیتی کی بنیاد پر تعلقات ہوں لیکن ایسی بے تکلفی دوسروں کو ضرور کھٹکتی ہے اس لیے احتیاط ضروری ہے۔ خاص طور پر بچے منفی اثر لیتے ہیں۔ اسلام نے محرم اور غیر محرم کے لیے جو حد مقرر کی ہے اس پر عمل ہمیں کئی پیچیدگیوں سے بچالیتا ہے۔ ابن الوقت میں عزمی میاں معاملہ فہم اور ساتھ عیّار بھی تھے۔ لوگوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا جانتے تھے پھر شہر کے مکینوں کی مصروفیات بھی کئی مسائل کو جنم دیتی ہیں جنہیں بھگتنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ عزمی میاں شاید پہلے حالات کا جائزہ لیتے رہے، کمزوریاں نوٹ کیں اور اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا قصد کیا اور کامیاب ٹھہرے۔ وہ ایک ورکر تھے، کام کرانا اور لینا جانتے تھے۔ اسی کوشش کرایا اور عیش کیے چاہے سب مکین مطمئن ہوں لیکن انہوں نے دوسروں کی لاعلمی اور مجبوری سے فائدہ اُٹھایا، وہ ناجائز کمائی کے زمرے میں آتا ہے، اس کا حساب دینا ہوگا۔ کہانی میں رنگینی نہ ہونے کے باوجود دلچسپی کی کمی نہ تھی۔ تیسرا عشق میں نسیم کی بغاوت ایک حد تک ٹھیک ہے، وہ غیر معمولی حسین تھی جس کے مقابلے میں خاوند میں کوئی صفت قابلِ تعریف نہ تھی پھر توقیر نے نفرت کی جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، وہ بھنورا تھا محض رس چوس کر اُڑان بھرنے کی تاڑ میں تھا، یہ اتفاق تھا کہ سارا منصوبہ سامنے آگیا ورنہ لٹنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی لیکن نسیم کی ہمت پر داد دیجیے کہ اس نے فطری بزدلی سے کام نہ لیا اور اس سنپولیے کا سر کچل دیا، یوں آزاد پرندہ پھندے میں آجائے تو اس کے پھڑ کنے کا منظر دیکھنے والا ہوتا ہے۔ گرگٹ میں انسان کے بدلتے خیالات پڑھ کر حیران ہوگیا ہوں پھر تیمور تو الگ مزاج کا لڑکا تھا۔ بہ ظاہر گولی کی زبان سے بات کرنے والا اندر سے نرم دل اور مفاہمت پسند تھا، بھلا کون سوچ سکتا ہے کہ وہ اتنا بدل جائے گا۔ وہ ایک معمولی نفسیاتی گرہ کو سلجھانے کے لیے پُرخطر زندگی گزار رہا تھا۔ اسے من پسند زندگی ملی ہے تو تارہ کے حق میں بھی بہتر ہوا ہے۔ وہ حقیقی خوشیوں سے لطف اندوز ہورہی ہے اور تیمور کی نیت شادی سے پہلے ظاہر ہوگئی ہے وگرنہ وہ بکھر کر رہ جاتی۔ تبصرہ اس محفل کے سب دوستوں نے سراہا ہے جس کے لیے شکریہ قبول کیجیے اور رانا محمد سجاد اگر مسندِ صدارت پر فائز ہیں تو یہ ان کی محنت اور لگن کا صلہ ہے اور دوسروں کے لیے تحریک ہے۔''

☒ عامر ساحل کی ڈیرہ اسماعیل خان سے آمد ''امید ہے کہ قارئین، مصنفین اور ادارہ سب بخیریت ہوں گے۔ میں عرصہ 10 سال سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں۔ سرگزشت مجھے بے حد پسند ہے۔ اس جیسا رسالہ میں نے آج تک نہیں پڑھا۔ کل ہی جولائی کا شمارہ ملا ہے۔ ابھی صرف سرورق پر ہی نظر دوڑائی ہے۔ سرورق بہت ہی پسند آیا۔ باقی تمام کہانیاں ابھی تک باقی ہیں۔ میں نے ابھی نہیں پڑھیں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ جس طرح عرصۂ دراز سے آپ نے شمارے میں فلمی الف لیلہ کا طویل سلسلہ شروع کررکھا ہے، بالکل اسی طرح فلمی دنیا سے باہر نکل کر پاکستان کی کرکٹ، کھلاڑیوں اور سابقہ سینئر کھلاڑیوں کے مختلف ملکوں کے سفرنامے اور انٹرویوز کا ایک طویل سلسلہ شروع کریں، پلیز پلیز۔ یہ ہماری دلی خواہش اگر ہوسکے تو اس بارے میں ضرور غور کیجیے گا (کھلاڑیوں پر خاص نمبر نکل چکا ہے۔ وقتاً فوقتاً مضمون دیتے رہتے ہیں) اور میرا یہ پہلا خط اور پہلی کوشش کو ردی کی ٹوکری میں مت پھینک دینا۔ عشق ناکام نمبر کا بہت شدت سے انتظار ہے۔''

☒ کوچۂ عشق سرگزشت کے پُرانے اسیر، عبدالرؤف عدم کی راولپنڈی سے یاد آوری ''وقت اور مصروفیت نے مل کر ایک ایسی دیوار بنادی کہ جس کے باعث ہم محصور ہوگئے اور پھر مجبور ہوگئے اور اسی وجہ سے شہرِ خیال سے دور ہوگئے لیکن اب وقت نے پلٹا کھایا۔ مصروفیت کا بت پاش پاش ہوگیا۔ فرصت کے باغ میں بہار آگئی۔ مجبوری اور شہرِ خیال سے دوری کو زوال آیا تو ہم بنا وقت ضائع کیے اپنے شہرِ خیال کی دہلیز پر پہنچ گئے۔ نئے اور پُرانے لوگوں کا امتزاج دیکھا، کچھ لوگوں نے ہمیں فوراً پہچانا جبکہ کچھ نے اجنبی جانا۔ رانا محمد سجاد کو صدارت کی کرسی پر براجمان پایا تو مبارک باد کے پھول ان پر نچھاور کیے۔ سدرہ بانو ناگوری کو دعاؤں کا تحفہ دیا۔ اعجاز حسین سٹھار سے معلومات کا ذخیرہ حاصل کیا۔ طاہر الدین بیگ کو گلے سے لگایا کیونکہ ان کا کسی سے لپٹنے کو دل چاہ رہا تھا۔ احمد خان توحیدی کے ذریعے تین شادیوں کا راز جاننے کی کوشش کی۔ سعید احمد چاند سے سلام دعا ہوئی۔ مہوش رفیق کی جانب گئے۔ مگر وہ خود کو تلاش کرنے میں مصروف نظر آئیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کو سلام پیش کیا، دیگر تمام دوستوں سے تعارف حاصل کرنے کے بعد محسن غالب کی خدمت میں حاضری دی اور مختصر عمر میں بجنوری صاحب کے کارنامے پڑھے تو دل بے اختیار جھوم اُٹھا۔ شاطر مصلح بہت خوبصورت تحریر ہے۔ مصنف کا اندازِ تحریر دل موہ لینے والا ہے۔ واقعی، گریگ نے اگر خرد برد کی تو وہ اپنی جگہ جرم ہے لیکن اس کے اچھے کام اپنی جگہ قابلِ ستائش ہیں۔ ایف بی آئی کا جنم دلچسپ تحریر ہے۔ ایڈگر نے شاطرانہ ذہانت کے ذریعے امریکی اعلیٰ حکام سے اپنی تمام باتیں منوالیں۔ فلمی الف لیلہ اس بار اپنے دامِ سحر میں گرفتار نہ کرسکی۔ رسوا ایک مشہور زمانہ رسوا کی زندگی کا خاکہ ہے۔ یقیناً امراؤ جان ادا، رسوا کو کبھی تاریخ کی گمنامیوں میں رسوا نہیں ہونے دے گی۔ سچ بیانیوں میں جال بہت پسند آئی۔ نجمہ کا کردار بہت خوبصورت ہے جس نے ثریا کو رسوائی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا۔ غیب فلمی انداز لیے ایک اثر انگیز کہانی ہے۔ عابدہ کے ایثار نے دونوں خاندانوں کو خوشیوں میں رنگ دیا۔ بساطِ زیست نے زیادہ متاثر نہ کیا۔ ذرا سی بات پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ کاش خوبصورت کہانی ہے، صندل کا کردار بہت زبردست ہے۔''

☒ عشقِ سرگزشت سے مخمور خالد یوسفی نے لیہ سے لکھا ہے ''میگزینز کے ایک سیلاب بلاخیز میں اپنے پورے قد سے کھڑا سرگزشت اپنے بانکپن اور رنگینی خیال کے باعث سب سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے، اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔ حسین و دل آویز سرورق کی دلکشی نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ جولائی کا شمارہ ملتے ہی فہرست پر اک نگاہ ڈالتے ہی اپنی محفل کی جانب لپکے کہ ''ٹھہر گیا ہے، نگاہ میں شہرِ خیال کا موسم۔'' اپنا نامہ دیکھا تو نام کی غلطی نظر آئی کہ سہواً خالد یوسفی سے خالد یوسف چھپ گیا، چلیے کوئی بات نہیں۔ سبھی دوستوں کے تبصرے پڑھے اور محفل کے آخر میں مہدی حسن کی رحلت کا پڑھ کر جیسے زخم پھر سے تازہ ہوگیا۔ آہ، اجل نے تاک کر کیسا ہیرا چنا کہ غزل گائیکی کا فن ہی یتیم کردیا۔ الہامی سُروں میں گانے والا، سُر سنگیت کا راجا، موسیقی کے آسمان کا روشن ستارہ، ہائے ہائے ہائے، بھلا کس منہ سے کہیے صاحب کہ وہ معجز نما آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی ہے، وہ غزل گائیکی کی دم توڑتی صنف میں سُروں کے جہان آباد کرنے والا یوں خاموشی سے چلا گیا ''یوں اُٹھے آج اس گلی سے ہم، جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے'' یا پھر خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر نے جیسے کہا تھا کہ تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی۔ اور تری بزم سے اب کوئی اُٹھا چاہتا ہے۔ مہدی حسن خوش نصیب تھے کہ زندگی میں ہی بے پناہ پذیرائی دیکھ لی۔ (سرگزشت نے بھی ان کا زندگی نامہ ان کی زندگی میں شائع کرکے خراجِ تحسین پیش کیا تھا جسے ان کے گھر والوں نے خصوصی طور پر پسند کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

تھا۔ وہ فالج میں مبتلا تھے مگر انہوں نے خصوصی طور پر اپنے پوتے سے پڑھوا کر سنا تھا اور بہت پسند کیا تھا) موسیقی کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں جنرل ایوب خان نے تمغۂ امتیاز، جنرل ضیاء الحق نے تمغۂ حسن کارکردگی، جنرل پرویز مشرف نے ہلال امتیاز سے نوازا۔ علاوہ ازیں 9 نگار ایوارڈز بھی ان کے حصے میں آئے۔ 1979ء میں بھارتی ضلع جالندھر میں سہگل ایوارڈ اور نیپالی حکومت نے گھورکھا کشنا ایوارڈ دیا۔ 25 ہزار کے لگ بھگ فلمی وغیر فلمی گیت، غزلیں اور گانے گائے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے شہرۂ آفاق کلام ''گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نو بہار چلے'' انہوں نے 1962ء میں گایا اور بس پھر اس کے بعد پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ایک سے ایک شاہکار غزل، گیت، نغمے یوں سمجھئے وہ اک مالا سی پروتے چلے گئے۔ آج یونہی بغیر کسی خصوصی کوشش وکاوش کے ان کے چند سدابہار نغمے ذہن میں گونج رہے ہیں، ذرا دیکھیے تو نظر ڈال کر کہ ہم نے کیا کھو دیا ہے۔ رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لیے آ۔ ہمیں کوئی غم نہیں تھا، غم عاشقی سے پہلے۔ یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی۔ زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں۔ دل ویراں ہے تری یاد ہے تنہائی ہے۔ مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو۔ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔ اک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا۔ یہ کاغذی پھول جیسے چہرے۔ جو درد ملا اپنوں سے ملا۔ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ۔ آفاقی صاحب سے دست بستہ عرض ہے کہ خدائے لم یزل آپ کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے، آپ جلد از جلد فلمی الف لیلہ کا ایک گوشہ اس عظیم کلاکار کی یادوں سے آباد کریں، انتظار رہے گا۔ اقتباسات اس بار شاندار رہے، میں تو انہیں ذہانت کے کیپسول کہوں گا (واہ! کیا خوبصورت بات کہی آپ نے) صفحہ بہ صفحہ بکھرے، معلوماتی، خرد افزا اور برمحل یہ پارچ تو پرچے کی جان ہیں اور اس بار تو انتخاب بے حد داد لے گیا۔ راہی صاحب نے مرزا ہادی بیگ رسوا پر مختصر مگر سیر حاصل مضمون لکھا، امراؤ جان ادا ایسی تحریریں دراصل اردو ادب کا عطر ہیں کہ جب جب، جہاں جہاں ان پر لکھا جائے تحریر کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی۔ فلمی الف لیلہ کی موجودہ قسط دلیپ کمار اور ہم عصروں کے واقعات کشید کرتی نظر آئی، نادرہ کے متعلق اتنی تفصیلی معلومات اس سے قبل کہیں نظر سے نہ گزریں، شاندار آفاقی جی، ماضی کی یادیں آپ یوں تازہ کر دیتے ہیں جیسے اب تب کی بات ہو۔ سراب کے بارے میں کیا لکھیں کہ شاید ہی کوئی خط ہو جس میں اس دلچسپ اور مربوط تحریر کے بارے میں توصیفی کلمات نہ ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن غالب میں عبدالرحمٰن بجنوری سے متعارف کرایا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ محض 33 برس کی عمر پانے کے باوجود اس قدر وا اہمیت رکھنے والا کام چھوڑ گئے۔ یہی حال اپنے سعادت حسن منٹو کا رہا کہ محض 39 برس جیے لیکن اردو افسانوں کا دامن سچے موتیوں سے بھر گئے، انتظار کی گھڑیاں ختم، ناکام عشق کی روداد سناتا، اہم نمبر اگلے ماہ رونمائی کرائے گا یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ وہ جن کے عشق ناکام ہو جائیں، وہ امر ہو جاتے ہیں۔ بڑے آدمی کہلاتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں شوہر کا طوق گلے میں ڈالتا ہے یعنی یہ واحد شعبہ ہے جہاں ناکامی ہی دراصل کامیابی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ پٹاری سے کیا کچھ نکالتے ہیں، روایت لیکن یہی کہتی ہے کہ سرگزشت نے کبھی اپنے مداحوں کو مایوس نہیں کیا۔ بہرحال، پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہِ عشاق دل تھام بیٹھیں ہیں۔''

☒ عاشقِ سرگزشت ایم اے خالق بھٹی، رحیم یار خان کا اندازِ شوق ''سرگزشت ایک ڈائجسٹ نہیں ایک تاریخ کا نام ہے جس میں ماضی کی تاریخ کے علاوہ دنیا جہاں کی معلومات اکٹھی ملتی ہیں ورنہ تو ملک میں سینکڑوں ہزاروں ڈائجسٹ، میگزین، رسائل چھپ رہے ہیں لیکن یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس میں جہاں تاریخ اور دنیا کے بارے میں معلوماتی مضمون پڑھنے کو ملتے ہیں وہیں پر سچ بیتی پر معاشرے میں گزری کچھ کہانیاں بھی ذہن کو جلا بخشتی ہیں جنہیں پڑھ کر اپنی اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ شوبز کے حوالے سے ماضی اور حال میں بیتے واقعات پڑھ کر سلور اسکرین کے خدوخال اور اس سے وابستہ افراد کے بارے میں صحیح معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، ویلڈن سرگزشت۔ اداریہ میں...... کرپشن کے بارے میں پڑھا۔ کرپشن واقعی حکمرانوں کے لیے لازم وملزوم حقیقت بن چکی ہے۔ مختصر بیتی میں چوہدری خلیق الزماں کی پاکستان تحریک کے حوالے سے خدمات پڑھیں۔ محسنِ غالب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد۔ شاطر مصلح میں ابنِ کبیر نے ایک امریکی کے فراڈ کے حوالے سے صحیح معلومات فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شرپا پر تحریر۔ صائمہ اقبال کی ایف بی آئی۔ علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ میں ماضی کی شوبز شخصیت کی تصاویر نے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ این جی یزدانی کی شہریوں کے شہر کا دوسرا حصہ پڑھا پسند آیا۔ مختار آزاد کی سینگ چور، ایاز راہی کی رسوا، شکیل صدیقی کی اُڑان اور زین مہدی کی نگینے پڑھ کر اپنے اکلوتے ذہن کو مزید ذہانت سے سرفراز کرنے کا موقع ملا ہے۔ سچ بیتیوں میں فی الحال ڈیڈی پاپا اور میں، محبت، بساط زیست پڑھی ہے مزید لوڈشیڈنگ کے درمیان وقفہ ملنے پر پڑھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔ رانا سجاد کو کرسی صدارت مبارک، منظر علی خان، مسز سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار، طاہر الدین بیگ، احمد خان توحیدی، سعید احمد چاند، راجا ثاقب نواز ثاقب، مسز مہوش رفیق، ملک جاوید محمد خان سرکانی، ڈاکٹر محمود فیضانی مسز طاہرہ گلزار، خالد یوسفی اور رانا حبیب الرحمٰن نے تبصرے کا صحیح حق ادا کرنے کے علاوہ اپنے خطوط سے جن معلومات سے نوازہ ہے وہ قابلِ تحسین ہے، تمام دوستوں کا شکریہ۔''

☒ اسیرِ عشق سرگزشت غلام یٰسین نوناری کا چوک سرور شہید سے محبت نامہ ''اس ماہ معراج انکل نے جون ایلیا کے انداز میں کرپشن

کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یک صفحی سرگزشت چوہدری خلیق الزماں کی سوانح عمری کی مختصر جھلک پر مشتمل تھی۔ صفحہ الٹا تو خطوط کی عظیم محفل منتظر تھی۔ اپنے ضلع سے رانا محمد سجاد صدارت کی کرسی پر راج کرتے نظر آئے، دل خوش ہو گیا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ منظر علی خان نے وزارت عظمٰی کے عہدے کو مناسب انداز میں پیش کیا۔ صاحب! ذرا شہر خیال کے نام سے بھی پڑھ لیا کریں ویسے کہانیوں پر آپ کا تبصرہ بہت عمدہ رہا۔ شوکت رحمٰن خٹک، یہ کیا بات ہوئی صرف تین جملوں کا تبصرہ۔ بھئی دل کھول کے لکھا کریں۔ بے شک تمام ملکی حالات وواقعات کا غصہ خط میں نکال لیا کریں کہ یہ اپنی ہی محفل ہے، یہ شہر خیالات کے اظہار کا ہے۔ ہر کسی کو اپنے خیالات پیش کرنے کا حق ہے۔ بھتیجی کا لیٹر اچھا تھا مگر بھتیجی کا نام پتا معلوم ہو تو بندہ کے پاس جنوری کا سرگزشت موجود ہے ان کو بھجوا دیا جائے گا۔ سدرہ بانو ناگوری! مسز اس ملک کے حالات روز بہ روز خرابی کی طرف گامزن ہیں۔ قائد نے برصغیر میں آزادی کی روشنی کا دیا اس ملک کی صورت میں روشن کیا تھا لیکن آپ کو پتا ہے، دیا اندر سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ بس باہر اس کی روشنی پھیلتی ہے تو بس آج کے حکمرانوں نے پاکستان کو دیا سمجھ رکھا ہے، یہ دوسری دنیا کو کئی فوائد دے رہا ہے اور خود گھپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ پتا نہیں کب یہ دیے سے بلب بنے گا جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ اعجاز حسین سٹھار! بھئی مزہ آ گیا آپ نے تو اتنا طویل اور دلچسپ تبصرہ لکھ کر دل جیت لیا۔ اگر خاص شمارے میں بھی آپ کا طویل عشقیہ تبصرہ ہو تو سونے پر سہاگہ والی بات ہو جائے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ طاہر الدین بیگ! سرگزشت کی ٹیم ایک دو افراد پہ نہیں لاکھوں افراد پر مشتمل ہے۔ آپ کس کس سے لپٹتے پھریں گے؟ ہر وہ فرد جو سرگزشت سے کسی نہ کسی حوالے سے جڑا ہوا ہے خواہ قاری ہو لکھاری ہو یا مرتب کرنے والا۔ سب سرگزشت کی ٹیم کے کھلاڑی ہیں، اب سوچ لیں۔ سب سے پہلے مجھ سے جھپی ڈالنی پڑے گی، ہاہاہا۔ احمد خان توحیدی! توحید کے مکمل تقاضوں پر پورا اُترنے کے لیے شادی کر ڈالو لیکن محترم، دین صرف چار شادیوں کا نام نہیں، دین کے مکمل احکامات پر عمل کرنا لازم ہے۔ سعید احمد چاند! زبردست مگر جب ایسی باتیں ہم سوچ سکتے ہیں اور ایسے واقعات پر کڑھ سکتے ہیں، رو سکتے ہیں مگر عملاً حالات درست ہونے کی امید اس ملک میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ خالد یوسفی! آپ کا اندازِ تحریر بہت بھایا۔ رانا حبیب الرحمٰن! ابھی تک آپ جیل میں ہو یہ جان کر افسوس ہوا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، سویرا کو فتح خان نے منظم منصوبے کے تحت نہایت ہوشیاری سے اغوا کیا اور کوئی مقصد حاصل کیے بغیر حویلی چھوڑ دیا۔ نادر خان کی نگرانی کرواتے ہوئے شہباز ملک خود اسی کے نرغے میں آ گیا اور آخری آواز غالباً ڈیوڈ شا کی ہو سکتی ہے۔ صحیح بات تو آئندہ ماہ ہی معلوم ہو سکے گی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے شرپا قبیلوں کی روایات کو عمدہ انداز میں بتایا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہاں ایک عورت دو شوہر رکھتی ہے۔ ایف بی آئی کا جنم معلوماتی تحریر تھی۔ فلمی الف لیلیٰ میں پُرانے اداکاروں کے واقعات دوبارہ پیش کیے گئے۔ شہریوں کا شہر دوسرا حصہ ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ زین مہدی نے قیمتی پتھروں پہ بہترین تحقیق پیش کی۔ سچ بیانیوں میں جال، بساط زیست، کاش، ابن الوقت اور گرگٹ اس ماہ کی سپرہٹ تحریریں تھیں۔''

☒ ملک رحیم بخش اعوان رقم طراز ہیں ''جون 2012ء کے شمارے سرگزشت میں مجاہدِ اعظم والی تحریر میں نور الدین زنگیؒ کی حضورِ سرورِ کائنات خواب میں زیارت کرنے اور اپنے جسد مبارک تک ناپاک ہاتھ پہنچنے کی دوری کی ہدایت فرمائی پڑھی۔ صاحب تحریر نے لکھا ہے کہ حضور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ان ہاتھوں سے بچاؤ کا فقرہ ذہن پر بہت گراں گزرا اور جو بھی اپنے آقائے دو عالم ﷺ سے دلی محبت رکھتا ہے اسے بھی گراں لگے گا۔ ہم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دو جہاں کے آقا اپنے ایک امتی سے کہیں کہ مجھے بچاؤ۔ یہ شانِ رسول ﷺ کے خلاف ہے۔'' (آپ نے بجا فرمایا، یہ غلطی سہواً ہوئی۔ مصنف کے ساتھ ہم بھی معذرت خواہ ہیں)

☒ سرگزشت کے عشق میں ڈوبی سدرہ بانو ناگوری نے کراچی سے لکھا ہے ''آغاز انکل کے اداریے سے کیا۔ انکل اب تو ہمیں ملک کا ذرہ ذرہ کرپشن کی گرد میں اٹا ہوا نظر آتا ہے۔ کرپشن، جھوٹ، بدعنوانی اور لوڈشیڈنگ ان سب عذابوں نے ہمارا سانس لینا دشوار کر دیا ہے۔ شہر خیال کی محفل خوب زوروں پر رہی مگر خالد یوسفی نے عمدہ تبصرہ کیا بہت اچھا لگا۔ صفحات پلٹتے پلٹتے اچانک ہی نظر عشق ناکام کے اشتہار پر پڑی گویا انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے ہی والی ہیں۔ سراب میں اس دفعہ یوں لگا جیسے چڑیا گھر کے شیر نے اچانک پنجرہ توڑ کر اعلان کر دیا ہو کہ خبردار میں جنگل کا شیر ہوں۔ اتنی تیزی اور اتنی پھرتی کہ ہمیں اس قسط کو دو دفعہ پڑھنا پڑا کہ کہانی آگے نکل رہی تھی اور ہم پیچھے رہ گئے تھے۔ فلمی الف لیلیٰ میں اس دفعہ آفاقی انکل ماضی کی یادیں لے کر آئے ہیں ان کے لیے ایک بات پر شکوہ کرنا چاہوں گی کہ اس دور کے لوگ اپنے ہیرو کو جلد ہی فراموش کر دیتے ہیں۔ سو انکل آپ کے زمانے میں ایک ٹی وی تھا اور وہ بھی بارہ بجے بند ہو جاتا تھا اور آج کے نوجوان پچاسوں چینلز دیکھتے ہیں۔ سب کے ہیروز اور کرداروں پر نظر رکھنا ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹے ٹی وی آن رہتا ہے۔ موبائل انٹرنیٹ، آئی پیڈ، آئی فون آخر کس کس ایجاد کا نام لوں کہ ان سب میں مہارت حاصل کر لی ہے پھر فیس بک اور یوٹیوب، کالج اور یونیورسٹی کے معاملات، مستقبل کی فکر پھر محلّے کی سیاست اس کے بعد اگر ٹائم بچتا ہے تو ویڈیو گیم سے استفادہ دوستی کے تقاضے پھر آخر میں کہیں جا کر رومان کے لیے وقت نکالنا آپ کے زمانے میں اتنی مصیبتیں تھیں؟ آپ ہم سے شکوہ کرتے ہیں۔ آپ کو ہم نوجوانوں پر ترس کھانا چاہیے کہ اتنی سی زندگی اور اتنی ساری مصروفیتیں تو ہم کس کس شے کو یاد رکھیں اور کسے بھلائیں اور اس کے بعد والدین کی ڈانٹ کہ تم تو کسی کام کے نہیں ہو۔ آپ کے

www.paksociety.com

زمانے میں اتنی مصیبتیں کہاں تھیں؟ ہم تو ہجومِ غم میں گھری ہوئی نسل ہیں، جو نہ جانے کس کی بوئی فصل کاٹ رہے ہیں۔ اللہ ہم پر رحم فرائے (نگینے) زین مہدی مختلف نگینوں کے بارے میں معلومات لے کر آئے۔ اچھے سفرنامے کے شوقین ہم بھی بہت ہیں مگر شہریوں کا شہر صرف دو اقساط پر مشتمل ہے۔ گویا ابھی تشنگی برقرار ہے۔ امید ہے اگلا سفرنامہ دس سے بارہ اقساط پر مشتمل ہوگا۔ سچ بیانیوں میں سب سے پہلی کہانی جال نوجوان اور نادان لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے۔ انور کمال کی تحریر ذرا سی بات نے لبوں پر بے اختیار ہی مسکان بکھیر دی اور ادارےیے میں لفظ پاسنگ کا مطلب بتادیں، کیا اس کا مطلب غیر متوازن ہے۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟'' (جی ہاں ترازو کے پلڑے غیر متوازن ہوں تو اس کو پاسنگ کہتے ہیں۔ یہ لفظ سنسکرت سے بھاکا پھر ہندی اور اردو میں آیا)

☒ عافیت خان خٹک، کرک سے رقم طراز ہیں۔ ''معلوم نہیں کتنے برسوں سے سرگزشت کا قاری ہوں اور میں از خود ہر ماہ سوچتے سوچتے شہرِ خیال میں داخل ہونے سے رہ جاتا ہوں۔ آج نیا شمارہ ہاتھ آیا تو سوچا کہ اب کی بار لکھ ہی لوں اور شہرِ خیال کے دوستوں سے تعارف و ملاقات کا شرف حاصل کر ہی لوں۔ اب تک پڑھا نہیں لیکن میں تو سرورق دیکھ کر سب جان جاتا ہوں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ سرگزشت میں وہ سب ہوتا ہے جو قاری کو چاہیے۔ اب میں کس کس کے بارے میں لکھوں۔ کس کس کا نام لوں۔ خدا کرے یہ سفر جاری رہے۔ کئی سال پہلے معراج رسول صاحب کو ایک خط لکھا تھا انہوں نے مختصر جواب سے نوازا تھا۔ اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ لکھنے پر آئے تو کئی صفحات سیاہ ہوں لیکن پھر کبھی۔ شہرِ خیال کے دوستوں سے استدعا ہے اختصار ایسا نہ ہو کہ پڑھنے کے لیے صرف شہرِ خیال ہی رہ جائے۔''

☒ نو گرفتارِ عشق سرگزشت مدیحہ خان، ماریہ خان، راولپنڈی سے لکھتی ہیں ''آپ نے جون کے شمارہ میں ہمارا خط شائع کیا بہت بہت شکریہ۔ سرگزشت ہمیں انیس جون کی شام کو ملا۔ تبصرہ سے قاصر ہوں، وجہ ہم بچوں کی خالہ بن گئی ہیں۔ ہاسپٹل میں خاصی مصروفیت رہی۔ آئندہ بروقت مطالعے کے بعد تبصرہ کی سعی کریں گے۔ گھریلو خانہ داری، بچوں کی پرورش پھر گھر والوں سے آگے پیچھے ہوکر مطالعہ کرنا۔ وقت کا مسئلہ۔ بروقت مطالعے کے بعد ہی سرگزشت و پاکیزہ کی محفل میں تبصرہ ہوسکتا ہے۔''

☒ عاشق سرگزشت رانا حبیب الرحمٰن گوجرہ سے مرسل ہیں۔ ''اس دفعہ رسالہ تیس تاریخ کو پیشی پر سیشن کوٹ سے خریدا اور سب سے پہلے آزادی کے سپاہی چوہدری خلیق الزماں کی سرگزشت پڑھی۔ اس کے بعد شہرِ خیال میں انٹری کی رانا محمد سجاد صاحب فرنٹ سیٹ پر براجمان تھے۔ ذاکر انکل صاحب واہ کیا بات ہے۔ ہر دفعہ کچھ معروف لوگ ہی کیوں کرسی پر بیٹھتے ہیں کیا ہم اب سرگزشت کو بھی سیاست سے تشبیہ دے دیں کیونکہ سیاست میں بھی یہی ہوتا آرہا ہے۔ (سرگزشت میں قابلیت قابلِ ترجیح ہے۔ پہلا خط جامع لفظوں میں اختصار کے فن سے مزین ہوتا ہے) سجاد صاحب عشق ہمیشہ ہی ناکام ہوتا آیا ہے۔ اتنا تو سب جانتے ہوں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت بھی عشق ناکام ہوگیا تھا جس کی وجہ سے پہلا قتل وجود میں آیا۔ ازل سے بھائی بھائی کا دشمن بنا ہے۔ اس لیے عشق کامیاب نمبر نہیں نکال سکتا، ہاں میرے خیال میں اب اپنی کوئی وادی نمبر جیسے وادی کاغان، وادی کشمیر، وادی کیلاش، وادی نیلم جیسی وادیوں کا ذکر کیا جائے ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے آپ کا کیا خیال ہے؟ (تمام وادیوں پر مضامین شائع ہوچکے ہیں) دوسرے نمبر پر منظر علی خاں وزیرِاعظم بنے بیٹھے تھے۔ آپ کا تبصرہ بھی ٹھیک ہے۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ خلوص سے بھرپور لگا۔ واقعی انسان آپ جیسا ہوجائے تو شاید غم بھی کم ہوجائیں اس کے بعد ذاکر انکل صاحب اس دفعہ بغیر نام و پتے والی اب کبھی بھی پتا لکھنا نہیں بھولے گی، اعجاز حسین، احمد خاں توحیدی، راجہ ثاقب نواز ثاقب، ملک جاوید سرکانی درانی، طاہرہ گلزار کے تبصرے پسند آئے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ اس کے بعد اینڈ پر اپنا خط پڑھ کر خوشی ہوئی لگتا ہے اب سسپنس اور جاسوسی کے علاوہ سرگزشت میں ہمیں زیادہ خوش آمدید کہا جارہا ہے اس لیے ہم نے سوچا ہے سرگزشت کے لیے کچھ لکھا جائے۔ امید ہے ہمیں حوصلہ ضرور ملے گا اور شکریہ کا موقع عطا کیا جائے گا۔ تاخیر سے خط بھیجنے والے پندرہ تاریخ سے پہلے پہلے خط بھیج دیا کریں۔ اس کے بعد اس دفعہ بیت بازی میں میرا شعر جو شمیم کے نام لکھا گیا تھا بلکہ دو کوپن جن کے نمبر اکتالیس اور بیالیس تھے بھیجے لیکن ان میں سے کوئی بھی شعر نہیں چھپا (چھپے گا) انکل کیا ان کے علاوہ ہم کسی پرانے سرگزشت کا بیت بازی کا کوپن استعمال کرسکتے ہیں (نہیں) بیت بازی میں ندا علی، عنایت علی بنگش، ڈاکٹر اقرا بانو ناگوری، عذرا پروین، آمنہ حق، منظر علی خان، زویا احمد کے اشعار بہترین تھے۔ اس کے بعد آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے خلافِ معمول نویں سچ بیانی پڑھی لیکن آپ کو بتاتا چلوں جس وقت میں صرف یہ لفظ ہی پڑھے تھے کہ گولیوں کی کرخت ہیبت ناک اور خون منجمد کرنے والی آوازوں سے پورا علاقہ گونج رہا تھا ہم سب اسی وقت ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ دیکھا تو بخشی خانے میں ایک قیدی نے ایک دوسرے قیدی کو نائن ایم ایم کی آٹھ گولیاں ماردیں اور وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ ہم سب ڈر گئے تھے پھر پورا ڈیڑھ گھنٹا گولیاں قیدی اور پولیس کے درمیان چلتی رہیں اور ہم کانوں میں انگلیاں ڈالے دعا مانگتے رہے پھر سپاہیوں نے مقابلہ کرنے کے لیے دیوار کو نشانہ بنایا اور دیوار توڑ ڈالیں۔ میڈیا بھی لیٹ پہنچا تھا لیکن اس وقت وہ قیدی بھی موت سے ہمکنار ہوگیا تھا۔ ہم آج تک یہ سنتے آئے ہیں کہ میڈیا بہت تیز ہے ہر جگہ جلد پہنچ جاتا ہے۔ یہ واقعہ تیس جون کو ہی پیش آیا اور

یہ سچا واقعہ ہے اس وقعے کی کچھ معلومات لینا چاہتے ہیں تو اکتیس جون بروز اتوار کے اخباروں میں بمعہ تصویر پڑھ لیجیے۔ یہ واقعہ بالکل سچا ہے جو میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ اب حالات تیزی سے بدل گئے ہیں ملاقاتیں اور سامان وغیرہ بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ حادثات انسان کو بدل دیتے ہیں اور میرے تجربے کے مطابق واقعی انسان حادثے سے بہت زیادہ بدل جاتا ہے۔ کراچی کے ایک حادثے میں پروفیسر نفیس خیال اور تارہ اور ڈاکٹر جواد کے بیٹے تیمور کی زندگی بھی حادثے کے بعد ہی بدلی بلکہ خود بھی بدل گئے۔ اس کے بعد سراب ہماری فیورٹ کہانی ہے جہاں شہباز ملک کو فتح خان جیسا شاطر و چالاک دشمن سے واسطہ پڑچکا تھا اور ایک بار پھر پہلی بار کی طرح فتح خان کے توسط دشمن نادر کے شکنجے میں آگیا۔ آفاقی صاحب کے ہم بھی ہم خیال ہیں واقعی اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ انسان کے رویے اور اندازِ فکر کے علاوہ اندازِ گفتگو بھی بدل چکا ہے اور مزید بدل رہا ہے جیسے اپنی زبان اردو بدل کر انگریزی لازمی کردی گئی ہے اور ترقی یافتہ ممالک کے قانون ہم استعمال کررہے ہیں اور کراچی میں بلکہ ہر شہر میں پانی، گیس اور بجلی کی لوڈشیڈنگ کے تابڑ توڑ حملے جو پاکستانیوں کی جان کے دشمن ہورہے ہیں اب کئی علاقوں میں پانی اور بجلی یا گیس تو ختم ہوچکی ہے پھر بھی دھمکی کہ بل مقررہ تاریخ تک ادا نہ کرنے کی صورت میں جرمانے کے علاوہ کنکشن بھی کاٹ دیا جائے گا۔ کیا حالات ہیں ہمارے آزاد ملک پاکستان کے، کیا ان حالات میں پاکستان ڈولنے کے بعد ایک جگہ ٹھہرا رہ پائے گا؟ فلمی الف لیلیٰ میں دلیپ کمار اور مینا کماری کے کارنامے بھی بہترین تھے۔''

☒ سرگزشت کے عاشقِ کامل منظر علی خان لاہور سے رقم طراز ہیں محسنِ غالب کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر پسند آئی۔ غالب کے بارے میں سچ یہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود غالب کا کلام جدید ترین ہے۔ تازہ اور دلکش۔ کوئی لفظ بھی متروک نہیں ہوا۔ غالب آج بھی زندہ ہے اور سو سال بعد بھی اسی جدت اور ندرت میں زندہ رہے گا جبکہ دیگر شعرا کے کلام میں اکثر لفظ متروک ہوچکے ہیں۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور کلامِ غالب، یہ اندازِ نظر خوب ہے۔ شاطر مصلح پڑھ کر یہ احساس بڑھا کہ ہمارے اپنے لوگ ہی ہماری قوم میں تعلیم عام کرسکتے ہیں، دوسرے لوگ نہیں۔ یکساں نظامِ تعلیم کے بغیر کوئی قوم اعلیٰ معیار کو نہیں پہنچ سکتی اور نہ ایک قوم کہلانے کی حق دار ہوسکتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ اردو قومی زبان آئینی طور پر 1988 میں مکمل دفتری زبان بنانے کا وعدہ تھا مگر عملاً کچھ نہیں کیا گیا اور قوم کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ علاقائی زبانوں، مادری زبانوں کو بھی ابتدائی تعلیم میں رائج کیا جائے، ورنہ ہمیں دیگر زبانوں میں پڑھنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ قومی یکجہتی کے بھی منفی ہے۔ شراپا ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دلچسپ تحریر تھی۔ ایف بی آئی کا جنم تفتیشی ادارے کا قیام اور پس منظر پڑھ کر حیرت ہوئی۔ جاسوسی تنظیمیں بھی کیا عجیب ہوتی ہیں۔ فلمی الف لیلہ ذکر حسبِ حال ہے۔ سینگ چور کے عنوان سے گینڈوں کے بارے میں کافی معلومات ملیں۔ کسی نوع کی بقا دوسروں کی بقا کی ضامن ہوتی ہے اور کسی بھی نوع کے مٹ جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی دیگر انواع کے لیے بھی نقصان رساں ہوتا ہے۔ کسی اہلِ علم کی بات ہے کہ آخری دور میں جب شہد کی مکھیوں کا دنیا سے خاتمہ ہوجائے گا تو نوعِ انسانی بھی جلد مادی خاتمے سے ہمکنار ہوجائے گی۔ واللہ عالم بالصواب شہریوں کا شہر آسٹریلیا کے معاشرے کی خوبیوں کا عکاس ہے۔ سیاحت کے موضوع پر ممالک کی سیر اور وہاں کے معاشرتی سماجی حالات بہت اچھے لگتے ہیں۔ رسوا مرزا محمد ہادی رسوا اردو ادب کی قدیم شخصیت ہیں ان کی وجہ شہرت صرف امراؤ جان ادا نہیں بلکہ ان کی تحریروں کی پختگی اور شگفتگی بھی ہے۔ اُڑان شکیل صدیقی صاحب کا اچھا ترجمہ ہے۔ مہم جوئی اور حادثات خاصے دلچسپ ہوتے ہیں۔ زندگی خطرات سے عبارت ہے مگر ولولہ انگیز واقعات بہت دلکش ہوتے ہیں۔ نگینے کے عنوان سے آپ نے جواہرات کے بارے میں جو روشنی ڈالی ہے۔ اتنا پوری پوری کتابوں میں بھی معلومات کا ذخیرہ نہیں ملتا۔ ہر نگینے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں یاقوت اور مرجان بیک وقت پہنے جائیں تو ایک ٹوٹ جاتا ہے یا ضائع ہوجاتا ہے کیونکہ مطابقت نہیں ہوتی۔ میگنا ٹک خون کی بہت سی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ سراب اچھی جارہی ہے۔ سچ بیتیوں میں جال، غیب اور کاش پسند آئیں۔ ڈیڈی پاپا اور میں اچھی کاوش ہے۔ کرپشن پر جناب معراج رسول صاحب کی تحریر حسبِ حال ہے۔ کرپشن پر باتیں ہوتی رہتی ہیں مگر اعلیٰ ترین مناصب بھی کرپشن زدہ ہوں تو اصلاح کیسے ہو؟ سپاہی کے عنوان سے چوہدری خلیق الزمان کا تذکرہ بھی خوب تھا۔''

☒ عاشقِ زارِ سرگزشت رانا محمد شاہد کابورے والا سے خلوص نامہ ''جولائی کا شمارہ سخت گرمی میں خریدا۔ گرمی اوپر سے غیر اعلانیہ اور بے تحاشہ لوڈشیڈنگ نے ہر پاکستانی کی زندگی کو مفلوج کرکے رکھ دیا ہے۔ جہاں فیکٹریاں، ادارے بند ہورہے ہیں وہیں لاکھوں لوگ بے روزگار ہورہے ہیں۔ اوپر سے حکمرانوں کی بے پناہ کرپشن نے لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم کردیا ہے۔ معراج رسول صاحب نے انتہائی حساس اور اہم موضوع پر لکھا۔ نیب کے سربراہ کا حالیہ بیان ہے کہ ملک میں روزانہ چھ سے آٹھ ارب روپے کی کرپشن ہورہی ہے۔ دوسری طرف خاندانی سیاست نے ہمارے ملک اور نظام کا مزید بیڑا غرق کیا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کو حال ہی میں مصر کے کامیاب ہونے والے صدر ڈاکٹر محمد موری سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہے۔ جس نے کیلی فورنیا یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی پھر امریکا اور مصر کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے چنانچہ جب تک ہماری سیاسی جماعتیں بھی بھٹو، میاں یا

www.paksociety.com

چوہدری خاندان سے باہر نہیں آتیں جب تک ڈاکٹر محمد مورسی، عبداللہ گل، طیب اردگان اور مہاتیر محمد جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ آگے نہیں آتے اس وقت تک تبدیلی کی امید رکھنا کارِ عبث ہوگا۔ ہمارے ان سیاسی خاندانوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ سیاست کسی کی جاگیر نہیں بلکہ عوام کی خدمت کا نام ہے اور اس کے لیے خاندانی حسب نسب نہیں بلکہ میرٹ ہونا چاہیے۔ چوہدری خلیق الزماں کے بارے میں یک صفحی سرگزشت میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ تحریک پاکستان کے ان سپاہیوں کے کام ہی دراصل نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بارے میں سرگزشت پڑھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر امجد صاحب ان گمنام گوہر نایاب کی زندگیوں وجدوجہد کی بھرپور کہانی سنا کر ایک نیا جذبہ امنگ پیدا کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ گریگ ایک شاطر مصلح تو تھا مگر اتنا بڑا جرم بھی نہیں کہ اسے معاف نہ کیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے نیپال کے کنارے آباد ایک منفرد قبیلے کے بارے میں معلومات سے بھرپور تحریر لکھی۔ واقعی ان کی رسومات بھی اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں لیے ہوئے تھیں۔ صائمہ اقبال نے ایک تفتیشی ادارے کے قیام کو ایک کہانی کی صورت میں لکھا۔ اندازِ تحریر بہت اچھا تھا۔ فلمی الف لیلہ میں فلم نگری کے ستاروں کی وہ بہت سی باتیں بھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں جو یقیناً علی سفیان آفاقی کا ہی خاصہ ہیں۔ گینڈے کی زندگی کا احاطہ کرتی مختار آزاد کی تحریر سینگ چور ایڈونچر و دلچسپی سے بھرپور تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی جیسے لوگ ہی ہمارے ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں لیکن ان جیسی شخصیات کے حوالے سے بہت کم لکھا جاتا ہے۔ سرگزشت کا ہی یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر شعبے کی ان شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں جن کے بارے میں قارئین کی اکثریت بہت کم جانتی ہے۔ شکیل صدیقی نے پائلٹ کی دنیا کی ایک ایڈونچر بھری مختصر مگر بہترین کہانی پیش کی۔ زین مہدی نے نگینے نما چھوٹے پتھروں کے بارے میں تفصیلاً ذکر کیا۔ ''جال'' بہت زبردست تحریر تھی۔ معاشرہ رنگ برنگے لوگوں کا نام ہے اور یقیناً جہاں بہت سے بُرے لوگ ہوں، وہاں چند اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جال معاشرے کے مختلف رنگ دکھاتی ایک بہترین کہانی تھی۔ تیسرا عشق یقیناً ایک نہایت اہم پہلو کو آشکار کرتی بہترین کہانی تھی۔ کہانی اور ایک تحقیقی مضمون ''جب ابراہام لنکن کی لاش چوری کی گئی'' بھیجا تھا۔ اس کے متعلق ہی کچھ بتادیں۔'' (یہ تاریخی مضمون پہلے بھی چھپ چکا ہے)

☒ عاشق زار سرگزشت ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کا برہ زئی، پیچھے سے خلوص نامہ ''جناب عبیداللہ بیگ کی رحلت سے ایک اور علمی چراغ بجھ گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک مبارک فرمان کا مفہوم ہے کہ ایک عالم کی موت ایک جہان کی موت ہے۔ ان کے انتقال پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں، شہر میں ایک چراغ تھا، نہ رہا۔ اک روشن دماغ تھا، نہ رہا۔ حقیقتاً ان کے متعلق لکھنے کا حق انہیں حاصل ہے جو ان کے مقام و مرتبے کا بہ خوبی ادراک رکھتے ہیں یعنی قلمی، ادبی حیثیت کے حامل ہوں، صرف ان سے عقیدت کی بنا پر یہ حق حاصل ہے کہ کچھ لکھا جائے۔ مرحوم نے ایک عالم، ادیب اور علم پرور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کا کردار بھی ادا کیا۔ ٹیلی وژن پر دکھایا جانے والا پروگرام کسوٹی تو ایک روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ معین اختر مرحوم نے ان کی اہلیہ محترمہ سلمیٰ بیگ سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ کے خاوند کا ایک کروڑ روپے کا انعام نکل آئے تو وہ اس کا کیا کریں گے؟ جواباً سلمیٰ صاحبہ نے کہا تھا ''ساری رقم کی کتابیں خرید لیں گے'' اور بیگ صاحب نے بھی کہا تھا کہ زیادہ رقم کی کتابیں خریدوں گا۔ یہ بھی جان لیں کہ یہ سوال بیگ صاحب کی غیر موجودگی میں کیا گیا تھا۔ واقعی، علم اور کتاب سونا ہے۔ رانا سجاد صاحب اختلاف رائے میں معذرت کیسی، اللہ تعالیٰ کرے آسکر ایوارڈ کے بارے میں میرے ہی خدشات غلط ہوں۔ بھائی احمد خان توحیدی ہمارے بھائی کو دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ اور ان کی شفایابی کی خوشخبری بھی۔ آپ کے سوا کسی نے انہیں دعاؤں میں یاد نہیں رکھا ورنہ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ شہرِ خیال کے سارے باسیوں کا دکھ درد سانجھا ہے مگر معلوم یہ ہوا کہ یہاں بھی نفسا نفسی کا برتاؤ ہے۔ طاہرہ گلزار، آپ کو بھی یاد رہا تو صرف سرکانی کا مطلب پوچھنا تو عرض ہے کہ یہ مرکب ہے دو لفظوں یعنی سرکانی کا جس کا مطلب ہے ''چوٹی کا، سب سے اعلیٰ پتھر'' اور یہ لقب اور خطاب ہے جدِ امجد حضرت بسم اللہ خان کا۔ سرورق سرپرست سرچشمہ وغیرہ جیسے الفاظ سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ اس کے اور معانی اور مفہوم بھی بیان کیے جاتے ہیں جو طوالت کی وجہ سے نہیں لکھ رہا۔ اس خاندان کے افراد بھچھو، ضلع ملتان، مہمند ایجنسی اور ڈیرہ اسماعیل خان میں کثیر تعداد کے ساتھ ساتھ ملک اور بیرونِ ملک کئی جگہوں پر آباد ہیں۔ کئی علاقے بھی سرکانی نام سے موسوم ہیں۔ مہوش رفیق، آپ کا تبصرہ ٹھیک ٹھاک تو ہوتا ہے اس کے علاوہ اعجاز سٹھار، سعید احمد چاند اور بغیر نام و پتے والی محجوب اور مستور ہستی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ محمد ایاز راہی قومی اور مادری زبان تو ماں کی طرح ہوتی ہے باندی نہیں اور یہ بھی کہ علم و فن کی دیوی، دولت اور قسمت کی دیوی جیسی تراکیب سے ایک الگ مذہبی سوچ کا اظہار ہوتا ہے، آپ اہلِ قلم ہیں، آپ کے الفاظ سند بن کر عوام میں رائج ہو جاتے ہیں۔ احتیاط برتیں۔''

☒ عشق سرگزشت سے سرشار رانا محمد سجاد کا خط شاہ جمال، مظفر گڑھ سے ''اور ماہ جون ایک ایسی شخصیت کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، میری مراد مہدی حسن صاحب سے ہے، جن کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ سُر اور سنگیت کا آفتاب غروب ہوگیا۔ ان کے خلا کو پُر کرنے کے لیے دور دور تک کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔ پروردگار ان کو اعلیٰ درجات سے بہرہ ور فرمائے، آمین۔ عبدالودود بیگ، سرشار صدیقی بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ موسم گرما کی گرمی تو عروج پر ہے ہی لیکن سیاسی گرما گرمی بھی اپنے عروج پر ہے، کوچہ اقتدار میں چہرے بدل گئے۔ قوم

کی راہنمائی کا فریضہ جسے سونپا گیا ہے وہ صاحب ہیں جنہوں نے توانائی کے بحران کے خاتمے کی خوشخبریاں سنائیں لیکن افسوس کوئی وعدہ وفا نہ ہوا۔ جولائی کا سرگزشت 28 تاریخ کو موصول ہوا۔ معراج رسول صاحب اپنے انداز سے اظہار خیال فرمارہے تھے۔ بس جناب، دعا کیجیے۔ تحریک پاکستان کے سرگرم رکن کا تعارف کرایا گیا۔ بہت پسند آیا۔ شہرِ خیال میں داخل ہوئے، اپنا خط سرِفہرست دیکھ کر خوشی ہوئی اور آپ نے ہماری درخواست فوراً مسترد کردی۔ آپ نے جواب بھی خوب دیا۔ منظر علی خاں کا خوبصورت تبصرہ پڑھا، پسند آیا۔ گل حمید پر مضمون کا انتظار رہے گا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ نے تلخ حقیقتوں کا ذکر کیا اور مزار قائد کے حوالے سے آپ نے بتایا، یقین جانیے، بہت دکھ ہوا۔ قوم کے باپ کے ساتھ یہ سلوک ہے تو باقی لوگوں کا تو کیا کہنا؟ اعجاز حسین سٹھار کا بھرپور تفصیلی تبصرہ اور عشق ناکام نمبر کے متعلق بات، اپنی بے چینی کا اظہار ہے۔ مدینہ منورہ سے متعلق اپنی خوبصورت یادوں کا تذکرہ کیا۔ دعائے بد میں ڈاکٹروں کی بے حسی کا تذکرہ کیا جو صورتِ حال آج کل پیش آرہی ہے، انسانیت کی خدمت کرنے کے دعوے کہاں گئے۔ انسانیت کی خدمت کرنے والے انسانیت کو رلا رہے ہیں۔ طاہر الدین اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے نظر آئے۔ احمد خان توحیدی کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ سعید احمد چاند، اللہ آپ کو حفظ وامان میں رکھے۔ راجا ثاقب نواز، مہوش رفیق بھی حاضر تھے۔ مہوش صاحبہ آپ کی توجہ والی لسٹ بڑھتی جارہی ہے۔ بھئی آپ بھی اتنی ہی عزیز ہیں جتنے ہم اور باقی ساتھی ہیں۔ سلام تو قبول کرلیا لیکن مبارک باد کس چیز کی، وضاحت نہیں کی۔ جاوید خان مختصر سا تبصرہ، ڈاکٹر محمود فیضانی، اللہ تعالیٰ آپ کو اس خدمت خلق کا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔ خالد یوسف صاحب، خوبصورت تبصرہ تھا خصوصاً دوسرا شعر بہت پسند آیا۔ رانا حبیب الرحمٰن پروردگار آپ کو جلد رہائی عطا فرمائے۔ محسن غالب تو سرگزشت کے خاصے کی چیز تھی۔ خصوصاً غالب کے شیدائیوں کے لیے۔ آپ کے توسط سے ایک نادر روزگار کے حالات زندگی پڑھے اور حیرت بھی ہوئی کہ اتنی کم عمری میں اتنا کچھ کرلیا۔ خصوصاً وید مقدس اور دیوانِ غالب والی بات تو ضرب المثل بن چکی اور یہی ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ محاسن کلام غالب نامی کتاب پڑھنے کے لیے بے تاب ہو گئے ہیں۔ عشق ناکام نمبر کا اشتہار بھی سامنے آگیا۔ تعارف والی شخصیات تو ہم نے پہچان لی ہیں سوائے خاتون اوّل کے۔ پاکستانی ڈاکٹر حسنات اور لیڈی ڈیانا ہے۔ بالی وڈ میں سے ریکھا ہے۔ انگریزی ادب میں کیٹس ہے۔ ٹھیک کہا نا ہم نے؟ (پرچہ حاضر ہے، جواب دیکھ لیں) شاطر مصلح شروع میں تو بُری لگی لیکن آخر میں ہم بھی ان کو سراہنے پر مجبور ہوگئے۔ سراپا دلچسپ و معلوماتی تحریر تھی۔ ایف بی آئی کا جنم صائمہ اقبال نے اس کی تاریخ بتائی، جو آج کل ایک نفرت کی علامت بن چکا ہے۔ فلمی الف لیلہ اب کی بار بہت دلچسپ لگی۔ خصوصاً دیو آنند کا خط بہت دلچسپ لگا۔ سینگ چور اور سفرنامہ کا مطالعہ نہیں کیا۔ شمارے کا ایک اور دلچسپ مضمون اور زبردست مضمون رسوا بہت پسند آیا۔ یہ تحریر تو خاص الخاص توجہ سے پڑھی۔ نگینے کا ابھی مطالعہ کرنا ہے۔ سراب کاشف زبیر صاحب کی دلچسپ تحریروں میں سے ایک تحریر، بہت سنسنی خیز جگہ پر اختتام کیا، بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔''

☒ مہوش رفیق کا پیام کراچی سے ''سب سے پہلے تو بہت بہت نوازش آپ کی ہر ماہ خط شائع کرنے پر۔ سب سے پہلے اداریہ میں پہنچے۔ ہر جگہ کرپشن اور صرف کرپشن ہے۔ سیاسی خاندانی کرسی چلی آرہی ہے۔ کوئی نظم وضبط نہیں ہے وہ اس لیے کہ عوام کمزور ہے اور خاموش تماشائی بن گئی ہے اور میڈیا جو آزاد ہے وہ غیر ممالک کو کیا دکھانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا مطلب دہشت گردی، لوڈشیڈنگ، ظلم وتشدد میرے انکل اور آنٹی لندن سے آئے ہوئے ہیں آج صبح کہنے لگے کہ لندن میں ہر وقت پاکستان نیوز چینلز پر یہی نیوز آتی رہتی ہیں فلاں جگہ فائرنگ، فلاں جگہ بم بلاسٹ، فلاں جگہ لوڈشیڈنگ سے احتجاج بس اور کچھ نہیں۔ لندن میں لوگ جب یہی نیوز دیکھتے ہیں تو پاکستان کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ وہاں جائیں اور لوٹ کر نہ آئیں یہ ہے پاکستان......؟ اب آتے ہیں شہرِ خیال کی رانا محمد سجاد صاحب کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ اس دفعہ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے پچھلی دفعہ کی طرح دل برداشتہ نہیں تھیں۔ کافی اچھا لگا کہ اپنا دکھ انہوں نے بانٹا۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین لگا۔ سعید احمد چاند صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں بالکل کہ آج تک جتنی بھی وارداتیں، کرائمز، آپریشن ہوئے کوئی بھی نہیں پکڑا گیا مگر ہمارے بولنے سے کیا ہوتا ہے سب کچھ ویسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ ہر طرف کرپشن، بے روزگاری، لوڈشیڈنگ، کرائمز جاری وساری ہے۔ کوئی پُرسان حال نہیں ہے۔ میڈیا نے اور تباہی مچائی ہوئی ہے۔ میرا چار سال کا بھانجا ہے۔ کل میں اسے سوتے وقت کہانی سنا رہی تھی تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ بیٹا سو جاؤ صبح اپنا ہوم ورک مکمل کرنا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں ایک بندوق لوں گا اور اسکول جا کر تمام میڈمز اور تمام ٹیچرز کو گولی ماردوں گا۔ یہاں پر مجھے میڈیا پر اتنا غصہ آیا کہ بچے نے آج کل جو کرائمز اسٹوری دکھائی جاتی ہے اسے ذہن میں رکھ لیا ہے کہ اگر کوئی ڈانٹے گا تو بندوق لے کر گولی ماردوں گا قصہ ختم۔'' (آپ نے بہت اہم معاملے کی جانب توجہ دلائی۔ یقیناً اسی طرح کی خبروں اور پروگراموں کا بچوں کے ذہن پر نہایت منفی اثر ہوتا ہے۔ نہ صرف ٹی وی چینلز کو چاہیے کہ اس طرح کے پروگرام نشر کرتے ہوئے لکھ دیں کہ بچے نہ دیکھیں بلکہ والدین کا بھی فرض ہے کہ بچوں کو ایسے پروگرام نہ دیکھنے دیں۔ یہ ایک نہایت اہم نفسیاتی مسئلہ ہے جس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے ورنہ نئی نسل برباد ہو جائے گی)

www.paksociety.com

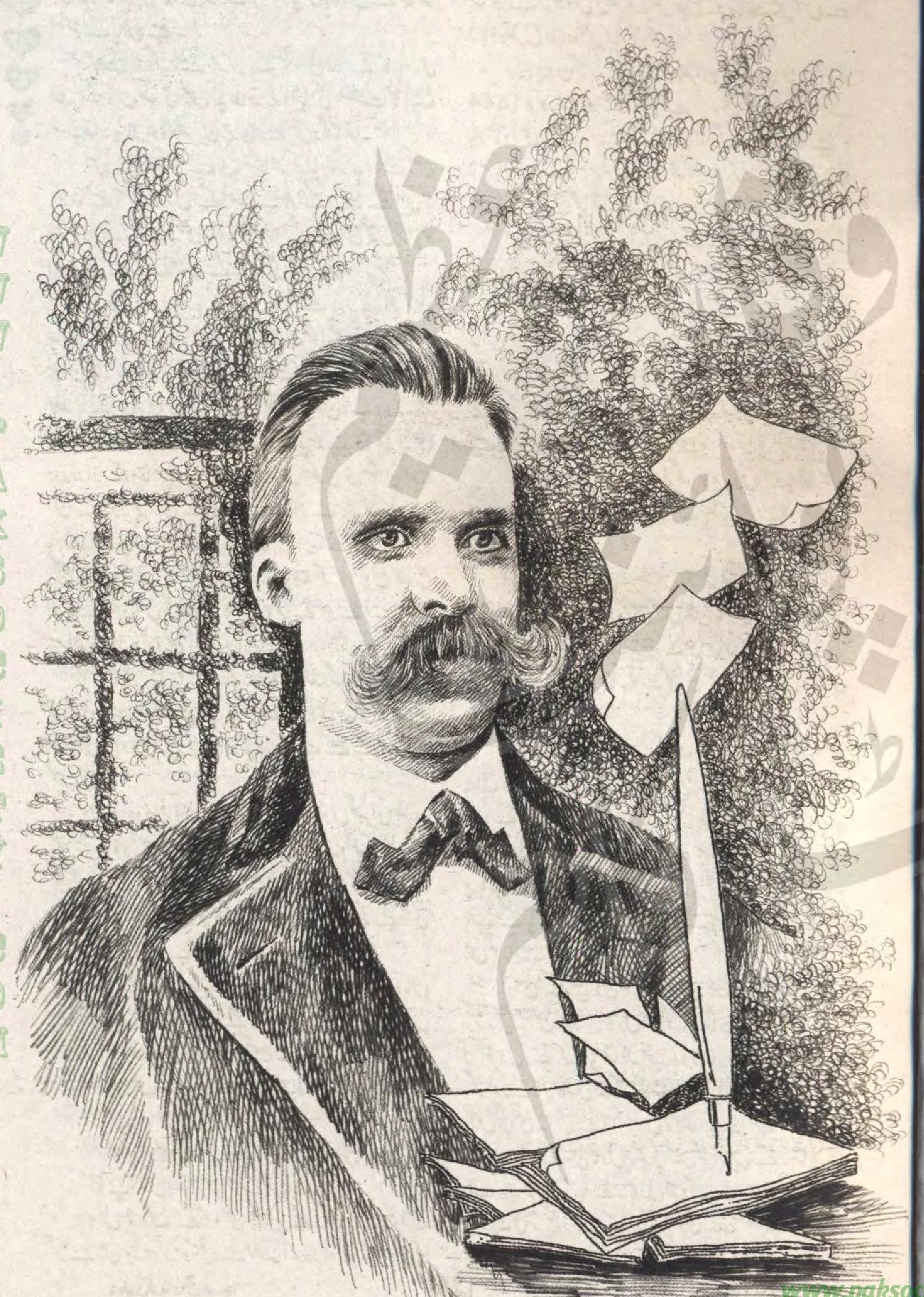

مجذوبِ عشق

ڈاکٹر ساجد امجد

خوش جمالوں کے دلوں میں گھر کرنے والی وہ فسوں کار شخصیت اہلِ علم ودانش کے دماغوں کو بھی مسخر کرتا رہا تھا۔ آج بھی اہلِ دانش اسے علم کی معراج پر دیکھتے ہیں مگر کوئی اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا کہ وہ کس طرح غمِ عشق میں مبتلا رہا، سوگ کی دنیا آباد کیے اپنی منزل کی طرف گامزن رہا، اس پر کوئی غور نہیں کرتا، بس سب اس کے فلسفے میں ڈوبتے اُبھرتے رہتے ہیں۔ اسے اس عہد کے بڑے فلسفیوں میں شمار کرکے خوش ہولیتے ہیں۔

ایک معروف فلسفی کا زندگی نامہ، ایک ٹوٹے دل کی کتھا

عشقِ ناکام نمبر

بڑے پادری نے چھوٹے پادری کی طرف تشویش آمیز نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر تھکن کے ایسے آثار تھے جیسے وہ میلوں کا سفر پیدل طے کرکے آرہا ہو۔

"تمہیں کیا ہورہا ہے، کارل لڈوگ! تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟ ابھی تم اپنا ہاتھ ماتھے تک لے کر گئے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ تمہیں بڑی دشواری پیش آرہی تھی۔"

"ہاں، کچھ دن سے کبھی کبھی یہی کیفیت ہوجاتی ہے۔ طبیعت میں چڑچڑا پن بھی آتا جارہا ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ تمہارے اعصاب کی کمزوری ہے۔ تم کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟"

"آج یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اب تو کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

"کمال ہے، آج کل کے نوجوانوں کو یہ کیا ہوگیا ہے۔ تم لوگ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ تم کسی ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤ۔ ابھی تو تمہیں میری جگہ لینی ہے، بہت ترقی کرنی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ دیکھیے، اب میرے ہاتھ بھی نہیں کانپ رہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا۔"

"جی فادر، آج ہی جاؤں گا۔"

"تو پھر جاؤ، بیٹھے کیوں ہو؟ تم چھٹی کرو، میں کام سنبھال لوں گا۔"

کارل لڈوگ کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید یہی کہ چھٹی کی کیا ضرورت ہے لیکن بڑے پادری نے آنکھیں دکھائیں تو اس نے اپنی ٹوپی اُٹھائی اور گرجے سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے تو اس کی طبیعت مزید سنبھل گئی اور وہ تیزی سے گھر کی طرف چل دیا۔

کارل لڈوگ یہ بھول ہی گیا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ اس نے سوچا تو صرف یہ سوچا کہ کچھ دیر آرام کرلے گا تو طبیعت بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ وہ اسی طرح کا بے پروا تھا سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا۔

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ اس کی بیوی نے اسے بیدار کیا اور اطلاع دی کہ بڑے پادری صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ انہوں نے فرانزسکا کو سب کچھ بتادیا ہو۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا جہاں بڑے پادری صاحب بیٹھے تھے۔ یہاں پہنچ کر اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ انہوں نے فرانزسکا کو سب کچھ بتادیا ہے۔

"مجھے معلوم تھا، تم ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے ہوگے۔ یہی معلوم کرنے آگیا تھا۔"

"بس جانے ہی والا تھا۔ آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔"

"یہ کبھی نہیں جاتے۔ اچھا ہوا آپ نے مجھے بتادیا۔ اب میں انہیں لے کر جاؤں گی۔ انہوں نے تو مجھے یہ تک نہیں بتایا کہ گرجا میں ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔" فرانزسکا نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا اور ساتھ ہی کارل لڈوگ کو حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلے۔

کارل لڈوگ نطشے جرمنی کے سیکسونی علاقے کا پادری تھا۔ انیسویں صدی میں یہ علاقہ پروشیا کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں وہ لوتھرین چرچ سے تعلق رکھتا تھا۔

اس نے ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرایا اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ اگر اس نے علاج نہیں کرایا تو اس پر دورے پڑنے لگیں گے۔ وہ ابھی جوان تھا اور یہ مرض!

وہ علاج کراتا رہا لیکن اس کی صحت روز بہ روز گرتی جارہی تھی۔ اس کے پاس ترقی کے بہت مواقع تھے۔ وہ ابھی جوان تھا۔ بادشاہ فریڈرک اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ بہت جلد بڑے پادری کی جگہ سنبھال سکتا تھا لیکن اب وہ ذمے داریوں سے کترانے لگا تھا۔ اب تو وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی دور دراز کے مقام پر جاکے رہے جہاں سکون ہی سکون ہو۔ اس نے خود پر ترقی کے سارے دروازے بند کرلیے اور بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ اسے کسی دیہات کے گرجا میں بھیج دیا جائے۔ بادشاہ یہ کبھی نہ چاہتا کہ وہ یوں ضائع ہوجائے لیکن اس کی صحت کا خیال کرتے ہوئے اسے ایک پسماندہ گاؤں ”روکن“ بھیج دیا گیا۔

اس گاؤں میں آنے کے بعد کارل لڈوگ کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہوجائے گا کیونکہ یہاں کام کم تھا اور تنہائی زیادہ تھی۔ پریشان کرنے کے لیے ملنے جلنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس کی بیوی فرانزسکا یہاں آکر کچھ دنوں گھبرائی ضرور تھی لیکن گاؤں میں اپنی اور اپنے شوہر کی عزت دیکھ کر بہل بھی گئی تھی۔ کارل لڈوگ نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ صحت ٹھیک ہوتے ہی وہ کسی بڑے شہر کا رُخ کرے گا اور اپنے لیے ترقی کے راستے تلاش کرے گا۔

فرانزسکا نے اسے ایک روز یہ خوش خبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس خوشخبری کے لیے کارل لڈوگ کو چار سال انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”دیکھنا میں اپنے بچے کو بہت بڑا پادری بناؤں گا۔“

”ابھی یہ کیا خبر، لڑکی ہوتی ہے یا لڑکا؟“

”لڑکا ہی ہوگا، ہمارے خاندان میں یہی ہوتا ہے۔“

”آپ تو بس......“ فرانزسکا شرما کر رہ گئی۔

کارل لڈوگ کے دو ہی شوق تھے۔ شام کے وقت گرجے میں بند ہوکر موسیقی سے لطف اندوز ہونا یا پھر بیوی کو ساتھ لے کر کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ دیہات میں اس سے زیادہ تفریح اور ہو بھی کیا سکتی تھی۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ پھر ان کا پہلا بچہ 15 اکتوبر 1844ء کو پیدا ہوا۔ اتفاق سے یہ وہی تاریخ تھی جب بادشاہ اپنی سالگرہ مناتا تھا۔ کارل لڈوگ نے اپنے بیٹے کا نام بادشاہ کے نام پر فریڈرک رکھا، فریڈرک نطشے۔ فرانزسکا کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ گھر کی تنہائی دور ہوگئی تھی۔

فریڈرک نطشے کی آمد ایسی مبارک ثابت ہوئی۔ ایک بھائی اور پیدا ہوا اور پھر ایک بہن آگئی جس کا نام الزبتھ رکھا گیا۔

فریڈرک نطشے اپنے بھائی اور بہن سے مانوس ضرور تھا۔ خاص طور پر الزبتھ سے تو بہت ہی محبت کرتا تھا لیکن وہ طبعاً افسردہ اور خاموش رہنے والا تھا۔ بولنا بھی دیر سے سیکھا تھا۔ حیران آنکھوں سے گرد و پیش کے لوگوں کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کررہا ہو۔

تین بچوں کی موجودگی نے گھر کو پُر رونق کردیا تھا لیکن بدقسمتی پیچھا کررہی تھی۔ کارل لڈوگ پر ایک مرتبہ پھر اعصابی دورے پڑنے لگے۔

ایک روز وہ گھر کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ پاؤں پھسلا۔ سیڑھیاں کوئی ایسی زیادہ نہیں تھیں لیکن پتھر کی تھیں اور سر ان سیڑھیوں سے ٹکرا گیا تھا۔ یہ چوٹ ہی بہانہ بن گئی۔ اس کے بعد وہ بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ قوت گویائی ختم ہوگئی۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔

فرانزسکا پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ تین بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج اور بستر پر پڑے شوہر کی تیمارداری۔ اس نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنے پاس بلالیا اور دونوں مل کر یہ بوجھ اُٹھاتی رہیں۔ ننھا فریڈرک نطشے بہت حساس بچہ تھا۔ اس پر باپ کی بے بسی نے ایسا اثر کیا کہ بالکل ہی خاموش ہوگیا۔ باپ کے پاس خاموش بیٹھا رہتا یا الگ بیٹھ کر تصورات کی دنیا میں گم رہتا۔

اُداسی کے یہ دن اتنے طویل ہوگئے کہ ایک سال گزر گیا۔ اس دوران کارل لڈوگ کا علاج ہوتا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ دوبارہ نارمل زندگی نہیں گزار سکے گا۔ کارل لڈوگ کو شاید ڈاکٹروں کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں کو جھٹلا دیا۔ ڈاکٹر تو کہتے تھے، زندہ رہیں گے لیکن نارمل زندگی نہیں گزاریں گے۔ شاید کسی وقت کچھ بہتری آجائے۔ کارل لڈوگ نے بے بسی کی زندگی پر موت کی ترجیح دی۔ ایک دن خاموشی سے رخصت ہوگیا۔

فرانزسکا بیوہ ہوگئی۔

www.paksociety.com

فریڈرک نطشے کی عمر اس وقت پانچ سال تھا۔

اس نے اپنے باپ کی لاش دیکھی۔ آہ و بکا کا شور سنا۔ گرجے میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ پورا گاؤں اس کے باپ سے زیادہ اس پر آنسو بہا رہا تھا جو صرف پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا تھا۔ اس کا ذہن ایک ایک منظر کو محفوظ کرتا جارہا تھا۔ اس کے آنسو اس کے دل ہی میں کہیں چھپ گئے تھے۔ پھر وہ اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ اس قبرستان تک گیا جہاں اس کے باپ کو قبر میں اُتارا جانا تھا۔ ایک گہری قبر میں اپنے باپ کے تابوت کو اُترتے ہوئے دیکھا۔ لوگ مر کیوں جاتے ہیں اور پھر انہیں قبر میں کیوں اُتارا جاتا ہے؟ اس کا معصوم ذہن سوچ رہا تھا۔

وہ گھر لوٹ کر آیا اور جب رات آگئی، گھر عورتوں سے خالی ہوگیا تو وہ اس بستر کے قریب گیا جہاں اس کا باپ لیٹا کرتا تھا۔ ہلکے ہلکے باپ کو آواز دی اور پھر بے اختیار رونے لگا۔ اس کے آنسوؤں نے ایک مرتبہ پھر سب کو رُلا دیا۔

وہ سونے کے لیے لیٹا تو گرجے کی المناک گھنٹیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ بار بار اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ بالآخر بہت دیر بعد اسے نیند آہی گئی۔

اس کا بھائی اور بہن بہت چھوٹے تھے۔ انہیں اس سانحے کا اندازہ کیا ہوتا۔ فرانزسکا اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی۔ بچوں سے اپنا دکھ چھپا رہی تھی۔

دوسرے دن کے سورج نے گھر میں قدم رکھا تو ایسی اُداسی ساتھ لایا جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کچھ ضروری رسومات کے لیے فرانزسکا گرجا گئی تو نطشے بھی ساتھ تھا۔

”مام! میں بڑا ہوکر اس گرجا کا پادری بنوں گا، بالکل اسی طرح جیسے کہ میرے ڈیڈ تھے۔“

”شاباش میرے بچے! کیوں نہیں؟“

پورا گھر اس سانحے کے زخم کو بھرنے کے انتظار میں زبردستی ہنس رہا تھا۔ فرانزسکا کی چھوٹی بہن کا اس میں بڑا ہاتھ تھا۔ وہ دن بھر بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی تاکہ گھر میں ان کی ہنسی گونجتی رہے البتہ نطشے کی طرف سے وہ فکرمند تھی جو، اب پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہوگیا تھا۔

وہ ڈراؤنے خواب دیکھتا تھا اور اُٹھ کر اپنی ماں سے چمٹ جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس کیفیت سے نکلنے لگا تھا۔ کئی مہینے گزر گئے بلکہ اب سال ہونے کو آیا تھا۔ ایک رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو آنکھیں بند ہوتے ہی ایک خواب اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ ماتمی دھنیں بج رہی ہیں، ویسی ہی جیسی اس نے باپ کے انتقال پر سنی تھیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ اس قبرستان میں کھڑا ہے جہاں اس کے باپ کو دفن کیا گیا تھا۔ اتنی دیر میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک قبر کھلی اور اس کا باپ باہر نکلا۔ وہ گرجے کی طرف جارہا تھا، کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔ اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا جسے نطشے بالکل نہیں پہچان سکا۔ اس کا باپ اس بچے کو لے کر اسی قبر میں اُتر گیا۔ قبر اپنی جگہ آگئی۔ ماتمی دھنیں خاموش ہوگئیں۔ نطشے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کچھ دیر ڈر کے مارے کانپتا رہا اور پھر دوبارہ سو گیا۔ صبح ہوئی اور اس کی ماں اسے بیدار کرنے آئی تو اسے اپنا خواب یاد آگیا۔ اس نے اپنی ماں کو پورا خواب سنا دیا۔

”تم ابھی تک اپنے ڈیڈی کی موت کو نہیں بھولے ہو۔“ اس کی ماں نے کہا ”بھلانے کی کوشش کرو، زندگی ایک جگہ رک نہیں جاتی۔ ابھی تمہیں بڑا ہونا ہے، اپنے باپ کی طرح پادری بننا ہے۔ ان خوابوں پر نہ جاؤ، چلو اُٹھو اور ناشتے کی میز پر آجاؤ۔“

فرانزسکا نے بیٹے کو سمجھا تو دیا تھا لیکن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ذرا فرصت ملی تو وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ کچھ دیر کے لیے پریشان ضرور ہوئی لیکن پھر اسے وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔ اسی طرح خود کو سمجھانے لگی جس طرح وہ کچھ دیر پہلے نطشے کو سمجھا چکی تھی۔

اس خواب نے اسے کئی دن اُلجھائے رکھا اور پھر بہت سی باتوں کی طرح یہ خواب بھی ذہن سے اُتر گیا۔

ابھی اس خواب کو دیکھے چار ماہ گزرے تھے کہ نطشے کا چھوٹا بھائی بیمار پڑا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

فرانزسکا جب اپنے مردہ بچے پر بین کررہی تھی تو اسے رہ رہ کر نطشے کا دیکھا ہوا خواب یاد آرہا تھا۔ اس کا خواب سچا ہوگیا تھا کیونکہ اسے کارل لڈوگ کی قبر کے برابر ہی دفن کیا جارہا تھا۔

اس دُہری مصیبت نے فرانزسکا کو توڑ پھوڑ دیا۔ ابھی شوہر کا غم بھلا نہیں پائی تھی کہ گود اُجڑ گئی۔ وہ اب یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ گاؤں ہی منحوس ہے۔ پہلے اس کا شوہر اس سے چھین لیا اور پھر اس کا ننھا بیٹا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے قریب بیٹھے ہوئے نطشے اور الزبتھ کو یوں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا جیسے خطرے کے وقت مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپا لیتی ہے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اب وہ اس گاؤں میں نہیں رہے گی وہ اپنے بچوں کو قصبہ نومبرگ لے جائے گی جہاں اس کا میکا تھا۔

بھائی رخصت ہو گیا تھا۔ اب نطشے اکیلا رہ گیا تھا۔
فرانزسکا شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ نطشے کی حفاظت کے لیے گھر میں کوئی اور بھی ہونا چاہیے۔ اس کی ماں کی طرف سے بھی خط آ رہے تھے کہ وہ نومبرگ چلی آئے۔ ایک دن سامان لے جانے والا چھکڑا دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گھر کا سامان چھکڑے پر لادا۔ نطشے اور الزبتھ کا ہاتھ پکڑا اور گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گئی۔

نطشے اب جس گھر میں آیا تھا، اس میں اس کی نانی اور دو خالائیں پہلے سے موجود تھیں۔ گھر میں واحد مرد صرف فریڈرک نطشے ہی تھا جس کی عمر اب چھ سال سے اوپر ہو رہی تھی۔

نومبرگ کوئی بڑا شہر نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن نہایت خوبصورت جہاں ننھے نطشے کی اُداس طبیعت کے بہلنے کے بہت سے مواقع تھے۔

یہاں پہنچ کر اسے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ وہ خاندان کے بزرگوں کے ناموں اور کارناموں سے واقف ہو گیا۔ بزرگوں کی یہ کہانیاں اس کی نانی اسے سنایا کرتی تھیں جن میں حقیقت کم مبالغہ زیادہ ہوتا تھا۔ اسے نانی ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کے آباواجداد چھوٹے موٹے تاجر تھے البتہ اس کے دادا پادری تھے اور اس کے والد بھی۔ نطشے کو تاجر سے زیادہ پادری بننے کا شوق تھا۔ یہ شوق ہو ہی جانا چاہیے تھا کیونکہ گھر کا ماحول ہی ایسا تھا۔ وہ سب کو عبادت کرتے اور نصیحتیں کرتے ہی دیکھتا تھا۔ اس خوف سے کہ نطشے بگڑ نہ جائے اسے دین کی طرف راغب کیا جا رہا تھا۔ باہر نکلنے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے تک سے منع کیا جاتا تھا۔ وہ نانی اور والدہ کے ساتھ باقاعدگی سے گرجا جاتا رہتا تھا۔ باہر نکلتا بھی تھا تو دوسرے بچوں سے مختلف ہی نظر آتا تھا۔ سنجیدہ، متین اور کچھ سوچتا ہوا۔ اسی لیے بچوں نے اسے "ننھا پادری" کہنا شروع کر دیا تھا۔

وہ ابھی اسکول نہیں گیا تھا لیکن گھر پر اس کی تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ گھر کی سب عورتیں اسے اپنی اپنی دانست میں تعلیم سے آراستہ کر رہی تھیں۔

کارل لڈوگ کو موسیقی سے شغف تھا۔ نطشے نہایت کم سنی میں باپ کے اس شوق کا مشاہدہ کر بھی چکا تھا۔ جب وہ نو سال کا ہوا تو اسے بھی شوق ہوا۔ گھر میں پیانو رکھا تھا۔ وہ پیانو سیکھنے لگا۔ جلد ہی وہ دھنیں ترتیب دینے لگا۔ خود ہی چھوٹے چھوٹے گیت لکھتا اور ان گیتوں کے لیے دھنیں تیار کرتا۔

اس کے اس شوق نے بہت سے بچوں کو اس کے قریب کر دیا۔ انہی دنوں وہ اپنی ماں کے ساتھ تھیٹر دیکھنے گیا۔ گھر آ کر اسے شوق ہوا کہ وہ بھی ایسا ڈراما لکھے اور پیش کرے۔
اس نے اپنے دوستوں کو ساتھ ملایا، چھوٹا سا اسٹیج بنایا، پردے کھڑے کیے۔ سب نے مل کر اس کا لکھا ہوا ڈراما اسٹیج کیا۔ بچوں کو تو شغل ہاتھ آ گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھتا رہا اور سب مل کر اسٹیج کرتے رہے۔

بچپن ان ہی کھیل تماشوں میں گزرتا رہا۔ ان تماشوں میں الزبتھ بھی اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

وہ اسکول جانے لگا تھا لیکن پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس کا ایک ساتھی پفورٹا کی قدیم درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ ایک رہائشی اسکول تھا۔ اس کا دوست جب بھی گھر آتا تھا تو اس درسگاہ کی تعریف کیا کرتا تھا۔ تعریفیں سن سن کر نطشے کو بھی شوق ہوا کہ وہ اس اسکول میں داخلہ لے۔

یہ اسکول نومبرگ سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک ندی کے کنارے واقع تھا۔ یہ ایک بورڈنگ اسکول تھا یعنی طالب علموں کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ یہ اسکول چونکہ چند پادریوں نے قائم کیا تھا اور نطشے چونکہ آنجہانی پادری کا بیٹا تھا اس لیے داخلے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کی ماں اسے وہاں بھیجتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا، وہ بھی نظروں سے دور ہو جاتا۔ گھر میں بہت دن تک تناؤ رہا اور بالآخر اسے داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

وہ گھر اور گھر والوں سے دور پفورٹا کی اس قدیم درس گاہ میں چلا گیا۔ اس وقت اس کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی۔

اس اسکول میں آنے کے بعد بھی اس کی پُرانی عادتیں برقرار رہیں۔ سب سے پُرانی عادت دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کی عادت تھی۔ دوست بنائے تھے مگر بہت کم۔ اس کی ذہنی افتاد ہی ایسی تھی کہ بہت کم دوست اس کے معیار پر پورے اُترتے تھے۔ کھیل کود میں بھی اسے دلچسپی نہیں تھی۔ یہ عادت یہاں بھی برقرار رہی۔ اتوار کی سہ پہر کو جب تمام لڑکے اسکول کے گراؤنڈ میں جمع ہوتے، وہ لمبی سیر کے لیے نکل جاتا اور دور تک چلا جاتا۔

مہینے میں ایک بار اس کی والدہ اور بہن اس سے ملنے آتیں۔ یہ دن اس کے لیے بڑی خوشی کا ہوتا تھا۔ وہ انہیں لے کر قریبی سرائے میں چلا جاتا۔ یہ سرائے اس کا گھر بن جاتی۔ چند روز کے بعد والدہ چلی جاتیں۔ پھر وہی اسکول کی تنہائی۔

اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے اس نے کتابوں کو دوست بنا لیا۔ خاموشی سے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کمرے

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

میں لاطینی ادب، عبرانی زبان وادب کے ساتھ ساتھ ارضیات، نباتات اور فلکیات کی کتابیں دیکھی جاسکتی تھیں۔

درس گاہ کا ماحول مذہبی تھا اس لیے اس کا عقیدہ تھا کہ تمام علوم اپنی جگہ لیکن اصل چیز مذہب ہے جو تمام علوم کی بنیاد ہے۔

شب وروز گزرتے رہے۔ اس عرصے میں اس نے شلر، ہولڈرن اور بائرن جیسے شاعروں کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔

شاعری کی رومان پرور فضا نے اسے دیوی دیوتاؤں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ہر وقت خواب دیکھنا اور اداسیوں کی چادر اوڑھے رہنا اس کا شیوہ بن گیا۔

شاعری کے اس مطالعے نے اس پر ایک اور نتیجہ یہ مرتب کیا کہ اسکول کا نظم وضبط اسے بوجھ معلوم ہونے لگا۔ اس کی فطرت میں آزاد خیالی سر اُبھارنے لگی۔ اس میں کچھ قصور اس کی عمر کا بھی تھا۔ اب وہ سترہ سال کا ہو گیا تھا۔ شباب کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب اسے اساتذہ کے خطبات سننے کے بجائے اپنی روح سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ اب اس کے عقیدوں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ مذہب سے دور ہونے لگا تھا۔ باپ پادری تھا۔ ماں خدا کے آگے جھکنے والی تھی۔ درس گاہ کا ماحول مذہبی تھا لیکن وہ الحاد کی آندھیوں سے ٹکرانے کی تیاری کر رہا تھا۔

مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی اس کے خیالات میں انقلاب آ گیا۔ اب وہ اپنے باپ کی طرح پادری بننے کے بجائے موسیقار بننا چاہتا تھا۔

اس کی ماں اس سے ملنے آئی تو یہ وحشت ناک خبر اس نے ماں کے کانوں تک پہنچا دی۔

"اب مزید تعلیم حاصل کرنے سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ یوں بھی اب پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اب میں پادری یا پروفیسر بننا نہیں چاہتا۔ میں اب موسیقار بنوں گا۔"

کسی بھی ماں کے لیے یہ خبر اچھی نہیں ہو سکتی کہ اس کا بیٹا آگے پڑھنا نہیں چاہتا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھایا، وہ بھی اپنے ارادوں میں ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا لہٰذا اس نے یکدم درس گاہ کو چھوڑ نہیں دیا۔

اس نے درس گاہ کو نہیں چھوڑا تھا مگر اپنے ارادوں کو بھی خیرباد نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کی سوچوں کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے۔ سب سے بڑی سوچ یہ تھی کہ وہ آئندہ کے لیے کون سا راستہ اختیار کرے۔ میں کیا پڑھوں؟ یہ سوال ہر وقت اس کے سامنے رہتا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کہاں جائے گا؟ یہ دوسرا سوال تھا۔

اس کا دماغ فلسفی کا تھا اور وہ خود موسیقار بننا چاہتا تھا۔ یہی وہ دو شاہراہیں تھیں جن پر وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔

مستقبل کے اندیشوں نے اسے اتنا پریشان کیا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ سر اور آنکھوں کی تکلیف میں ایسا مبتلا ہوا۔ وہ گھبرا کر ماں کے پاس چلا گیا۔

کامل دو مہینے بعد وہ اسکول لوٹ کر آیا تو اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ عام طالب علموں کی طرح معمول کی زندگی گزارے لیکن اس کی سوچیں پھر بھی اسے چین لینے نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے ذہنی سکون کے لیے ایک راستے کا انتخاب کر لیا۔ اس نے قلم ہاتھ میں لے لیا۔ وہ نظمیں لکھنے لگا۔ یہ نظمیں وہ نومبرگ میں اپنے دوستوں کو بھی بھیجا کرتا تھا۔ اس نے چند تنقیدی اور فکری مضامین بھی لکھے اور دوستوں کو بھیجے۔

اپنی ان کاوشوں کی وجہ سے وہ اساتذہ کی نظروں میں آ گیا۔ ان اساتذہ کی مدد سے وہ قدیم ادب اور زبانوں کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔

اسکول چھوڑنے کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ اسکول کا قاعدہ تھا کہ ایسے سینئر طلبہ کو اساتذہ اپنے گھر مدعو کرتے تھے۔ اسے بھی یہ مواقع ملنے لگے۔ وہ ایسی ہی ایک دعوت میں شرکت کے لیے اپنے ایک استاد کے گھر گیا۔ وہاں کھانے کی میز پر اس نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی صنفِ نازک کو مرد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی بھی اس کی آنکھوں کے پیغام سے بے خبر نہ رہ سکی۔ اس نے بھی کئی مرتبہ پلکوں کی جھالر اُٹھائی اور اس کے لیے آنکھوں کے چراغ روشن کر دیے۔

کھانے سے فراغت کے بعد جب سب مل کر بیٹھے تھے تو نطشے کے لیے اس لڑکی کے سوا کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ نطشے نے اپنے استاد کی فرمائش پر اپنی کئی نظمیں سنائیں۔ وہ لڑکی ان نظموں سے متاثر ہو رہی تھی۔ خود نطشے کا حال یہ تھا کہ ان نظموں کے معنی آج اس پر کھل رہے تھے۔

وہ اس دعوت سے لوٹ کر آیا تو دل میں پیانو بج رہے تھے۔ اس نے اس رات ایک نظم لکھی جو صرف اس لڑکی کے لیے تھی۔ اس نظم میں نطشے کی دلی کیفیات پوری طرح سما گئی تھیں۔

دوسرے دن اس خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ وہ اس نظم کو کس طرح اس لڑکی تک پہنچائے۔ وہ شام کے وقت ان استاد کے گھر ایک کتاب ہاتھ میں لے کر پہنچ گیا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ان سے اس کتاب کے چند ابواب سمجھنے آیا ہے۔ اتفاق سے استاد گھر پر نہیں تھے۔ قدرت بھی

شاید اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس کی میزبانی اسی لڑکی کو کرنی پڑی۔ نطشے کو موقع مل گیا کہ وہ یہ نظم اس لڑکی کو سنا سکے۔

اس دن خوب باتیں ہوئیں۔ وہ یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ لڑکی بھی اس سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

وہ کئی دن تک پڑھنے کے بہانے ان استاد کے گھر جاتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ کون سی کتابیں ہو سکتی ہیں جو وہ اس لڑکی کو تحفے میں پیش کرے۔ کئی دھنیں سوچتا رہا جو اس کا خیال تھا پیانو پر بیٹھ کر اس لڑکی کو سنائے گا۔

مسرت کے لمحات میں وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ لڑکی مہمان کے طور پر آئی ہوئی ہے۔ کسی دن اسے جانا بھی ہو گا۔

وہ اس روز چند کتابیں ہاتھ میں لے کر اپنی استاد کے گھر گیا۔ یہ کتابیں وہ تحفے کے طور پر اس لڑکی کو دینا چاہتا تھا لیکن وہ لڑکی جا چکی تھی۔ اس نے وہ کتابیں اٹھائیں اور ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے اُٹھ آیا اور اپنے کمرے میں آ کر بند ہو گیا۔ اسے اس لڑکی پر غصہ آ رہا تھا جو اسے بتائے بغیر چلی گئی تھی۔

یہ زخم گہرا نہیں تھا۔ اچٹتی سی چوٹ تھی جو جلد ہی بھر گئی۔ اس چوٹ نے اسے تکلیف تو نہیں پہنچائی لیکن یہ تجربہ ضرور دیا کہ لوگ بچھڑ بھی جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تجربہ اور وہ لڑکی کتنے دنوں تک اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں جذب رہی کیونکہ جانے والے چلے جاتے ہیں مگر ان کے قدموں کے نشانات بہت دن تک باقی رہتے ہیں۔

وہ پیانو بجاتا رہا۔ نغمے بکھیرتا رہا۔

رخصت کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس نے ڈپلوما حاصل کیا اور پفورٹا کے مدرسے سے فارغ ہو کر نومبرگ واپس آ گیا۔

بڑے دنوں کے بعد وہ نومبرگ کے دوستوں سے ملا تھا۔ لمبی لمبی سیریں کرتا رہا۔ خوش گپیوں میں دن گزرتے رہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں کی تھکن اُتار رہا ہو۔

ایک شام وہ اپنے دوست پال ڈیوسن کے گھر بیٹھا تھا کہ بون یونیورسٹی کا ذکر نکل آیا۔ نوجوان نطشے کو شوق ہوا کہ وہ بھی بون یونیورسٹی میں داخلہ لے۔ اس یونیورسٹی کا علمی وقار اور آزادی اس کے لیے متاثر کن تھی۔

اس نے اپنے دوست پال ڈیوسن کو آمادہ کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے۔ پال ڈیوسن نے اپنے ایک کزن کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ تینوں نومبرگ سے نکلے۔

بون تک کا یہ سفر علم سے زیادہ تفریح کے لیے تھا جیسے کوئی نئی دنیا کی سیر کے لیے جاتا ہے۔ ہنستے کھیلتے، شرارتوں سے جی بہلاتے وہ بون یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ایک نئی دنیا ان کے سامنے بازو پھیلائے کھڑی تھی۔

نطشے نے اپنے لیے "لسانیات" اور "الٰہیات" کے مضامین کا انتخاب کیا۔ لسانیات کا اس لیے کہ وہ پرانی زبانوں کا مطالعہ پہلے ہی کر چکا تھا اور الٰہیات؟ شاید اس لیے کہ مذہب کی طرف سے جو شکوک وشبہات اس کے دل میں پیدا ہونے لگے تھے، وہ ان کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، میں سچائی کی تلاش میں ہوں چاہے وہ کتنی ہی خوف ناک ہو۔

اس نے مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ پادریوں کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی جس کے پابند ضابطوں کے اثرات اب تک اس کے دل ودماغ پر تھے۔ بون یونیورسٹی کے آزاد ماحول میں قدم رکھتے ہی اس کے تیور بدلنے لگے۔ اس نے تنہا، اپنے تصورات میں گم رہنا چھوڑ دیا۔ اس نے بہت سے دوست بنائے اور دیکھتے دیکھتے شوخ اور شریر لڑکوں کا حلقہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ یہ ایسی تبدیلی تھی جو نہ جانے کس نفسیاتی گتھی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ الگ تھلگ رہنے والا ایک لڑکا بزم آرائیوں میں مشغول ہو گیا۔ ان دوستوں کی صحبت میں وہ شراب بھی پینے لگا۔ اس نے کبھی سگریٹ تک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب شراب پی رہا تھا اور شراب پی کر لڑائی جھگڑے بھی کر رہا تھا، غل غپاڑا بھی کر رہا تھا۔ اس کا شمار یونیورسٹی کے آوارہ لڑکوں میں ہو رہا تھا۔

اس آوارہ گردی کے بین بین وہ تربیت بھی سفر کر رہی تھی جو اسے گھر سے ملی تھی اور ایک دن یہ تربیت اس پر حاوی آ گئی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ وہ وقت جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

اس کے اندر کا پادری جاگنے لگا۔ اس نے اپنے دوستوں کو سمجھانا شروع کر دیا۔

"تم سب یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔ لیکن تعلیم کے سوا سب کچھ حاصل کر رہے ہو۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے نطشے! کیوں ایسی باتیں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں تمہاری اور اپنی بھلائی چاہتا ہوں۔ ہم نے اگر یہ وقت ضائع کر دیا تو ہم کچھ نہیں بن سکیں گے۔"

"تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"تمباکو اور شراب چھوڑ دو۔ ہماری تفریحات صحت مند ہونی چاہئیں۔"

"اچھا پادری صاحب، اپنا وعظ چھوڑ دو۔ تم تو ہمیں

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

جوانی میں بوڑھا بنانے پر تلے ہوئے ہو۔"
"جوانی صرف اس لیے نہیں ہوتی جو تم کر رہے ہو؟"
"فکر مت کرو۔ ہم اس سے بھی آگے جائیں گے۔ طوائفوں کے دروازے بند نہیں ہیں۔"
"پھر تو تمہارا خدا حافظ ہے۔"

وہ اسی طرح سمجھاتا رہا اور ان دوستوں کو کسی قاعدے اور ضابطے میں لانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اب یہ دوست اس کا مذاق اُڑانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ مجبوراً پیچھے ہٹنے لگا۔ سب دوست اس سے چھن گئے۔ وہ پھر سے اکیلا رہ گیا لیکن اس مرتبہ یہ تنہائی اس کے لیے فخر کا باعث نہیں تھی بلکہ باعث ندامت تھی کیونکہ اس مرتبہ اس نے دوستوں کو نہیں چھوڑا تھا۔ دوستوں نے اسے چھوڑا تھا۔

وہ بلا کا خوددار تھا۔ دوستوں نے اسے اس طرح چھوڑا تو اس کی عزتِ نفس کو دھچکا لگا۔ اس کا حوصلہ اسے ناکام دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور یہ اس کی ناکامی تھی کہ اس کے دوستوں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔

اسے اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی۔ ایک روز اچانک ہی وہ اس شہر سے نکلا۔ اب اس کا ارادہ تھا کہ بون یونیورسٹی کے بجائے لیپزگ یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرے گا۔ اس نے لیپزگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں آ کر اسے بڑی طمانیت ملی۔ نیا ماحول تھا، نئے لوگ تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بون یونیورسٹی کے چار چھ ہفتوں میں اس نے کیسے دن گزارے ہیں اور کس ناکامی سے دوچار ہوا ہے۔ یہاں وہ نئے انداز سے اپنے دن گزار سکتا تھا۔ وہ پوری تندہی سے لسانیات پڑھنے لگا۔

چھٹیوں کے دن تھے۔ وہ تفریح کے لیے "کولون" گیا۔ اس نے قلی سے کہا کہ وہ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے جائے۔ قلی کو شرارت سوجھی یا وہ غلط سمجھا کہ اسے کولون کے بازارِ حسن میں لے گیا اور ایک گھر میں پہنچا دیا۔ 21 سالہ نطشے نے خود کو کچھ نہیں تو آدھی درجن لڑکیوں کے جھرمٹ میں دیکھا۔ ان کے جسموں پر باریک جالی کے ایسے چست لباس تھے کہ صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو والا منظر تھا۔ اس پر ان کی ادائیں اور آنکھوں میں یہ امید کہ یہ نوجوان ان کے ساتھ جائے گا۔ نطشے کبھی ایسے حادثے سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ وہ گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یاالٰہی! یہ کیسا ریسٹورنٹ ہے۔ مڑ کر دیکھا تو قلی جا چکا تھا۔ کمرے میں ایک طرف پیانو رکھا ہوا تھا۔ وہ دوڑ کر گیا اور پیانو پر ایک دھن چھیڑ دی۔ ایسی مسحور کن دھن تھی کہ یہ طوائفیں ساکت ہو کر اس جادوگر کو دیکھنے لگیں۔ نطشے نے جب انہیں یوں مدہوش دیکھا تو پیانو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ اپنے پیچھے بلند ہونے والے قہقہے سن رہا تھا۔

وہ وہاں سے بھاگ آیا تھا لیکن واپس آنے کے بعد اپنی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔ اسے ہنسی آ رہی تھی کہ کیا وہ وہاں پیانو بجانے گیا تھا۔

کئی دن تک وہ پریاں اس کے تصور میں چکر کاٹتی رہیں اور پھر ایک روز وہ خود وہاں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ کوئی قلی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

لیپزگ واپس آنے پر بھی وہ ایسی جگہوں پر جاتا رہا۔ نتیجہ یہی ہونا تھا۔ وہ ایسی ہی کسی جگہ سے ایک خطرناک بیماری ساتھ لے آیا۔ اس بیماری نے اس کی جسمانی قوت کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیماری اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔

وہ ایک بھیانک تجربے سے گزرا اور پھر بہرحال صحت یاب ہو گیا۔ قدرت نے اسے سنبھال لیا۔ پھر اس نے زندگی بھر ان کوچوں کا رُخ نہیں کیا۔

اب کتابیں تھیں اور وہ تھا۔ ایک روز وہ اپنی پسند کی کتابیں ڈھونڈنے پُرانی کتابوں کے بازار میں گیا۔ اس بازار میں اسے بعض نایاب کتابیں مل جاتی تھیں اور مناسب دام پر۔

وہ کچھ دیر مختلف کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اسی الٹ پلٹ میں ایک کتاب اس کے ہاتھ میں آئی۔ کتاب کی پیشانی پر لکھا تھا "دنیا ایک تصور کی حیثیت سے" مصنف کا نام تھا "شوپنہار" یہ کتاب نطشے کی پیدائش سے پچیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ گویا اب اسے شائع ہوئے پچاس سال کے قریب ہو گئے تھے۔

اس نے شوپنہار کا صرف نام سنا تھا۔ اس کی کوئی تصنیف نہیں پڑھی تھی۔ اس کتاب میں بھی اسے کوئی کشش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کتاب جہاں سے اُٹھائی تھی، وہیں رکھ دی۔ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ وہ کتاب اس نے پھر اُٹھا لی۔ ایک مرتبہ پھر ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ خریدے یا نہیں اور پھر اس نے وہ کتاب خرید لی۔

اس کتاب کے بعد اس نے کچھ نہیں خریدا۔ نہ جانے کیوں اسے جلدی ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے بازار سے نکلا اور اپنے کمرے میں پہنچتے ہی صوفے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا اور کتاب پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس پر انکشاف ہونے لگا جیسے یہ کتاب آئینہ ہے، جس میں وہ دنیا، زندگی، انسانی ارادے، ارادوں کی ناکامیاں دیکھ رہا ہے۔

www.paksociety.com

اس کتاب نے اس کو ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ پڑھتا اور سوچتا، سوچتا اور پڑھتا۔ چودہ دن کی مشقت کے بعد اس نے دو ہزار صفحات پر مشتمل کتاب کو ختم کر لیا۔

نطشے جس سچائی کی تلاش میں نکلا تھا، یہ کتاب اسے اس سچائی سے ہم کنار کر رہی تھی۔ اسے برسوں سے ایک مرشد کی تلاش تھی۔ شوپنہار کی صورت میں یہ مرشد اسے مل گیا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ جس وقت یہ کتاب اس کے ہاتھ میں آئی اس سے چھ سال پہلے شوپنہار کی وفات ہو گئی تھی۔ اب وہ اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ اپنے ان اختلافات پر بحث نہیں کر سکتا تھا جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں اُبھرے تھے۔

اسے یہ اختلاف شوپنہار کی قنوطیت اور یاسیت سے تھا۔ شوپنہار اسے بہت آگے تک لے آیا تھا۔ اب نطشے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شوپنہار کے قنوطی خیالات کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھے۔

شوپنہار نے اسے دنیا کو سمجھنے کا ایک زاویہ مہیا کر دیا تھا۔ اسے ایک مضبوط بنیاد مل گئی تھی جس پر کھڑے ہو کر وہ دنیا کا سامنا کر سکتا تھا۔ شوپنہار نے اسے سکھایا کہ تاریخ اور سیاست فریب ہیں۔

شوپنہار کا وہ اس قدر اسیر ہوا کہ اس نے شوپنہار پر ایک مضمون لکھا اور دوستوں کو سنایا۔ اس مضمون کا لبِ لباب یہ تھا کہ شوپنہار تمام فلسفیوں میں سب سے سچا ہے۔

یہ وہ دن تھے جب پروشیا کی فوجی مہمیں جاری تھیں۔ لوگوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا جا رہا تھا۔ نطشے کی آنکھیں کمزور تھیں اس لیے اب تک فوجی خدمات سے بچتا چلا آ رہا تھا لیکن جب افرادی قوت کی شدید قلت ہو گئی تو اس کا نمبر بھی آ گیا۔ اسے گھڑ سوار دستے میں بھیج دیا گیا۔ ادبی ذوق رکھنے والے ایک شخص کو فوج میں بھیج دینا حماقت تھی لیکن اس تبدیلی سے اسے کچھ دیر کے لیے خوشی ہوئی تھی اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔

"بیرک میں رہتے ہوئے انسان کو اپنے آپ کو جاننے کا موقع مل جاتا ہے۔"

اس کی یہ کیفیت عارضی تھی۔ فوجی زندگی کی سختیوں کا اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ اب اس کے ایک اور خط کا انداز یہ تھا۔

"جب ادبی ذوق رکھنے والے کسی شخص کو سپاہی بنا دیا جاتا ہے تو وہ دنیا کا سب سے ناخوش حیوان بن جاتا ہے۔"

اسے فوج میں گئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کسی محاذ پر جانے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ وہ گھڑ سواری کرتے ہوئے گھوڑے سے گر گیا۔ اس کی پسلیوں میں شدید چوٹ آئی تھی لیکن ناکامیوں سے چڑنے والا نطشے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہی ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے کچھ نہیں ہوا لیکن جب وہ بیرک میں واپس پہنچا تو تازہ چوٹ نے رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا جہاں وہ ایک مہینے تک صاحبِ فراش رہا۔

اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد حکام نے اسے بیرک کے بجائے گھر بھیج دیا۔

وہ پھر لیپزگ یونیورسٹی آ گیا۔

وہ تمام توجہ اپنی تعلیم پر صرف کر رہا تھا اور ایسا ذہین طالب علم ثابت ہو رہا تھا جس پر اساتذہ کو فخر ہوتا ہے۔

اس کی ذہانت اسے پھر بھٹکانے پر تلی ہوئی تھی۔ لسانیات کا علم اب اسے فضول معلوم ہونے لگا تھا کیونکہ یہ علم زندگی کے مسائل سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ ایک خیال تو نہایت ہی خطرناک تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ علم کیمیا حاصل کرے۔ اس کے ذریعے دولت بنائے اور پیرس جا کر عیش و عشرت کی زندگی گزارے۔

اگر وہ اس خیال پر عمل کر لیتا تو ناکامیوں سے لڑنے والا خود ناکامی کی تصویر بن چکا ہوتا۔

موسیقی سے اس کی رغبت اب بھی باقی تھی۔ ان دنوں وہ موسیقار شومان کا دیوانہ تھا۔ پھر اس نے واگنر کے قومی نغمے سنے۔ جرمن قوم حالتِ جنگ سے گزر رہی تھی اور اس کے سر پر قومی عظمت حاصل کرنے کا خبط سوار تھا۔ واگنر ان خوابوں کو اپنے نغموں میں ڈھال رہا تھا۔

پوری قوم واگنر کی دیوانی ہو رہی تھی لیکن نطشے اتنی آسانی سے گرفتار ہونے والا نہیں تھا لیکن اس کے لیے جال تیار ہو رہا تھا۔

واگنر نے قومی عظمت کے موضوع پر ایک نظم لکھی۔ نظم کیا تھی جادو کا منتر تھا جس نے پورے جرمنی کو پتھر کا بت بنا دیا۔ یہ نظم نطشے نے سنی تو وہ بھی ششدر رہ گیا۔ اس کے دل میں بے اختیار یہ تمنا جاگی کہ وہ اس عظیم موسیقار سے ملاقات کرے۔ نہ صرف ملاقات بلکہ کسی چیلے کی طرح اس گرو کی خدمت کرے لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ لیپزگ میں نہیں تھا۔ بیس سال پہلے اسے انقلابی سرگرمیوں کے الزام میں اس شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں اس کے سیاسی رویے بدل گئے تھے۔ شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گیا تھا۔ عوام اسے دیوانہ وار پسند کر رہے تھے لیکن اس کی سزا ختم نہیں ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نطشے کے دوست نطشے کی دیوانگی سے واقف تھے لیکن واگز ہوتا تو اس سے ملاقات کرواتے۔

ایک روز اس کے ایک دوست نے اسے خوش خبری پہنچائی۔

''دوست! تمہیں مبارک ہو۔ واگز لیپزگ میں ہے۔''

''وہ چوری چھپے آگیا ہے اور اپنی بہن مادام بروک باس کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔''

''اب اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوگا۔ پورا شہر اس کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ شاید اسی لیے حکمران اس کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں۔''

''اس سے ملاقات کی سبیل کیسے ہو؟''

''کل ہی اس کی بہن کے گھر چلتے ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

وہ دوسرے ہی دن اپنے دوست کے ساتھ مادام بروک کے گھر پہنچ گیا جہاں واگز ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ملاقات پہلے سے طے نہیں تھی اور واگز اس وقت اپنے کام میں مصروف تھا۔ نطشے سے کہہ دیا گیا کہ وہ کل آسکتا ہے۔

نطشے کو افسوس ضرور ہوا لیکن مہذب طریقہ یہی تھا کہ اسے وقت اسے وقت طے کرکے آنا چاہیے تھا۔ وہ اور اس کا دوست کل تک کا انتظار کرنے کے لیے لوٹ آئے۔

وہ رات بھر دن نکلنے کے انتظار میں کچھ سوتا کچھ جاگتا رہا۔ دن نکلا تو ایک امتحان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرے دن کا آغاز سخت بارش اور شدید برف باری سے ہو رہا تھا۔ باہر نکلنے کا سوال نہیں تھا واگز کے گھر تک پہنچنا تو دور کی بات، کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس موسم سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا لیکن اس وقت تو یہ بارش اس کے لیے انگاروں کی بارش تھی۔

ایک طوفان اس کے دل میں تھا، ایک طوفان باہر گلیوں میں شور مچاتا پھر رہا تھا۔ شام تک بارش رکی نہیں تھی۔ اس کی امیدیں دم توڑنے لگی تھیں کہ اس کا دوست آگیا۔

''میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ بارش بہت ہو رہی ہے۔ واگز سے ملاقات کسی اور وقت پر ٹال دی جائے۔''

''یہ غلطی بھی مت کرنا۔'' نطشے نے کہا ''یہ موقع گیا تو پھر کبھی نہیں آئے گا۔''

''اس بارش میں کیسے جاؤ گے؟''

''اپنے مقصد کے حصول کے لیے آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''تو پھر چلو، ہمت کرتے ہیں۔''

نطشے نے جلدی جلدی کوٹ گلے میں ڈالا۔ چھتری ساتھ لے لی اور دونوں گھر سے نکل گئے اور واگز کے گھر پہنچ گئے۔ یہ بارش ان کے لیے نعمت ثابت ہوئی تھی۔ بارش کی وجہ سے واگز کا کوئی پرستار وہاں نہیں تھا۔ گھر کے افراد کے سوا گھر خالی تھا۔

نطشے کے دوست نے نطشے کا تعارف کرایا اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں واگز کو احساس ہوگیا کہ اس سے ملاقات کے لیے آنے والا کوئی عام طالب علم نہیں ہے۔

ڈنر سے پہلے واگز نے اپنے مہمانوں کو موسیقی سے لطف اندوز کیا۔ اس کی موسیقی میں جادو تھا۔ اس کی باتوں میں جادو تھا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس سے ملے اور اس کے سحر میں گرفتار نہ ہو۔ نطشے تو اس سحر میں گرفتار ہونے کے بعد ہی یہاں آیا تھا۔ اس کی تو حالت ہی دوسری تھی۔ وہ تو خواب دیکھ رہا تھا، خواب سن رہا تھا۔

واگز نے ملاقات ختم ہونے کے بعد نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

''میں آپ کو دوبارہ آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ کسی دن آؤ۔ موسیقی اور فلسفے پر باتیں ہوں گی۔'' یہ دعوت نطشے کو سرشار کرنے کے لیے بہت تھی۔

اس ملاقات کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ اس کے ایک مہربان استاد مسٹر ٹشل نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔

''تمہارے لیے ایک عظیم خوش خبری میرے پاس ہے۔''

''آپ ہمیشہ اچھی خبریں ہی سناتے ہیں۔''

''باسل یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر کی جگہ ہے۔ میں نے تمہارا نام لکھ کر بھیج دیا ہے، کیا تم اس خبر سے خوش نہیں ہوئے؟''

''بات تو خوشی کی ہے لیکن کیا میری تقرری عمل میں آجائے گی جبکہ میری ڈاکٹریٹ بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی۔''

''تقرری اس لیے ہوجائے گی کہ باسل یونیورسٹی نے خود تمہارا نام پیش کیا ہے۔ مجھ سے تو صرف رائے مانگی گئی تھی۔ میں نے تمہاری تعریف کردی ہے۔ یہ کمال ان عمدہ مقالات کا ہے جو تم شائع کراتے رہے ہو۔''

ایک اور خوشی کی بات یہ ہوئی کہ لیپزگ یونیورسٹی نے امتحان کے بغیر ہی اس کی سابقہ کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے سند سے نواز دیا۔

نطشے ابھی صرف چوبیس سال کا تھا۔ اس عمر میں باسل یونیورسٹی کا پروفیسر بننا اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے فخر کا باعث تھا۔

اس نے چند ہفتے نومبرگ جاکر اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارے اور پھر ایک نئی زندگی گزارنے سوئٹزرلینڈ کی باسل یونیورسٹی پہنچ گیا۔

اسے لسانیات کے ساتھ ساتھ فلسفے کے اضافی لیکچر دینے کو بھی کہا گیا۔

نطشے کو بس ایک افسوس ہوا تھا کہ وہ واگز سے دور ہوگیا تھا لیکن قدرت انہیں ملانا چاہتی تھی۔ اس کا بھی انتظام ہوگیا۔ واگز، لیوکرین جھیل کے کنارے ٹریس چن کے مقام پر ایک شاندار حویلی میں منتقل ہوگیا تھا۔ یہ مقام باسل سے صرف چالیس میل دور تھا۔ نطشے اس کے پاس ہفتہ وار جانے لگا۔ ان جلد جلد کی ملاقاتوں نے واگز کو اس کا شیدائی بنادیا۔ نطشے کی دل میں بھی اس کی محبت اور عقیدت کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے دوستوں کو لکھ رہا تھا۔

''مجھ کو ایک ایسا شخص مل گیا ہے جو شوپنہار کے تصور نابغہ کی بہترین تجسیم ہے اور وہ تعجب انگیز حد تک شوپنہار کے اعلیٰ فلسفے کا مداح بھی ہے۔ میری مراد رچرڈ واگز سے ہے...... بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا سے مختلف ہے...... میں جب بھی اس کے قریب ہوتا ہوں تو لگتا ہے جیسے خدا کے حضور میں ہوں۔''

اس زمانے میں واقعی ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی واگز کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہے۔ ایک مرتبہ تو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ باسل یونیورسٹی سے دو سال کی رخصت لے کر اپنے آپ کو واگز کی خدمت کے لیے وقف کردے۔ وہ شاید یہ کر گزرتا لیکن پروشیا اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی۔ نطشے واگز کو چھوڑ کر جنگ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ حب الوطنی نے تقاضا کیا اور اس نے طبی اردلی کے طور پر اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کردیں۔ وہ محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہوا تو فوجوں کا جاہ وجلال دیکھ کر اس پر انکشاف ہوا کہ زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد صرف زندہ رہنے میں نہیں بلکہ مقابلہ کرنے، لڑنے اور دوسروں پر غلبہ پانے میں ہے اس کا یہی نظریہ بعد میں اس کے فلسفے کی بنیاد بنا اور سپرمین یعنی فوق البشر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے ''مردِ مومن'' کا تصور نطشے سے لیا تھا۔

محاذِ جنگ پر بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر جاہ وجلال کا یہ متوالا اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔

اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر باسل یونیورسٹی پہنچ گیا۔

اس جنگ میں پروشیا کو فتح حاصل ہوئی۔

نطشے نے جنگ کی کڑواہٹ کچھ کم کرنے کے لیے اپنی کتاب ''المیہ کا جنم'' لکھنی شروع کی۔ وہ اس کتاب کے ذریعے یونانی دنیا میں المیہ ڈرامے کے آغاز اور اس کے بنیادی تصورات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کتاب مکمل ہوگئی تو اس کی روح سرشار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی اشاعت سے فن وفکر کی دنیا میں انقلاب آجائے گا لیکن ہوا یہ کہ انقلاب تو بعد میں آتا، کوئی ناشر اسے شائع کرنے پر بھی تیار نہ ہوا۔ مجبور ہوکر اس نے اس کتاب کے مختلف ابواب مختلف جرائد میں شائع کرادیے۔

اس کتاب میں مقبول عام تصورات کا مذاق اُڑایا گیا تھا اور جدید جرمنی کے مسائل کو قدیم یونان کے مسائل سے منتھی کرکے سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسی لیے ناشرین اسے شائع کرنے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ اس موقع پر واگز اس کے کام آیا۔ اس کی سفارش پر واگز کے ناشر نے اس کتاب کو شائع کرنے کی ہامی بھرلی۔ محبت اور عقیدت کے جوش میں نطشے نے واگز کے کئی کمزور پہلو نظر انداز کردیے تھے۔ یہ کمزور پہلو واگز کا غرور اور دوسروں کی اہلیت کا اعتراف کرنے سے گریز تھا۔ نطشے کو اس کا تجربہ اور ادراک ہوا تو اس نے واگز سے دور ہونا شروع کردیا۔

اس دوری میں خود نطشے کا غرور بھی شامل ہوسکتا ہے کیونکہ اب وہ خود مصنفین کی صف میں کھڑا ہوگیا تھا۔

اس کی ایک اور کتاب ''تاریخ کا جائز وناجائز مصرف'' شائع ہوئی۔ یہ کتاب تاریخ کے علم کے خلاف لکھی گئی تھی جبکہ اس کے زمانے کے اہلِ یورپ تاریخ پر بہت نازاں تھے۔

اس ماحول میں تاریخ کو بُرا بھلا کہنا اپنے معاشرے سے ٹکرانا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ہر وہ بات کہہ اور لکھ رہا تھا جو اس کی سوسائٹی سے متصادم تھی۔

اس کتاب کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کی پہلی کتاب کا ہوا تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جنہوں نے پڑھ لی انہوں نے اس پر منفی رائے دی۔

دوسرے مصنفین کی طرح نطشے نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اب نہیں تو آنے والا زمانہ اس کی تحریر کو اہمیت دے گا۔

نطشے روز بہ روز مذہب سے دور ہوتا جارہا تھا۔ واگز کا ڈراما ''پارسی فال'' اسٹیج ہوا تو نطشے نے اسے واگز کے مسیحی ہونے کا اعلان نامہ کہہ کر اسے رد کردیا۔ وہ واگز کو مذہبی روپ میں دیکھنے کا قائل نہیں تھا۔ دونوں کے بگڑتے ہوئے تعلقات میں مزید بگاڑ پیدا ہوگیا۔

باسل یونیورسٹی اس کی مالی امداد کا بڑا سہارا تھا لیکن وہ

www.paksociety.com

کچھ دنوں سے بیمار رہنے لگا تھا۔ اس کے کئی قیمتی دن بستر پر گزر جاتے تھے۔ اس نے گھبرا کر ایک سال کی چھٹی لے لی۔

اس کا خیال تھا کہ مستقل آرام کرنے سے اس کو صحت مل جائے گی لیکن اس کا یہ خواب ٹوٹ گیا۔ ایک سال ختم ہوگیا لیکن اس کی صحت نے اسے دوبارہ یونیورسٹی نہیں آنے دیا۔ اس نے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا۔

اس نے صرف پانچ چھ سال پڑھایا تھا لیکن اس کی خدمات اور صحت کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی نے اس کے لیے تین ہزار فرانک کی سالانہ پنشن مقرر کردی۔ اب یہی رقم اس کا واحد سہارا تھی۔

یہ پنشن اسے 1876ء سے ملنا شروع ہوئی۔

اس کی جسمانی صحت ناگفتہ بہ تھی لیکن اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا، اس کی فکر آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نے تنہائی اور فرصت کے دنوں میں ایک کتاب مرتب کرلی تھی۔ اس کا عنوان اس نے انسانیت بے حد انسانیت رکھا۔ یہ کتاب دراصل اس کی کہاوتوں اور اقوال کا مجموعہ تھی اور 1878ء میں منظرِ عام پر آئی۔

اس کتاب میں اس کا اندازِ بیان مختلف تھا۔ اب تک اس کا اندازِ بیاں جھگڑالو مصنف کی طرح تھا اپنے خیالات کو اہمیت دیتا تھا اور دوسروں پر چوٹ کرتا تھا۔ اب اس نے دلائل پیش کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے انداز کو چھوڑ کر اقوال کی صورت میں اپنے خیالات پیش کرنے کا شاعرانہ اسلوب اختیار کیا۔ اس اسلوب میں وہ جھلک ملتی تھی جو بعض بزرگانِ دین اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

اس اسلوب کی بدولت اسے جرمن زبان کا بڑا ادیب مان لیا گیا۔ نطشے نے اظہار کا جو نیا اسلوب اختیار کیا وہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے پُرفضا دیہی علاقوں میں گھومتا رہا تھا۔ ان سیروں کے دوران جو خیالات اس کے ذہن میں آتے رہتے تھے، وہ ان کو کاغذ پر درج کرلیا کرتا تھا۔ کاغذوں کا یہی مجموعہ اس کی کتاب بن گیا۔ یہ ایسا اسلوب تھا جس کی انیسویں صدی کے یورپ میں کوئی اور مثال موجود نہیں تھی۔ اس کا یہ اسلوب یہ بتا رہا تھا کہ بیسویں صدی کا ادب کیسا ہوگا؟

وہ اس وقت کے فلسفیوں سے بھی مختلف ثابت ہورہا تھا۔ اس کی یہ کتاب محض فلسفے پر مشتمل نہیں تھی بلکہ اسے بہترین نفسیات داں بھی ثابت کررہی تھی۔ (بہت بعد میں فرائڈ جیسے نفسیات داں نے اس کا لوہا مانا)

اس کتاب کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان مخالفین میں اس کا دوست واگنر بھی تھا جس سے اب اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہوگئے تھے۔

ادبی حلقوں میں اس کتاب کو ضرور پذیرائی ملی تھی لیکن فروخت کے اعتبار سے ناکام ہوگئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے اسے پڑھا تھا۔

نطشے بے چارہ اس صدمے سے مزید بے حال ہوگیا۔ وہ بیمار تھا اور صحت کی تلاش میں دربدر مارا پھر رہا تھا، اس کا زیادہ تر وقت اٹلی، جنوبی فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے صحت افزا مقامات پر گزر رہا تھا جہاں کے موسموں سے وہ اپنی صحت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

اس کی بینائی اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ اسے نیم نابینا کہا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ لکھنے پڑھنے کا کام بند کردے لیکن یہ مشورہ وہ کیسے مان سکتا تھا؟ کیا سانس لینا چھوڑ دیتا؟ کام جاری رہا تو سر کے درد کا پُرانا مرض بھی لوٹ آیا۔ وہ کئی کئی دن بستر پر پڑا رہتا۔ ڈاکٹر اب اس نتیجے پر پہنچنے لگے تھے کہ اس کی بینائی کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ وہ اس بیماری کی حالت میں باسل پہنچ گیا۔ یہاں اس کا دوست اوربیک رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس بیمار فلسفی کی تیمارداری میں دن رات ایک کردیے۔

اس کی مخدوش حالت کو دیکھتے ہوئے اوربیک اور اس کی بیوی نے باہم مشورہ کیا کہ اب نطشے کی حالت سے اس کے گھر والوں کو مطلع کردینا چاہیے۔ انہوں نے اس کی بہن الزبتھ کو خط لکھ دیا۔ آخر بہن تھی، خط ملتے ہی دوڑی چلی آئی۔ بھائی کو اس حال میں دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ چند مہینوں میں کوئی برسوں کا سفر بھی طے کرسکتا تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے بھائی کو برسوں بعد دیکھ رہی ہو۔ نطشے نے بہن کو اپنے سرہانے دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا۔ اس کے اعزا اسے آخری بار دیکھنے آئے ہیں۔ اس نے اپنا نحیف اور سرد ہاتھ بہن کے ہاتھ میں دے دیا۔

"الزبتھ! وعدہ کرو کہ صرف میرے دوستوں کو میرے مردہ جسم کے نزدیک آنے دوگی۔ کوئی یونہی منہ اُٹھائے چلا آئے تو اس کو میرے قریب مت آنے دینا۔ میں اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ رہوں گا۔ اور ہاں، یاد رکھو، کسی پادری کو میری لاش کے قریب آنے اور ریاکاری کے الفاظ ادا کرنے کی اجازت ہرگز نہ دینا۔ خیال رکھنا، میری تدفین کسی پکے

کافر کی طرح ہو۔ کوئی جھوٹ وہاں نہ بولا جائے۔"

الزبتھ نہایت مذہبی لڑکی تھی لیکن اس وقت وہ بھائی کی باتوں کا کیا جواب دیتی۔ بیٹھی سسکیاں لیتی رہی اور سوچتی رہی، اپنے بھائی کو موت کے منہ سے کیسے نکالے؟ وہ اسے اپرامینگاڈائن کے صحت افزا مقام پر لے گئی اور وہ واقعی موت کے منہ سے نکل گیا۔

اسے ماں کی یاد آئی اور وہ ماں کے پاس نومبرگ چلا گیا۔ ماں کی قربت نے اسے واقعی صحت مند کردیا۔

اسی زمانے میں اس کی کتاب "مسافر اور اس کا سایہ" شائع ہوئی۔

آنکھیں پھر سے دُکھنے لگیں۔ سر کے درد نے پھر شور مچایا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

"میں نے اسی قدر دُکھ اُٹھائے ہیں اور اتنی بے شمار چیزوں سے دست بردار ہوا ہوں کہ کسی زمانے کا کوئی راہب کوئی سادھو بھی نہیں جس کی زندگی سے اپنی زندگی کا موازنہ کرسکوں۔"

وہ بیمار تھا۔ جسمانی اذیّت میں مبتلا تھا۔ روحانی اذیّت الگ تھی۔ وہ کسی سازگار موسم کی تلاش میں مختلف مقامات کے چکر لگا رہا تھا۔

"میرا وجود ہولناک بوجھ ہے۔ شاید میں بہت عرصہ پہلے اس سے نجات پالیتا لیکن دُکھ اور ترکِ دنیا کی اسی کیفیت سے گزرتے ہوئے میں ذہنی اور اخلاقی امور میں نہایت معلومات افزا تجربے کرتا رہا ہوں۔ حصولِ علم سے ملنے والی مسرت مجھ کو ان بلندیوں تک لے جاتی ہے جہاں میں اپنی تمام مصیبتوں پر غالب آجاتا ہوں تاہم درد سے ایک پَل کے لیے بھی نجات نہیں ملتی۔ نیم معذوری اس کے علاوہ ہے جو بات کرنا بھی میرے لیے دشوار بنادیتی ہے۔ شدید دورے پڑتے ہیں۔ آخری دورے کے سبب میں تین دن اور رات تک قے کرتا رہا تھا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔"

"میں یوں جیتا ہوں جیسے صدیاں کچھ بھی نہ ہوں۔"

وہ اپنے دوستوں اور معالجوں کو یہی پیغامات دیتا رہا تھا لیکن یہ کسے بتاتا کہ بیماری سے بڑھ کر وہ مالی وسائل کی کمی کا شکار ہے۔ غربت اتنی تھی کہ وہ خود کو گرم رکھنے کے وسائل سے بھی محروم تھا۔ وہ کسی مقام پر تھا کہ اس کی ماں کا خط اسے موصول ہوا۔ ماں نے لکھا تھا کہ وہ اپنی صحت پر مناسب توجہ نہیں دے رہا ہے۔

اس نے جواب میں لکھا۔

"صحت سے زیادہ اہم باتیں میرے ذہن میں رہتی

نئے موسم کی بدلتی رتیں اگست 2012ء کے شمارے کی لطافتیں

جال در جال

جنگل بیابان سے جدید نخلستان کا رخ کرلینے والی سنسنی خیز کہانی کے اختتامی واقعات
سلیم فاروقی کے مخصوص آہنگ و رنگ

سرورق کی کہانیاں

محبت کی نرم گفتاریاں...... نفرت کی چنگاریاں......
دوستی کی دل فریبیاں ...... اور دشمنوں کی عیاریاں ...... دل پسند سرورق کہانیاں

مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ

مغربی دنیا کے رسم و اطوار...... معاشرت و تغیرات کے گرد گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

سحر انگیز سلسلے

للکار...... بدلتے ماحول اور گرجتے دشمنوں کی للکاریں
طاہر جاوید مغل کا معرکہ...... ایک نئی ڈگر پر گامزن
اسما قادری کا سلسلہ گرداب

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے...... مشورے...... محبتیں......
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

اور وہ سب جو جاسوسی کا خاصہ ہے

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ اس لیے میں اس بیماری کو بھی برداشت کرنے پر تیار ہوں۔ دوسروں کے غلط علاج نے میری مشکلات بڑھائی ہیں۔ آیندہ سے میں خود اپنا معالج بننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دیکھنا لوگ کہیں گے، میں ایک اچھا ڈاکٹر ہوں۔"

اس خط کا جواب دینے کے بعد وہ اپنا علاج ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سوانح نگار بھی نہیں جانتا کہ اس سفر میں اس نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں؟

جب پاؤں تھک گئے تو وہ سمندر سے ساڑھے چھ سو ہزار فٹ کی بلندی پر سوئٹزرلینڈ کے سلزماریا نام کے گاؤں میں خاموشی سے دن کاٹنے لگا۔ اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ چپ چاپ جنگل کی سیر کو نکل جاتا اور پھر اپنے ٹھکانے پر واپس آ جاتا۔ گاؤں کے لوگ اسے کوئی پُراسرار ہستی سمجھنے لگے تھے۔ کوئی راہب، کوئی سادھو یا کوئی جوگی۔ گاؤں والے بھی غلط نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ یہی سب کچھ تو تھا۔

اپنی رہی سہی بینائی کی روشنی میں کچھ لکھتا رہتا یا پھر محض کاغذ ٹٹولتا رہتا۔ علالت کے باوجود اس کی موجودہ زندگی قدرے سکون سے گزر رہی تھی۔

کئی دن سے ایک خیال اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا لیکن اس خیال کے اظہار کی کوئی واضح صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ فکری کرب ایسا تھا کہ اپنے جسم سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ اب نہ کوئی درد تھا، نہ تکلیف۔ کیا میں نے اپنا علاج ڈھونڈ لیا؟ کیا میں اب بالکل ٹھیک ہوں؟

وہ جنگل کی سیر کو نکلا تو دور تک چلا گیا۔ جنگل کی خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ چاپ بھی اس وقت ساکت ہو گئی جب وہ چلتے چلتے تھک گیا اور دم لینے کو ایک مخروطی چٹان پر بیٹھ گیا۔ یہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے سانس لینے میں اسے کوئی دقت پیش آ رہی ہو۔ ان اُلجھی ہوئی سانسوں کے درمیان ایک الہام سا اس پر اُترا۔ جس خیال نے اسے پریشان کیے رکھا تھا اس پر منکشف ہو گیا۔ یہ تصور آیندہ اسے بہت شہرت دینے والا تھا۔ اسے "تکرار مسلسل" کا تصور کہا جا سکتا تھا۔ آگے چل کر اسی تصور نے اس کے فلسفے میں فوق البشر کو جنم دیا۔

اس تصور کا انکشاف ہی ایسا تھا کہ اس کی روح کانپ اُٹھی۔ دنیا میں جو دُکھ ہیں، یہ ختم ہونے والے نہیں۔ یہ ابدی چکر ہے جو ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اس سے پہلے بھی دنیا میں یہی تماشا ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی یہی تماشا دُہرایا جاتا رہے گا۔

زندگی نے اس کی ساتھ بھیانک سلوک کیا تھا اور اب وہ یہ پرچار کرنے والا تھا کہ یہ سلوک ہمیشہ دُہرایا جاتا رہے گا۔

اس خیال سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

وہ بڑی دیر تک اس مخروطی پتھر پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا اور پھر فاصلے سمیٹتا ہوا گھر چلا آیا۔

اس نے اپنے اس الہام سے دنیا کو سمجھ لیا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دوسروں کو کیسے سمجھائے؟ اس خیال کو منطق اور استدلال کے طریقوں سے نہیں سمجھایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک شاعرانہ خیال تھا۔ علامتوں کے ذریعے ہی سمجھایا جا سکتا تھا جسے اس زمانے میں صوفیہ اپنے روحانی تجربات کو علامتوں کے ذریعے بیان کر رہے تھے۔ اس نے سوچا اگر وہ اپنے خیالات کو ماضی کی کسی برگزیدہ ہستی کی زبانی بیان کرے تو لوگوں کے دلوں پر زیادہ اثر کرے گا۔ اس کے لیے اس نے قدیم ایران کی ایک مذہبی شخصیت زرتشت کا انتخاب کیا۔ زرتشت نے بھی ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی تھی، نطشے بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں اس زمانے کے لوگ روایتی عقیدے کو مسترد کر چکے ہیں۔ یوں مسیحی خدا کی انسانی زندگی، سماج اور کائنات میں مرکزی حیثیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ اب نئے نظام اور نئی اقدار کی ضرورت ہے تاکہ جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کیا جا سکے۔ اپنے ان خیالات کے اظہار کے لیے اس نے زرتشت کو وسیلہ بنایا۔

اس نے کتاب کا پہلا حصہ مکمل کیا تھا کہ سلزماریا میں سردیوں کے شباب نے چہرہ دکھایا۔ ہڈیوں تک اُتر جانے والی سرد ہواؤں نے اس کے حوصلوں کو برف بنا دیا۔ اس نے سامان باندھا اور گاؤں کی بلندی سے نیچے اُتر گیا۔

اس کے بعد تاریخ نے اسے روم میں دیکھا جہاں وہ ایک چھوٹے سے ریستوران میں ایک روسی نژاد لڑکی سلومی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا گیا۔ یہ لڑکی حسین بھی تھی، ذہین بھی اور نطشے کی طرح آزادی کی دلدادہ بھی۔

نطشے روم پہنچا تو بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی سلومی کی ادبی و ثقافتی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ ہر جگہ دیکھی جا رہی تھی ہر جگہ اس کے چرچے تھے۔ نطشے کی اس سے ملاقات ایک خاتون مادام میسن بگ کے گھر پر ہوئی۔ یہ خاتون نطشے کی پرستار تھیں۔ انہوں نے نطشے کا تعارف ایسے الفاظ میں کرایا کہ زندہ دل سلومی، نطشے میں دلچسپی لیے بغیر نہ رہ سکی۔ دیر تک نطشے کے خیالات اور اس کی کتابوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی رہی۔ مادام میسن بگ نے انہیں تنہائی دی اور ان کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئیں۔

"میں نے آپ کی کوئی کتاب تو نہیں پڑھی لیکن آپ

کمال کے مصنف معلوم ہوتے ہیں۔"

"میں جلد ہی اپنی کتابیں آپ کو دوں گا۔"

"میری خوش قسمتی ہو گی لیکن اس وقت تو میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اب تک میں آپ کی تحریروں سے ناواقف کیوں رہی؟"

"شاید اس لیے کہ میری تحریریں آنے والے کل کے لیے ہیں۔"

"آپ کی عمر تو ایسی ہے جب کوئی کل کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ اس کے لیے آج ہی سب کچھ ہوتا ہے۔"

"میں اپنے آج کے لیے کل تیار کر رہا ہوں۔"

"آپ بہت دلچسپ ہیں۔"

"میرے دوستوں کے سوا کوئی مجھے ایسا نہیں سمجھتا۔"

"اس حساب سے تو آپ کی دوست ہوئی۔"

"دوستی روح کا سفر ہے، اگر آپ کی روح مجھ سے ملتی ہے تو آپ میری دوست ہیں۔"

"میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟"

"میں شاعر بھی ہوں اس لیے آپ کے حسن نے مجھے متاثر کیا ہے لیکن فلسفی بھی ہوں جو روح کے اندر جھانکتا ہے۔"

"میری روح میں آپ کیا دیکھتے ہیں؟"

"روح میں جھانکنے کے لیے قربت ضروری ہوتی ہے۔ ہم ملتے رہیں گے تو یہ فریضہ بھی ادا ہو جائے گا۔"

"اس میں تو برسوں لگ سکتے ہیں، میں اتنے صبر کی عادی نہیں۔"

"میں خود اُداس رہتا ہوں لیکن شوخ لوگوں کو پسند کرتا ہوں اور آپ میں حِس مزاح بہت ہے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں نے کچھ دیر کے لیے آپ کو خوش کر دیا۔"

"آج آپ میرے ساتھ ڈنر پر چل سکتی ہیں؟"

"مجھے تو خوشی ہو گی کہ میں اتنے بڑے فلسفی کے ساتھ ڈنر پر جا رہی ہوں۔"

وہ دونوں کینڈل ڈنر پر آمنے سامنے بیٹھے تو سلومی کا نرم و نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کسی سے اتنی جلد بے تکلف ہونے کا عادی نہیں تھا۔ خواتین کی قربت بھی اسے کم ہی ملی تھی لیکن سلومی ایک نظر میں اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ وہ تھی بھی اتنی بے باک کہ ہاتھ میں ہاتھ دیے بیٹھی تھی بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر میں ہلکے سے دبا بھی دیتی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دیر تک ہوٹل کے لان میں ٹہلتے رہے۔ پھر پیدل ہی بڑی دور تک چلے گئے۔ سلومی اپنے گھر

محبت کا شاعر

سید فضل شاہ 1882ء میں لاہور سے متصل آبادی نواں کوٹ میں پیدا ہوئے۔ شاعری فطرت میں رچی بسی تھی۔ پنجابی زبان میں اہم مقام حاصل کیا مگر زیادہ تر عشق کی ناکامی پر اشعار کہے۔ سوہنی مہنوال لکھ کر پنجابی ادب میں وہ مقام حاصل کر لیا جس کا جواب آج تک پیش نہیں کیا جا سکا ہے۔ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایت میں مشہور ہے کہ ابتداً جوانی میں آپ ایک حسین دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے جو عمر میں ان سے بڑی تھی مگر آپ کی دلچسپ باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ وقت کا زیادہ حصہ دونوں ساتھ گزارتے تھے۔ یہی ہم نشینی عشق کا موجب بنی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت زیادہ چاہنے لگے لیکن عمر کا فرق دو دلوں کے درمیان دیوار بن گیا اور اس کی شادی کہیں اور کرا دی گئی۔ یہ زخم وہ سہ نہ پائے اور اپنے بے سکونی کا اظہار پوشیدہ انداز میں بذریعہ شاعری کرنے لگے۔ ان کی شاعری خوب پسند کی جانے لگی، کوبہ کی راگ میں ان کا درد گاتے۔ سوہنی مہنوال کو عوامی پسند کی سند ملی یہ قصہ زبان زد عام ہوا۔ دور و نزدیک پسند کیا جانے لگا تو آپ نے ہیر رانجھا لکھا۔ اس منظوم قصّے کو بھی شہرت حاصل ہوئی پھر قصّہ لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا کو بھی منظوم کیا۔ رومانی شاعری میں ایک مقام رکھتے ہی تھے۔ "تحفۂ فضل" لکھ کر عاقبت بھی بنا لی۔ اس کتاب میں معجزات رسول اکرم ﷺ قلمبند کیا تھا۔ 1890ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: ایاز راہی مانسہرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کی طرف چلی گئی۔ نطشے مادام میسن کے گھر پہنچ گیا جہاں وہ قیام کیے ہوئے تھا۔

اسے دیکھتے ہی مادام کے ہونٹوں پر معنی خیز ہنسی آ گئی۔

''نطشے! سلومی تمہیں کیسی لگی؟''

''وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔''

''بس اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''اس کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔''

''اسی لیے تو ثقافتی حلقوں کی جان بنی ہوئی ہے۔ روم میں اس کے بہت سے دیوانے ہیں۔'' مادام نے کہا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر مخاطب ہوئیں ''میں تو کہتی ہوں، تم سلومی سے شادی کرلو۔ وہ تمہارے مزاج کی لڑکی ہے۔''

''میں جسمانی رشتوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا لیکن سلومی کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''اس کا مطلب ہے تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟''

''شاید!'' نطشے نے مادام کو اس سے آگے کچھ نہیں کہنے دیا اور اُٹھ کر اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔

نطشے نے اپنے تصورات کے سوا کسی کے بارے میں اتنا نہیں سوچا تھا۔ وہ بستر پر گیا تو سلومی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ سلومی نے انوکھی باتیں نہیں کی تھیں۔ ایسی باتیں سب ہی لڑکیاں کرتی ہیں لیکن اس نے جس انداز سے کی تھیں وہ انداز نیا تھا۔ وہ اس کی کہی ہوئی باتوں کو ایک ایک کرکے دُہراتا رہا۔ اس نے چلتے ہوئے کہا تو تھا کہ وہ کل صبح اس سے ملنے آئے گی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب مادام میسن گھر پر نہیں ہوتیں۔ دیکھو وہ کل آتی ہے یا نہیں؟ اس نے سوچا اور لکھنے کا کاغذ نکال کر بیٹھ گیا۔ وہ ان دنوں ''زرتشت نے کہا'' کا دوسرا حصہ مکمل کرنے کی فکر میں تھا۔

وہ صبح سو کر اُٹھا تو سلومی اس کے اُٹھنے سے پہلے آئی بیٹھی تھی۔ مادام میسن کی وہ صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ وہ آفس جانے کے لیے نکل رہی تھیں۔ سلومی نے بالکل گھر دار عورتوں کی طرح اس کے لیے ناشتا تیار کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ اس لڑکی میں کتنے گن ہیں۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ اپنی نئی کتاب کے بارے میں اسے کچھ بتانے بیٹھ گیا۔

''میں اس کتاب میں ایک ایسے انسان کو بیان کررہا ہوں جو اپنی قوت سے ناکامیوں کو زیر کرلے۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ چاہے بدی کا راستہ اختیار کرنا پڑے؟''

''تم جسے نیکی کہتی ہو وہ دوسروں پر غالب آنے کی خواہش ہی کا تو نام ہے۔''

''غلبہ حاصل کرنے کی خواہش خطرناک نہیں ہے۔''

''اگر آسمانی بجلی خطرناک ہے تو کیا تم اسے ختم کرنے کی سفارش کروگی؟''

''یہ تو آپ بتائیں۔''

''دانش مندی یہ ہے کہ اس کو مفید طور پر بروئے کار لانے کے طریقے تلاش کیے جائیں۔ پھر بھی میں قوت اور غلبے کا حامی ہوں۔ میرا فوق البشر اسی جذبۂ قوت کا حامل ہے۔ انسان ایک ایسی چیز ہے جس سے آگے بڑھنا چاہیے۔''

وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر وہ اس سے مخاطب ہوا ''پہلے جب لوگ سمندر پر دور سے نظر ڈالتے تھے تو خدا کا نام زبان پر لاتے تھے لیکن اس کتاب کے ذریعے میں لوگوں کو کہنا سکھاؤں گا ''فوق البشر!''

''کیا تم نے انسان کو خدا کے مقابل نہیں لا کھڑا کیا ہے؟''

''تم بالکل ٹھیک سمجھیں۔ یہ مذہبی لوگ انسان کو تمام جانداروں سے افضل کہتے ہیں لیکن انسان کی حالت دیکھو، اس کی یہ حالت اس لیے ہوئی ہے کہ اسے کمزور بنادیا گیا ہے۔ طاقت کہیں اور ہے۔ میں نے خدا کی جگہ فوق البشر کو دی ہے، خدا کی عنایت اور مہربانی کی جگہ قوت وجذبہ حاصل کرنے کی خواہش ہے اور ابدی زندگی کی جگہ تکرار مسلسل کو رکھ دیا ہے۔''

''یہ تو مسیحیت پر حملہ ہے۔''

''میں یہی کررہا ہوں۔'' نطشے نے سرد مہری سے کہا ''یہی سچائی ہے۔''

''کیا یورپ تمہارے خیالات کو قبول کرلے گا؟ کیا اس کتاب کو پذیرائی ملے گی؟''

''میں دنیا کو نئی اقدار دے رہا ہوں۔ تم دیکھنا اس کتاب کی اشاعت سے تہلکہ مچ جائے گا۔''

''مجھے فخر ہوگا کہ اتنے بڑے مصنف کی دوست رہی ہوں۔''

''صرف دوست؟''

''کیا یہ بے وقعت لفظ ہے؟''

''میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''دوستی کا دروازہ محبت کی چابی ہی سے تو کھلتا ہے۔''

''تو کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' نطشے نے کسی جذبے سے بے اختیار ہوکر اس کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں

پھنسالیں۔

''تم مجھے پسند ہو اور پسند ہی کا نام محبت ہے۔''

نطشے نے اپنی انگلیاں آزاد کیں اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

''آج رات ہم کسی تھیٹر میں کچھ وقت گزاریں گے۔''

وہ تھیٹر دیکھنے گئے اور ایک دوسرے میں گم بیٹھے رہے۔

اب وہ ہر محفل میں ایک ساتھ دیکھے جارہے تھے۔ ہر طرف ان کی دوستی کے چرچے تھے۔

دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ نطشے 38 سال کا ہوگیا تھا جبکہ سلومی بائیس تیئس سال کی تھی۔

نطشے سیر سپاٹے کا شوقین تھا۔ اس کی اب تک کی عمر گھومتے پھرتے ہی گزری تھی۔ سلومی کی محبت میں گم ہوکر وہ بہت عرصہ روم میں رہ لیا تھا۔ اب اسے یہاں سے نکلنے کی سوجھی لیکن اب اسے زنجیر سمیت بھاگنے کی ضرورت تھی۔ اس نے سلومی کو راضی کرلیا، وہ دونوں سیاحت کو نکلے۔ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ پُرسکون دیہات میں دن گزارتے رہے۔

اس سیاحت کے دوران محبت کے بہت سے مراحل طے ہوگئے۔ وہ سلومی سے شادی کرنے کے لیے سنجیدہ تھا۔ بس یہ سوال اس کے سامنے رکھنے کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔

وہ اس سیر وتفریح کے بعد ''باسل'' آیا۔ یونیورسٹی کے زمانے کے پروفیسر اوربیک اور ان کی بیوی سے اس کے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ وہ ان کے گھر گیا۔ ان دنوں وہ اپنی محبت کے سوا کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ مسز اوربیک سے ملا تو یہاں بھی اپنی محبت کا قصہ چھیڑ دیا اور وہی مشہور جملہ دُہرایا جو وہ اکثر کہتا رہتا تھا۔

''اگرچہ مجھ کو جسمانی رشتے اچھے نہیں لگتے لیکن میں سلومی سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔'' اس نے یہ بھی کہا ''سلومی کے ساتھ اس کے رومانی رشتے سے ایک رومانی بیٹا بھی جنم لے گا...... ولی زرتشت!''

مسز اوربیک نے اس کے اس جذبے کو سراہا لیکن یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اس معاملے میں اپنی بہن سے بات کرے۔

''میں اپنی بہن کو اس معاملے سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سارا کھیل بگاڑ دے گی۔''

''تو پھر سلومی سے خود بات کرو یا کسی دوست کو بیچ میں ڈالو۔ کہو تو مجھ سے یہ خدمت لے لو۔ ہم لوگ تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔''

وہ اپنی بہن الزبتھ سے بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اپنی بہن کی مذہبی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اسے ڈر تھا کہ وہ سلومی کو پسند نہیں کرے گی۔ وہ ماں کو بھی اس کے خلاف بھڑکا دے گی۔ وہ شاید یہ چاہتا تھا کہ پہلے شادی کرلے، اس کے بعد بتائے البتہ کوئی دوست کام آ سکتا ہے۔

نطشے کو اپنے ایک دوست پال رے کا خیال آیا۔ وہ ایک ذہین یہودی تھا۔ نہایت اچھی گفتگو کرتا تھا۔ دوسروں کو شیشے میں اُتارنے کا ہنر خوب جانتا تھا۔ سلومی اگر نہیں بھی مانے گی تو وہ اسے تیار کرلے گا۔ بس یہی سوچ کر اس نے پال رے کو سلومی سے ملوادیا۔

اب وہ دو سے تین ہوگئے تھے۔

اس نے پال رے کے ذریعے سلومی کو شادی کا پیغام بھجوادیا۔ وہ پال رے کا انتظار کررہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سلومی خوشی خوشی اس سے شادی کے لیے تیار ہوجائے گی لیکن پال رے کوئی دوسرا ہی جواب لے کر آیا۔

''میں پہلے ہی ایک ناکام محبت کا بوجھ اُٹھائے پھر رہی ہوں۔ شادی کا میرا کوئی ارادہ نہیں البتہ دوستی ٹھیک ہے۔ دوستی رکھنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اس جواب سے نطشے کو سخت دھچکا لگا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ ابھی سلومی کو پوری طرح متاثر نہیں کیا ہے یا پھر وہ اسے مزید تڑپانا چاہتی ہے۔ کچھ وقت اور گزرے گا تو وہ ضرور تیار ہوجائے گی۔ وہ اس کی دوستی سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تعلقات منقطع نہیں کیے۔ وہ اسی طرح سلومی سے ملتا رہا بلکہ اب پال رے بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

اس دوران نطشے کی دو کتابیں ''طلوع سحر'' اور ''فرحت بخش توانائی'' شائع ہوئیں اور دونوں ہی ناکام رہیں۔ بلکہ پہلے کی کتابوں سے زیادہ ناکام۔ کسی نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

اس نے اپنی کتاب ''زرتشت نے کہا'' کا پہلا حصہ شائع کرایا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کتاب ضرور تہلکہ مچادے گی۔ سلومی کو بھی اس پر فخر ہوگا لیکن اس کی یہ خوش خیالی عارضی ثابت ہوئی۔ کتاب شائع ہوئی تو پھول تو پھول کسی نے کوئی پتھر بھی اس کی طرف نہیں اُچھالا۔ اس کے دوست بھی چپ سادھے ہوئے تھے۔ اخبارات اور جریدوں میں بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔

ان پے در پے ناکامیوں نے بھی اسے مایوس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ اب بھی اس احساسِ برتری میں مبتلا تھا کہ آنے والا زمانہ اس کا ہوگا۔ دنیا اسے جس قدر نظر انداز کرتی جارہی تھی، اتنا ہی یہ احساس بڑھتا جارہا تھا لیکن اکیلے پن کا

www.paksociety.com

احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر کوئی ہم مزاج عورت میری ہمسفر ہو جائے تو میں بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہوں۔ میرا یہ اکیلا پن مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ دنیا مجھے نظر انداز کر دے، مجھے پروا نہیں لیکن کوئی عورت مجھے ٹھکرائے یہ مجھے برداشت نہیں اور شاید ساری دنیا کی عورتوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ مجھے ٹھکرائیں گی۔ اسے ایک مرتبہ پھر یاد آ گیا کہ سلومی نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا کہ سلومی سے بات کرے۔ شاید وہ اب انکار نہ کرے۔

"میں ہر طرف سے ناکام ہو گیا ہوں۔ کیا تم بھی مجھے ناکام رہنے دو گی۔ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ ہم دونوں مل کر دنیا فتح کر سکتے ہیں۔"

"کتنی ہنسی کی بات ہے کہ تم دنیا فتح کرنے کے لیے مجھ سے شادی کر رہے ہو؟"

"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھے فتح کرو؟"

"میری فتح تو یہ ہے کہ میں تم سے شادی نہ کروں اور دوستی برقرار رکھوں۔"

"میں اکیلا ہوں سلومی! بہت اکیلا۔ تم میری تنہائی دور کرنے میرے پاس چلی آؤ، مجھ سے شادی کر لو۔"

"میرے پیارے نطشے! جس طرح تمہیں اپنے تصورات عزیز ہیں اسی طرح مجھے بھی ہیں۔ مجھے شادی میں دلچسپی نہیں۔ کسی ایک کے ساتھ پوری زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تم ہی سے نہیں کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی، میں تو بس آزاد عورت کی طرح رہنا چاہتی ہوں۔"

نطشے، سلومی کے اس جواب سے سخت مایوس ہوا لیکن وہ نطشے تھا، کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اس نے کوشش جاری رکھی۔

دوسری مرتبہ کی ناکامی کے بعد اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ بہن کی مدد لے۔ شاید وہ سلومی کو سمجھا سکے۔

وہ نومبرگ گیا اور بہن کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اس نے اپنی دو مرتبہ کی ناکامیوں کا ذکر نہیں کیا۔ بس یہ کہا کہ ایک لڑکی سلومی ہے، جس سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس لڑکی سے مل لے اور شادی کے لیے راہ ہموار کرے۔ الزبتھ یہ سن کر خوش ہوئی تھی کہ اس کے بھائی کی آوارہ گردی کو آخر کوئی ٹھکانا ملنے والا ہے۔ الزبتھ نے ماں کو بتایا تو اسے بھی خوش ہی ہونا تھا۔ اس کا بیٹا چالیس کے قریب پہنچ رہا تھا اور ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اچھا ہے اس کی شادی ہو جائے۔

الزبتھ نے وعدہ کیا کہ وہ اس شادی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

الزبتھ، واگنر کے کھیل "پارسی فال" دیکھنے کے لیے جانے والی تھی۔ وہ ٹاؤن برگ آئی تو یہ طے ہوا کہ سلومی بھی اس کے ساتھ جائے تاکہ دونوں میں دوستی بڑھے۔

الزبتھ خوش تھی کہ نئی بھابی سے ملاقات ہونے والی ہے۔ نطشے پہلی نظر میں سلومی کا دیوانہ ہو گیا تھا لیکن الزبتھ پہلی ملاقات میں سلومی سے نفرت کرنے لگی۔ الزبتھ کی مذہبی تربیت سلومی جیسی آزاد خیال لڑکی کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔

سلومی نہ صرف آزاد خیال تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ سچی بھی تھی۔ وہ اپنے بارے میں کوئی بات بھی چھپانے کی عادی نہیں تھی۔ ٹاؤن برگ میں قیام کے دوران اس نے نہ صرف اپنے معاشقوں کی فہرست الزبتھ کے سامنے رکھ دی بلکہ اپنے مذہبی خیالات بھی کھول کر بیان کر دیے۔

"شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" الزبتھ نے پوچھا۔

"ایک ناگوار بندھن۔"

"کیا شادی کے بغیر کسی سے تعلق رکھنا تمہیں بُرا نہیں لگتا؟"

"نیکی اور بدی کو میں اضافی خوبی یا خامی سمجھتی ہوں۔ نیکی بس یہ ہے کہ ہم دوسروں کو خوش رکھیں۔ میں یہ کام بہ خوبی کر رہی ہوں۔"

"تم عورت کے نام پر دھبا ہو۔"

"میں ہی تو اصل عورت ہوں۔ تمہارا بھائی مجھے اسی لیے پسند کرتا ہے۔ میں اس کے فلسفے کے عین مطابق ہوں۔"

"تم نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔"

"تم مجھ سے جل رہی ہو کیونکہ تمہاری ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور شباب کی منزلوں سے گزر گئی ہو، تم حسین بھی نہیں ہو کہ تمہارا کوئی دوست بن سکے۔"

بات نطشے کی شادی سے شروع ہوئی تھی اور ذاتیات پر جا کر ختم ہوئی۔ دونوں میں خوب جھگڑا ہوا۔

وہ دونوں تین ہفتے اکٹھی رہی تھیں۔ الزبتھ اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ سلومی ایک بُری عورت ہے۔ اس کے بھائی کو اس سے دور رہنا چاہیے۔

الزبتھ ٹاؤن برگ سے نومبرگ پہنچی تو طے کر چکی تھی کہ وہ نطشے کو اس بُری عورت سے بچائے گی۔ اس نے گھر پہنچتے ہی سلومی کے گناہوں کی ایسی تصویر کھینچی کہ نطشے کی ماں دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئی۔

www.paksociety.com

"ماں، کیا تمہیں یہ گوارا ہو گا کہ ایک ایسی عورت ہمارے گھر میں آئے جو شادی کے بغیر دوسرے مردوں کے ساتھ رہتی رہی ہے۔ میرے خیال میں تم نہیں چاہو گی۔"

"پھر نطشے اس کے لیے سفارش کیوں کر رہا ہے؟"

"وہ بُرے لوگوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ یہ لڑکی بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

"اور نطشے کے خیالات؟"

"ان بُرے لوگوں ہی نے اس کے دل میں یہ خیالات ڈالے ہیں جنہیں وہ اپنا فلسفہ کہتا ہے۔"

"مذہب کے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں؟"

"اگر وہ مذہب کو مانتی تو یہ حرکتیں کیوں کرتی؟"

"اب ہم دونوں کا فرض ہے کہ نطشے کو اس سے بچائیں۔"

نطشے نومبرگ گیا تو الزبتھ سے اس کی جھڑپ ہو گئی۔ الزبتھ نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ نطشے کے فلسفے پر بھی چوٹیں کیں۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے نطشے کے فلسفے کو سلومی کی شکل میں گوشت پوست کے روپ میں دیکھا ہے۔ وہ اپنے خیالات بھی درست کرے اور اس عورت سے ناتا توڑ لے۔

نطشے ابھی پوری طرح سلومی کی جانب سے بدظن نہیں ہوا تھا۔ یہ معاملہ یکطرفہ سہی لیکن وہ اس سے شادی کرنے کا خواہاں تھا۔ اسے یہ بھی بُرا لگ رہا تھا کہ الزبتھ خود تو نیکی اور پارسائی کا دعویٰ کر رہی ہے اور سلومی کو بدی کا مجسمہ قرار دے رہی ہے۔

اسے ماں سے امید تھی کہ وہ اس کی حمایت کرے گی لیکن ماں کو الزبتھ پہلے ہی بدظن کر چکی تھی۔ اس نے الزبتھ سے بھی زیادہ نطشے کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"تم نے آوارگی میں پڑ کر اپنی صحت کا بھی ستیاناس کر لیا ہے اور اپنے خیالات کا بھی۔ تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ تم ایک پادری کے بیٹے ہو۔ آج ہر جگہ چرچا ہے کہ تم لادین ہو گئے ہو اور اب ایک بدکار عورت کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہو۔ تم تو اپنے باپ کی قبر کے لیے بھی بے عزتی کا باعث بن گئے ہو۔"

نطشے اس طعنے کو برداشت نہ کر سکا اور نومبرگ سے لیپزگ آ گیا۔

سلومی کو الزبتھ کی باتوں سے دکھ ہوا تھا۔ وہ لڑ جھگڑ کر آئی تھی۔ اس نے نطشے کا خیال دل سے نکال دیا اور پال رے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دونوں میں خوب پینگیں بڑھنے لگیں۔

سلومی اور رے لیپزگ آئے تو نطشے بھی وہیں تھا۔ وہ خوش ہو گیا کہ سلومی سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شاید وہ اسے منا بھی لے۔ وہ تینوں تین ہفتے تک لیپزگ میں ہنسی خوشی رہتے رہے۔ تینوں نے طے کیا کہ وہ پیرس جائیں گے۔

پال رے بہ ظاہر نطشے کا دوست بنا ہوا تھا لیکن وہ اسے اپنا رقیب تصور کیے ہوئے تھا اور اب چاہتا تھا کہ اس کانٹے کو نکال پھینکے۔ اس نے سلومی کو بھڑکایا۔ وہ دونوں نطشے کو چھوڑ کر اکیلے ہی پیرس کے لیے روانہ ہو گئے۔

نطشے کو جب معلوم ہوا کہ وہ دونوں پیرس چلے گئے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے اسے اپنے حواس گم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ پورا دن اور پوری رات سلومی کی بے وفائی کا جشن مناتا رہا۔

ٹھکرائے جانے کے شدید احساس نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ رقابت کی آگ الگ تھی۔ اگر صرف سلومی اسے چھوڑ کر چلی جاتی تو بات الگ تھی۔ وہ اسے اس کی مجبوری بھی کہہ سکتا تھا لیکن اس نے پال رے کو اس پر فوقیت دی تھی یہ احساس اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے اندر ایسی توڑ پھوڑ مچی کہ وہ جنون کے کنارے جا کھڑا ہوا۔

اب وہ بالکل اکیلا تھا۔ صحرا میں کسی اکیلے درخت کی طرح۔ بہن سے اس کی لڑائی ہو گئی تھی۔ ماں سے خط کتابت ختم کر چکا تھا۔ سلومی کسی اور کے ساتھ چلی گئی تھی۔ بس ایک شغل رہ گیا تھا کہ دور بیٹھے دوستوں کو خطوط لکھتا رہے اور ان سے سلومی کے رویے کی شکایتیں کرتا رہے۔ وہ یہی کر رہا تھا۔ محبت کے بوجھ سے چھٹکارا چاہتا تھا جو تکلیف دہ بن گیا تھا۔

پھر وہ ایک ایسے بچے کی طرح ہو گیا جس کا کھلونا ٹوٹ جائے۔ وہ بہت روئے لیکن یہ سوچ کر صبر کر لے کہ کھلونا تھا ہی خراب ورنہ ٹوٹتا کیوں؟

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ بہن سے ملنے گیا اور سلومی کے بارے میں بہن کے خیالات قبول کر لیے۔ اس نے مان لیا کہ سلومی اس کے ساتھ مخلص تھی ہی نہیں۔ وہ محبوبہ تو کیا دوست بھی نہیں تھی۔ وہ بداخلاق تھی، فحاشی میں مبتلا تھی۔ الزبتھ کہتی رہی اور وہ سنتا رہا۔

یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سلومی کی محبت دل میں کہیں اتنی گہری اتر گئی ہے کہ خود اس کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گئی ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے اس نے اسے بھلا دیا ہے لیکن شاید نہیں۔ کسی وقت یہ محبت پھر اسے پریشان کرے گی کیونکہ اس محبت کے ساتھ ناکامی کا لفظ جڑ گیا ہے۔ ناکامی کا داغ اتنی آسانی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

سے نہیں دھلتا۔

یہ پھانس کہیں نہ کہیں لگی رہ گئی جو بعد میں زخم بننے والی تھی۔

وہ اسی غم کو بہلانے کے لیے سلزماریا آ گیا۔ اس نے اظہار کا وسیلہ پھر ڈھونڈا۔ دراصل اس کی کتاب کا کردار زرتشت اس کا ہمزاد بن گیا تھا جس کے ساتھ وہ وقت گزارتا رہتا تھا۔ زرتشت بھی اس کی طرح اکیلا تھا۔ نطشے کی ڈھارس بندھ جاتی تھی کہ اس کی طرح کوئی اور بھی ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے، زرتشت اسے بیان کردیتا ہے۔ نطشے کے پاس اب کہنے کو بہت کچھ تھا مثلاً یہ:

''مسیحیت نے اندلس کے شاندار تمدن اسلام کا گلا گھونٹ دیا۔ صلیبیوں نے مسلمانوں سے بارہا لڑائیاں لڑیں لیکن اس سے کہیں بہتر تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور وہ اندر سما جاتے۔ صلیبی جنگیں انتہا درجے کی رہزنی تھیں۔''

''عورت سرتاپا معمّا ہے اور عورت کا سرتاپا ایک ہی حل ہے جس کا نام حمل ہے۔''

''مرد سے بہتر عورت بچوں کو سمجھتی ہے لیکن مرد میں عورت سے زیادہ بچپن ہے۔ کھرے مرد میں بچہ پوشیدہ ہوتا ہے اور یہ بچہ کھیلنا چاہتا ہے۔ عورتو، اُٹھو اور مرد میں بچے کو ڈھونڈ نکالو۔''

''عورت کو ایک کھلونا ہونا چاہیے۔ پاک اور لطیف مثل جواہرات کے جس میں ایک ایسی دنیا کی شعاعیں چمک رہی ہوں جو ابھی وجود میں نہیں آئی۔''

''عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اطاعت کرے اور اپنی سطحیت کے لیے گہرائی تلاش کرے۔ عورت کی طبیعت سطحی ہوتی ہے جس طرح کے اتھلے پانی کے اوپر ایک متحرک اور طوفان خیز چھلکا۔''

مگر مرد کی طبیعت گہری ہوتی ہے۔ اس کا طوفان نیچے ہی نیچے غاروں میں شور مچاتا ہے۔ عورت کو اندر سے یہ تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں طاقت ہے لیکن یہ امر پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تو عورتوں کے پاس جاتا ہے تو چابک نہ بھول جانا۔''

عورتوں کے بارے میں یہ خیالات اسے یقیناً سلومی کے ساتھ رہ کر ملے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی وہ سلومی کو نہیں بھولا تھا۔ ایک سچے فنکار کی طرح اس نے ان تجربوں کو فن بنادیا۔

وہ ''زرتشت نے کہا'' کا دوسرا حصہ لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے بار بار سلومی کی یاد آجاتی تھی اور اس کے لہجے میں، اسلوب کی مٹھاس کے بجائے کڑواہٹ آجاتی تھی۔ وہ غصے میں چیخ اُٹھتا تھا۔

''سلومی تو میرے جوتے چاٹنے کے بھی قابل نہیں......

''اس اندازِ بیان کو معاف کیجیے گا، یہ میری بدقسمتی تھی کہ ایک جھوٹا اور مکّار میری راہ میں آیا۔''

وہ سلومی کو جوتیاں چاٹنے کے لائق نہ سمجھے لیکن یہ کہتے ہوئے دراصل وہ اپنی جھینپ مٹا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اندر ہی اندر اس کی محبت میں سلگ رہا تھا۔ اس کی ناکام محبت تقاضا کررہی تھی کہ وہ اپنی بہن کو اپنا دشمن سمجھے جس نے اس سے پہلے سلومی کو ٹھکرادیا۔

اس نے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے کہا ''مجھے اپنی بہن سے نفرت ہونے لگی ہے جس نے انتقام کی آگ میں جل کر اس کو پال رے اور سلومی کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔

محبت کیسے کیسے انوکھے رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ تو اس کی محبت نے اسے بالکل ہی بے قابو کردیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ سلومی رے کے ساتھ برلن میں رہ رہی ہے (شادی کے بغیر) تو نفرت کا الاؤ دہکنے کے بجائے سلومی کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں مچلنے لگی۔

وہ اس وقت وینس میں تھا۔ اس نے اپنے پروفیسر دوست اوربیک کو خط لکھا۔

''میں یہاں چند دوستوں کو مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں شاید ڈاکٹر رے اور سلومی بھی شامل ہوں گے۔ جن کے ساتھ میں وہ سب کچھ ٹھیک کرنا چاہتا ہوں جو میری بہن نے خراب کردیا تھا۔''

اس خط سے کچھ اور ظاہر ہو نہ ہو، یہ ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی سلومی کو نہیں بھولا۔ یہی نہیں بلکہ قصوروار بہن کو سمجھتا تھا۔

وہ انہیں مدعو نہیں کرسکا یا وہ خود نہیں آئے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن لوگوں نے یہ ضرور دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ مایوس ہوگیا تھا۔ سلومی سے ملاقات کے دوران وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ مناسب شریکِ حیات مل جانے کے بعد اس کے دن بدل جائیں گے لیکن اب اسے یقین ہوگیا تھا، تنہائی اس کا مقدر ہوگئی ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا تھا کہ اس کے بہت سے دوست اپنا گھر بسا کر مطمئن زندگی گزار رہے ہیں تو اس کی محرومیوں میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ اس کے دوست روڈے نے اپنے نوزائیدہ بچے کی تصویر بھیجی تو وہ اُداس ہوگیا۔ اس نے خط کے جواب میں روڈے کو لکھا۔

''دوست میں کتنی بے معنی اور کٹی ہوئی زندگی گزار رہا ہوں۔ کس قدر اکیلا ہوں۔ کیسے بچوں سے محروم ہوں۔''

اسے اب یہ بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے فرائض اور ذمّے داریوں سے بھاگ کر ناقابلِ تلافی نقصان کرلیا ہے مگر اب کھیل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اب 43 برس کا ہوگیا تھا اور اکیلا تھا جس طرح بچپن میں اکیلا تھا۔ اس نے کوئی ٹھکانا نہیں بنایا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے چھوٹے سے گاؤں سلزماریا میں چھوٹے سے گھر کا ایک کمرا اسے مل جاتا تھا جہاں وہ بار بار جاتا تھا اور سب سے چھپ کر آنسو بہاتا تھا۔ وہ جو انسانوں کو قوت وغلبہ کا سبق دیتا تھا، سلومی کی بے وفائی نے اسے کتنا کمزور کردیا تھا۔

سستے ریستورانوں میں کھانا کھانے اور اپنے کام میں مصروف رہنے کے سوا اس کے پاس اب کوئی کام نہیں تھا۔ چند کپڑے اس کی کل کائنات تھے۔ کاغذ تھے اور ایک بڑا سفری بیگ۔ ایک نوٹ بک تھی جس پر چلتے چلتے رک کر وہ اپنے خیالات نوٹ کرتا رہتا تھا۔

اس کی انا یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ لوگوں سے اپنی محبت کا رونا روتا رہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں کہیں بھی سلومی یا اپنی ناکام محبت کا تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن وہ چھپ چھپ کر سلومی کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اس ناکامی کو طاقت میں بدلنے کے لیے وہ ہر سال دنیا کو حیران کرتے ہوئے ایک کتاب پڑھنے کے لیے دے دیا کرتا تھا۔ یہی اس کی قوت تھی، یہی اس کی کامیابی۔

اس کی زندگی ایک طویل خودکلامی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ انہی خودکلامیوں سے اس کا فلسفہ مرتب ہورہا تھا لیکن اس فلسفے کی پذیرائی نہیں ہورہی تھی۔

اب اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ اسے نیم مجنوں کہا جاسکتا تھا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں اس نے اپنی شاہکار کتاب ''زرتشت نے کہا'' مکمل کی۔

اس کتاب کے بارے میں خود اس کا خیال یہ تھا کہ اس نے جرمن زبان کو عروج کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے اور یہ وہ کام ہے جو کوئی اور لکھنے والا نہ کرسکتا تھا۔ وہ اپنے اسلوب کو رقص قرار دیتا تھا لیکن دوسروں کا یہ خیال نہیں تھا۔ اس کتاب کی پذیرائی نہیں ہورہی تھی۔ ناشر نے ''زرتشت'' کا چوتھا حصہ شائع کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کتاب کی فروخت ہی نہیں تھی تو ناشر بھی کیا کرتا۔

نطشے نے اپنے خرچ پر ''زرتشت نے کہا'' کے چوتھے اور آخری حصے کے چالیس نسخے چھپوائے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہ نسخے دوستوں میں تقسیم کرے گا۔ اس نے ایک اور غلطی کی تھی۔ چالیس دوست کہاں سے لاتا، وہ صرف سات دوستوں کی فہرست بنا سکا۔ ان سب کو نسخے بھیج دیے۔ جواب کسی کی طرف سے بھی نہیں آیا۔

ایک بوجھ تھا جو اس نے اپنے سر سے اُتار دیا۔

اس کے بعد اس کی تین کتابیں اور شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کو بھی ناشر نہ مل سکا۔

اس کی تمام تحریریں مسیحیت پر جارحانہ حملہ تھیں۔ اسی لیے وہ نامقبول ہورہا تھا۔ یہ کوئی نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس کی جنگ ان لوگوں سے تھی جنہوں نے مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں تحریف کردی تھی خصوصاً سینٹ پال اس کام میں سب سے آگے تھا۔

انیسویں صدی کا یورپ دنیا کی سب سے بڑی جارحانہ قوت تھا۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے روایتی مسیحی اخلاقیات کے بجائے نئے اور جارحانہ نظام کی ضرورت تھی۔ نطشے کی تحریریں اسی پس منظر کو پورا کررہی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تحریریں ہی بعدازاں نازی ازم کے فروغ کا سبب بنیں۔

☆☆☆

وہ اپنی بہن سے اس وقت مل رہا تھا جب اس کی بہن الزبتھ شادی کرکے اس سے بہت دور جنوبی امریکا جارہی تھی۔ یہ سوچتے ہی کہ وہ اس سے بہت دور جارہی ہے، نطشے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''الزبتھ، جانتی ہو تم مجھے کس مقام پر چھوڑ کر جارہی ہو، میں بالکل تنہا ہوگیا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ ایک تم تھیں، اب تم بھی جارہی ہو۔''

وہ اس کے سامنے یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ اب سلومی بھی نہیں۔

''بھائی، تم دوبارہ یونیورسٹی کیوں جوائن نہیں کرلیتے؟''

''ساری جرمن یونیورسٹیاں مجھ سے نالاں ہیں۔ میری بات کون سنے گا؟ میں کس کو پڑھاؤں گا؟''

الزبتھ گوئٹے مالا چلی گئی اور وہ لیپزگ آگیا۔

اذیّت ناک تنہائی نے اس کے قدم جنون ودیوانگی کی طرف بڑھانے شروع کردیے۔ اب اس کی حرکات سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ نارمل نہیں رہا۔

اس نے اپنی بہن کو خط لکھا۔

''کیا میں اکلاپے کے لیے پیدا ہوا ہوں...... جس کو کبھی کوئی ایسا نہیں ملے گا جو اس کو جان سکے۔ جب اس کے پاس خدا کا سہارا بھی نہ ہو، دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا یہ حال ہے کہ خدا ہے اور نہ ہی کوئی دوست۔ جن کو تم دوست کہتی ہو وہ کبھی دوست ہوا کرتے تھے۔

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھ کو چند لوگ دے دو جو میری بات سنیں اور سمجھیں۔ تب میری صحت خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گی۔''

وہ ایک مرتبہ پھر نہیں کہہ سکا کہ سلومی مجھے دے دو۔ وہ بہن سے اپنے تعلقات دوبارہ ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہی تو ایک رہ گئی تھی۔

الزبتھ کا جب بھی خط آتا تھا، وہ اسے یہی مشورہ دیتی تھی ''استاد بن جاؤ، شادی کرلو۔'' وہ بیوی کہاں سے ڈھونڈتا؟ دوسرے لفظوں میں سلومی کو کہاں سے لاتا؟

1888ء میں وہ اٹلی کے شہر تبورن میں تھا کہ اسے ڈنمارک کے پروفیسر جارج برنیڈس کی طرف سے ایک خط ملا۔ اس نے لکھا تھا، یہ دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے کہ یہاں اسکینڈے نیویا میں آپ کو کوئی نہیں جانتا۔ میں نے بیڑا اٹھایا ہے کہ آپ کو ان لوگوں سے متعارف کراؤں گا۔''

نطشے کو اس نیم دیوانگی میں بھی ہنسی آ گئی۔ اس نے جواب میں لکھا ''میں تو اپنے وطن میں بھی نہیں پہچانا جاتا۔ یہاں کے لوگ تو مجھے اوٹ پٹانگ اور بے ہودہ سمجھتے ہیں۔

جان برنیڈس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے کوپن ہیگن یونیورسٹی میں نطشے کے تصورات پر لیکچرز دینے کا سلسلہ شروع کیا۔

ان لیکچرز کے ذریعے لوگوں نے نطشے کے خیالات کو سمجھا اور اسے عظیم فلسفی قرار دیا جانے لگا۔

یہ اس کی شہرت کا نقطۂ آغاز تھا لیکن اس کی داخلی حالت بہت ابتر تھی۔ یہ پورا سال اس نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی شہرت کے قدموں کی چاپ سنتے ہوئے گزارا اور پانچ چھوٹی چھوٹی کتابیں تخلیق کیں لیکن اب اس کے بدن کی عمارت سے انہدام انہدام کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ اپنے ایک دوست کو خط لکھ کر فارغ ہوا تھا اور کچھ دیر کے لیے گھر کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، ایک کوچوان اپنے گھوڑے پر بُری طرح چابک برسا رہا ہے۔ گھوڑا بلبلا رہا ہے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اپنی تکلیف کا اظہار کر رہا ہے۔ نطشے کو محسوس ہوا جیسے یہ چابک اس کی پیٹھ کو زخمی کر رہا ہے۔ وہ چیخ مار کر آگے بڑھا اور گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر لٹک گیا اور پھر بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ شور سن کر نطشے کا مالک مکان بھی گھر سے نکل آیا۔ نطشے کو اس حال میں دیکھا تو اُٹھا کر گھر میں لے آیا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

مالک مکان اسے ہوش میں لے آیا لیکن سوچ ضرور رہا ہو گا کہ اس سے تو وہ بے ہوش ہی اچھا تھا کیونکہ نطشے نے ہوش میں آتے ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ گانے گا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ مالک مکان یہ سمجھا کہ اس کا کرایہ دار نشے میں ہے۔

''چپ ہو جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔ شراب پینا ہے تو کوئی اور گھر دیکھو۔ اُٹھاؤ اپنا سامان!''

وہ شاید پولیس کو بلا بھی لیتا لیکن نطشے کی طبیعت سنبھل گئی۔ ایک دورہ سا تھا جو آ کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور لکھنے کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔

اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ دوستوں اور یورپ کی بعض ممتاز شخصیات کے نام خط لکھ رہا تھا۔ ان خطوں کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔

''مصلوب (اس نے اپنے لیے لقب اختیار کیا) 8 جنوری کو روم جائے گا جہاں یورپ کے شہزادے اور پوپ اس کے اعزاز میں اکٹھے ہوں گے۔''

''جب تم نے مجھے دریافت کیا تو مجھے پانا دشوار نہ تھا۔ مشکل تو اب مجھ کو کھونا ہے۔''

ایک خط میں اس نے خود کو ''ڈائنوسس'' لکھا یعنی شراب وعیش کا یونانی دیوتا۔

باسل یونیورسٹی کے پروفیسر دوست برک ہارٹ کو لکھا ''میں خدا بننے سے بھی زیادہ باسل یونیورسٹی میں پروفیسر بننا پسند کرتا لیکن میں اپنی انا کو اس حد تک نہ لے جانا چاہتا تھا کہ دنیا کی تخلیق ہی کو نظر انداز کر دیتا۔''

خدائی کا یہ دعویٰ سن کر برک ہارٹ سمجھ گیا کہ اس کی نیم دیوانگی کا دائرہ اب مکمل ہو گیا ہے۔ مزید دیر کی تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ اسی وقت نطشے کو لینے تیوران روانہ ہو گیا۔ وہ نطشے کے کمرے میں پہنچا تو اسے بے قابو دیکھا۔ وہ شور مچا رہا تھا اور مالک مکان اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

''جناب، اس آدمی نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ اسے فوراً یہاں سے لے کر جائیے۔'' مالک مکان نے برک ہارٹ کو دیکھ کر اس سے کہا۔

''جناب، آپ فکر نہ کریں۔ ہم انہیں لے جانے کے لیے ہی آئے ہیں۔''

نطشے نے برک ہارٹ کو دیکھا اور اس کے ساتھ اور بیک کو تو اس نے شور مچانا بند کر دیا اور دونوں کو پہچان لیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور اوربیک کے کان میں سرگوشی کی۔

''تمہیں ہائمن ٹو لائف نامی نظم یاد ہے؟ جس کی میں نے دھن بنائی تھی۔ میں تمہیں بتاؤں وہ نظم میری نہیں تھی بلکہ ایک نوجوان روسی خاتون فرالین وان سلومی کی تھی جس سے میری دوستی تھی۔''

یہ غیر متعلق بات سن کر اوربیک کو یقین آ گیا کہ نطشے کی ذہنی حالت نہ صرف مخدوش ہے بلکہ اس کی دیوانگی کا کوئی نہ کوئی تعلق سلومی سے ضرور ہے۔

اسے باسل لایا گیا اور ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ ذہنی طور پر بالکل مفلوج تھا۔ اس کی ماں کو لکھ دیا گیا تھا۔ وہ اس سے ملنے آئی تو وہ بالکل ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ الزبتھ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ گھر کے اخراجات کے بارے میں فکر مند تھا۔ ہوش مندی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ماں خوش ہو رہی تھی اور نطشے کی وہ حالت نہیں تھی جو بتائی گئی تھی لیکن باتیں کرتے کرتے اچانک چیخنے چلانے لگا۔ اس کی ماں اس کی حالت سے مایوس ہو گئی۔

اس کے دوست اس کی دیوانگی کے اسباب جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک سبب یہ بھی سامنے آیا کہ سلومی نے کسی جرمن پروفیسر سے شادی کر لی تھی جبکہ اس نے نطشے سے کہا تھا، وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرے گی۔ ممکن ہے اس شادی کی خبر نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہو۔

تین دن بعد اس کی ماں اسے لے کر نومبرگ چلی گئی اور نومبرگ کے قریب ''جینا'' کے مقام پر اسے وہاں نفسیاتی علاج کے مرکز میں داخل کرا دیا۔

شاید دنیا اس کے حواس گم ہونے کے انتظار میں تھی۔ اس کی شہرت حیرت انگیز طور پر دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ وہ ایک لیجنڈ بن گیا تھا۔ جرمن قوم پرستوں نے اسے اپنا ہیرو بنا لیا تھا۔ اس کی شہرت ہندوستان تک پہنچی فلسفی علامہ اقبال نے اسے مجذوب فرنگی کہا اور ایسی روحانی شخصیت کا درجہ دیا جو مناسب رہنمائی نہ ملنے کے سبب راہ سے بے راہ ہو گیا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ جب لوگ مجھ سے رجوع کریں گے تو میں ان سے دور جا چکا ہوں گا۔ اس کے یہ الفاظ پورے ہو رہے تھے۔ اس کی شہرت پھیل رہی تھی اور وہ خود اس شہرت سے بے نیاز تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اسپتال کے باہر کیا ہو رہا ہے؟

قوم پرست نازیوں کو اس فلسفی کے خیالات میں اپنے عزائم کی جھلک ڈھونڈنے میں جلد ہی کامیابی مل گئی۔ انہوں نے نطشے کی فکری بزرگوں کی فہرست میں سب سے بلند درجہ دے دیا۔

بدقسمت فکری بزرگ کی حالت یہ تھی کہ بے ربط جملے بولتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ان باتوں میں ربط بھی آ جاتا تھا جس سے یہ امید بندھتی تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس دنیا میں واپس آ جائے گا، جہاں سے وہ بہت دور چلا گیا تھا۔

1890ء تک وہ ''جینا'' کے نفسیاتی اسپتال میں رہا۔ اس کی ماں نے بیٹے کے قریب رہنے کے لیے ایک گھر لے لیا تھا اور نطشے کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ جب مایوسی بہت بڑھ گئی تو وہ اسے لے کر نومبرگ چلی آئی اسی گھر میں جہاں وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد منتقل ہوئی تھی جہاں نطشے نے بچپن کے دن گزارے تھے۔

نومبرگ پہنچتے ہی وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ذہنی خرابی کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن اس کی ماں ایک واقعے سے چونک گئی اور اس کی مسلسل نگرانی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ عام طور پر چپ چاپ برآمدے میں بیٹھا رہتا تھا لیکن اس دن گلی میں نکل گیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر جانے کے بعد وہ بندر کی طرح اُچھلنے کودنے لگا۔ اس کی عجیب وغریب حرکات دیکھ کر بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھ کر کپڑے اُتارنے شروع کر دیے، اتنی دیر میں پولیس آ گئی۔ پولیس نے اسے حراست میں لے لیا لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ کون ہے تو ایک سپاہی اسے اس کے گھر لے آیا۔ اتنی دیر میں وہ بالکل نارمل ہو چکا تھا۔ اس نے سپاہی کا شکریہ ادا کیا اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس دن کے بعد سے اس کی کڑی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔

اس کی ماں اس صدمے سے دوچار تھی کہ ایک صدمہ اور اس پر آ پڑا۔ الزبتھ بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ جنوبی امریکا سے واپس آ گئی۔

بھائی کی حالت دیکھی تو اپنا صدمہ بھول گئی۔ شکر ہے کہ نطشے کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے پہچان نہ سکتا ہو۔

الزبتھ کے چلے آنے کے بعد اس کی ماں کی ذمے داریوں میں کچھ کمی آ گئی۔ دونوں عورتیں مل کر اس کی تیمارداری کرنے لگیں۔

الزبتھ کے آنے سے یہ بھی ہوا کہ نطشے کی کتابیں اور وہ مسودات جو اپنی اشاعت کا منہ نہ دیکھ سکے تھے، محفوظ ہو گئے۔ اس کی وفات کے بعد الزبتھ نے ان مسودوں کو شائع بھی کروایا حالانکہ اس پر یہ الزام بھی آیا کہ چونکہ وہ یہود دشمن تھی اور اس کا شوہر یہود دشمن تحریک کا سرگرم رکن رہ چکا تھا' لہٰذا اس نے نطشے کے مسودات میں ردوبدل کر دیا تھا اور ایسی باتیں شامل کر دی تھیں جو یہود دشمنی اور جرمن قوم پرستی کی تائید کرتی تھیں۔

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

الزبتھ نے نطشے کا ''آرکائیو'' بھی قائم کردیا جس میں نطشے کی زیرِاستعمال اشیا کتابیں وغیرہ محفوظ کردی گئیں۔

نطشے کی ذہنی حالت روز بہ روز خراب ہوتی جارہی تھی۔ سر جھکائے گھر کے برآمدے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اب اس سے کوئی یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ خود اس کا یہ حال تھا کہ اس نے بولنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ کبھی اگر کسی بات پر بول اٹھتا تو گھر والے خوشی سے چیخ اُٹھتے۔ الزبتھ زور زور سے ماں کو آوازیں دینے لگتی۔

''ماں، ذرا آ کر تو دیکھو، بھائی نے ابھی بات کی تھی۔''

اس کی یہ کیفیت بھی اس کی بیماری کے پانچ سال تک رہی۔ اس کے بعد تو اس نے کسی کو پہچاننا ہی چھوڑ دیا۔ ایک دن گھر سے نکل گیا۔ بہ مشکل گلی کے کونے تک پہنچا تھا کہ لوگوں سے اپنے گھر کا پتا پوچھنے لگا۔

''ہمارا گھر کہاں ہے؟''

اس کا ایک پُرانا دوست اس سے ملنے آیا تو نطشے اس پُرانے دوست کو نہ پہچان سکا۔ اس کا دوست اس کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگا۔ نطشے پر اس کے آنسوؤں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ کسی کی موجودگی سے بے نیاز بیٹھا رہا۔ وہ رنج اور مسرت کی حدوں سے آگے نکل گیا تھا۔

''آپ اُداس نہ ہوں۔'' نطشے کے اس دوست نے الزبتھ سے کہا تھا ''کچھ دنوں سے ان کی یہی حالت ہوگئی ہے۔ میرے اور مام کے سوا... کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایک سال پہلے تک اکیلے نہیں تو کسی کے ساتھ گھومنے جاتے تھے لیکن اب تو کمرے میں کسی زخمی جانور کی طرح لیٹے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں، میرے پاس کوئی نہ آئے۔ آنکھوں سے گہری نفرت چھلکتی رہتی ہے۔''

دوپہر کا وقت تھا۔ کوئی سہیلی الزبتھ سے ملنے آئی۔ نطشے ان سے کچھ فاصلے پر پیانو پر بیٹھا، پیانو سے کھیل رہا تھا۔ جی ہاں، اب وہ کھیل ہی سکتا تھا ورنہ ایک زمانہ وہ تھا جب وہ دُھنیں تخلیق کرتا تھا بلکہ موسیقار بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ بے شک، اگر وہ فلسفی نہ ہوتا تو عظیم موسیقار ہوتا۔

دونوں سہیلیاں کسی مرد کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ وہ کتنا خوبصورت ہے۔ نطشے قریب ہی تو بیٹھا تھا۔ اس نے یہ بات سن لی۔ اس نے پیانو سے ہاتھ ہٹائے اور الزبتھ کی طرف دیکھ کر کہا ''سچ بتاؤ، کیا میں کبھی خوبصورت نہیں تھا؟''

الزبتھ نے ایسی ہوش مندی کی بات اس کی زبان سے سنی تو لپک کر اس کے پاس پہنچی لیکن اتنی دیر میں وہ اپنی دنیا کی طرف لوٹ چکا تھا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کیا کہہ دیا۔ الزبتھ اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

''نطشے، پھر کہو تم نے ابھی کیا کہا تھا؟ ہاں، مجھے یاد ہے تم بہت خوبصورت تھے۔ تم تو اب بھی خوبصورت ہو، کسی معصوم بچے کی طرح۔ کتنی مدت بعد میں نے تمہاری آواز سنی ہے۔ تمہاری آواز بھی کتنی خوبصورت ہے۔''

نطشے یوں لاتعلق تھا جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔

اس کی اس دیوانگی کو سات سال گزر چکے تھے۔ پچھلے دو سالوں میں وہ بالکل خاموش ہوگیا تھا جیسے اپنے ٹھکرائے جانے کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔

اس کی ماں فرانزسکا اس کی دیکھ بھال کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اس انتظار میں کہ اس کا لاڈلا اکلوتا بیٹا ٹھیک ہوجائے گا۔ پتھر کی بن گئی تھی۔ ہر رات اس امید میں سونے کے لیے لیٹتی تھی کہ صبح اس کا بیٹا اس سے باتیں کرے گا۔ ایک رات وہ ایسی مایوس ہوئی کہ اس نے اُٹھنے سے ہی انکار کردیا۔ 20 اپریل 1897ء کو فوت ہوگئی۔

نطشے نہ زندہ تھا نہ مردہ۔ اس پر اس حادثے کا اثر کیا ہوتا۔

فرانزسکا کے انتقال کے بعد نطشے کو ''ویمار'' منتقل کردیا گیا جہاں اس کی ایک مداح خاتون نے اپنا گھر ''نطشے آرکائیو'' کے لیے دے دیا تھا۔

نطشے کو ویمار لایا گیا تو یوں لگا جیسے کوئی باغی لیڈر جلاوطنی کاٹ کر اپنے وطن واپس آتا ہے۔ قوم پرستوں نے اسے ولی کا درجہ دے رکھا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کی زیارت کو آرہے تھے۔

نطشے نے کبھی کہا تھا ''مجھے ڈر ہے کسی روز مجھے ولی قرار دے دیا جائے گا۔'' اس کی پیش گوئی صحیح ثابت ہو رہی تھی۔

اس کی دیوانگی کی گیارہ سالہ سزا ختم ہوئی۔ 56 سال کا ہوا تھا کہ اپنی سالگرہ سے چند ہفتے قبل 25 اگست 1900ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

اسے روکن کے قصبے میں اس کے باپ کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔

وہ یہ جانے بغیر ہی مر گیا کہ وہ مشہور شخصیت بن چکا ہے۔

اس کی محبوبہ سلومی اس کی وفات کے 35 سال تک زندہ رہی۔

ماخوذ: فریڈرک نطشے، حیات و افکار ایک مطالعہ از قاضی جاوید

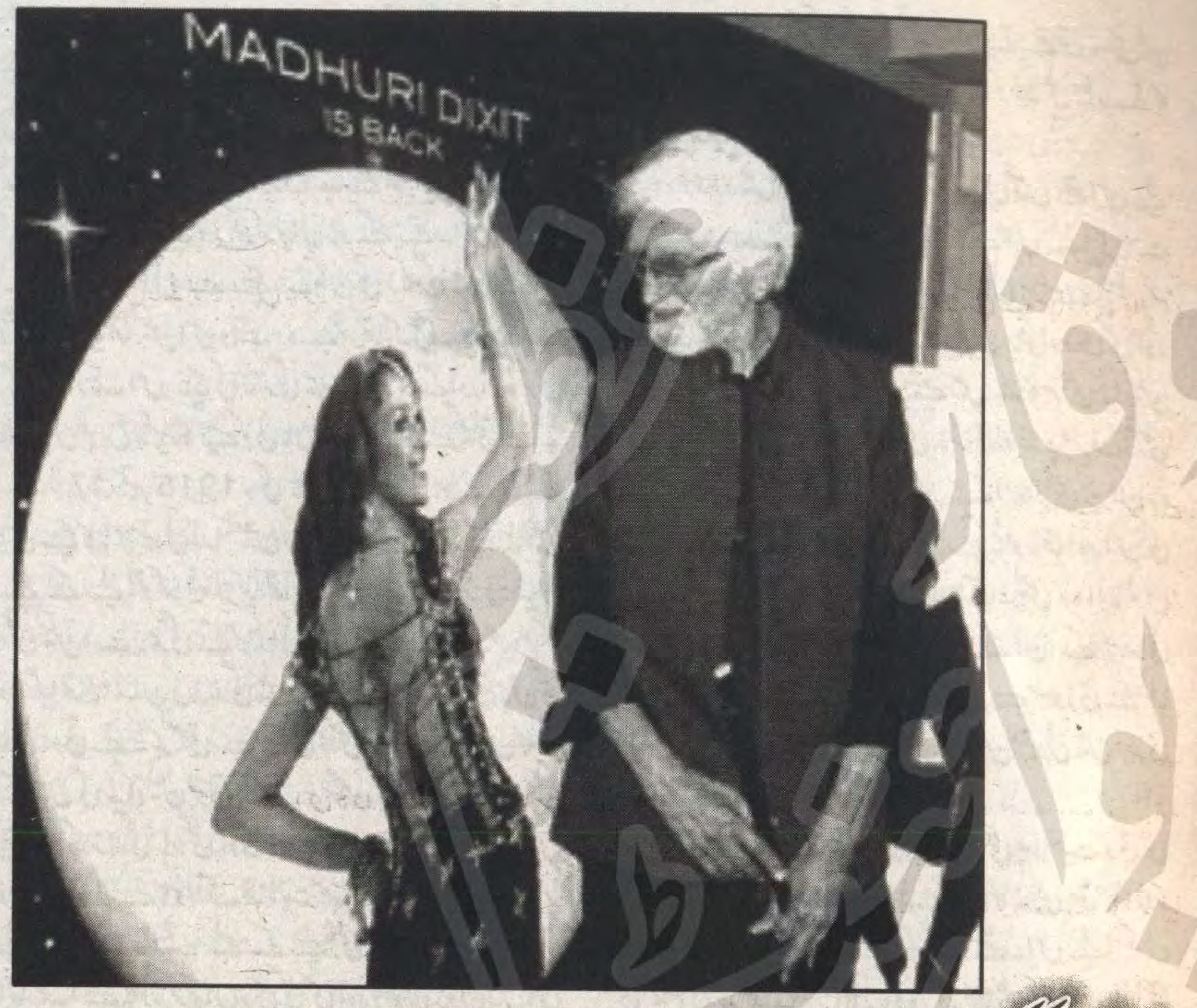

عشقِ رنگیں

مریم کے خان

اس نابغۂ روزگار کی داستان جسے قدرت نے فنِ مصوری میں کمال عطا کیا تھا۔ وہ دنیا بھر میں اپنے کام کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ برصغیر میں اس کا ثانی نہ تھا۔ اس نے رنگوں کی ایسی حسین دنیا تخلیق کرلی تھی کہ لوگ اش اَش کر اُٹھتے تھے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی قیمت لاکھوں میں لگتی تھی لیکن وہ حسن کا شیدائی تھا۔ فطرت کا حسن ہو یا حسین چہرے، وہ ان کو رنگ و روغن کے ذریعے زبان دے دیا کرتا تھا۔ مگر جب وہ لڑکی جس نے بالی وڈ میں تہلکہ مچا رکھا تھا اس کے سامنے آئی تو وہ ''سدھ بدھ'' کھو بیٹھا۔ تقریباً 80 سال کی عمر میں اس کے لیے بھنورا بن گیا۔

برصغیر کی پہچان کہے جانے والے مصور کی داستان

عشقِ ناکام نمبر

یہ پہلی جنگِ عظیم کا پُرآشوب دور تھا۔ اگرچہ ہندوستان اس جنگ سے بہت دور تھا اور جنگ یورپ میں لڑی جارہی تھی لیکن بدقسمتی سے ہمارے آقا انگریز اس جنگ کے ایک فریق تھے اور انہوں نے ہندوستان کے وسائل اور لوگوں کو جنگ کی اس بھٹی کے لیے مخصوص کردیا تھا۔ جوانوں کو بھرتی کر کے محاذ پر بھیجا جارہا تھا اور تمام ہی اشیائے ضروریہ کی راشن بندی کر دی گئی تھی کیونکہ یہ چیزیں بھی بحری جہازوں میں بھر کر یورپ

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

بھیجی جارہی تھیں۔ دولت مندوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن عام ہندوستانی بہت مشکل میں تھے۔ ان ہی دنوں یو پی (اُتر پردیش) کے ایک چھوٹے سے قصبے پھندر پور کے ایک عام گھرانے میں فدا حسین اور زینب کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں باپ اس بچے کو دیکھ کر نہال ہو گئے تھے۔ اس گورے چٹے اور گول مٹول سے بچے نے ان کی زندگی میں ایک نیا رنگ بھر دیا تھا لیکن اس وقت وہ بے خبر تھا کہ ایک وقت آئے گا جب رنگ اس بچے کی زندگی بن جائیں گے اور یہ رنگوں سے اس طرح کھیلے گا جیسے کوئی ماں اپنے بچے سے کھیلتی ہے۔

17 ستمبر 1915ء کی تاریخ کو پیدا ہونے والے اس بچے کا نام مقبول فدا حسین رکھا گیا۔ کاتبِ تقدیر نے اس بچے کے لیے انوکھا فیصلہ کیا تھا، عورت اس کا مرکزی خیال تھی لیکن اسے زندگی کے ابتدائی دور میں عورت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ انسان کی زندگی میں آنے والی اوّلین ہستی اس کی ماں ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے مقبول ابھی صرف تین برس کا تھا کہ اس کی یہ اوّلین ہستی اس سے چھن گئی۔ زینب چند دن بیمار رہ کر زندگی ہار گئی اور مقبول کو بے ماں کا کر گئی۔ اس وقت وہ دکھ سے ناواقف تھا البتہ بہت دن تک اس بات پر روتا رہا کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہ چھوڑنے والی ماں اچانک اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی اور واپس کیوں نہیں آئی تھی؟

فدا حسین مرد تھے، کام کرتے تھے۔ انہیں اپنے گھر اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے پھر شادی کی اور اپنے خاندان کو لے کر اندور منتقل ہو گئے۔ اس وقت تک مقبول کسی قدر ہوش سنبھال چکا تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اب اس کی ماں اسے کبھی واپس نہیں ملے گی۔ فدا حسین نے اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی تھی۔ مروجہ تعلیم سے ہٹ کر مقبول کو کاغذ پر بولتی لکیریں بنانے سے دلچسپی تھی۔ فدا حسین مغربی تعلیم کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ بچوں کو اپنے ماضی اور اقدار سے متعلق بھی کوئی نہ کوئی علم سیکھنا چاہیے۔ اس لیے مقبول کے شوق کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اسے خطاطی سیکھنے کی طرف مائل کیا۔ تاکہ اس کا شوق صحیح سمت اختیار کر سکے۔ مسلمان عام طور سے مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے رغبت نہیں رکھتے تھے۔ البتہ خطاطی کو اسلامی آرٹ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے شرفا عام طور سے دینی اور دنیاوی تعلیم کے بعد اپنے بچوں کو کسی فن کی تعلیم دلواتے تھے تو وہ یہی فن خطاطی تھا۔ اس لیے فدا حسین نے بیٹے کو خطاطی سکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اندور میں خطاطی کے اساتذہ خاص نہیں تھے اس لیے مقبول ان سے رہنمائی حاصل نہ کر سکا اور اس نے اپنی محنت سے خط کوفی کی ہندسی اور ریاضیاتی اشکال پر عبور حاصل کر لیا۔ بعد میں بھی اس کی خطاطی سے دلچسپی برقرار رہی تھی اور والد کے اصرار پر اس نے اس شعبے میں کچھ کام بھی کیا لیکن اس کی اصل دلچسپی مصوری سے تھی۔ سادہ کاغذ پر صرف پنسل کی مدد سے وہ ایسے اسکیچ بناتا کہ اس کے استاد بھی حیران رہ جاتے تھے۔ اس میں مصوری کا قدرتی شعور تھا اور اس کی بنائے ہوئے اسکیچز میں تناسب ہوتا تھا۔ یعنی وہ انسانوں اور جانوروں کے اسکیچز بناتے ہوئے ان کے جسمانی تناسب کا خیال رکھتا تھا۔ یہ چیز عام طور سے مصوری کے طلبا کو آرٹ اسکول میں سکھائی جاتی ہے لیکن مقبول میں فطری طور پر موجود تھی۔

ابتدائی دور میں اس کی مصوری کی صلاحیت دبی سی رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ والد فدا حسین کا مذہبی ہونا تھا اور ظاہر ہے وہ تصویر کشی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اسکول کی تعلیم کی حد تک مقبول کا زیادہ زور خطاطی کی طرف رہا تھا اور اگر اس نے مصوری کی تھی تو یہ ڈھکی چھپی ہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ادب اور تعلیم ایک ہی معنوں میں لیے جاتے تھے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لیے ادب کے کسی نہ کسی شعبے سے منسلک ہونا ضروری تھا اگر کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا نہیں کرتا تھا تو وہ اپنے ماحول سے کٹ جاتا تھا۔ یہ ضرورت مقبول نے بھی محسوس کی اور اس نے شاعری کا انتخاب کیا۔ فدا حسین نے بھی اس معاملے میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ کیونکہ یو پی کے شرفا میں شاعری زندگی کا لازمی جزو تھی۔ وہاں کسی ان پڑھ کا شاعر ہونا اتنا انوکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جتنا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کا شاعر نہ ہونا۔

مقبول فدا حسین نے باپ کی حوصلہ افزائی پا کر شاعری کی طرف بھرپور توجہ دی تھی لیکن جلد اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا اصل میدان شاعری نہیں ہے بلکہ مصوری ہے۔ اندور سے اسکول کی تعلیم مکمل کر کے جب کالج میں داخلے کا وقت آیا تو خلافِ توقع مقبول نے شمالی ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں جنوبی ہند کو ترجیح دی۔ اس وقت ہر مسلم نوجوان کا خواب علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھنا ہوتا

www.paksociety.com

تھا۔ مگر مقبول جو پڑھنا چاہتا تھا اس کے اصل تعلیمی مراکز جنوب میں تھے۔ وہ کچھ آرزوئیں اور کچھ خواب لے کر بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی اس کے لیے اجنبی شہر تھا۔ لیکن برصغیر کے دو شہروں کا مزاج ایسا ہے کہ یہ اپنے پاس آنے والے ہر شخص کے لیے دامن کشادہ رکھتے ہیں اور ہر شخص یہاں یوں رچ بس جاتا ہے جیسے ہمیشہ سے یہیں کا باشندہ ہو۔ ان میں ایک بمبئی ہے اور دوسرا شہر کراچی ہے۔ بمبئی بھی زیادہ دن مقبول کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ یہاں اسے دوست اور ہم نشین مل گئے جن کی دلچسپیاں مشترک تھیں۔

بمبئی میں آرٹ سکھانے والے بے شمار تعلیمی ادارے تھے لیکن جو حیثیت سر جے جے اسکول آف آرٹ کو حاصل تھی وہ کسی اور تعلیمی ادارے کو حاصل نہیں تھی۔ اس اسکول میں فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مقبول نے اسکول آف آرٹ میں مصوری کے شعبے میں ایک سال کے لیے داخلہ لیا۔ اس وقت اس کالج میں معدودے چند مسلمان طلبا پڑھتے تھے۔ زیادہ تر پارسی اور ہندو طالب علم تھے۔ مسلمانوں میں مقبول فدا حسین کے علاوہ ایک اور طالب علم تھے جنہوں نے بعد میں اردو کو کمپیوٹر کی زبان بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ احمد جمیل مرزا تھے۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا اور اتفاق سے مقبول فدا حسین کی طرح انہوں نے خطاطی سے آغاز کیا تھا اور پھر گھر والوں کی مرضی کے بغیر فنون کی طرف آ گئے تھے۔ مگر دونوں میں کوئی رابطہ نہیں رہا اور نہ ہی کوئی قدر مشترک تھی سوائے اس کے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں میں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچے۔

جے جے اسکول آف آرٹ میں آ کر مقبول فدا حسین کو اندازہ ہوا کہ اس کا اصل میدان پینٹنگ ہے۔ خام رنگوں سے بے جان کاغذ کو جاندار تصویروں میں بدلنا اس کا مقصد حیات تھا۔ اس لیے اس نے اپنی ساری توجہ اس طرف مبذول کر دی۔ جب وہ برش سے کینوس پر اسٹروک لگاتا تو یہ رنگ کی لکیر نہیں رہتی تھی بلکہ کچھ بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ پینٹنگز بنانا مقبول فدا حسین کے لیے پیشہ نہیں بلکہ کام تھا۔ مگر جے جے اسکول آف آرٹ ایک ایسا ادارہ تھا جو معاشرے میں آرٹ کی پیشہ ورانہ کمی پوری کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہاں تعلیم کا نصاب کچھ اس طرح کا تھا کہ آدمی لازمی اسے پیشے کی حیثیت سے سیکھتا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں آرٹ کے حوالے سے انڈسٹری ترقی کر رہی تھی۔ جس میں فلمی صنعت نمایاں تھی۔ اسکول آف آرٹ سے فارغ ہونے والے تقریباً تمام ہی طلبا اور طالبات فلم انڈسٹری سے منسلک ہو رہے تھے اس لیے جب مقبول فدا حسین کے ہاتھ میں ڈگری آئی تو اس نے گزر اوقات کے لیے بمبئی کی فلمی صنعت کا رُخ کیا تھا۔ دورانِ تعلیم اس کا گزارا اس رقم سے ہوتا تھا جو فدا حسین اسے بھیجتے تھے یا کوئی چھوٹا موٹا کام مل جاتا تھا۔ یہ دور کفائت شعاری کا تھا اگر ایک وقت پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا تو اس کی کوشش ہوتی کہ ایک وقت فاقے سے گزار لے۔

کیونکہ مقبول نے مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے پہلا کام سنیما ہورڈنگز کا ملا تھا۔ اس زمانے میں بلکہ آنے والی نصف صدی تک سنیما ہورڈنگز ہاتھ سے ہی پینٹ کیے جاتے تھے اور یہ کام زیادہ تر نو آموز اور شوقیہ مصوروں سے لیا جاتا تھا لیکن چالیس کی دہائی میں برصغیر میں نو آموز اور شوقیہ مصور نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے یہ کام تربیت یافتہ مصوروں سے لیا گیا تھا۔ 1935ء میں بمبئی آنے کے بعد مقبول نے پہلی کمائی 1937ء میں حاصل کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو سال اس نے کتنی مشکل اور تنگ دستی میں گزارے ہوں گے۔ آغاز میں آمدنی اتنی نہیں تھی۔ اسے کام زیادہ نہیں ملتا تھا کیونکہ اسے کام لینے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ پیشہ ور کاموں میں فن کارانہ مزاج نہیں چلتا ہے لیکن اس میں شروع سے فن کارانہ نازک مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہترین مصور ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس زیادہ کام نہیں ہوتا تھا اور وہ جتنا کماتا تھا اس سے بہ مشکل ہی اس کا گزارا ہوتا تھا۔

چند سال بعد وہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کے کام کو کرنسی سے سراہا جانے لگا تب اسے اتنی فراغت ملی کہ وہ اپنے اصل فن کی طرف توجہ دے سکے۔ اپنے کام کے دوران اسے بعض لینڈ اسکیپ پر کام کرنے کا موقع ملا تھا اور یہ کام اسے اتنا بھایا کہ جب اس کے پاس کچھ رقم آتی تو سورت، بڑودا اور احمد آباد کے فطری علاقوں کی طرف نکل جاتا تھا اور وہاں لینڈ اسکیپ پینٹ کرتا تھا۔ جب رقم ختم ہو جاتی تو واپس آ کر سنیما ہورڈنگز پینٹ کرنا شروع کر دیتا۔ جلد اسے محسوس ہوا کہ وہ اگر سنیما ہورڈنگز ہی پینٹ کرتا رہا تو اسے اپنے اصل کام کے لیے وقت بہت کم ملے گا۔ اس شعبے میں مقابلہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور اسی لحاظ سے آمدنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے اس نے کوئی دوسرا کام تلاش کرنا شروع کر دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم جس عطیہ کو جانتے ہیں وہ 1877ء میں استنبول میں پیدا ہوئی۔ باپ بہت مال دار تاجر، سلطنتِ عثمانیہ اور یمن میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ 19 زبانیں روانی سے بولتے تھے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح پرورش کیا۔ تب ہی ان کی تینوں بیٹیوں زہرہ، نازلی اور عطیہ نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پردہ ترک کیا۔ ان کے خاندان کی لڑکیاں 1880ء سے انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ عطیہ فیضی کی نانی درۃ الولی ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں، ان کی والدہ امیر النساء بیگم نے ایک ناول ''نادر بیان'' لکھا جو پہلی جنگِ عظیم شروع ہونے سے چند مہینوں پہلے شائع ہوا۔ عطیہ وہ پہلی مسلمان لڑکی تھیں جسے سرکاری وظیفہ ملا کہ وہ لندن جا کر تعلیم حاصل کریں۔ 1906ء کا یہی وہ سفر تھا جس کا روزنامچہ عطیہ فیضی نے پابندی سے لکھا اور لاہور سے چھپنے والے ماہنامے ''تہذیب نسواں'' میں باقاعدگی سے شائع ہوا۔ 1921ء میں یہ روزنامچہ جسے سفرنامہ بھی کہا جا سکتا ہے ''زمانہ تحصیل'' کے عنوان سے مطبع مفید عام آگرہ نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ 2010ء میں ادارۂ یادگار غالب نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ اور عطیہ کی زندگی کا احوال آکسفورڈ پریس انڈیا نے چھاپا ہے۔ یہ کام بوسٹن یونیورسٹی میں فارسی کے سینئر لیکچرار ڈاکٹر سنیل شرما اور S.Lambert-Hurley نے مشترک طور پر کیا ہے۔ اس کتاب کا نام Atiay`s Joneney:A Muslim Woman from Clonial Bombay to Edwardian Briton.

عطیہ فیضی جنہیں علامہ شبلی نعمانی کی وجہ سے مشہور ہونے کا الزام دیا جاتا ہے ان کے بارے میں یہ لکھنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوتی کہ یہ عطیہ تھیں جنہوں نے بیگم بھوپال سے سفارش کر کے ''سیرۃ النبیؐ'' کی اشاعت کے لیے خطیر رقم کا اہتمام کیا تھا اور یہ بھی وہی تھیں جن کے بارے میں مولانا نے ان کی بہن ہر ہائی نس جنجیرہ نازلی بیگم کو ایک خط میں لکھا ''آپ اور عطیہ جیسی اردو لکھ لیتی ہیں کاش ہمارے صوبے بھر میں کوئی خاتون لکھ سکتی۔'' کبھی شبلی اپنے خطوں میں انہیں فارسی پڑھانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، کبھی انہیں پارسی اور ہندو خواتین کی طرح لیکچر دینے پر اکساتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ موسیقی سے عطیہ کی محبت دیکھ کر انہیں منشی نول کشور کی چھاپی ہوئی کتاب ''قانونِ موسیقی'' بھجواتے ہیں۔ کبھی اپنی کسی کتاب کو عطیہ کے نام معنون کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ موسیقی کے حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''گراموفون میں پیارے صاحب کے جو گانے بند ہیں، ان کو سنو، پلیٹوں پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے دادرا اور دوسرے راگ۔ ایک خط میں مولانا شبلی لکھتے ہیں ''میری لڑکی تمہارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے اس کا بھی یہی جواب دیا کہ وہ عورت کب ہیں۔''

شبلی، عطیہ سے بیس برس بڑے تھے لیکن اپنی ایک پرانی تصویر تیس برس کی عمر کی تھی، بھیجتے ہیں جس کے بعد عطیہ نے اپنے مشہور مصور شوہر رحمین سے ایک پورٹریٹ بنوائی۔ فرانس میں 1913ء میں ایک نمائش ہوئی جس میں یہ رکھی گئی۔ رحمین کی اس پورٹریٹ کو بعض فرانسیسی قدردان مہنگے داموں خریدنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے عطیہ راضی نہیں ہوئیں۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے جھوٹی سچی باتیں مشہور ہوئیں۔

اقتباس: عطیہ فیضی از زاہدہ حنا

مرسلہ: خالق بھٹی، اللہ آباد، رحیم یار خان

جس کام میں اسے سب سے اچھی آمدنی کی پیش کش ہوئی وہ ایک کھلونا ساز فیکٹری کی تھی۔ مقبول فدا حسین کو یہاں کھلونے ڈیزائن کرنے تھے اور ان کو بنانے والے آرٹ فریم بھی تیار کرنے تھے۔ اس کام سے اسے اتنی اچھی آمدنی ہونے لگی کہ اس نے شادی کا فیصلہ کیا۔ 1941ء میں فضیلہ نامی خاتون سے شادی کی اور بعد میں ان کے پانچ بچے بھی ہوئے۔ دو بیٹیاں رائیسہ اور عقیلا اور تین بیٹے مصطفیٰ جو ایک ہوٹل کا مالک ہے، شمشاد اور اولیس ہیں۔ یہ دونوں مصور ہیں۔ تقسیم کے ہنگامے شروع ہونے سے پہلے مقبول فدا حسین ایک پُرسکون خاندان کا مالک بن چکا تھا۔ اس کی فنکارانہ زندگی بھی آسودہ تھی۔ اس کا نام بن گیا تھا اور اب اس کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔

گزشتہ ایک دہائی میں اس نے آرٹ میں کام تو بہت کیا تھا لیکن اس کا یہ کام ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ 1947ء کا سال جہاں برصغیر میں بسنے والی قوموں کے لیے قیامت خیز تبدیلیاں لایا وہیں یہ سال مقبول فدا حسین کے لیے بھی تبدیلی لایا۔ اس برس بمبئی آرٹ سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہونے والی مصوری کی نمائش میں اس کی تصویر ''سنہرا سنسار'' نے پہلا انعام حاصل کیا اور پہلی بار مقبول فدا حسین ایم ایف حسین کے نام سے فنون کی دنیا میں جانا گیا اور پھر اسے حسین کہا جانے لگا۔ آنے والے دنوں میں یہ نام مقبولیت کی حدود کو مستقل پھیلاتا رہا۔ 1946ء میں بمبئی کے ایک آرٹسٹ فرانسس نیوٹن سوزا نے اسے بمبئی پروگریسو آرٹسٹ گروپ میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ اس گروپ کا مقصد انڈیا کے قدیم مصوری کے آرٹ کو دورِ حاضر سے ہم آہنگ کرنا تھا۔

اس سوسائٹی کے ساتھ کام کرتے ہوئے حسین کے فن پر دو روسی فنکاروں ایمل نولڈے اور اوسکر کوشکا نے گہرا اثر ڈالا۔ ان کے اثر کے ساتھ حسین نے کئی شاہ کار پینٹنگز بنائیں جن میں ''رے بیٹوین دی اسپائڈر اینڈ دی لیمب'' شامل ہے۔ ان تصویروں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد برصغیر میں آرٹ کے قدردانوں کو احساس ہوا کہ ان کے درمیان ایک غیر معمولی فنکار موجود ہے اور اس کا فن آنے والے دنوں میں مزید بلندیوں کی طرف جائے گا۔ حسین اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ اسے اردگرد کے سیاسی ماحول کا علم ہی نہیں تھا اور جتنا علم تھا اس کی پروا نہیں تھی۔ بائیں بازو کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ سیاست کو صرف انگریزوں کا کھیل سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ انگریز تھے جو اس خطے میں قوموں کی تقسیم کے ذمے دار تھے۔ وہ دوسرے بائیں بازو والوں کی طرح اس تقسیم کے حق میں نہیں تھا۔ مگر وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

برصغیر ٹوٹ کر کئی ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان انڈیا سے الگ ہو گیا اور نوّے فیصد سے بھی زیادہ مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالا تھا لیکن دس فیصد اس کے مخالف بھی تھے۔ یہ مخالف پاکستان ہجرت کر کے نہیں گئے اور انہوں نے انڈیا میں رہنے کو ترجیح دی۔ حسین بھی انڈیا میں رہا اور اس نے کبھی پاکستان جانے کا نہیں سوچا حالانکہ بعد میں اس کے بہت سارے دوست احباب اور جاننے والے پاکستان چلے گئے تھے۔ وہ لوگ بھی چلے گئے جنہوں نے دل و جان سے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مگر حسین انڈیا کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ مرتے دم تک انڈیا میں ہی رہے گا لیکن افسوس اس کا یہ فیصلہ بعد میں بدل گیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اپنی چند مشہور پینٹنگز منظرِ عام پر آنے کے بعد حسین دہلی کے دورے پر گیا اور وہاں اس نے قدیم انڈین آرٹ کا مطالعہ کیا جن میں متھرا کے مجسمے اور منی پینٹنگز نمایاں تھیں۔ یہاں سے اس نے قدیم انڈین آرٹ کو جدید مغربی آرٹ سے ملانے کا کام شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر قسم کے آرٹ کی اصل ایک ہی تھی۔ پانچ فنون لطیفہ اپنی ظاہری صورت کے فرق کے ساتھ دنیا بھر میں ایک ہی وقت میں اور ایک ہی انداز میں رواج پائے تھے۔ قدیم آرٹ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مذہب سے جڑا ہوا تھا۔ خاص طور سے غیر الہامی مذاہب میں آرٹ کو بہت زیادہ فروغ ملا اور مجسمہ تراشی سے لے کر پینٹنگز تک کا رواج ان ہی مذاہب میں پایا گیا جن کی اصل بت پرستی اور مظاہر پرستی تھی۔

ایشیا میں بھارت، چین اور قدیم ایران آرٹ کے مراکز رہے۔ جبکہ مغرب میں یونان اور روم آرٹ کے مراکز تھے۔ ان کے علاوہ افریقا اور شمالی و جنوبی امریکا میں بھی مقامی قسم کے آرٹ فروغ پائے اور ان سب کا تعلق مذہب سے تھا۔ اس سے بھی پہلے جب انسان نے متمدن ہونا شروع کیا تو اس وقت آرٹ کو ذریعہ اظہار بنایا گیا تھا۔ جب فنونِ لطیفہ نے مزید ترقی کی ان میں لطافت اور نزاکت پیدا ہوئی تو اسے مذہب کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ الہامی مذاہب میں آرٹ کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں تھی لیکن یہاں مخصوص قیود و حدود کی وجہ سے آرٹ کی نئی اشکال سامنے آئیں جیسے مصوری اور مجسمہ سازی کے بجائے کیلی گرافی اور آرائشی اشیا کا فن سامنے آیا۔

قدیم سادہ عیسائیت جب روم میں داخل ہوئی تو اس نے قدیم دیوی دیوتاؤں کی بہت ساری چیزوں کو اپنا لیا جن میں سرِفہرست فنونِ لطیفہ تھے۔ وہ روایات آج بھی عیسائیت کا ایک حصہ ہیں اگرچہ ابتدائی عیسائیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ میں بہت جلد آرٹ مذہب سے الگ ہو کر ایک علیحدہ حیثیت اختیار کر گیا۔ آرٹ کے

www.paksociety.com

اسکول وجود میں آگئے اور ان کے زیرِ اثر آرٹ کی نئی اقسام پر تجربات کیے جانے لگے۔ دہلی میں اپنے قیام کے دوران حسین نے آرٹ کی قدیم اور جدید تاریخ کو پڑھا اور یہاں سے اس کے فن میں ایک نیا نکھار آگیا وہ فن کاروں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا جس نے سب سے پہلے اپنے فن میں مشرق اور مغرب کو یکجا کیا۔ مگر یہ یکجائی دونوں طرف سے تھی عام طور سے مشرق کے فنکار اپنے فن میں مغرب کی آمیزش اس طرح کرتے ہیں کہ بہ ظاہر وہ مغربی طرز کے پیروکار لگنے لگتے ہیں مگر حسین کا رنگ ان سب سے جدا تھا۔ اس نے اپنا جداگانہ انداز برقرار رکھا اور اپنے فن میں مشرقی انداز کو نمایاں رکھا۔

آزادی کے بعد حسین کا نام تیزی سے اُبھرا اور 1950ء تک وہ اپنی متعدد تصویری نمائشوں سے ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ شروع میں اسے مالی لحاظ سے اتنا فائدہ نہیں ہوا تھا لیکن چند سالوں میں وہ انڈیا کا سب سے زیادہ مالدار مصور بن گیا۔ اس کی تصویر ایک لاکھ روپے تک میں فروخت ہونے لگی تھی۔ مگر اس وقت حسین کو مالی منفعت کی اتنی پروا نہیں تھی۔ جب وہ روزگار کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو اس کے پاس دو ہی لباس ہوتے تھے جنہیں وہ بدل بدل کر پہنتا تھا اور اکثر اوقات چپل یا جوتی نہ ہونے کی وجہ سے اسے ننگے پاؤں گھومنا پڑتا تھا۔ دولت آنے کے بعد بھی اس کی قطع وضع اسی طرح برقرار رہی تھی۔ وہ سادہ لباس اور ننگے پاؤں ہر جگہ بے تکلفی سے گھومتا تھا۔ اس نے کبھی کوئی ذاتی اسٹوڈیو نہیں بنایا تھا۔ جہاں اس کا موڈ ہوتا وہ پینٹ کرنے لگتا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ وہ جن ہوٹلوں میں رکا تھا ان کی دیواروں اور فرش کو مصوری سے سجا دیا۔ یہ اور بات تھی کہ فن ناآشنا ہوٹل انتظامیہ نے اس سے نقصان کا ہرجانہ وصول کر لیا اور اس کی مصوری کے بہت سارے شاہ کار اسی طرح ایک دو دن کے لیے وجود میں آ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ بعد میں وہ لوگ بہت پچھتائے ہوں گے جنہوں نے ان فن پاروں کو ختم کر دیا تھا۔

حسین کے پینٹ کرنے کا انداز نرالا تھا۔ اگر اسے کینوس میسر نہ آتا اور اس کے پاس رنگ نہیں ہوتے تھے تو وہ سادہ کلر مار کرلے کر کسی بھی کاغذ، چمڑے کے ٹکڑے یا محض دیوار پر مصوری شروع کر دیتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اس نے ایک دن میں درجن سے زیادہ فن پارے بنائے اور آج ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کا صرف وہی کام محفوظ ہے جو اس نے باقاعدہ کینوس پر کیا اور یہ بھی اتنا ہے کہ چار آرٹ میوزیم صرف اس کے فن پاروں پر مشتمل ہیں جو حسین نے خود قائم کیے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے زندگی میں ساٹھ ہزار تصویریں بنائی ہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ مبالغہ آمیز لگتا ہے۔ لیکن اگر اس کی پوسٹ کارڈ سائز منی ایچر بھی شامل کی جائیں تو یہ دعویٰ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔

حسین کی مصوری کا دورانیہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک محیط رہا۔ بلکہ یہ سفر کوئی ستر برس تک جاری رہا۔ اس نے ستر برس پہلے جے جے آرٹ اسکول میں داخلہ لیا تھا اور مصوری کی صلاحیتیں یقیناً اس وقت بھی اس میں موجود تھیں۔ جس طرح بعض لکھنے والے زود نویس ہوتے ہیں اسی طرح بعض مصور بھی بہت زیادہ کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ساری بات آئیڈیاز کی ہوتی ہے اور حسین کے پاس آئیڈیاز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ فن نام ہی آئیڈیے کو سجا سنوار کر پیش کرنے کا ہے۔ آئیڈیاز اس وقت آتے ہیں جب فنکار اپنے شعبے سے ہٹ کر دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ دوسرے مصوروں کے برعکس حسین نے نہ صرف فن کے دوسرے شعبوں میں طبع آزمائی کی تھی جیسے رقص اور فلم سازی، وہ شاعر بھی بہت اچھا تھا اور برصغیر کی شاعری پر اس کی گہری نظر تھی۔ مصوری کی تاریخ کے ساتھ اس نے ہندو پاک کی تاریخ بھی پڑھ رکھی تھی۔

ساٹھ کی دہائی کے آغاز میں حسین ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا اور عوام میں بھی اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ 1952ء میں بمبئی میں اس نے اپنے کام کی پہلی مکمل یکتا نمائش کی۔ اس نمائش میں صرف حسین کی پینٹنگز تھیں اور اس نمائش کو غیر معمولی کامیابی ملی۔ اس کی کئی تصاویر ریکارڈ قیمت میں فروخت ہوئیں اور پہلی بار اس نے خود کو دولت مند محسوس کیا۔ مگر یہ ساری رقم خرچ ہو گئی اس کا ایک روپیہ بھی کسی بینک اکاؤنٹ میں نہیں گیا تھا۔ اس نے ساری عمر پیسا کسی بینک میں نہیں رکھا اس کے پاس رقم آ جاتی اور مختلف مدات میں بٹ کر خرچ ہو جاتی تھی۔ دو برس بعد اس نے کلکتہ میں اپنے فن پاروں کی نمائش کی اور اس بار اسے صرف مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ دہلی کی للت کالا اکیڈمی کی جانب سے اسے اعزازی ممبر شپ بھی دی گئی یہ اعزاز بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوا ہے۔ اسے سال کے غیر معمولی مصور کا ایوارڈ ملا۔

ایم ایف حسین انڈیا کی سطح پر جانا پہچانا نام بن گیا تھا لیکن ابھی بین الاقوامی سطح پر اس کی شناخت ہونا باقی تھی۔ ساٹھ کی دہائی کے آخر میں لندن رائل اکیڈمی آف آرٹس نے انڈین آرٹ کے زیرِ اہتمام ایک نمائش کی جس میں حسین کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ اس کے فن نے مغربی مصوروں اور نقادوں کو چونکا دیا تھا۔ ابھی تک وہ انڈین آرٹسٹوں کی جانب سے مخصوص انڈین آرٹ ہی دیکھتے آئے تھے، یہ پہلا موقع تھا جب کسی انڈین پینٹر نے مغربی تحریکوں کا اثر اپنے فن پاروں میں جدید اور قدیم کی آمیزش کے ساتھ دکھایا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اکیلے اتنی پذیرائی ملی جتنی ملا کر باقی تمام آرٹسٹوں کو بھی نہیں ملی تھی جو اس ایگزبیشن میں شامل تھے۔ حسین اس پذیرائی سے بے حد خوش تھا۔ لندن دنیا میں آرٹ کا ایک بڑا مرکز ہے اور یہاں کسی آرٹسٹ کو سراہے جانے کا مطلب ہے کہ وہ واقعی فنکار ہے۔

آنے والی تین دہائیوں میں لگاتار حسین کو مغرب میں بے پناہ سراہا گیا۔ لندن، پیرس، فرینکفرٹ، ماسکو، جینوا اور روم سمیت فنون کے تمام ہی مراکز میں اس کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ پیرس کی ایک نمائش میں اس کی تصویر آسمان اور انسان ایک لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے کسی مصور کی زندگی میں اس کی تصویر ایک لاکھ ڈالرز میں فروخت ہوئی ہو۔ اس وقت یہ خبر انڈیا میں شہ سرخیوں میں شائع ہوئی تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اب اس سے زیادہ قیمت کسی تصویر کی نہیں ملے گی۔ مگر آنے والے وقتوں میں حسین نے لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ نوّے کی دہائی میں وہ واحد زندہ مصور تھا جس کی ایک تصویر دو ملین ڈالرز میں فروخت ہوئی تھی اور یہ صرف ایک کینوس پر بنائی گئی تصویر تھی۔ مغرب میں بھی چند ہی مصوروں کو یہ اعزاز حاصل ہے شاید اسی لیے اسے انڈیا کا پکاسو قرار دیا گیا۔

ابتدا میں روایتی انداز میں پینٹ کرنے والے حسین نے بعد میں کئی تجربات کیے۔ اس نے دھات کے کینوس پر پینٹ کیا۔ دیواروں پر میورل بنائے اور شیشے پر اپنی مصوری کے جوہر دکھائے۔ مغرب کے سفر کے دوران ایم ایف حسین نے وہاں کیمیو دیکھے تھے۔ یہ پتھر کے چھوٹے سنگتراشی کے نمونے تھے جن پر رنگوں کی مدد سے نقوش اُبھارے گئے تھے۔ انڈیا میں اجنتا کے غاروں میں دیواروں پر بنائے گئے مصوری کے نمونے ساری دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے نیا خیال آیا اور اس نے واپسی پر پتھر کی قد آدم سلوں پر مصوری کا تجربہ کیا۔ مگر اس کی توقع کے خلاف ایک تو یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا۔ قد آدم اور کئی فٹ لمبے چوڑے پتھر کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ اسے اپنی جگہ سے ہلانا بھی دشوار تھا پھر پتھر پر رنگ بھی اچھے طریقے سے نہیں جمتے تھے اور کچھ عرصے بعد یہ اُکھڑنے لگتے۔ بعد میں اس نے ہموار پالش کیے ہوئے پتھر پر مصوری کے تجربات کیے یہ نسبتاً زیادہ کامیاب رہے لیکن یہ صرف آرٹ کا تجربہ تھے ان سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی جا سکتی تھی جبکہ لاگت بھی بہت زیادہ آ رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر پتھر پر بنائی گئی تصویر پائیدار نہیں تھی۔ ماربل اور بسالٹ پر کیے گئے تجربات کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی تھی۔

عجیب بات ہے کہ کاغذ سب سے کمزور چیز ہے اور یہ ساخت کے لحاظ سے بایولوجیکل ہے یعنی زندہ مادے سے بنتا ہے اس لیے بہت تیزی سے فنا پذیر ہے لیکن مصوری کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ یہی استعمال ہوتا ہے اور یہ بہت پائیدار بھی ثابت ہوتا ہے۔ دیواروں پر بنائے گئے میورل پانچ صدی سے زیادہ وقت نہیں گزار سکتے ہیں لیکن کاغذ پر بنائے گئے مصوری کے نمونے ہزار سال گزرنے کے بعد بھی صحیح سلامت ہیں اور ان کے رنگوں کی آب و تاب برقرار ہے۔ تقریباً یہی معاملہ کپڑے کے ساتھ ہے۔ پُرانے زمانے میں تقریباً تمام ہی اقسام کے کپڑے حیاتیاتی مادوں سے بنائے جاتے تھے جیسے کپاس، اون، ریشم اور لینن وغیرہ۔ اس میں ریشم مصوری کے لیے نہایت موزوں تھا اس پر رنگ بہت آسانی سے آجاتا ہے اور بہت پائیدار ثابت ہوتا ہے۔ چین میں ریشم کے کینوس مصوری کے نمونے دو ہزار سال سے زیادہ پُرانے ہیں اور ان کے رنگوں کی تابنا کی آج بھی برقرار ہے۔ حسین نے کپڑے پر بھی رنگ بکھیرے۔ اس کے بنائے اس طرح کی کئی سو پینٹنگز خاصے مہنگے داموں شائقین نے خریدی ہیں۔

☆☆☆

عام مصوروں کے برعکس حسین نے فن کے کئی شعبوں میں طبع آزمائی کی جیسے رقص اور مجسمہ سازی۔ پھر اس نے ان آرٹ کا مجموعہ یعنی فلم کی طرف بھی توجہ دی۔ انڈیا میں فلم ایک کریز ہے اور کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والی مشہور شخصیت کا کسی نہ کسی طور فلم سے تعلق بن ہی جاتا ہے چاہے اسپورٹس سے ہو یا سیاست سے۔ حسین نے تو کیریئر ہی فلم

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

سے شروع کیا تھا جب اس نے سینما ہورڈنگز بنانا شروع کیے۔ بعد میں وہ دوسری طرف نکل گیا تھا لیکن فلم سے اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے باقاعدہ فلم سازی کی تکنیک سیکھی۔ فلم اسٹوڈیوز میں اس کا آنا جانا تھا۔ پروڈیوسرز اور فلمی ہدایت کاروں سے اس کے تعلقات تھے۔ اس نے ان سے فلم سازی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔

1967ء میں اس نے اپنی پہلی فلم بنائی جس کا نام تھا۔ ''تھرو دی آئز آف اے پینٹر'' اس فلم نے برلن میں ہونے والے فلم فیسٹول میں گولڈن بیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ اسے میلے کی بہترین مختصر فلم قرار دیا گیا تھا۔ اس کامیابی کے بعد ایم ایف حسین کی صلاحیتوں کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ اس کے بعد اس نے متعدد مختصر فلمیں بنائیں۔ 2000ء میں حسین نے پہلی مکمل فلم بنائی۔ گجا گامنی نام کی اس فلم کا مرکزی موضوع عورت تھی اور اس کا مرکزی کردار مادھوری نے ادا کیا۔ مادھوری حسین کی فیورٹ عورت تھی۔ وہ اس پر تصویروں کی ایک پوری سیریز بنا چکا تھا۔ مزے کی بات ہے کہ وہ اپنی دوسری تصویروں پر ایم ایف حسین کے سائن کرتا تھا لیکن مادھوری کی سیریز پر اس نے صرف فدا لکھا ہے۔ شاید وہ بتانا چاہتا ہو کہ میں اس پر فدا ہو چکا ہوں۔

گجا گامنی میں حسین نے مادھوری کو عورتوں کے مختلف سمبل بنا کر پیش کیا، جیسے کالی داس کی شکنتلا، مونا لیزا، ایک دہقانی عورت اور رقاصہ کے کرداروں میں پیش کیا۔ یہ فلم اصل میں مادھوری ڈکشٹ کے فن اور حسن کو خراجِ تحسین تھی۔ مادھوری کی ایک فلم ''محبت'' میں ایم ایف حسین ایک سین میں آیا جب وہ مادھوری کی تصویر بنا رہا تھا اور یہ منظر حقیقی تھا جب وہ مادھوری کی تصویروں کی سیریز بنا رہا تھا۔ کئی سال بعد اس نے ایک اور فلم ''اے ٹیلز آف تھری سٹیز'' بنائی اس میں تبو نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان فلموں کو ناقدین نے بہت سراہا اور کئی فلمی میلوں میں اس کی بنائی ہوئی فلموں نے ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

ایم ایف حسین فلمیں اپنے شوق کی خاطر بناتا تھا اس نے ان سے کبھی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ تمام ہی فلموں پر اس نے سو فیصد سرمایہ خود لگایا اور اسے کبھی اس کا نفع حاصل نہ ہو سکا آرٹ فلموں سے ویسے بھی کسی فلم ساز نے نفع نہیں کمایا، یہ سراسر نقصان کا سودا ہوتا ہے۔ اسے نفع کی پروا بھی نہیں تھی۔ فلم بنانا اس کے نزدیک کاروبار نہیں بلکہ شوق تھا اور آخر تک اس کا یہ شوق برقرار رہا۔ فلموں کے علاوہ اس نے اسٹیج کے ذریعے اپنے اندر کے فنکار کو پیش کیا۔ ان ڈراموں کا موضوع بھی مصوری رہی تھی۔ مصوری ایم ایف حسین کی اصل تھی اور اس کے علاوہ وہ فنون کے جن شعبوں میں طبع آزمائی کرتا تھا وہاں بھی اس کا مقصد اپنے فن کو اُجاگر کرنا ہوتا تھا۔ فلم ہو یا اسٹیج مرکزی موضوع ہمیشہ مصوری ہی رہی۔

آزادی تک حسین ملک کی سطح پر جانا پہنچانا نام بن گیا تھا۔ آغاز میں وہ فرانسس نیوٹن سوزا کے پروگریسیو آرٹسٹ گروپ کے ساتھ رہا بعد میں اس گروپ نے بنگال اسکول آف آرٹ قائم کیا اور مقامی فنون کو بین الاقوامی فنون کے تابع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں سے حسین اور گروپ میں اختلاف ہوا۔ اس کے خیال میں مقامی فن مصوری اور دوسرے فنون کسی طرح بین الاقوامی معیار سے کم نہیں ہیں اس لیے انہیں کسی کے تابع نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوسروں کے ساتھ اشتراک کرتے ہوئے اپنی راہ خود الگ بنانی چاہیے۔ جیسا کہ خود حسین نے کیا۔ اس اختلاف کے بعد ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ دوسرے پروگریسیو گروپ مقامی روایات اور معاشرے کو نظر انداز کرتے ہوئے آرٹ کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ آرٹ کو محدود کرنے کا مخالف تھا۔ حسین اس بات کا مخالف تھا کہ آرٹ کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے تخلیق کیا جائے لیکن اسے فروخت اور نمائش کے لیے مخالف کیمپ میں پیش کیا جائے۔ یہ تو خود اپنے نظریے کی نفی کرنے والی بات تھی۔

اپنی راہ الگ کرنے سے یہ ہوا کہ ایم ایف حسین خود ایک اسکول آف آرٹ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ نوجوان فنکار جو خود پر مخصوص چھاپ نہیں لگوانا چاہتے تھے اس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس نے انڈیا میں آرٹسٹوں کی ایک پوری کھیپ کو متاثر کیا ساتھ ہی اس نے بین الاقوامی سطح پر بھی خود کو منوا لیا۔ اس نے جدید بین الاقوامی آرٹ کے اثرات قبول کیے مگر انہیں مقامی آرٹ پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنی مصوری میں مقامی چھاپ کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام دوسرے انڈین مصوروں سے الگ حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اپنی راہ بنائی اور ساری دنیا اس کے پیچھے چل پڑی۔

ساٹھ کی دہائی تک ایم ایف حسین مغرب میں ایک جانا پہچانا نام بن گیا تھا۔ نقاد اس کے فن کو سراہا رہے تھے اور آرٹ گیلریاں اس کے فن پاروں کو منہ مانگی قیمت پر لینے کو تیار رہتی تھیں۔ اس پر اعزازات کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ 1955ء میں اسے بھارتی حکومت کی جانب سے پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس وقت تک اسے آرٹ سے تعلق رکھنے والے ایک درجن قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ مل چکے تھے۔ 1971ء میں اسے پبلو پکاسو کے ساتھ ساؤ پاولو میں مشترکہ طور پر مدعو کیا گیا اور ساؤ پاولو بینلے سے نوازا گیا۔ 1973ء میں اسے پدم بھوشن اور 1991ء میں پدماوی بھوشن کے سرکاری اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ واحد فنکار ہے جسے بھارتی حکومت نے اپنے تینوں اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا۔

پچھتر برس کی عمر میں عام طور سے لوگ ریٹائر ہونے اور اپنی کمائی دولت سے لطف اندوز ہونے کا سوچتے ہیں۔ گزشتہ پچپن برس میں حسین بے شمار کام کر چکا تھا اور اب وہ کچھ نہ کرتا تب بھی اس کا نام ہمیشہ کے لیے فن کی دنیا میں کندہ ہو چکا تھا۔ لیکن بے شمار اعزازات پانے والے اور بے شمار دولت کمانے والے اس فنکار میں ابھی فن کی بھوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ دولت اور شہرت اس کے لیے ثانوی چیز بن گئی تھی۔ اصل اہمیت کام کی تھی۔ کام اور مزید کام کے آئیڈیاز کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے بچے بڑے ہو گئے تھے اور خود بچوں والے بن چکے تھے۔ ان کے اپنے خاندان تھے۔ بیوی دنیا سے گزر گئی تھی اور ایم ایف حسین اب اکیلا تھا۔ اکیلے آدمی کے پاس کرنے کے لیے سوائے اپنے کام کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے اس لیے حسین کام میں لگ گیا تھا۔

مصور کی حیثیت سے اس کا حسین خواتین اور شوبزنس سے تعلق رکھنے والی عورتوں سے تعلق رہا تھا لیکن یہ تعلق صرف اپنے کام کی حد تک تھا۔ اپنے طویل کیریئر میں کبھی اس کا کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا تھا مگر جب اس نے مادھوری کو دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب صنفِ مخالف کی کشش دم توڑ دیتی ہے مگر اس وقت مادھوری اسے اپسرا لگ رہی تھی۔ وہ اس کے خدوخال، نشیب و فراز کی تعریف میں رطب اللسان نظر آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اور مادھوری کے بارے میں اخبارات خبریں دینے لگے۔ بعض محرم راز سمجھے جانے والے صحافیوں نے تو یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ عنقریب بالی ووڈ کی جان مادھوری ڈکشت اور ایم ایف حسین ایک ہو جائیں گے۔ حالانکہ دونوں میں ظاہری فرق زمین آسمان کا تھا۔ صرف عمر کا فرق ہی نصف صدی کے برابر تھا۔ جب ان افواہوں کے بارے میں حسین سے پوچھا گیا تو اس کا جواب یہ تھا۔

''مادھوری میرے نزدیک ایک مکمل عورت ہے اور میں اسی حیثیت سے اسے پسند کرتا ہوں۔''

ایک صحافی نے پوچھا۔ ''اگر وہ آپ سے شادی کرنا چاہے تو....؟''

اس سوال کا جواب حسین نے ایک زوردار قہقہے کی صورت میں دیا تھا۔ البتہ مادھوری کے بارے میں وہ اپنے بیان پر قائم رہا تھا۔ دوسری طرف مادھوری اس قسم کے کسی تعلق کی تردید کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ایم ایف حسین کے فن کی پرستار ہے اور بس۔ مگر حسین کی طرف سے بس نہیں ہوا تھا۔ مادھوری کے لیے اس کا والہانہ پن بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی سنگل کینوس تصویر دو ملین ڈالرز میں بک رہی تھی۔ مگر اس نے کہا کہ اگر مادھوری چاہے تو وہ اسے معاوضہ ادا کرنے کو بھی تیار ہے۔ حسین کی اس پیش کش کے بعد مادھوری اس کی پینٹنگز کے لیے ماڈل بننے پر تیار ہو گئی۔ حالانکہ اس وقت وہ ٹاپ کلاس ہیروئن تھی اور فلم انڈسٹری پر راج کر رہی تھی۔ کیا مادھوری نے منہ مانگی رقم کے عوض حسین کے لیے ماڈل بننا قبول کر لیا تھا؟

ماڈل بننا آسان کام نہیں ہوتا ہے، ماڈل کو روزانہ گھنٹوں اور پھر ہفتوں یا مہینوں کے حساب سے مصور کے سامنے ایک ہی پوز میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ مادھوری اس وقت سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن چکی تھی اور اس کا ایک ایک گھنٹا لاکھوں کی مالیت رکھتا تھا۔ اگر معاوضے والی بات درست ہے تو حسین نے اسے یقیناً بہت بڑی رقم ادا کی ہوگی لیکن دونوں کی جانب سے کسی معاوضے کی تردید کی گئی۔ مادھوری کا بیان ہے اس نے تصویروں کے بدلے ایک روپیہ معاوضہ نہیں لیا اور حسین کا کہنا تھا کہ یہ تصاویر اس نے صرف اپنے لیے بنائی ہیں اور یہ کبھی برائے فروخت نہیں ہوں گی۔ بعد میں اس نے مادھوری کے پرستاروں کو منہ مانگی قیمت کے عوض بھی یہ تصاویر فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔

جہاں تک حسین کا معاملہ ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ مادھوری کو پسند کرنے لگا تھا۔ اپنے عروج کے دنوں میں وہ سحر انگیز حسن کی مالک تھی اور کسی کو بھی اپنا دیوانہ بنانے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ چہرے کے دلکش ترین نقوش اور تراشے ہوئے جسم کی مالک مادھوری ناز و ادا میں بھی کم

www.paksociety.com

نہیں تھی اور بالی ووڈ کی دوسری ہیروئنیں اس معاملے میں اس کا پاسنگ بھی نہیں تھیں۔ حسین اگرچہ عمر کے اس دور سے گزر چکا تھا جو عشق و عاشقی کے لیے موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ مگر فنکار اس معاملے میں وقت کی قیود سے آزاد سمجھے جاتے ہیں۔ شوبزنس کی دنیا میں بے جوڑ شادیوں کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے۔ ممکن ہے مادھوری بالی ووڈ کی نمبر ون ہیروئن کے بجائے کوئی عام عورت ہوتی تو اس کا امکان ہے حسین اس سے شادی کرلیتا۔

ایم ایف حسین کو عمر کے پچھتر برس میں وہ عورت نہیں ملی جو اس کا آئیڈیل تھی اور جب ملی تو وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں تھا اس کے باوجود وہ خود کو اس کے عشق سے نہیں روک سکا تھا۔ مادھوری کی فلم انڈسٹری میں آمد اسی کی دہائی کے آخر میں ہوئی تھی لیکن اسے خود کو منوانے میں چند سال کا عرصہ لگا۔ جب مقبول فدا حسین اس پر فدا ہوا تو وہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ایم ایف حسین کا عشق تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مادھوری نے اس میں کیا دیکھا جو اس کے لیے ماڈل بننے کو تیار ہوگئی اور یہی نہیں بلکہ وہ اس کی فلم میں بھی کام کرنے کو تیار ہوگئی جس کے بارے میں اسے اچھی طرح علم تھا کہ یہ کوئی کمرشل فلم نہیں ہے جس سے اسے معاوضہ ملے اور اس کی ساکھ میں اضافہ ہو۔ یہ فلم چند دن سنیماؤں پر لگ کر اُتر جائے گی اور پھر لوگ اسے بھول جائیں گے۔ کیا وہ بھی اسے پسند کرنے لگی تھی؟ اگرچہ بہ ظاہر ایسا بہت مشکل لگتا ہے کہ مادھوری جیسی جوان اور حسین اداکارہ جسے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی وہ ایک ایسے فنکار سے محبت کرنے لگے۔ جو عمر میں ہی اس سے تین گنا بڑا نہیں تھا بلکہ شادی شدہ اور بچوں کے بھی بچوں والا تھا۔ صورت و شکل کا تو تقابل ممکن ہی نہیں ہے۔ مگر محبت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ عورت بعض اوقات بادشاہ سے بھی محبت نہیں کرتی ہے اور اسے فقیر سے محبت ہو جاتی ہے۔ شاید مادھوری بھی حسین سے ایسی ہی محبت کرنے لگی تھی۔ اس محبت میں جسمانی طلب نہیں تھی اور شاید دونوں طرف سے نہیں تھی۔

میڈیا سے تعلق رکھنے والے حلقے الزام لگاتے ہیں کہ مادھوری نے ایسا صرف پیسے کی خاطر کیا اور ایک بوڑھے شخص کا نام اپنے ساتھ برداشت کرلیا۔ وہ اس کے لیے ماڈل بنی اور اس کی فلم میں کام کیا صرف پیسے کی خاطر، ورنہ اس کا حسین سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ صرف اس کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اس کے لیے وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ تصویروں کی سیریز مکمل ہو جانے کے بعد مادھوری نے اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں بات کی۔

مگر تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ مادھوری نے یہ کام رقم کی خاطر نہیں بلکہ اپنا نام ہمیشہ زندہ رکھنے کی خاطر کیا...... بےشک فلموں نے اسے پورے انڈیا اور کسی حد تک دنیا میں بھی مشہور کیا۔ مگر فلمی اداکار چاہے وہ جتنا مشہور کیوں نہ ہو اِدھر فلموں سے آؤٹ ہوتا ہے اور اُدھر چند سال میں لوگ اسے بھولنے لگتے ہیں۔ کم سے کم وہ ذہنوں سے اُتر جاتا ہے۔ مادھوری کی مثال سامنے ہے وہ آج جانی جاتی ہے لیکن مشہور نہیں رہی ہے۔ اس کی جگہ دوسری ہیروئنیں آگئی ہیں اور اب وہ مشہور ہیں۔ لیکن حسین کی تصویروں کی صورت میں وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ آج سے دوسو سال بعد جب کوئی نہیں جانے گا کہ مادھوری نام کی کوئی فلمی ہیروئن بھی تھی تب حسین کی تصاویر لوگ دیکھیں گے اور جانیں گے کہ مادھوری نام کی ایک حسین عورت تھی جس سے ایک فنکار نے پیار کیا اور اسے بہت محبت سے اپنے کینوس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ تب اس کے ساتھ مادھوری کا نام بھی زندہ رہے گا۔ یہ کہنا اتنا ہی مشکل ہے کہ مادھوری کے دل میں ایم ایف حسین کے لیے کیا جذبات تھے جتنا یہ کہنا کہ اس نے تصویروں اور فلم میں کام کرنے کے بدلے حسین سے کچھ لیا یا نہیں لیا۔

کہتے ہیں ہر مرد کی زندگی میں ایک عشق ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو زندگی میں ایک بار کسی عورت سے محبت ہوتی ہے۔ چاہے وہ عورت اسے ملے یا نہ ملے چاہے اسے دنیا جہان کی چیزیں اور رشتے مل جائیں یا نہ ملیں لیکن اگر اسے کسی سے عشق نہیں ہوا تو وہ اپنی اس کمی کو مرتے دم تک محسوس کرتا ہے۔.. حسین کو قدرت نے ہر اس چیز سے نوازا جس کی ایک انسان خواہش کرسکتا ہے۔ رشتے، دولت اور بے پناہ شہرت اس کے حصے میں آئی اس نے جو چاہا وہ پالیا۔ اپنی ہر خواہش پوری کی۔ ننگے پاؤں گھومنے والے حسین کو انوکھا شوق ہے اس کے پاس دنیا کی نادرو نایاب اسپورٹس کاروں کا منفرد کلکشن ہے۔ ایسا کلکشن دنیا میں شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ ان میں سے بہت ساری کاریں اسے تحفے میں ملی ہیں لیکن بہت ساری کاریں اس نے بہت جتن کر کے منہ مانگے داموں حاصل کی ہیں۔ دنیا کی ہر بڑی آرٹ گیلری میں اس کا کوئی نہ کوئی شاہکار موجود ہے۔ خود اس نے اپنے

کام کی نمائش کے لیے چار بہت بڑے آرٹ میوزیم قائم کیے ہیں۔ نوّے برس کی عمر میں بھی وہ چاہتا تو روز ایسی تصاویر بنا سکتا تھا جن میں سے ہر ایک اسے ملین ڈالرز دلا سکتی تھی لیکن اس نے ہمیشہ اپنی مرضی سے پینٹ کیا۔

ایم ایف حسین کو سب مل گیا تھا لیکن کسی عورت سے عشق اس کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اسے عورتوں کی کمی نہیں تھی دنیا کی حسین ترین عورتیں اس کے لیے ماڈل بننا اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھیں اور بہت ساری اس کے قرب کی خواہش مند تھیں لیکن یہ اس کی شہرت اور دولت کی وجہ سے اس کے پاس آنا چاہتی تھیں۔ خود حسین کو ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پچھتر برس کی عمر میں اس کا خیال تھا کہ اب اسے کسی عورت میں کشش محسوس نہیں ہوگی۔ مگر مادھوری نے اس کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا اسے دیکھ کر وہ جیسے پھر سے نوجوان ہوگیا تھا۔ عشق و سرمستی کا وہ اُبال جو صرف جوانی کے لیے مخصوص ہوتا ہے اس عمر میں اس میں اُبال آیا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ حسین نے اپنی محبت اپنی اور مادھوری کی تضحیک کا سبب نہیں بنایا تھا۔ اس کے بجائے اس نے اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے امر کرلیا۔ اس نے کوئی روایتی طریقہ اپنانے کے بجائے مادھوری سے اپنے عشق کا اظہار یوں کیا کہ اسے اپنی تصویروں میں محفوظ کرلیا۔ اس پر فلم بنائی اور اسے اپنے پسندیدہ انداز میں دیکھ لیا۔

☆☆☆

ہر بڑے فن کار کی طرح جب ایم ایف حسین ایک مقام پر پہنچ گیا جہاں ساری دنیا اس کا نام جان گئی تھی اور لوگ اس سے کسی بڑے کام کی توقع کر رہے تھے ایسا کام جو اس کے فن کے شایانِ شان ہو۔ تب اس نے ایک بڑے پروجیکٹ پر کام کرنے کا سوچا۔ قدیم ہندو آرٹ اور دیومالا سے اسے ہمیشہ سے دلچسپی رہی تھی۔ اسی دلچسپی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایم ایف حسین نے مہا بھارت کو کینوس پر اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ جب اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو بہت سارے حلقوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ مہا بھارت بہت بڑا کام تھا۔ دنیا میں جن تین بڑی جنگوں کو شاعروں اور مصنفوں نے الفاظ کی شکل میں بیان کیا ہے ان میں مہا بھارت غالباً سب سے بڑی ہے۔ اس کی طوالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ صدیوں تک لکھی جاتی رہی تھی اور بے شمار لوگوں نے اس کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ اس کے مقابلے میں فردوسی اور ہومر نے جو رزمیہ داستانیں رقم کیں ان کے خالق صرف وہی تھے۔ اس کے باوجود کسی ایک پینٹر نے ان داستانوں کو کینوس کے پردے پر منتقل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خاص طور سے ہومر کی رزمیہ داستان کو متعدد مصوروں نے کینوس پر منتقل کرنے کا کام کیا لیکن کوئی ایک بھی تسلی بخش انداز میں اس کام کو نہیں کر سکا تھا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایم ایف حسین کا ارادہ بہت بڑا تھا۔ کچھ مخالف جو خالص ہندو تھے انہیں یہ اعتراض تھا کہ ہندوؤں کی ایک مذہبی داستان کو ایک مسلم پینٹر کیوں کینوس کر رہا ہے؟

مہا بھارت کو پینٹ کرنا ایک فلم کے ذریعے مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے سے کہیں زیادہ بڑی بات تھی کیونکہ معاملہ بھارت کی ہندو اکثریت کے جذبات کا تھا۔ ایم ایف حسین نے ہمیشہ کی طرح وہی کیا جو اس نے فیصلہ کیا تھا۔ اس نے مہا بھارت پر کام شروع کر دیا۔ 1995ء میں جب اس نے یہ اعلان کیا تو اس کی عمر اسّی برس ہو چکی تھی۔ اس کا جسم انحطاط پذیر تھا لیکن اس کا فن پوری طرح جوان تھا اور اس میں مزید نکھار آرہا تھا۔ اس نے سیریز کی ابتدائی پینٹنگز پر کام شروع کیا تھا کہ انتہا پسند ہندوؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے اسے دھمکیوں اور گالیوں سے بھرے خطوط آنے لگے۔ 1998ء میں بھارتی انتہا پسند جماعت بجرنگ دل کے کارکنوں نے ایم ایف حسین کے گھر پر حملہ کر دیا۔ وہ برافروختہ تھے کہ ایک مسلمان ان کے دیوی دیوتاؤں کی تصویریں کیوں بنا رہا ہے؟

اہم بات یہ ہے کہ 1970ء میں ایم ایف حسین نے اسی موضوع پر کچھ تصاویر بنائی تھیں اور ان میں دیوی دیوتاؤں کو اسی صورت میں دکھایا تھا جس طرح وہ مندروں اور معبدوں میں دکھائی دیتے ہیں یعنی لباس سے بے نیاز اور اکثر اوقات جنسی حالت میں۔ یہ خود ہندوؤں کا کلچر ہے۔ اجنتا سے لے کر مہا ویرا تک مصوری اور پورے بھارت کے طول و عرض میں پھیلے مندروں میں ان دیوی دیوتاؤں کو اسی صورت میں مجسمے بنا کر رکھا جاتا ہے اور ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ انہیں کسی مسلم مصور یا مجسمہ ساز نے نہیں بنایا تھا اس لیے ہزاروں سال سے کسی کو اعتراض بھی نہیں تھا۔ مگر جب ایک مسلم پینٹر نے انہیں پینٹ کیا اور ایک

www.paksociety.com

بھارتی میگزین ''وچھار مامانسا'' نے اپنی 1996ء کی ایک اشاعت میں ان تصویروں کو ایک مضمون میں اس عنوان سے شائع کیا۔ ''ایم ایف حسین اے پینٹر اور اے بوچر'' تو بھارت میں شور مچ گیا اور ایم ایف حسین کو دیوی دیوتاؤں کی بے حرمتی کا مرتکب قرار دے دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد اس پر آٹھ مختلف الزامات کے تحت کیس کر دیے گئے اور اس بوڑھے فنکار کو عدالتوں میں کھینچا جاتا رہا۔ آٹھ سال بعد دہلی ہائی کورٹ نے ان کیسز کو خارج کر دیا۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا۔ ''گروپوں کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ جہاں تک درگا اور سرسوتی کو اس طرح پینٹ کرنے کا تعلق ہے تو ہندو پہلے ہی اسے قبول کر چکے ہیں۔''

بجرنگ دل کے کارکنوں کے حملے میں ایم ایف حسین کا گھر ہی تباہ نہیں ہوا بلکہ اس کی کئی پینٹنگز اور آرٹ کی چیزوں کو نقصان ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا بلکہ لندن میں ہونے والی ایک ایگزی بیشن میں گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ بچ گیا، ورنہ عین ممکن ہے اسے جسمانی نقصان ہوتا یا یہ انتہا پسند اسے قتل کر دیتے۔ شیو سینا کی قیادت نے اس حملے کی ذمّے داری قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن پولیس نے بجرنگ دل کے چھبیس کارکنوں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف حملے کا کیس بنا دیا۔ اس کے بعد یہ معاملہ دب گیا اور ایم ایف حسین نے مہابھارت پر اپنا کام جاری رکھا لیکن احتیاطاً اس نے یہ سارا کام انڈیا سے باہر منتقل کر دیا۔ جہاں اسے یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی حملہ کر کے اس کا کام تباہ کر دے گا۔

آنے والے آٹھ سال معاملہ دبا ہی رہا لیکن 2006ء میں ویکلی انڈیا ٹوڈے کی ایک اشاعت میں فلم مشن کشمیر کے لیے ایک اشتہار دیا گیا اور اس میں ایم ایف حسین کی ایک تصویر مدر انڈیا کو استعمال کیا گیا۔ یہ ایک عورت کی عریاں تصویر تھی جس کے جسم کے مختلف حصوں کو انڈیا کی ریاستوں کے نام دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے اصل تصویر میں ایسا نہیں تھا یہ صرف اشتہاری حربہ تھا۔ اس اشتہار بازی کا انتظام ایک این جی او ایکشن انڈیا اور آپاراؤ آرٹ گیلری نے مل کر کیا تھا۔ فوراً ہی ہندو تنظیمیں جیسے جاگرتی سمیتی اور وشوا ہندو پریشد میدان میں آ گئیں اور انہوں نے ایم ایف حسین کی ویب سائٹ اور شمالی یورپ میں اس تصویر کی نمائش کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ اس پر ایم ایف حسین نے عوام سے معذرت کی اور اس تصویر کو نیلام گھر میں دے دیا جہاں بعد میں یہ اسّی لاکھ بھارتی روپے میں فروخت ہوئی تھی۔ البتہ ویب سائٹ پر یہ تصویر آویزاں رہی تھی۔

اس کے بعد ایم ایف حسین کے خلاف عدالتوں میں کیسز کی بھرمار ہو گئی تھی جن میں اس کے خلاف ہندو دیوی دیوتاؤں کی توہین کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ ملک سے باہر تھا اور جب اس نے کسی سمن کی تعمیل نہیں کی تو اس کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ گرفتاری نکل آئے تھے۔ ساتھ ہی اسے وطن واپسی پر قتل کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ 2006ء کے آخر میں اس وقت ایم ایف حسین نے جلاوطنی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جب اس نے دیکھا کہ اس کے خلاف کیس پیچیدگی اختیار کرتے جا رہے تھے اور اس کے وکلا نے اسے وطن واپس نہ آنے کا مشورہ دیا۔ مگر ساتھ ہی اس نے واپس آنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا تھا چاہے اس کے لیے اسے گرفتاری کا خطرہ کیوں نہ مول لینا پڑے۔ کچھ عرصے بعد سپریم کورٹ نے اس کے وارنٹ گرفتاری معطل کر دیے کیونکہ ایم ایف حسین کے پاس کسی اور ملک کی شہریت نہیں تھی اور اسے وطن واپسی کا حق تھا۔ اس وقت کے سکریٹری داخلہ جی کے پلائی نے بیان دیا کہ ایم ایف حسین وطن واپس آنے یا دنیا میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں اور انہیں تحفظ بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔

یہ خوش آئند بات تھی لیکن ایم ایف حسین ان طاقتور ہندو تنظیموں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا جو اس کی جان کی دشمن بن گئی تھیں اور کسی قیمت پر اسے وطن واپسی کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کی طاقت کے سامنے حکومت بھی بے بس تھی اور اگر وہ ایم ایف حسین کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ کر لیتیں تو اس کے لیے جان بچانا مشکل ہو جاتا اس لیے اس نے ملک سے باہر ہی رہنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ ملک سے باہر اس کا زیادہ وقت یورپ میں گزرتا تھا۔ ان ہی دنوں اس کے سامنے ایک نئی پیشکش آئی۔ ایم ایف حسین کی تصاویر کی نمائش قطر میں بھی ہوئی تھی جہاں شاہی خاندان آرٹ کا بہت بڑا قدر دان اور ایم ایف حسین کا پرستار تھا۔ قطر نے اسے اپنے ملک کی شہریت دینے کی پیشکش کی۔ حالانکہ قطر سمیت مڈل ایسٹ کا کوئی عرب ملک کسی غیر ملکی کو شہریت دینے کے معاملے میں نہایت سخت ہے حد یہ کہ یہاں پیدا ہونے والا غیر ملکیوں کا بچہ بھی شہریت کا حق دار نہیں ہوتا ہے اور اسی طرح شادی کے ذریعے بھی شہریت حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس لیے قطر کی یہ پیشکش حیران کن تھی۔

ایم ایف حسین نے یہ پیشکش قبول کر لی اور قطر کا شہری بن گیا لیکن اس کی انڈین شہریت بھی برقرار رہی تھی۔ یہ پیشکش قبول کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو قطر کا شاہی خاندان اور خاص طور خاتونِ اول شیخا موزہ بنت ناصر المنسد جو قطر کے حکمران شیخ حماد بن الاخلیفہ بن ثانی کی بیگم ہیں۔ وہ ایم ایف حسین کی پرستار ہیں اور ان کی ذاتی گیلری میں اس کی سو سے زائد تصاویر موجود ہیں جو خاتونِ اول نے بھاری معاوضے کے عوض حاصل کی ہیں۔ دوسری وجہ وہاں اسے کام کرنے کی سہولت تھی۔ انڈین شہری ہونے کے ناتے اسے انڈیا کی تاریخ کو کینوس پر لانے میں دلچسپی تھی۔ تو دوسری طرف ایک مسلمان ہونے کے ناتے اسے عرب تاریخ کو بھی کینوس پر منتقل کرنے میں دلچسپی تھی۔ قطر میں رہائش رکھتے ہوئے وہ دونوں کام کر سکتا تھا۔

قطر کی شہریت اختیار کرنے کے بعد اس کا زیادہ وقت دوہا میں گزرنے لگا جہاں وہ نیشنل میوزیم کے ایک حصے میں اپنے کام میں مگن رہتا تھا اور اس کی گرمیاں لندن میں گزرتی تھیں جو دنیا میں اس کا پسندیدہ ترین شہر تھا۔ مگر یہ چھٹیاں بھی نمائشوں اور سیمینارز میں گزر جاتی تھیں اور اسے اپنے لیے وقت کم ملتا تھا۔ چار مہینے لندن میں گزار کر وہ واپس دوہا پہنچ کر کام میں لگ جاتا تھا۔ اس نے بانوے برس کی عمر میں یہ کام شروع کیا تھا۔ جو بجائے خود حیرت انگیز امر ہے۔ پینٹ کرنا آسان کام نہیں ہے گھنٹوں کینوس پر جھکے رہنا اور ہاتھ کو اتنا معمولی سا حرکت دینا کہ بُرش ملی میٹر سے زیادہ نہ ہلے یقیناً بہت مشکل کام ہے۔ اس میں جسم کے پٹھے اکڑ جاتے ہیں اور اکثر مصور عمر کے آخری حصے میں کمر اور جوڑوں کے درد کا شکار ہو جاتے ہیں پھر وہ جس عمر میں تھا اس عمر میں اتنا بڑا کام زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

مگر ایم ایف حسین نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید اس کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور جلد وہ دنیا کے تمام جھمیلوں اور جھگڑوں سے آزاد ہو جائے گا اس لیے وہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اپنے یہ دونوں پروجیکٹ مکمل کرنا چاہتا تھا۔ تین سال تک آٹھ مہینے دن رات کی محنت کے بعد اس نے بالآخر اپنے یہ دونوں پروجیکٹ مکمل کر لیے۔ جو آج دوہا کے اس میوزیم میں شائقینِ فن کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ فن کے ایک فرانسیسی نقاد کے کے جے سیٹلنگ کا کہنا ہے۔ ''مصوری بہت مشکل کام ہے اور بہت بڑے اور اچھے مصور بھی اپنی ساری زندگی میں ایک دو ہی بڑے کام کر کے گئے ہیں لیکن جب ہم ایم ایف حسین کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے ناتواں جسم میں توانائی کا بحرِ بے کراں نظر آتا ہے جو اس عمر میں بھی اسے تھکنے نہیں دیتا۔ اس نے ایک دو نہیں کم سے کم نصف درجن بڑے کام کیے ہیں جن میں سے کوئی ایک ہی اس کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔''

یہی ایم ایف حسین جسے انڈیا کا فخر کہا جاتا تھا۔ اچانک ہی معتوب ٹھہرایا گیا۔ عوام، لیڈر اور فن کار تک اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کی حمایت میں بولنے والے بہت کم تھے اور اس کے ساتھ تو کوئی کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اسے پے در پے مقدمات میں اُلجھایا گیا جن میں پہلے ہی کوئی جان نہیں تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ ان مقدمات کو بالآخر خارج کر دیا جائے گا۔ ایسا ہی ہوا لیکن آٹھ سال اس بوڑھے مصور کو عدالتوں میں دھکے کھلوانے کے بعد مقدمات ختم ہوئے تھے۔ 2006ء میں جب دوسری بار اسے انہی الزامات کے ساتھ عدالتوں میں گھسیٹا گیا تو وہ ملک سے باہر چلا گیا اور بالآخر جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔

جس وقت وہ جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہوا اور عدالتوں میں اس کے خلاف کیس چل رہے تھے اس وقت بھارت میں اسے مختلف اعزازات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا۔ کیرالہ کی حکومت نے اسے راج روی ورما ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا لیکن عدالت کا فیصلہ آنے تک اسے ملتوی کر دیا۔ بعد میں ایم ایف حسین نے خود اس ایوارڈ کو لینے سے انکار کر دیا۔ ایک طرف ملک میں اس کے پتلے جلائے جا رہے تھے اور انتہا پسند ہندو رہنما اس کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ عوام اسے گالیاں دے رہی تھی۔ بلکہ فن کی دنیا سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کا رویّہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

جب ایم ایف حسین نے ہندو مائتھ کو کینوس کے پردے پر منتقل کرنے کا سوچا تو یہ کام اس نے قومی فریضہ سمجھ کر انجام دیا اور اس نے انہیں اسی طرح کینوس پر پیش کر دیا جس طرح تاریخ انہیں بیان کرتی تھی اور خود ہندو اپنے مندروں میں انہیں پیش کرتے آئے تھے۔ جب اس کا شدید ردِعمل آیا تو وہ حیران ہوا تھا۔ یہ تصویریں اس کا خیال نہیں تھیں بلکہ ان کی اصل پہلے سے موجود تھی۔ خود ہندو مصوروں نے اس سے پہلے بارہا اسی طرح کی تصاویر بنائی

www.paksociety.com

ہے اور کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس لیے اگر ایم ایف حسین نے دیوی دیوتاؤں کی ایسی تصاویر بنائیں تو اس نے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا جس کی مذمت کی جاتی۔ اس کے برعکس اسلام میں سرے سے تصویر بنانا ہی ممنوع ہے۔ افسوسناک... بات یہ ہے کہ ایم ایف حسین کو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ سب سننا اور برداشت کرنا پڑا۔

جہاں سب ایم ایف حسین کی مخالفت کر رہے تھے وہیں کچھ آوازیں اس کی حمایت میں بھی اُٹھی تھیں۔ ہندو مصور تری پاٹھی کہتا ہے۔ "یہ بہت ہی افسوسناک ہے کہ ہم حسین کی فنکارانہ آزادی سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ حقیقت شرمناک ہے کہ ہم سیکولرازم کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہندو نیشنلسٹ حسین کو سزا دلوانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ انڈیا کے فخر کی نہیں شرم کی بات ہے۔"

بے پناہ کام کے باوجود ایم ایف حسین ابھی تھکا نہیں تھا۔ اس کا برُش بدستور رنگوں سے کھیل رہا تھا لیکن قدرت کی طرف سے وہ مہلت ختم ہوگئی جو ہر شخص کو عطا کی جاتی ہے اور اس کے بعد اس شخص کو اپنے اعمال کے ساتھ اپنے خدا کے حضور پیش ہونا پڑتا ہے۔ گزشتہ سال مارچ کے آغاز میں اس کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ مگر اس نے کام ترک نہیں کیا۔ ڈاکٹروں نے دل کی بیماری تشخیص کی تھی اور اسے کام ترک کرنے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے لیے کام زندگی سے زیادہ اہم تھا اس لیے اس نے ڈاکٹروں کا مشورہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ 6 جون 2011ء کے روشن دن لندن رائل برومپٹن ہاسپٹل میں اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ تقریباً چھیانوے برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگیا اور اسے چار دن بعد بروک ووڈ کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ایک ناکام عشق کی داستان بھی دفن ہوگئی۔

بھارتی وزیرِ اعظم من موہن سنگھ نے اپنے تعزیتی پیغام میں ایم ایف حسین کی موت کو قومی نقصان قرار دیا جبکہ بھارتی صدر پراتھیا پاٹیل نے اس کی موت کو "فن کی دنیا میں ہمیشہ رہ جانے والا خلا" کہا۔ مگر کسی نے اس سلسلے میں معذرت نہیں کی کہ بانوے سال تک انڈیا میں رہنے والے اور ساری دنیا میں اس کا نام روشن کرنے والا شخص دوسرے ملک کا شہری بن کر دنیا سے رخصت ہوا۔

آخری مغل

مختار آزاد

صدیوں پہلے ترکمانستان سے کالی بھیڑوں والے قبیلے کے لوگ جب ظہیر الدین بابر کے ساتھ ہندوستان آکر مراد آباد میں قیام پذیر ہوئے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ نسلوں بعد ان میں وہ جنم لے گا جس کے نام کا علم و ادب کی دنیا میں شہرہ ہوگا۔

محمود علی کی آٹھ اولادوں میں عبیداللہ بیگ چھٹے نمبر پر تھے۔ یکم اکتوبر 1936ء کو وہ مراد آباد میں پیدا ہوئے۔

عبیداللہ بیگ کی زندگی کتاب، قلم اور فلم کے تین خانوں میں ایسی بٹی ہوئی تھی کہ ان سے ملنے کے لیے جس دروازے سے داخل ہوں، سامنے کتاب آجاتی تھی۔ خود ان کے بقول "بچپن میں کتاب کو ہاتھوں میں لیا تو اس نے پھر ایسا ہاتھ تھاما کہ زندگی کا کوئی بھی حصہ ہو، کوئی بھی مشکل مرحلہ درپیش ہو، سکون کی تلاش ہو یا شہرت کی بات کی جائے، ذہنی آسودگی کا ذکر ہو یا صحت مند دماغ کے لیے ورزش... زندگی کتاب سے ہی عبارت رہی۔"

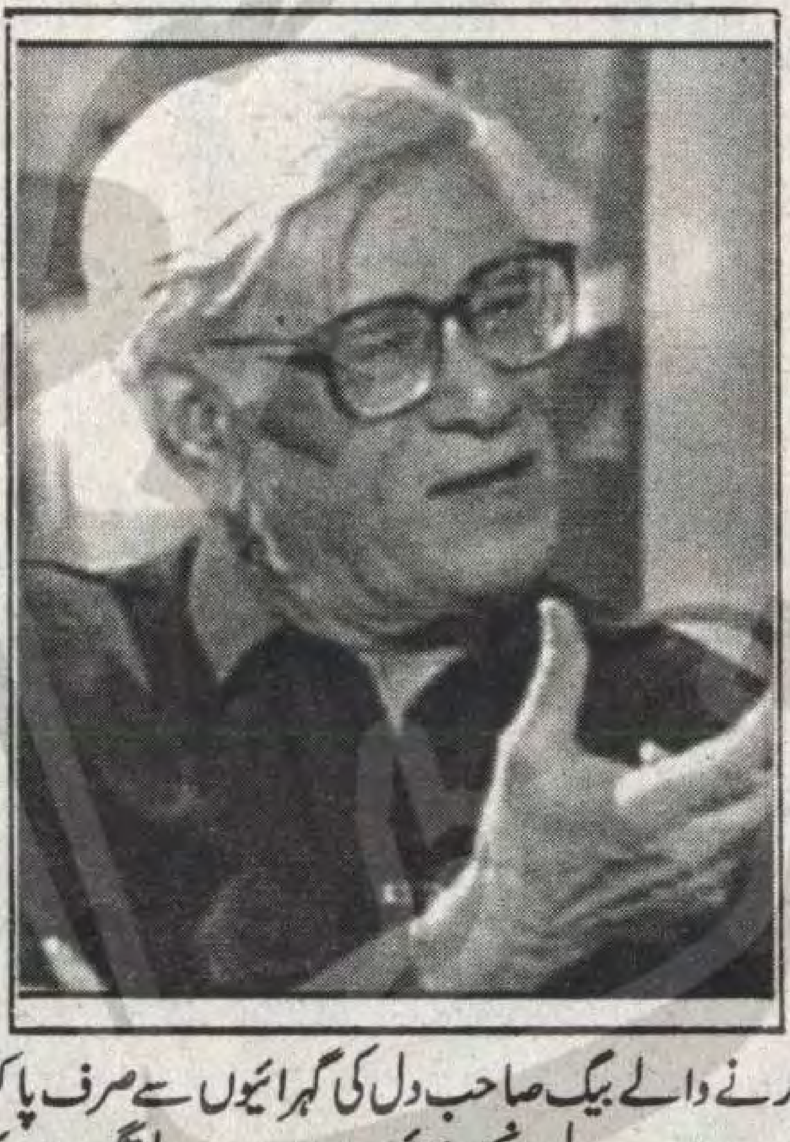

تیس سال پہلے پاکستان ٹیلی وژن کے علمی پروگرام 'کسوٹی' نے ہر عمر کے ناظر کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اس کے روحِ رواں عبیداللہ بیگ ہی تھے۔

انہوں نے کراچی میں صحافت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ نیوی اور بری فوج میں بطور سویلین خدمات سرانجام دیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ اخبارات میں راتوں کو جاگ کر خبریں بنائیں۔ ایڈورٹائزنگ کی دنیا میں کچھ وقت گزارا۔ پی ٹی وی میں شمولیت سے قبل اس کے ایک ذیلی ادارے میں ملازمت کی۔ پی ٹی وی سے منسلک ہوئے تو کم و بیش ڈھائی دہائی کی وابستگی کے دوران میں سوا تین سو سے زائد دستاویزی فلمیں بنائیں۔ 1974ء میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کی براہِ راست نشریات میں بطور چیف پی ٹی وی اینکر پرسن شامل ہوئے۔ ان کی تیار کردہ کئی دستاویزی فلموں کو عالمی اعزازات سے نوازا گیا۔

انگلستان، امریکا، جرمنی، ترکی اور اپنے وطنِ مالوف ترکمانستان سمیت دنیا کے کئی ممالک کی سیاحت کی۔ ترکمانستان کے اُس وقت کے صدر سپر مراد نیازوف نے اپنی لکھی ہوئی کتاب پر اپنے ہاتھ سے لکھا۔ "میرے ہم وطن عبیداللہ بیگ کے لیے۔" بیگ صاحب اس عبارت کو اپنی ترکمانی شہریت کا پروانہ قرار دیتے تھے۔ ترکمان ہونے پر فخر کرنے والے بیگ صاحب دل کی گہرائیوں سے صرف پاکستانی تھے۔

پی ٹی وی کی ملازمت کے بعد ماحولیات کے حوالے سے عالمی انجمن آئی یو سی این سے وابستگی اختیار کی اور سہ ماہی رسالے 'جریدہ' کا اجرا کیا۔ راقم کو بھی بیگ صاحب کے بعد اس پرچے کی ادارت کا شرف ملا۔ اسی وابستگی کے دوران میں انہوں نے ملک کے ماحولیاتی مسائل کے حوالے سے کئی دستاویزی فلمیں تیار کیں۔

'اور انسان زندہ ہے' ان کا پہلا اور ضخیم ناول ہے جو 60ء کی دہائی میں شائع ہوا۔ ایک اور ناول 'راجپوت' جو 2010ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد نے شائع کیا۔ تیسرا ناول 'کاوا' لکھنے کا ارادہ تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ موئن جودڑو کے پس منظر میں ایک ناول 'سانگی' لکھ رہے تھے مگر وہ اُدھورا تھا کہ مسودہ غائب ہوگیا۔ زندگی کے آخری چند ہفتوں تک وہ بڑے تاسف سے اُس کا تذکرہ کرتے رہے۔ اُردو زبان پر قدرت اپنی جگہ فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر بھی مضبوط دسترس رکھتے تھے۔

2008ء میں حکومتِ پاکستان نے ٹیلی وژن کے حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دینے پر انہیں 'تمغۂ حسنِ کارکردگی' کے اعزاز سے نوازا۔

بیگ صاحب کی زندگی کے کسی بھی پہلو کا جائزہ لیں کتاب ہر جگہ جھلکتی ہے۔ کتاب اور عبیداللہ بیگ کا تعلق کیا ہے؟ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کاغذ پر جواب لکھ کر مجھے دیا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ انہوں نے لکھا تھا "کتابیں میری زندگی ہیں۔ میری پوری زندگی کتابوں سے عبارت ہے... اگر کتابیں نہ ہوتیں تو آپ مجھ سے واقف نہ ہوتے اور خود میں...؟ اپنے آپ سے ناواقف رہتا۔"

زندگی کے آخری ایام میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہہ رہے تھے "میاں آزاد... مہینوں ہوگئے، طبیعت کے باعث نہ کچھ لکھا نہ پڑھا، عجب بے کلی ہے۔"

یہ بے کلی بائیس جون، سن دو ہزار بارہ کی صبح سورج طلوع ہونے پر ختم ہوئی۔

خاندان والوں اور لڑکپن کے ساتھیوں کا حبیب۔ بے تکلف دوستوں کا OB۔ شکاریات کا جم جونیئر۔ تاریخ اور ماحولیات کا طغرل ترکمان... بھابی سلمیٰ کا بادشاہ سلامت۔ تین بیٹیوں کا شفیق باپ، درباری دوستوں کا آخری مغل۔ ساتھ کام کرنے والوں کا بیگ صاحب۔ عمر میں چھوٹے دوستوں اور بے شمار پرستاروں کا عبیداللہ بیگ۔ اور مجھے اپنا دوست کہنے سمجھنے والا، دکھ سکھ باٹنے والا، دکھوں میں ہمت بندھانے اور خوشی میں خوش ہونے والا، کئی رازوں کا ہمراز۔ گئی تہذیب کا نشان۔ فخر سے خود کو 'آخری مغل' کہتا تھا۔ دوستوں کا آخری مغل تاج دار کراچی کے گذری قبرستان کی پہاڑی چوٹی پر سب سے اونچی جگہ پر آرام فرما ہے۔ آخری مغل جو تھا۔ یوں ادب، ثقافت اور ثقاہت کے آسمان کا ایک اور درخشاں ستارہ ڈوب گیا۔

www.paksociety.com

سوزِ عشق

تنویر ریاض

اس کی آواز میں ایسا سوز تھا، ایسا درد تھا کہ آنکھیں بھر آئیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ابُھرنے کے لیے فلمی پردے، ٹی وی یا ریڈیو کا سہارا لینا نہیں پڑا۔ خودبہ‌خود نجی محفلوں کے سہارے اس کی شہرت پھیلتی رہی اور ایک دنیا اس کی آواز کے جادو کی اسیر بن گئی لیکن اب تک کسی نے اس کے دکھی دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ یہ درد کس کی محبت کا عطیہ ہے۔

پاکستان کے اس مشہور گلوکار کی رودادِ زندگی جسے عشق ناکام نے کمال بخشا

عشقِ ناکام نمبر

محبت اور نفرت کا وجود انسان کے خمیر سے اُٹھتا ہے۔ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی اور حضرت انسان نے زمین پر قدم رکھا۔ تب سے ہی یہ دونوں جذبے اس کی ذات سے جڑے نظر آتے ہیں۔ نفرت پر تو اوصاف جمیلہ کی مدد سے قابو پایا جاسکتا ہے لیکن محبت کے سرکش اور منہ زور جذبے کو لگام دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ دنیا کے سبھی مذاہب، اپنے ماننے والوں کو نفرتیں پالنے سے روکتے ہیں لیکن کوئی محبت کرنے سے منع نہیں کرتا۔ محبت کا سودا سر میں سما جائے تو انسان عقل وخرد سے بے گانہ ہوجاتا ہے پھر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا اور سسی پنوں جیسی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ اگر ان خیالی داستانوں پر یقین نہیں تو ماضی میں ہونے والے تاریخی واقعات کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے جن میں کہیں ایک کنیز، شہزادے سے محبت کرنے کے جرم میں دیوار میں زندہ چنوادی جاتی ہے تو کہیں ایک بادشاہ اپنی چہیتی ملکہ کی یاد میں تاج محل جیسی حسین یادگار تعمیر کرواتا ہے۔ کہیں ایڈورڈ ہشتم اپنی محبوبہ کی خاطر تاج برطانیہ کو ٹھوکر ماردیتا ہے تو کہیں شہنشاہ ایران اپنی چہیتی ملکہ ثریا کو جسے وہ دل وجان سے چاہتا تھا، وزیروں اور پارلیمنٹ کے دباؤ میں آکر صرف اس لیے طلاق دینے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ اسے تخت کا وارث دینے میں ناکام رہی تھی۔

اس کے علاوہ بھی بے شمار ناکام عشق کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ برصغیر پاک وہند بالخصوص فلمی دنیا میں ایسی کئی کہانیوں نے جنم لیا جن کے کردار اپنی منزل کو نہ پاسکے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں امر ہوگئیں اور کچھ کو وقت کی گرد نے ڈھانپ لیا اگر پاک وہند کی فلم انڈسٹری پر نظر دوڑائیں تو زیادہ تر اداکار اور اداکارائیں بیماری عشق کا مزہ لوٹ چکے ہیں۔ ان میں دلیپ کمار، امیتابھ بچن، راجیش

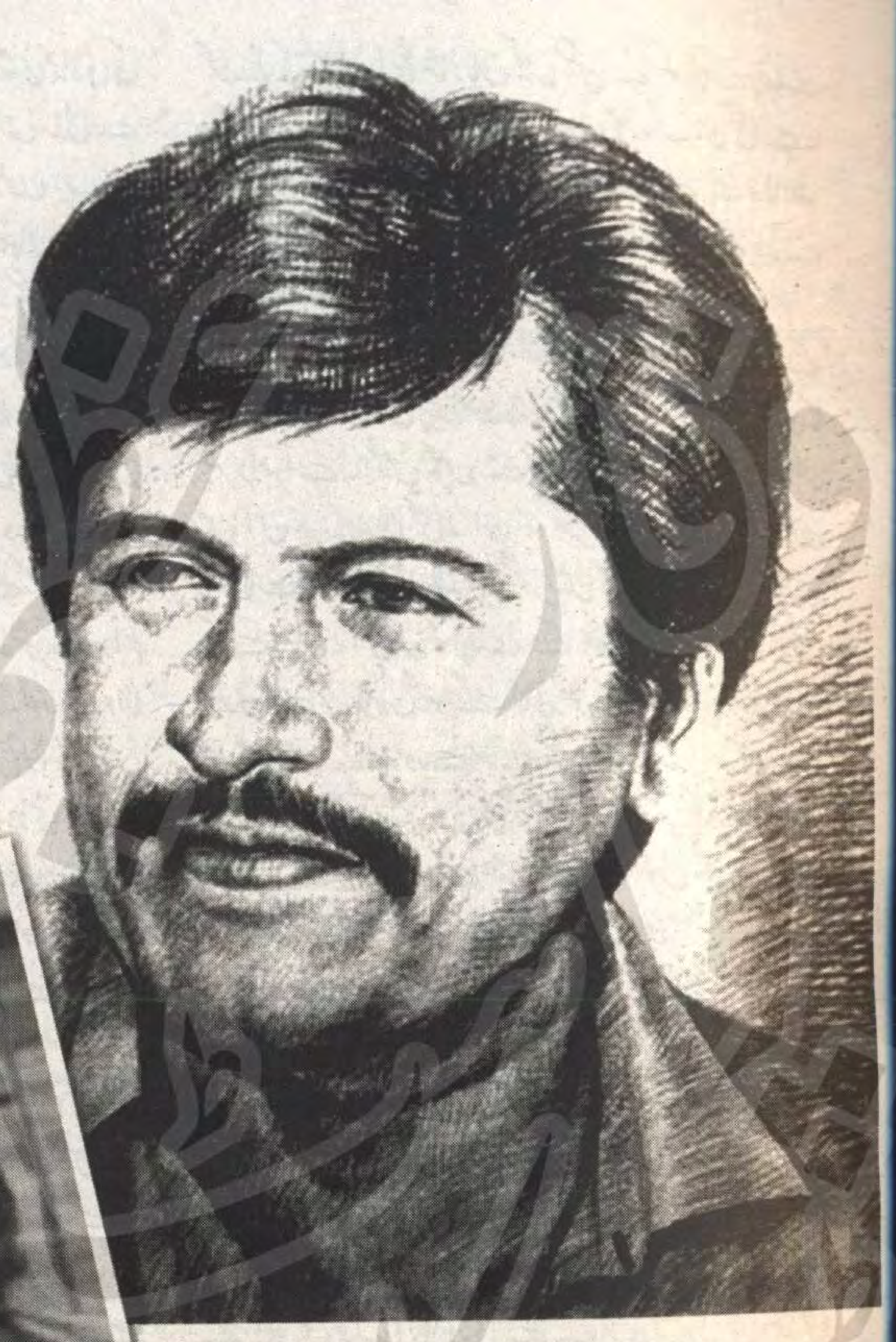

کھنہ، مدھوبالا، ثریا، ٹینا منیم اور ریکھا وغیرہ شامل ہیں۔ بلبل ہند لتا منگیشکر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ساری عمر دلیپ کمار سے خاموش محبت کرتی رہیں اور ٹریجڈی کنگ کی شادی کے موقع پر انہوں نے ٹھیک ٹھاک سوگ بھی منایا تھا۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے دبانا ممکن نہیں اگر ایسی کوئی کوشش کی جائے تو کسی نہ کسی رنگ میں جذبہ عیاں ہوجاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر ناکام عاشق ایک بڑا اور سچا فنکار ہوتا ہے۔ دل پر چوٹ لگی ہو تو درد کی یہ لہر اس کے ہر فن پارے میں موجیں مارتی نظر آتی ہے اور اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ سچا عاشق، محبوب سے جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کرپاتا۔ دنیا اس کے لیے بے معنی ہوجاتی ہے اور وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہوکر تن من دھن سے فن کی آبیاری میں لگ جاتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی بڑے فنکار شاعر، ادیب، گلوکار، مصور کے شاہکار ملاحظہ فرمائیے تو ان میں درد کا عکس پوری سچائی کے ساتھ جھلکتا نظر آتا ہے اور جب ہم ان نامور فنکاروں یا نامراد عاشقوں کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہیں نہ کہیں وہ سرا مل ہی جاتا ہے جس کے سہارے ہم اس فنکار کی داستانِ حیات کے ان پوشیدہ گوشوں تک پہنچ جاتے ہیں جس کی آگ میں جل کر وہ خود بھی امر ہوا اور اس لازوال دکھ نے اس کے فن کو بھی کندن بنادیا۔

علاقائی موسیقی کی دنیا میں تہلکہ مچادینے والے، درد

www.paksociety.com

بھرے گیتوں اور غزلوں کے خالق عطاء اللہ خاں عیسیٰ خیلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ گزشتہ چالیس سال سے کیسٹ کے ذریعے کروڑوں شائقین کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ ان کی آواز میں جو سوز اور درد پنہاں ہے اگر اسے قدرت کا عطیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا لیکن عشق کی ناکامی نے ان کی آواز کو جلا بخشی اور جب یہ درد بھرے گیت فضاؤں میں گونجے تو سننے والوں نے انہیں اپنے دل کی آواز جانا، ہر صاحب دل نے اس درد کی کسک محسوس کی اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ہر خاص و عام کی پسند بنتے چلے گئے۔ یہ اعزاز بہت کم گلوکاروں کے حصے میں آیا ہے کہ وہ جو کچھ بھی گائیں، اسے قبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہو جائے اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ گانے اور سننے والا درد کے ایک ایسے رشتے سے منسلک ہو جو انسانوں کو آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔ درد کے اس رشتے کو احساس، دوستی، محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی ایک ایسے فنکار کا نام ہے جس کے دل میں اپنے لوگوں کے لیے پیار، دوستی اور محبت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے گیتوں میں اس کا اظہار مکمل طور پر نظر آتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فنکار کی زندگی پبلک پراپرٹی ہوتی ہے اور اس کی شخصیت کا کوئی پہلو عوام کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا لیکن عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ وہ کیسٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لوگ ان کی گائیکی پر سر دھنتے اور محفلوں میں انہیں سننے کے لیے جوق در جوق پہنچتے ہیں لیکن کسی کو ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں علم نہیں۔ وہ میڈیا سے دور رہتے ہیں اور ان کی شخصیت پُراسراریت کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ Low پروفائل میں رہے اور ان کے بہت کم انٹرویوز اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی شخصیت ایک افسانوی کردار کے رنگ میں ڈھل چکی ہے۔ لوگ ان کے فن سے پیار کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس سوز اور درد کے پیچھے عشق میں ناکامی کا دکھ پنہاں ہے لیکن اس سے زیادہ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ کوئی نہیں جانتا کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے دل پر پہلی چوٹ کب لگی؟ کب سے وہ عشق میں ناکامی کا دکھ لیے آبلہ پائی کا سفر طے کر رہے ہیں کسی سایہ دار چھاؤں کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ جس طرح صحرا میں بھٹکتے مسافر کو پانی کی تلاش میں ہر بار سراب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح انہوں نے بھی سکون حاصل کرنے کی خاطر پانچ شادیاں کیں لیکن بے سکونی سے نجات حاصل نہ کر سکے..... محبت ان کے دل کا روگ بن گئی ہے۔ اس واردات قلبی کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی 19 اگست 1951ء کو میانوالی کے علاقے عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ تین بہن بھائیوں میں ان کا نمبر دوسرا ہے۔ انہیں بچپن سے ہی گانے کا شوق تھا لیکن گھر میں اس پر پابندی تھی۔ ان کا گھرانا کٹر قبائلی اور مذہبی رجحانات کا حامل تھا، لہٰذا وہ گھر میں اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس فن کو اپنانے کے بعد تو وہ گھر اور خاندان دونوں سے ہی فارغ ہو گئے۔ کافی عرصے تک اپنے دوستوں میں گاتے رہے اور وہ سنتے رہے لیکن اس پابندی کے باوجود عطاء اللہ کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ چپکے چپکے موسیقی کے بارے میں سیکھتے رہے البتہ ان کے اسکول ٹیچر نے بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے اسے محمد رفیع اور مکیش کے گانے سننے کے لیے دیے اور تاکید کی کہ وہ کبھی بھی موسیقی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کریں گے۔ عطاء اللہ نے اپنے گھر والوں کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور چاہا کہ انہیں گانے کی اجازت مل جائے لیکن ناکام رہے۔ مجبور ہو کر انہوں نے گھر چھوڑ دیا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مختلف کام کیے جن میں ٹرک ڈرائیوری سے لے کر بیرا گیری تک شامل ہے۔

انہوں نے باقاعدہ کسی استاد سے موسیقی کی تربیت حاصل نہیں کی۔ ان کے بقول اساتذہ سے کچھ سیکھنے کے لیے کچھ ہونا ضروری تھا جو بدقسمتی سے ان کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے وہ باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل نہ کر سکے۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں انہوں نے امتیاز خالق سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی لیکن ان کے والد صاحب کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے امتیاز خالق کو منع کر دیا۔ جس کے بعد امتیاز نے معذرت کر لی۔ جب عطاء اللہ خاں عیسیٰ خیلوی کو کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو انہوں نے اپنے لیے لوک موسیقی کا انتخاب کیا۔ وہ اپنے کام میں انفرادیت چاہتے تھے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے کلام کا انتخاب کیا جائے جو براہ راست عام آدمی کے دل تک پہنچے۔ چنانچہ اپنے علاقے اور چاروں صوبوں سے علاقائی گیت اکٹھے کرنا شروع کر دیے۔ ان گیتوں میں بول کم ہوتے ہیں چنانچہ انہوں نے ایسے شعراء سے رابطہ کیا جو اچھے شعر کہنے کے باوجود گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ان شعراء سے مل کر اپنی ضرورت سے آگاہ کیا یعنی خاکہ وہ دیتے اور شعراء ان کے جذبات کو گیت کے قالب میں ڈھال دیتے پھر انہوں نے اسی کلام کو اپنے انداز میں گایا تو اسے سن کر سامعین ششدر رہ گئے۔ ان گیتوں کیا کچھ نہیں تھا۔ شاعری، نغمگی، درد، دل کو چھو لینے والے جذبات اور سب سے بڑھ کر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی درد و سوز میں ڈوبی ہوئی آواز، دیکھتے ہی دیکھتے وہ مقبولیت اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

عطاء اللہ خاں عیسیٰ خیلوی کو شاعری سے گہرا شغف ہے اور وہ گائیکی کے لیے بہت دیکھ بھال کر کلام کا انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے جن شعرا کا کلام گایا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ کبھی کبھی کسی فوک گانے میں ایک آدھ شعر کا اضافہ کر لیتے ہیں یا مکھڑا پسند نہ آئے تو اسے تبدیل کر لیتے ہیں لیکن کبھی باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ ان کی شروع سے ہی کوشش رہی ہے کہ کسی صاحب دیوان اور مشہور شاعر کو نہ چھیڑا جائے لیکن بعد میں انہوں نے احمد فراز، ساحر لدھیانوی اور فیض احمد فیض کا کلام بھی گایا البتہ ان کی گائیکی زیادہ دیہی پس منظر سے تعلق رکھنے والے غیر معروف شعراء کے کلام پر مشتمل ہے ان میں منور علی ملک، سونا خاں بے بس، مجبور عیسیٰ خیلوی، فاروق روکھڑی، ایس ایم صادق، مظہر نیازی اور دیگر شعراء شامل ہیں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اپنے آپ کو بنیادی طور پر صوفیاء کا گلوکار کہتے ہیں کیونکہ اس میں روحانیت کا عنصر زیادہ ہے۔ انہوں نے خواجہ فرید آف مٹھن کوٹ کا کلام بہت زیادہ گایا ہے۔ اس کے بعد شاہ حسن اور محمد بخش اور دیگر صوفی شعراء کا کلام بھی کافی گایا ہے۔ وہ اپنی گائیکی کے لیے کلام کا انتخاب کس طرح کرتے ہیں، یہ انہی کے الفاظ میں سنیے۔

”میں نے ہمیشہ وہ گانا گایا ہے جو مجھ پر بیت چکی ہے کیونکہ جب تک آپ گانے کو دل سے محسوس نہیں کرتے تو میرا خیال ہے کہ گانا ہی نہیں چاہیے۔ اگر گاتے وقت گلوکار پر وہی کیفیت طاری نہیں ہوتی تو پھر سننے والے کو بھی مزہ نہیں آتا۔“

انہوں نے گھر سے نکلنے کے بعد بھی موسیقی کی تربیت جاری رکھی۔ وہ اپنے گانے کیسٹ پر ریکارڈ کر لیتے اور انہیں دوستوں میں تقسیم کر دیتے۔ اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈر کا رواج عام تھا۔ بیرون ملک پاکستانی چھٹیوں میں تو اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر ضرور لاتے۔ ایک دن وہ معمول کے مطابق

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

آزادی کے یادگار لمحات سے وابستہ ماہ اگست 2012ء کے شمارے کی بہار

پانچواں آدمی

طبقاتی استحصال کا زخم حساس دلوں کو اس قدر گھائل کر دیتا ہے کہ...... منزل کا حاصل، کارلا حاصل ٹھہرتا ہے۔ **ایچ اقبال** اور آخری صفحات کا خوب صورت سنگم

فیصلے فقیروں کے

ہندوستان کی سرزمین پر ولیوں اور مشائخ کا قتل عام...... ”ہنوز دلی دور است“ ایک ولی کا تاریخی جملہ...... ایک یادگار داستان۔ **ڈاکٹر ساجد امجد** کی عرق ریزی

کشکول

حالات و واقعات کے نشیب و فراز...... ایک سنسنی خیز طویل داستان

انوار صدیقی کے قلم کا جادو

مسافر

جذبات کے تلاطم...... حالات کی سازشیں...... اور چاہتوں کی ریشمی ڈوریوں میں گرفتار ایک مسافر کی ہنگامہ خیزیاں۔ **ناصر ملک** کا دلکش انداز بیاں

قرض حسنہ

محبوب قلم کار **ایم اے راحت** کا ایک منفرد شاہکار...... خوابوں کا تسلسل اور تلخ حقائق کی روانی

اس کے علاوہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کی روداد حیات، ملک صفدر حیات کا کارنامہ، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے دوستوں کی محفل میں گا رہے تھے۔ وہیں ایک دبئی پلٹ بھی موجود تھا۔ اس نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا گانا اپنے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرلیا۔ پھر نہ جانے کس طرح یہ کیسٹ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے رحمت گراموفون ہاؤس کمپنی کے مالک چوہدری رحمت علی تک پہنچی۔ انہوں نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی سے رابطہ کیا اور اس طرح ادھر ادھر بھٹکتی آواز کو ایک سمت مل گئی۔

چوہدری صاحب نے اپنی کمپنی سے بیک وقت ان کے چار البم ریلیز کر ڈالے اور یہ چاروں ہی سال کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے البم قرار پائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آواز ملک کے کونے کونے میں گونجنے لگی۔ ہر گلی، محلے، ٹیکسی، ٹرک، رکشا، یہاں تک کہ کراچی کی سڑکوں پر گدھا گاڑی چلانے والے بھی اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر رکھ کر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی پرسوز آواز کے سحر میں کھوتے چلے گئے۔ مارکیٹ میں میوزک شاپس، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی کیسٹوں سے بھری ہوئی تھیں اور وہاں کسی دوسری البم کے لیے گنجائش موجود نہیں تھی۔ ان کی یہ شہرت و مقبولیت اس لحاظ سے بے مثال تھی کہ اس وقت تک انہیں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے اپنے فن کے جوہر دکھانے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا تھا گوکہ انہوں نے 1972ء میں ریڈیو پاکستان بہاولپور سے گلوکاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ان کی آواز بہت زیادہ سامعین تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ویسے بھی ٹیلی وژن کے آنے کے بعد ریڈیو سننے والوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی اور ریڈیو کا دائرہ صرف ان جگہوں تک محدود ہوکر رہ گیا تھا جہاں ٹیلی وژن کی پہنچ نہیں تھی۔

اسی سال انہوں نے میانوالی کے ایک کنسرٹ میں اپنی گائیکی کے جوہر دکھائے۔ یہ ان کی پہلی پبلک پرفارمنس تھی۔ اس وقت تک ان کا کوئی البم ریلیز نہیں ہوا تھا اور لوگ ان کی غزلیں و گیت کیسٹ پر ریکارڈ کر کے دوستوں کو سنواتے تھے۔ اس کنسرٹ کے بعد عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی شہرت میانوالی کے گھروں اور گلی کوچوں میں پھیل گئی پھر اس کی گونج ان کے اپنے گھر تک کیوں نہ پہنچتی؟ جس کا نتیجہ ایک ہنگامے کی صورت میں برپا ہوا۔ ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ عطاء اللہ کو گھر اور موسیقی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ عطاء اللہ گائیکی سے رشتہ نہیں توڑ سکتے تھے کیونکہ یہ ان کے درد کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ درد جو کسی بے وفا کے طفیل ان کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اس چہرے کو نہ بھلا سکے جس نے انہیں عشق کی کسک اور درد کی لذت سے آشنا کیا تھا۔ اگر وہ گانا چھوڑ دیتے تو ان کی آواز سینے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی اور ادھر زندگی کا جنازہ اٹھے گا، جیسا شہرہ آفاق گیت تخلیق نہ ہو پاتا۔ چنانچہ انہوں نے دوسرا راستہ چنا اور اپنے درد کو سینے میں دبائے اس پر چل دیے جس کی منزل کا انہیں کوئی علم نہیں تھا۔

1973ء میں وہ پہلی بار چھوٹے پردے پر نمودار ہوئے۔ انہیں طارق عزیز نے اپنے شو نیلام گھر میں مدعو کیا تھا۔ اس طرح پہلی بار ٹی وی کے ناظرین عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے فن اور شخصیت سے روشناس ہوئے۔ اس وقت تک بھی ٹیلی وژن نشریات کا دائرہ بہت محدود تھا اور سیٹلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے یہ چند شہروں میں ہی دیکھی جا سکتی تھی۔

تاہم موسیقی سے شد بد رکھنے والے جان گئے کہ عطا اللہ خاں کی شکل میں ایک ہونہار گلوکار جنم لے چکا ہے۔

کہتے ہیں کہ عزم پختہ اور ارادہ نیک ہو تو راستے کی دشواریاں خود بہ خود دور ہو جاتی ہیں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی گھر سے تو چلے آئے لیکن ان کے سامنے کوئی واضح منزل نہ تھی۔ ناز و نعم میں زندگی گزارنے والا یہ نوجوان اپنی گزر اوقات کے لیے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی دوران میں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ تعلیم کے بغیر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا ممکن نہیں چنانچہ انہوں نے پہلے فیصل آباد سے ایف اے اور پھر میانوالی سے بی اے کیا۔ آخر کار ان کی دعائیں اور ان کی جدوجہد رنگ لائی۔ اس وقت تک عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی گلوکاری کیسٹ تک محدود تھی۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے عوام تک اپنا فن پہنچانے کی کوشش کی لیکن انہیں اس کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت تک انہیں موسیقی کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ بس گلے میں سوز تھا جسے وہ اللہ کی نعمت قرار دیتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کی باری تو اس وقت آئی جب عوام نے قبولیت کی سند دے دی۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ کسی بھی فنکار کو مقبولیت و شہرت حاصل کرنے کے لیے ریڈیو، ٹیلی وژن یا فلم کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس کے لیے انہیں موسیقاروں، شاعروں اور پروڈیوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنا پڑتی ہیں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی جیسا خود دار اور غیرت مند انسان یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا چنانچہ انہوں نے کیسٹ کے ذریعے لوگوں تک اپنی آواز پہنچائی اور اس میں کامیاب رہے۔ انہوں نے کیسٹ کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آواز

پاکستان اور بیرونِ ملک میں گونجنے لگی۔

پردیس میں بسنے والے پاکستانیوں کے لیے یہ ایک انوکھی اور منفرد آواز تھی۔ اس سے پہلے کیسٹ کی دنیا میں کسی گلوکار نے اپنا رنگ نہیں جمایا تھا۔ صرف مہدی حسن، غلام علی اور شوکت علی کی غزلیں اور گیت شوق سے سنے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ گلوکار سلیم جاوید بھی پاپ سنگنگ کے حوالے سے اپنا نام بنا رہے تھے۔ لیکن عطا اللہ عیسیٰ خیلوی ان سب سے آگے نکل چکے تھے اور صحیح معنوں میں انہوں نے کیسٹ کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا تھا، جس کی نظیر گزشتہ کئی دہائیوں میں نہیں ملتی۔ انہیں ریڈیو، ٹی وی کے کسی پروڈیوسر نے دریافت نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ 80 کی دہائی تک لوگوں کی آنکھ کا تارہ بن چکے تھے۔

رحمت گراموفون ہاؤس کمپنی نے ان کے بیک وقت چار البمز ریلیز کیے تو قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہوگئی۔ یہ البم فروخت کے اعتبار سے اس سال سرفہرست رہے۔ اس کے بعد عطا اللہ عیسیٰ خیلوی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شہرت کی دیوی ان پر مہربان ہوتی چلی گئی اور صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی وہ شوز کے لیے بلائے جانے لگے۔ پڑوسی ملک بھارت میں بھی ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگے جب ایک بھارتی فلم بے وفا صنم میں سونو نگم، انورادھا پوڈوال اور ادت نرائن نے ان کے مقبول نغموں کو اپنی آواز میں گایا۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے پاکستانی فلموں میں کام کیا اور گلوکاری بھی کی، انہوں نے آٹھ فلموں کے لیے پس پردہ گلوکاری کی اور تین فلموں دل لگی، زندگی اور سانول میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم دل لگی میں انہوں نے سلطان راہی کے چھوٹے بھائی کا رول پلے کیا تھا جس میں ان کا مشہور گانا دل لگایا تھا دل لگی کے لیے بھی شامل کیا گیا۔ دراصل یہ فلم انہوں نے سلطان راہی مرحوم کے کہنے پر ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ فلم ٹھگ بدمعاش میں ان کا مشہور گانا قمیص تیری کالی...... بھی انہی پر عکس بند کیا گیا کیونکہ اس زمانے میں زیادہ تر پنجابی فلموں میں سلطان راہی مرکزی کردار ادا کیا کرتے تھے اور ان پر گانا پکچرائز نہیں ہوتا تھا اس لیے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو فلموں میں زیادہ گانے کا موقع نہ مل سکا۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو عوامی یا غریبوں کا گلوکار کہا جاتا ہے اور وہ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ ان کے گانوں نے لوگوں کے جذبات کو زبان دی اور ان کے گیت سن کر ہر کس و ناکس اپنے غموں کی کسک محسوس کرنے لگتا ہے۔ ویسے تو انہیں عالی شان کوٹھیوں کے ڈرائنگ روم میں بھی سنا جاتا ہے لیکن غریبوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیتا جبکہ امراء کے لیے ایسا کرنا مشکل ہے ورنہ دکھ سکھ تو سب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کیا امیروں کو عشق نہیں ہوتا، کیا وہ اس آگ میں نہیں جلتے لیکن اپنے رکھ رکھاؤ اور سماجی حیثیت کے پیشِ نظر اس کا اظہار نہیں کر پاتے جبکہ عام آدمی عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے کیسٹ سن کر خود بھی درد کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ یہ ہی اس کے دل کی آواز ہے۔

انہیں حکومت اور سرکاری اداروں سے کوئی شکایت نہیں اور وہ مطمئن ہیں کہ عوام نے انہیں بہت محبت دی ہے۔ البتہ ان کا کہنا ہے کہ جو قومیں اپنے سینئرز کو بھول جاتی ہیں اور انہیں جائز مقام نہیں دیتیں وہ دراصل ان کی ناقدری کر رہی ہوتی ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ سینئرز کے تجربہ سے استفادہ کرنے کے لیے ان کی خدمات کسی ادارے کے سپرد کردی جائیں تاکہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں نئے آنے والوں کی راہنمائی کرسکیں۔ چاہے ان کا تعلق فنون لطیفہ کی کسی بھی شاخ سے ہو۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو شکوہ ہے کہ سرکاری دفاتر میں چپڑاسی کو بھی ریٹائر ہونے کے پنشن ملتی ہے لیکن فن کاروں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ انہوں نے چالیس برس فن کی خدمت کی اور زندگی بھر حکومت کو ٹیکس دیتے رہے۔ آج بھی وہ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ تاہم وہ چاہتے ہیں کہ سرکار کی سرپرستی میں انہیں فن کی خدمت کرنے کا موقع ملے اور اس کے لیے وہ پی ٹی وی پر پروگرام کرنے کے لیے تیار ہیں۔

انہوں نے کبھی کسی موسیقار یا گلوکار کی شاگردی نہیں کی اور نہ ہی ان کا کوئی شاگرد ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو صاحب علم نہیں بلکہ لوک گلوکار سمجھتے ہیں اور بقول ان کے فوک تو سبھی کو آتا ہے، ماں اپنے بچے کو جو لوری سناتی ہے وہ بھی فوک ہے اگر میں نے خود باقاعدہ کسی استاد سے سیکھا ہوتا اور موسیقی کے حروف ابجد سے واقف ہوتا تو ضرور شاگرد بناتا۔ میں تو خود ابھی تک سیکھ رہا ہوں۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو اپنے سبھی گانے پسند ہیں۔ البتہ سب مایا ہے...... ان کے اپنے تجربات کی عکاسی اور زندگی کی کہانی ہے۔ وہ اس کیفیت سے ذاتی طور پر گزر چکے ہیں، جب گانا گانے کی پاداش میں انہیں گھر سے نکلنا پڑا اور انہوں نے اپنی الگ دنیا بسالی۔ وہ اب بھی اپنے گھر سے دور ہیں۔ گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

اور خاندان والوں نے ابھی تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ یہ گانا گاتے ہوئے ان کے اپنے جذبات اس میں شامل ہوتے ہیں۔

شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر پہنچنے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ فن کی آبرو کا خیال رکھا اور یہی کوشش کی کہ کہیں ایسا کام نہ ہو جائے جس سے ان کی قوم، قبیلے یا ذات پر کوئی حرف آئے۔ انہوں نے فن کی بے لوث خدمت کی ہے اور ایک بھرپور زندگی گزارنے پر مطمئن ہیں۔ یہی وجہ کہ ان کا حلقۂ احباب بے حد وسیع ہے، عوام کے علاوہ سول بیوروکریسی اور فوج میں بھی انہیں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ انہوں نے فوج کے بہت سے کنسرٹ کیے ہیں۔

1982ء میں انہیں تمغہ حسن کارکردگی اور دو مرتبہ پی ٹی وی ایوارڈ مل چکا ہے لیکن اصل ایوارڈ تو عوام کی پسندیدگی ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ انہیں اندرون ملک اور بیرونِ ملک بہت محبت اور شوق سے سنا جاتا ہے۔ بلوچستان میں بھی ان کے سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں سبی میں ہونے والے سالانہ میلے میں ہر سال بلایا جاتا ہے۔ انہیں وہاں بھی بہت زیادہ پیار اور محبت ملی۔

انہوں نے موسیقی کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، گیت، نظم، ماہیا، ٹپہ، آزاد بولیاں سب کچھ گایا ہے۔ انہیں بڑے بڑے موسیقاروں اور گلوکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے بابا جی اے چشتی سے لے کر آج تک جتنے بھی بڑے موسیقار ہیں، ان کے ساتھ کام کیا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتے ہیں۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی چاہتے ہیں کہ میڈیا نئے گلوکاروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ سینئرز کو بھی نظر انداز نہ کرے۔ اگر انہیں ٹی وی پر نہیں بلایا جائے گا تو نئی نسل ان کے بارے میں کیسے جان پائے گی؟ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ریشماں، مہدی حسن، اے نیر، شوکت علی اور غلام علی کا فن موسیقی میں کیا کردار ہے؟

وہ نئے فن کاروں کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ بہت سارے چینلز کی وجہ سے میڈیا تک ان کی رسائی آسان ہو گئی ہے؟ ورنہ وہ خود ریڈیو اور ٹی وی تک کیسے پہنچے؟ اس پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ البتہ وہ ان کی گائیکی کے معیار سے مطمئن نہیں۔ ان کے خیال میں محنت اور جنون کی کمی ہے۔ لباس اور اُچھل کود پر توجہ دی جا رہی ہے۔ اگر موسیقی کے شائقین کو یہی پسند ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ ٹھیک ہے۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو کبھی زندگی میں کوئی پچھتاوا نہیں ہوا لیکن عشق کی ناکامی نے انہیں اس حد تک تلخ بنا دیا ہے کہ وہ ارینج میرج اور لو میرج دونوں کو ہی فضول سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں جو غلطی انہوں نے کی وہ دوسرے بھی کریں، غلط فیصلوں کا انجام ہمیشہ سہنا پڑتا ہے اور وہ بھی آج تک اس غلط فیصلے کی چبھن محسوس کر رہے ہیں۔

عطا اللہ عیسیٰ خیلوی نے اپنی گائیکی کی بدولت بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ دنیا بھر میں ان کے لاکھوں پرستار ہیں۔ وہ کیسٹ کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ان کے چار سو سے زیادہ البم ریلیز ہو چکے ہیں۔ انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے پرائڈ آف پرفارمنس مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ کینیڈا اسے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور امریکا سے بھی متعدد اعزازات مل چکے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تمام کامیابی اور شہرت کے باوجود ان کی ذاتی زندگی میں تشنگی کیوں پائی جاتی ہے؟ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں پانچ شادیوں پر مجبور کیا؟ پہلی شادی برادری میں ہوئی جو جلد ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ایک شادی کینیڈا میں کی۔ وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ تیسری شادی فلم اسٹار بازغہ سے ہوئی جس سے ان کے تین بچے ہیں۔ تینوں بچے اپنی ماں بازغہ کے ساتھ کینیڈا ہی میں مقیم ہیں۔ اسی دوران پاکستان میں دو شادیاں اور کیں۔ جن میں سے ایک جلد ہی ختم ہو گئی۔ دوسری ان کے ساتھ لاہور میں ہی مقیم ہے۔ حال ہی میں ایک انٹرویو کے دوران جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا۔

”جان بوجھ کر اپنے آپ کو برباد کوئی نہیں کرتا۔ گھر بنانا بڑا مشکل ہے اور اس کا ٹوٹنا کسی قدر غم انگیز ہوتا ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس پر گزرتی ہے۔“

عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کی ذاتی زندگی میں عشق کی ناکامی کا بھی اہم کردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں اوائل نوجوانی میں کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس میں ناکامی ہوئی۔ اس بارے میں بہت سی من گھڑت کہانیاں بھی پھیلا دی گئی ہیں جن پر کسی طرح بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ انٹرنیٹ پر موجود ان گمراہ کن کہانیوں پر بالکل توجہ نہ دیں جن پر ہرگز ہرگز یقین نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل اس لڑکی کا تعلق دوسری فیملی سے تھا اور گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ خاندان سے باہر اس فیملی میں رشتہ مانگنے نہیں جائیں گے جبکہ لڑکی والے انہیں اکیلا قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس طرح بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اس لڑکی کی شادی دوسری جگہ ہو گئی اور عطا اللہ عیسیٰ خیلوی اس درد کو لے کر گھر سے چل دیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی گلوکاری میں جو درد اور سوز نظر آتا ہے، اس کی بڑی وجہ عشق کی ناکامی ہے۔ اس کا اعتراف انہوں نے ایک حالیہ انٹرویو میں خود کیا ہے۔

”گلوکاری کے جراثیم تو روح میں موجود تھے، ہاں البتہ عشق کی ناکامی نے اس سوز کو جو میری گلوکاری میں تھا، درد سے بھر دیا۔“

اس سوز میں ذاتی زندگی کی تلخیاں بھی شامل ہیں۔ جب انہوں نے گانا شروع کیا تو خاندان والوں نے بڑی مخالفت کی اور ان پر زور دیا کہ وہ گلوکاری چھوڑ دیں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے گلوکاری تو نہیں چھوڑی البتہ گھر چھوڑ دیا۔ اپنی آواز کے درد اور سوز کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

”صلاحیت تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے لیکن اس کے اظہار کے لیے تحریک کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب آپ اپنے فن سے عشق کریں۔ عشق کی بھی مختلف اقسام یا شکلیں ہیں۔ میرے گاؤں میں آج بھی قبائلی نظام رائج ہے۔ اس نظام کے خلاف بغاوت کرنا اور یہاں تک پہنچنا عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ میرے خاندان میں کئی لڑکے گاتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے شوق کو دوستوں کی محفل تک محدود کر رکھا ہے۔ جبکہ میری تسکین اس سے نہیں ہوتی تھی۔ جوانی میں کون عشق نہیں کرتا، میں نے بھی عشق کیا کیونکہ عشق کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے عشق میں چوٹ کھا کر اپنے محبوب کے لیے گانا شروع کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گانا تو میں پہلے ہی شروع کر چکا تھا۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے نہ پانے کا غم میرے دل کا روگ بن گیا جس کی کسک آواز میں در آئی اور آج بھی مجھے چین نہیں لینے دیتی۔“

عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے ناکام عشق کے بارے میں انٹرنیٹ پر انتہائی گمراہ کن کہانیاں پھیلا دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے بدخواہوں اور حاسدوں کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ بولی وڈ کی فلم بے وفا صنم، میں بھارتی گلوکاروں نے ان کے نغمے گائے تو کہہ دیا گیا کہ اس فلم کی کہانی عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کی زندگی کے گرد گھومتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس فلم کا مرکزی کردار سندر سہگل اپنے باپ کی طرح بڑا ایکٹر بننا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں شیتل نامی لڑکی داخل ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ سندر کی ماں بھی اس رشتے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ سندر جلد ہی ایک مشہور ایکٹر بن جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں گوتم بھی شامل ہے۔ وہ سندر کو تباہ کرنے کے لیے شیتل کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بناتا ہے۔ شیتل اس کی امارت اور چکنی چپڑی باتوں سے متاثر ہو کر اس منصوبے میں شریک ہو جاتی ہے۔ وہ اسے سبق سکھانے کے لیے غنڈے بھیجتے ہیں لیکن سندر انہیں مار پیٹ کر بھگا دیتا ہے جس کے نتیجے میں اسے جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ یہیں اسے معلوم ہوتا ہے کہ شیتل وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے۔ جیل سے رہا ہو کر آتا ہے تو اسے شیتل اور گوتم کی شادی کی خبر ملتی ہے۔ وہ غصے کے عالم میں بھرا ہوا پستول لے کر شادی کے منڈپ میں پہنچ جاتا ہے اور بھرے مجمع میں شیتل پر فائر کر کے اسے قتل کر دیتا ہے۔

اس کہانی کا عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کی ذاتی زندگی یا ناکام عشق سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا کوئی رقیب تھا اور نہ ہی انہوں نے کسی کو قتل کیا۔ اس سلسلے میں قارئین کی توجہ کے لیے ایک اہم نکتہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ دراصل بھارت میں فلم کی ریلیز سے پہلے اس کی پروموشن پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے۔ اس طرح کئی کمزور فلمیں بھی کامیاب پروموشن کے نتیجے میں ہٹ ہو جاتی ہیں بلکہ کچھ ہوشیار فلم میکر فلم کی شوٹنگ کے دوران ہی کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے عام فلم بینوں کی دلچسپی مذکورہ فلم میں بڑھ جاتی ہے اور وہ بے چینی سے اس کی ریلیز کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ کبھی فلم کے ہیرو اور ہیروئن کے درمیان اسکینڈل بنا دیا جاتا ہے اور اس حوالے سے اخبارات کو چٹپٹی خبریں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہیرو، ہیروئن کے ساتھ فلم کو بھی مفت کی پبلسٹی ملتی رہتی ہے۔ اس سلسلے کی تازہ مثال فلم راک اسٹار کے ہیرو رنبیر کپور اور ہیروئن نرگس فخری کا اسکینڈل ہے جو فلم کی شوٹنگ کے دوران میڈیا کی زینت بنتا رہا لیکن فلم کی ریلیز کے بعد ان دونوں ستاروں کی راہیں جدا ہو گئیں۔

یہ معاملہ اسکینڈلز تک ہی محدود نہیں بلکہ بھارتی فلم ساز بعض اوقات کسی اہم واقعہ یا شخصیت کو لے کر اس کا تعلق اپنی فلم سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہی کچھ بے وفا صنم کے فلم ساز نے بھی کیا۔ ان دنوں عطا اللہ عیسیٰ خیلوی پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بھارت اور مشرق وسطیٰ میں بھی تیزی سے مقبولیت اور شہرت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ بھارت کے طول و عرض میں ان کے کیسٹ بڑے ذوق و شوق سے سنے جا رہے تھے اور انہوں نے مقبولیت کے اعتبار سے بھارت کے چوٹی کے غزل سنگر

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

جُلجیت سنگھ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بے وفا صنم، کے فلم ساز نے عطااللہ عیسیٰ خیلوی کی شہرت کو کیش کراتے ہوئے اپنی فلم میں ان کے مقبول گانے سونو نگم وغیرہ کی آواز میں ریکارڈ کروائے اور ساتھ ہی یہ پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ یہ فلم عطااللہ عیسیٰ خیلوی کے ناکام عشق کی کہانی پر مبنی ہے۔ بس پھر کیا تھا بھارت کے لاکھوں کروڑوں فلم بینوں کے لیے یہ فلم پرکشش ہوگئی اور وہ بے چینی سے اس فلم کی ریلیز کا انتظار کرنے لگے۔

یہ فلم ٹی سیریز کے گلشن کمار نے بنائی تھی اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کرشن کمار کو بہ طور ہیرو کاسٹ کیا تھا۔ وہ اس فلم کو ہر قیمت پر کامیاب دیکھنا چاہتا تھا تاکہ کرشن کمار کے لیے بولی ووڈ میں قدم جمانا آسان ہوجائے۔ عطااللہ عیسیٰ خیلوی کا نام استعمال کر کے وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی فلم کمزور کہانی اور ناکارہ ڈائریکشن کے باوجود غیر متوقع طور پر ہٹ رہی جس کا سارا کریڈٹ عطااللہ عیسیٰ خیلوی کو جاتا ہے البتہ فلم کی ریلیز کے بعد لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ یہ ایک سنگر کی نہیں بلکہ کرکٹر کی کہانی تھی اور اس کا پاکستانی لوک سنگر کی ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ گلشن کمار نے فلم بینوں کے ساتھ دھوکا کیا اور جھوٹ بول کر اپنی فلم کامیاب کروائی۔ اصولاً تو اس فلم کو فلاپ ہوجانا چاہیے تھا لیکن بھارت بہت بڑا ملک ہے اور وہاں ہر فلم بیک وقت ہزاروں سینما گھروں میں ریلیز ہوتی ہے۔ اس لیے اگر اچھی پبلسٹی کی جائے تو کم بجٹ کی فلمیں بہ آسانی ایک یا دو ہفتے میں اپنی لاگت پوری کر لیتی ہیں۔ یہ فلم تو عطااللہ عیسیٰ خیلوی کے نام پر کامیاب ہوگئی لیکن اس کے بعد کرشن کمار کو کسی نے نہیں پوچھا، بے وفا صنم اس کے کیریئر کی پہلی اور آخری ہٹ فلم تھی۔

بھارتی گلوکاروں نے بھی دل کھول کر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے گانوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا "جی ہاں، بہت زیادہ گانے چوری ہوئے ہیں۔ فلم بے وفا صنم، میں تو سارے کے سارے گانے میرے ہی تھے بلکہ اس فلم کے بارے میں تو یہ بھی مشہور ہوگیا تھا کہ اس فلم کی کہانی میری زندگی کے گرد گھومتی ہے حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بہت سے بھارتی گلوکاروں نے میرے گانے گائے۔ سونو نگم نے تو تسلیم بھی کیا کہ وہ میرے ہی گانے گا کر مشہور ہوا ہے۔

اس فلم کے بارے میں تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ قارئین، عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے بارے میں پھیلائی جانے والی گمراہ کن کہانیوں کی حقیقت سے آگاہ ہوجائیں۔

افسوس تو ان پاکستانی ویب سائٹس پر ہوتا ہے جو سوچے سمجھے اور تحقیق کیے بغیر نقل کر دیتی ہیں۔ ان کا مفاد صرف ایک کلک میں ہے انہیں معلوم ہے کہ عطااللہ عیسیٰ خیلوی کے ناکام عشق کے بارے میں جاننے کی خواہش ہر کسی کو ہوگی اور لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس ویب سائٹ کو کلک کریں گے جس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ ہوسِ زر میں مبتلا لوگ یہ نہیں جانتے کہ ان کے اس عمل سے کسی شریف اور نامور شخصیت کی شہرت اور ساکھ کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ایسی تمام ویب سائٹس کو بلاک کر دینا چاہیے جن پر بنا تحقیق بے بنیاد اور گمراہ کن مواد شائع کیا جاتا ہے۔

ہم اپنے قارئین سے بھی التماس کریں گے کہ وہ انٹرنیٹ پر موجود ان بے سروپا کہانیوں پر بالکل بھی یقین نہ کریں۔ اس ناکام عشق کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے اور جسے ہم اک بار پھر دہرا رہے ہیں کہ عطااللہ عیسیٰ خیلوی کا پہلا عشق صرف اس لیے ناکام ہوا کہ لڑکی کا تعلق دوسرے خاندان سے تھا اور ان کے گھر والے دوسرے خاندان میں رشتہ کرنے پر تیار نہ تھے۔

عطااللہ عیسیٰ خیلوی کا عشق تو ناکام ہوگیا لیکن انہیں عمر بھر کے لیے ایسے درد سے آشنا کر گیا جس نے ان کے گلے کے سوز کو دوآتشہ کر دیا۔ ان کی بے پناہ شہرت اور مقبولیت کا یہی راز ہے کہ ان کی آواز میں جو درد اور سوز پنہاں ہے، وہ برصغیر پاک و ہند کے کسی گلوکار یا گلوکارہ کے حصے میں نہیں آیا۔ دوسرے سنگر دماغ سے گاتے ہیں جبکہ عطااللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ انہیں ذاتی زندگی میں تو سکون نہیں ملا لیکن فنی زندگی میں بھی وہ اوجِ کمال کو پہنچ گئے اور یہ اسی درد کا اعجاز ہے جو عشق کی ناکامی نے انہیں بخشا۔ وہ آج بھی پوری توانائی اور جوش و جذبہ کے ساتھ فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ شادی نہ ہونا عشق کی ناکامی نہیں، عشق کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ میرا عشق بھی ذات برادری کا شکار ہوگیا۔ میں اگر کورٹ میرج کر لیتا تو اپنی اولاد کو کیا منہ دکھاتا۔" یہ شرافت کی دلیل ہے کہ اس نے ایک شریف خاندان کو بدنامی سے بچا رکھا ہے۔ لڑکی کا نام کسی طور سامنے نہیں آنے دیتا۔ ہماری دعا ہے کہ ناکام عشق کی یہ کسک ہمیشہ ان کے دل میں موجود رہے تاکہ آئندہ بھی اس کے درد سے ہم آہنگ سوز میں ڈوبے ہوئے شاہکار گیت اور غزلیں تخلیق ہوتی رہیں۔

عشق بے چین

منظرامام

اس دنیا میں عجب عجب کھیل کھیلے جاتے ہیں اور ہم سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو بااختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیاری کا کرب جھیل رہے ہوتے ہیں۔ عزت، دولت، شہرت ان کا مقدر ہوتی ہے مگر وہ دل کی دنیا آباد نہیں کرسکتے۔ صنم خانۂ دل ویران کا ویران رہتا ہے۔ کبھی کوئی آکر درِ دل پر دستک بھی نہیں دیتا لیکن جب یہ اپنی چیختی تنہائی کا مداوا نہیں کرسکتے تو یہ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں مدھوبالا کا نام آتا ہے۔ پردۂ سیمیں کی یہ نامور اداکارہ کس طرح محبت کی منزل پر پہنچ کر بھی ناکام رہی۔

ماضی کی ایک نامور اداکارہ کا قصہ مآل، غمِ عشق کا احوال

عشق ناکام نمبر

ناکام محبت کی ملکہ اگر کسی کو کہا جاسکتا ہے تو بلاشبہ اسی کو کہا جاسکتا ہے۔

کروڑوں دلوں پر وہ راج کرنے والی تھی، پردۂ اسکرین پر اس کی ایک جھلک دیکھ کر لوگ پاگل ہوجاتے تھے۔ اس کی دلفریب مسکراہٹ نے لاکھوں کو دیوانہ کر رکھا تھا۔

اس کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت، شہرت لیکن اس کے پاس محبت نہیں تھی۔ جب وہ دو تین ہی سال کی تھی تو ایک

www.paksociety.com

بابا نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی آگے چل کر بہت نامور ہوگی۔ بہت پیسے والی ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی بہت بدقسمت بھی ہوگی۔

اس بابا کو کشمیر والے بابا کہا جاتا تھا اور وہ بچی تھی ممتاز جہاں بیگم! جو 14 فروری 1933ء کو ایک پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئی۔

اس تاریخ کو ویلنٹائن ڈے کہا جاتا ہے اور شاید اسی لیے اس تاریخ کو پیدا ہونے والے یا تو محبت کو ترستے رہتے ہیں یا پھر محبت ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔

بہرحال جو بھی ہو، اس تاریخ کو پیدا ہونے والے محبت سے ضرور وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں بنتی ہیں اور وہ خود بھی کہانی کا کردار بن کر رہ جاتے ہیں۔

ممتاز جہاں بیگم اپنے ماں باپ کی اولادوں میں گیارہ میں سے پانچویں نمبر پر تھی۔ دیکھنے والے اسے دیکھتے اور خدا کی صناعی کی تعریف کرنے لگتے۔

وہ گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت تھی لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ اس بچی کے دل میں سوراخ تھا۔ یہ مرض تو آج کے دور میں بھی پریشان کن ہوا کرتا ہے جبکہ اس دور میں سرجری وغیرہ کی اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں۔

اس کے باپ کا نام عطاء اللہ تھا۔ ایک سخت گیر لیکن پیسوں کی ہوس رکھنے والا انسان۔ اس نے اپنی بچی کو فلم سازوں اور ڈائریکٹرز میں تو متعارف کروادیا لیکن کسی کو یہ نہیں بتایا کہ یہ دل کی مریضہ ہے۔ کیونکہ یہ بات کھلتی تو ممتاز جہاں بیگم کو کام نہیں ملتا۔ جس کو آگے چل کر مدھو بالا کے نام سے مشہور ہونا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی فلمی تاریخ میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہوسکی ہے اور نہ ہی کسی نے مدھو بالا جیسی مسکراہٹ پائی۔

کسی حد تک مادھوری، مدھو بالا جیسی خوبصورتی کی مالک تھی۔

مدھو بالا نے لاکھوں دلوں پر راج کیا تھا۔ کشمیر والے بابا کا کہا ہوا سچ ثابت ہو رہا تھا۔ مدھو بالا کو عزت، دولت اور شہرت تو مل چکی تھی لیکن محبت کے معاملے میں وہ بدقسمت ہی رہی۔ اس کی خوبصورت مسکراہٹ کے پیچھے ایک روتا، کراہتا اور سسکتا ہوا دل تھا۔

دل کی بیماری ظاہری بھی تھی اور اندرونی بھی۔ اس نے کبھی کسی سے سچی محبت نہیں پائی۔ اس کا باپ کسی کو اس سے زیادہ ملنے نہیں دیتا تھا۔

اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ سونے کی چڑیا کہیں ا… کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

1960ء میں مدھو بالا کے دل کا عارضہ جب بہ… شدید ہوگیا تو وہ آپریشن کے لیے انگلینڈ چلی گئی لیکن وہ… ڈاکٹرز نے اس لیے آپریشن سے انکار کردیا کہ اس کی زند… کو خطرہ ہوسکتا تھا۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔

دل کا یہی مرض اس کے لیے موت کا سبب بن گیا… اس نے صرف 28 سال میں بیماری کی وجہ سے کام ک… ترک کردیا تھا۔

اس کا دل کام کی زیادتی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

اس نے آخری عمر میں وقتی سہارے کے لیے کشور کما… سے شادی کی تھی جو ایک فضول سی شادی تھی اور صرف ایک سال برقرار رہی۔

مدھو بالا کی زندگی کے نہ جانے کتنے دکھ بھرے پہ… تھے۔ اس کی گھریلو زندگی کے حوالے سے، اس کی ناکامیو… کے حوالے سے، اس کی محبتوں کے حوالے سے، اس کے جذبات، احساسات، اس کی امیدیں، اس کی خواہشات یہ سب سامنے نہیں آسکیں۔

اسے روزانہ ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ اس ڈائری میں وہ دن بھر گزرنے والے واقعات تحریر کردیا کرتی۔

اس ڈائری کی حیثیت مدھو بالا کی زندگی پر ایک دستاو… کی تھی لیکن افسوس، اس کی موت کے بعد اس کے باپ… اس ڈائری کو بھی اس کی قبر میں دفن کروادیا تھا۔ اس طر… اس کی زندگی کے نہ جانے کتنے گوشے گمنام ہوگئے اور شا… گمنام ہی رہیں گے۔

مدھو بالا ایک بے چین روح کی طرح تھی۔ نہ جانے و… کس کو تلاش کرتی تھی، محبتوں کا سفر اسے کبھی سکون نہیں دے سکا۔

مدھو بالا کی پہلی محبت اس کے بچپن کا دوست لطیف تھا… دونوں دہلی میں رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے پڑوس… تھے اور بچپن کی محبتوں کی ہزاروں لاکھوں کہانیوں کی طر… ان کی بھی کہانیاں تھیں۔

دونوں ایک ساتھ کھیلا کرتے، ایک دوسرے سے… جھگڑتے بھی تھے، پھر ایک دوسرے کو منانے کے جتن بھی… کیے جاتے۔

مدھو بالا لطیف سے بہت جھگڑے کرتی تھی۔ جبکہ لطیف… اس کی ہر بات کو ہنس کر ٹال دیا کرتا۔ یہ محبت شاید مدھو بالا کی جانب سے ہو یا نہ ہو لیکن لطیف کی جانب سے ضرور تھی۔

لطیف اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ اسکول سے آتے ہی وہ سیدھے مدھو بالا کے گھر آجاتا۔ پھر دونوں بچپن کی محبتوں اور شرارتوں میں مصروف ہو جاتے۔

لطیف کے لیے وہ دن قیامت کا تھا جب مدھو بالا اس سے الگ ہو رہی تھی۔ مدھو بالا کا باپ قسمت آزمائی کے لیے اپنی بیٹی کو بمبئی لے جا رہا تھا۔

مدھو بالا نے جاتے وقت لطیف کو سرخ گلاب کا ایک پھول پیش کیا تھا۔ لطیف نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے رخصت کیا تھا۔

لطیف کی محبت کی انتہا یہ تھی کہ گرچہ مدھو بالا اسے کبھی نہیں مل سکی لیکن اس گلاب کے پھول کو اس نے ایک چھوٹے سے شیشے کے بکس میں محفوظ کردیا تھا۔

اور جب اسے مدھو بالا کی موت کی خبر ملی تو اس نے قبرستان آکر وہی پھول اس کی قبر پر رکھ دیا۔ لطیف ایک بڑے آفیسر کی زندگی گزار کر اب ریٹائر ہوچکا ہے لیکن مدھو بالا کی برسی کے دن وہ خاص طور پر دہلی سے بمبئی آتا ہے اور اس کی قبر پر سرخ گلاب کا ایک پھول رکھ دیتا ہے۔

تو محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔

یہ مدھو بالا کی زندگی کا ایک پوشیدہ گوشہ ہے جس کا انکشاف اتفاقاً ہوگیا تھا۔

کیدار شرما

بہت بڑا فلم ڈائریکٹر، اس نے بہت شاندار فلمیں بنائیں۔ مدھو بالا کو پہلا موقع اسی نے دیا تھا۔ اس وقت مدھو بالا کی عمر بہت کم تھی اور جب اس کا اسکرین ٹیسٹ ہوا تو اس کو دیکھتے ہی کیدار شرما اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا۔

یہ پہلی نظر کی محبت تھی۔ کیدار شرما، مدھو بالا کے لیے جنونی سا ہوگیا تھا۔ وہ شوٹنگ سے فارغ ہوکر مدھو بالا کے ساتھ بیٹھ جاتا اور رومانوی باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتوں میں ادب کی چاشنی بھی ہوا کرتی۔

ہندوستان میں اس قسم کے ڈائریکٹر، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوا کرتے تھے۔ اگر انہوں نے ڈگری حاصل نہیں بھی کی ہوتی تو بھی ان کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ ہوا کرتا۔

کیدار شرما کو گفتگو کا سلیقہ آتا تھا۔ مدھو بالا اس زمانے میں اتنی کم عمر اور اتنی کم سمجھ تھی کہ شرما کی بہت سی باتیں اس کے پلے نہیں پڑتیں۔

وہ محبت کے مفہوم سے ناآشنا لڑکی تھی۔ وہ شرما کے پاس اس لیے بیٹھ جاتی کہ اسے شرما کی باتیں بہت اچھی لگتیں۔

اس کی باتیں مدھو بالا کو نہ جانے خوابوں کے کون سے جزیرے میں لے جاتیں؟ اس نے ایک بار بتایا تھا ''میں نے اس زمانے کے احساسات کو اپنی ڈائری میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ (یہ وہی ڈائری ہے، جس کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ جس ڈائری کو اس کے باپ نے اس کی لاش کے ساتھ دفن کروادیا تھا)

مدھو بالا کیدار شرما کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ گرچہ اس کے باپ کو یہ میل جول بہت برا لگتا تھا لیکن وہ اس لیے خاموش رہتا کہ کیدار شرما کے ذریعے مدھو بالا کو اور فلمیں ملنے والی تھیں۔

پھر کچھ لوگوں نے مدھو بالا کو سمجھایا ''دیکھو لڑکی! تم ابھی بہت کم عمر اور ناسمجھ ہو۔ تمہارے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ تمہیں ابھی بہت آگے جانا ہے۔ اگر تم ابھی سے ان چکروں میں پڑ گئیں تو تمہارا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔''

''لیکن شرما جی تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' وہ کہا کرتی۔

''بس اسی حد تک رہو کہ وہ تمہیں اچھے لگتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں، آئندہ تمہیں اور بھی اچھے لوگ مل جائیں گے۔''

مدھو بالا کو یہ مشورہ اچھا لگا اور وہ آہستہ آہستہ کیدار شرما سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ یہ کہانی ہی ختم ہوگئی۔

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

مدھو بالا نے کئی محبتیں کیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ اس کی محبتیں تھیں یا وہ اپنا اظہار چاہتی تھی۔ ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچتا۔ پھر وہ نہ جانے کیوں اس سے یا تو خود دور ہوجاتی، یا حالات اسے دور کردیتے۔

پریم ناتھ

یہ ایک بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ خوبصورت اداکاری کرنے والا۔ پریم ناتھ کی اداکاری آن میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ وہ زمانہ تھا جب پریم ناتھ کی فلم باولی بن رہی تھی۔ مدھوبالا اس میں ہیروئن کا کردار ادا کررہی تھی۔ بے چارہ پریم ناتھ اس کو دیکھ کر سکتے ہی میں رہ جایا کرتا تھا۔

مدھوبالا کا حسن ہی ایسا تھا کہ اس کو دیکھنے والے مبہوت ہوجایا کرتے۔

پریم ناتھ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔

وہ اس وقت میک اپ روم میں بیٹھا تھا جب مدھوبالا اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط اور گلاب کا ایک پھول تھا۔

اس نے وہ پھول پریم ناتھ کو دیتے ہوئے کہا ''میں آپ کو یہ خط بھی دے رہی ہوں، میرے میک اپ روم سے جانے کے بعد پڑھ لیجئے گا۔''

پریم ناتھ تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے گلاب کا پھول اور خط لے لیا۔ مدھوبالا میک اپ روم سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی پریم ناتھ نے بے تابی سے وہ خط کھولا۔ اس میں صرف ایک جملہ لکھا تھا ''میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ کیا آپ کو میری محبت قبول ہے۔''

''قبول ہے، قبول ہے۔'' پریم ناتھ خوشی سے چلانے لگا تھا۔ شاید ہندوستان کی سب سے خوبصورت لڑکی نے اس سے محبت کا اظہار کیا تھا اسے اور کیا چاہیے تھا؟

پھر وہ دونوں ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔ آہستہ آہستہ ان دونوں کے لیے کہانیاں بننے لگیں۔ اور ایک دن پریم ناتھ نے یہ دیکھ لیا کہ مدھوبالا اشوک کمار کو گلاب کا پھول اور ایک خط دے رہی ہے۔

یہ عجیب بات تھی۔

لیکن اس کا سبب جاننا کوئی اتنا دشوار نہیں ہے۔

مدھوبالا کو اس کے باپ نے دبا کر رکھا تھا۔ اس کے نزدیک وہ صرف پیسا کمانے کی مشین تھی۔ اور چونکہ مشین کے کوئی جذبات نہیں ہوتے اس لیے مدھوبالا کے بھی جذبات نہیں ہونے چاہئیں۔

باپ کے اس رویّے نے مدھوبالا میں ضد کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہرٹ کرنے کے لیے یہ سب کیا کرتی۔

اسی لیے اس نے کئی لوگوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر خود کو ان سے الگ بھی کرلیا۔ چاہے لطیف ہو، کیدار شرما ہو یا پریم ناتھ اور اشوک کمار۔ مدھوبالا نے ان میں سے کسی سے کوئی خاص فائدہ نہیں اُٹھایا۔ لیکن خود کو مزید اُداس اور [illegible] کرتی چلی گئی۔

وہ ایک بے چین روح کی طرح تھی اور کوئی نہیں جا[illegible] کہ بے چین روحوں کو کس کی تلاش ہوتی ہے۔ اس نے پر[یم] ناتھ کو گلاب کا پھول دیا اور ویسا ہی پھول اشوک کمار کو بھ[ی] دے دیا۔ پریم ناتھ نے اسی دن اس سے علیٰحدگی اختیار کر[لی] جبکہ اشوک کمار سے بھی اس کی دوستی زیادہ دنوں نہیں چل سک[ی] تھی۔

پھر ایک اور بڑا نام اس کی زندگی میں شامل ہوا۔ شاید پہلی بار معاملات اتنے آگے تک چلے گئے تھے او[ر] وہ نام تھا کمال امروہوی کا۔

کمال امروہوی فلمی دنیا کا ایک بڑا نام تھا۔ اس نے اپنی فلم محل کے لیے مدھوبالا کو کاسٹ کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ محل ہی نے مدھوبالا کو مدھوبالا بنایا تھا۔

فلم محل ایک سپرہٹ فلم تھی۔ اس فلم کی کہانی پُراسرار ماحول کے گرد گھومتی ہے۔ اس فلم میں مدھوبالا کے ساتھ اشوک کمار بھی تھا۔

اس سسپنس فلم کے سسپنس کو مزید بڑھانے کے لیے کمال امروہوی نے فلم کے ٹائٹل میں مدھوبالا کا نام نہیں دیا بلکہ ہیروئن کی جگہ صرف ایک لڑکی لکھا گیا تھا۔

یہ انداز بہت کامیاب ہوا۔ لوگ اس حسین لڑکی کے لیے پاگل ہوگئے جس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس فلم میں مدھوبالا پر فلمایا ہوا یہ گانا شاید ہمیشہ کے لیے امر ہوگیا ہے۔

''آئے گا، آئے گا، آئے گا...... آئے گا آنے والا......''

محل اپنی تکنیک، کہانی اور کردارنگاری کی وجہ سے ایک لاجواب فلم تھی۔ مدھوبالا کے حسن نے صرف فلم بینوں کو ہی متاثر نہیں کیا تھا بلکہ خود کمال امروہوی بھی اس کی زلفوں اور مسکراہٹ کا اسیر ہوگیا تھا۔

یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی تھی اور آج تک پُرانے لوگوں میں اس فلم کے چرچے ہیں۔ کمال امروہوی نے ہدایت کاری کا کمال دکھا دیا تھا۔

مدھوبالا کا کہنا ہے کہ اس کی زندگی کے سب سے خوشگوار لمحات وہی تھے جو اس نے کمال کے ساتھ گزارے۔

دونوں نہر کنارے جاکر بیٹھ جایا کرتے۔

یا کہیں ایسی جگہ چلے جاتے جہاں سے شہر کی روشنیاں جھلملاتی دکھائی دیتیں۔ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ اس زمانے میں زندگی ان کے بہت

قریب آ گئی تھی۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ مدھو بالا کے باپ کو اس عشق پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ یہ کہا کرتا کہ اگر دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو وہ رکاوٹ نہیں بنے گا۔

لیکن کمال کے ساتھ شادی پر خود مدھو بالا کو اعتراض تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کمال امروہوی شادی شدہ تھے۔ ایک بیوی پہلے سے موجود تھی اور مدھو بالا اپنی فطرت کے مطابق کسی اور کے ساتھ شراکت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

کمال اسے سمجھایا کرتے ”دیکھو مدھو۔ ہماری یہاں چار شادیوں کی اجازت ہے اور جب میں دونوں کو افورڈ کر سکتا ہوں، دونوں کے درمیان انصاف بھی کر سکتا ہوں تو پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟ اگر کہو تو میں تمہیں لکھ کر دے دوں؟“

ان سب کے باوجود مدھو بالا کی یہ ضد رہی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔ کمال امروہوی نے اس کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں کے درمیان دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔

مدھو بالا ایک بار پھر تنہا ہو چکی تھی۔

اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

ممتاز جہاں بیگم کو تو شاید کسی کی دیرپا محبت حاصل بھی ہو جاتی لیکن مدھو بالا اکیلی ہی رہی۔

اس کے بعد مدھو بالا کی زندگی میں ایک اور محبت شامل ہوئی۔

یہ شاید اس کی زندگی کی سب سے شاندار اور سب سے یادگار محبت تھی۔

یہ محبت بذاتِ خود ایک خوبصورت کہانی کی طرح خوبصورت اور بھرپور تھی۔ رومانس، قرب اور وصال کے لمحات سے بھری ہوئی۔

اس محبت نے مدھو بالا کے دل کے کئی دروازے کھول دیے۔ اس کے کئی بھید سامنے آ گئے اور پتا چلا کہ وہ کتنی بھرپور اور شدید محبت کرنے والی لڑکی تھی۔

اور وہ تھی مشہور اور عظیم اداکار دلیپ کمار سے محبت۔

مدھو بالا اس کے عشق میں اسی وقت سے گرفتار ہو گئی تھی جب وہ صرف سترہ سال کی تھی لیکن اسے کبھی دلیپ کے قریب ہونے یا اظہار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

شاید دلیپ کی ہی محبت کو اس نے اپنے تصور میں رکھ کر اوروں سے محبت کی تھی۔

تمام عمر تیرا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

پھر جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو مدھو بالا نے دلیپ کے قدموں میں اپنی محبت رکھ دی۔ یہ ایک لازوال محبت تھی۔ جس پر کئی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں، کئی فلمیں بن سکتی ہیں۔

دلیپ اور مدھو بالا بہت تیزی اور بہت شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے تھے لیکن ظالم سماج ان کی راہ میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اور وہ ظالم سماج تھا مدھو بالا کا لالچی باپ جس کے لیے سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ اگر مدھو بالا دلیپ کی ہو گئی تو پھر اس کا کیا بنے گا؟ اس کی عیاشیاں تو مدھو بالا کی وجہ سے تھیں۔ وہ یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا کہ سونے کی چڑیا اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔

اس نے ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا گوارا بھی نہیں کرتا تھا۔ مدھو بالا کے لیے یہ سختی سے حکم تھا کہ وہ دلیپ سے صرف کام کی بات کرے گی اور وہ بھی فلم کے سیٹ پر۔

شوٹنگ کے خاتمے کے بعد دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔

نہ جانے کیوں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مدھو بالا اپنے باپ سے بہت خوف زدہ رہتی تھی؟ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دلیپ کمار کو اسی لیے مدھو بالا کا باپ سخت ناپسند تھا کہ وہ خزانے کے کسی سانپ کی طرح اس کی نگرانی کیا کرتا۔ شوٹنگ کے دوران بھی اس کی آنکھیں اپنی بیٹی پر جمی رہتیں کہ وہ کہیں اوور تو نہیں ہو رہی یا محبت کے مکالمے بولتے ہوئے کہیں حقیقت کا رنگ تو نہیں آ رہا ہے۔

ان دونوں کا یہ عشق بہت دنوں تک چلتا رہا لیکن دونوں کھل کر کسی کے سامنے نہیں آ سکے تھے۔ اس کی وجہ مدھو بالا کا باپ تھا۔ وہ اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔

بالآخر اس عشق کا ڈراپ سین 1957ء میں اس وقت ہوا جب بی آر چوپڑہ اپنی لازوال فلم ”نیا دور“ بنا رہا تھا۔

اس فلم میں دلیپ کمار اور مدھو بالا دونوں کو سائن کیا

گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھ رکھی ہے، انہیں اچھی طرح یاد ہو گا کہ اس فلم کی شوٹنگ میدانوں اور دور افتادہ علاقوں میں کی گئی تھی۔

چالیس دن کا کام تھا۔

چالیس دنوں تک دلیپ کمار اور مدھو بالا کو بمبئی سے دور رہنا تھا اور یہ بات مدھو بالا کے باپ سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اور دلیپ کمار ایک ساتھ شہر سے باہر جائیں۔ اس نے بی آر چوپڑہ کو مشورہ بھی دیا کہ وہ فلم کی شوٹنگ بمبئی کے کسی اسٹوڈیو میں کر لے۔

لیکن اس فلم کی کہانی ایسی نہیں تھی کہ اسٹوڈیو میں فلمائی جا سکتی۔ اسی لیے چوپڑہ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

مدھو بالا کے باپ نے آخری حربے کے طور پر مدھو بالا کو اس فلم میں کام کرنے سے منع کر دیا۔ نہ جانے اس نے مدھو بالا کو کیسی دھمکی دی ہو گی یا کیا کہا ہو گا کہ اس بے چاری نے وہی کیا جو اس کے باپ نے کہا تھا۔

بی آر چوپڑہ کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا۔

اس نے فوری طور پر عدالت میں ان دونوں کے خلاف مقدمہ درج کرا دیا۔ کیس چلنے لگا۔ اور اسی کیس کے دوران مدھو بالا اور دلیپ کے عشق کی کہانی بھی سامنے آ گئی۔

عدالت نے جب مدھو بالا کے باپ سے سوال کیا کہ وہ اس فلم سے مدھو بالا کو کیوں الگ کر رہا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ دلیپ کمار کی وجہ سے کر رہا تھا۔

اس پر پتا چلا کہ دلیپ اور مدھو کے درمیان کیسے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دلیپ کمار بدنام ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے مدھو بالا کے باپ سے زیادہ مدھو بالا پر غصہ تھا کہ وہ اس دوران بالکل خاموش رہی۔ اس نے دلیپ کمار کے حق میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

بالآخر مدھو بالا کو پورے پیسے واپس کرنے پڑے تھے۔ بی آر چوپڑہ نے اس فلم میں مدھو بالا کی جگہ وجنتی مالا کو لے لیا اور جاننے والے جانتے ہیں یہ ایک کامیاب ترین فلم تھی۔

اس فلم کی کہانی، مکالمے، گانے، اداکاری، ہدایت کاری غرضیکہ فلم کا ہر شعبہ اپنی مثال آپ تھا۔ فلم تو....

ڈرپوک عاشق

ماضی کی ہیروئنوں میں ایک مشہور نام تھا ”ثریا“ بڑے آن بان کی تھی، بالکل شہزادیوں جیسا وقار تھا۔ اس کا ایک بھائی تھا شہزادہ افتخار۔ اس کی شکل صورت بھی اچھی تھی۔ اسے ثریا سے عشق ہو گیا۔ گو کہ یہ عشق یکطرفہ تھا مگر اس نے پورے برصغیر میں ہلچل مچا دی۔ اس نے ثریا کے گھر کے سامنے دھونی رمالی۔ ٹاٹ بچھا کر بیٹھ گیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جب تک ثریا اس سے شادی کا اعلان نہیں کرے گی وہ یہیں بیٹھا رہے گا۔ یہ خبر لاہور سے نکلی اور بمبئی فلم انڈسٹری تک پھیل گئی۔ اخباروں رسالوں میں تصویریں لگنے لگیں۔ صبح سے شام تک ثریا کے دروازے پر بھیڑ لگی رہتی۔ ثریا کے ماموں نے اسے ڈرایا دھمکایا۔ مگر شہزادہ افتخار بارسوخ آدمی تھا۔ رعب میں نہیں آیا۔ دیگر افراد نے بھی سمجھایا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ثریا شادی کے لیے ہاں کر دے۔ ثریا کے گھر والوں نے مجبور ہو کر جدن بائی سے فریاد کی۔ جدن بائی کا بمبئی فلم نگری پر راج تھا۔ بڑے بڑے لوگ ان سے دبتے تھے۔ وہ فوراً مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ انہوں نے شہزادہ افتخار کو بلوایا اور بے نقط سنائیں پھر اس کی بہن کو بلوا کر کہا کہ اگر افتخار نے روش نہ بدلی تو اسے بہت بُرا دن دیکھنا پڑے گا۔ شہزادہ افتخار نے اپنی داستانِ محبت کو ناکامی کے قفل میں بند کیا اور گھر لوٹ گیا۔ مگر مرتے دم تک وہ ثریا کے نام کا ورد کرتا رہا۔

اقتباس: اوج ثریا از آشنا

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

بے انتہا کامیاب ہوئی لیکن ان دونوں کی محبت ناکام ہوگئی تھی۔

اس کے بعد دلیپ کمار مدھوبالا سے دور ہوتا چلا گیا۔

دونوں کے درمیان گہری خلیج حائل ہوگئی۔

لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔

ان دونوں نے کے آصف کی لازوال فلم مغل اعظم سائن کر رکھی تھی جس کی شوٹنگ کا دورانیہ بڑھتا جارہا تھا۔ بالآخر یہ فلم دس برسوں میں جا کر مکمل ہوئی۔

اب اندازہ کرلیں کہ اس دوران میں دونوں کے درمیان دوریاں تھیں، تلخیاں تھیں، لیکن اسکرین پر آپ کو کہیں بھی اس کا احساس نہیں ہو پائے گا۔

دونوں نے محبت کے مناظر میں ڈوب کر اداکاری کی تھی۔ ان کی آنکھیں، حرکات، سکنات سب کے سب یہ گواہی دے رہے تھے کہ شہزادہ سلیم اور انارکلی ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں جبکہ دلیپ اور مدھوبالا دونوں ایک دوسرے سے دور تھے۔

تو یہ ہے فن اور ایسے تھے فنکار کہ انہوں نے یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ ان کے درمیان کیا چل رہا ہے؟ انہیں اداکاری کرنی تھی، شہزادہ سلیم اور انارکلی کی محبت کو لازوال کرنا تھا اور وہ کر دکھایا۔

مدھوبالا نے اس فلم میں جذبات نگاری کا کمال دکھا دیا ہے۔ اس فلم کا ہر فریم موتیوں کی طرح سجا ہوا ہے۔ اب نہ تو ایسے فنکار ہیں اور نہ ہی ایسی فلمیں بنتی ہیں۔

اس کے بعد مدھوبالا کو ایک اور بانکا سجیلا شخص پسند آ گیا تھا۔

وہ ایک دولت مند، پڑھا لکھا، خوبصورت اور ذہین انسان تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ عزت، دولت، شہرت۔ وہ جب باتیں کرتا تو مدھوبالا سحر زدہ سی ہو کر اس کی باتیں سنتی رہتی۔

وہ شروع سے ایک بڑا آدمی تھا اور اس کی موت نے اسے اور بھی بڑا بنا دیا ہے۔

اور وہ آدمی تھا، ذوالفقار علی بھٹو۔

جی ہاں، وہی بھٹو جسے آگے چل کر پاکستان کا وزیراعظم بننا تھا۔ مدھوبالا ان کی مقناطیسی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوگئی تھی۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ 1950ء تک بھٹو صاحب پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ رہتے تھے۔ لاڑکانہ میں ان کے آباؤ اجداد کی وسیع وعریض زمینیں تھیں جبکہ بمبئی میں وہ بیرسٹری کی پریکٹس کیا کرتے۔

وہاں بھی پوش علاقوں باندرہ میں ان کے شاندار مکانات تھے۔ خدا نے انہیں سب کچھ دے رکھا تھا۔ مدھوبالا نے انہیں اس وقت دیکھا جب مغل اعظم کا مشہور گانا ”موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گیو رے“ فلمایا جارہا تھا۔

راگ پیلو میں مرتب کردہ اس گانے کی دھن، اس کی پکچرائزیشن اور مدھوبالا کے حسن نے بھٹو صاحب کو مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب گھنٹوں بے خودی کے عالم میں بیٹھے دیکھتے رہتے تھے۔ اس دوران مدھوبالا سے ان کی جان پہچان ہوگئی۔

مدھوبالا بھی ان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ دونوں اکثر لنچ کے لیے بھی جایا کرتے تھے۔ بھٹو صاحب کی دلچسپ اور ذہانت آمیز باتیں مدھوبالا کے لیے ایک شاندار تجربے کی طرح تھیں۔

یہ کہانی اس وقت اپنے انجام کو نہیں پہنچ سکی کیونکہ بھٹو صاحب پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں انہیں پاکستان کی سیاست میں ایک بڑا کردار ادا کرنا تھا۔

بہرحال، اس کے بعد مدھوبالا نے کشور کمار سے شادی کرلی۔

یہ شادی کیوں ہوئی؟ یہ راز بھی کوئی نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ کشور کمار نے پیسوں کے لیے شادی کی تھی۔

کیونکہ اس وقت کشور کمار پر لاکھوں کے ٹیکس واجب تھے اور ادائیگی کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

مدھوبالا نے اس کی بہت مدد کی۔ اسے اس گرداب سے نکالا۔ ہوسکتا تھا کہ دونوں کی زندگی کسی طرح گزر جاتی لیکن مدھوبالا کے دیرینہ مرض نے اسے جینے کی مہلت نہیں دی۔

کہتے ہیں کہ شادی کے وقت مدھوبالا نے شرط رکھی تھی کہ کشور مسلمان ہو جائے اور اس نے اسلام قبول بھی کرلیا تھا۔

اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا تھا۔

مدھوبالا مرگئی، ایک رومانوی اور افسانوی کردار ختم ہوگیا۔ عشق ناکام کی مجسم تصویر فنا ہوگئی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی بے چین روح ابھی تک بھٹک رہی ہو۔

www.paksociety.com

سرابِ عشق

نسرین منصور

اپنے حسن جہاں خیز سے اس نے پردۂ سیمیں پر تہلکہ مچادیا تھا۔ بالی وڈ کی سپراسٹار کہلانے لگی تھی۔ اس کا تعلق مقبوضہ جونا گڑھ سے تھا جسے پاکستان کا حصہ قرار دیا گیا تھا مگر ہندوستان نے اس پر زبردستی قبضہ کرلیا تھا اور نواب آف جونا گڑھ پاکستان ہجرت کر آئے تھے۔ نواب کی ہجرت نے اہلکاروں کو بے یارومددگار کردیا تھا۔ وہ بھی مصاحبین کے خاندان سے تھی اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے بمبئی آئی تھی کہ بمبئی نگریا نے اس کا شکار کرلیا۔ وہ فلموں کی جان کہلانے لگی، خوب شہرت حاصل کی لیکن دل کی دنیا ویران رہی۔

ایک ٹوٹے دل کی اداکارہ کی رودادِ پُرنم

عشق ناکام نمبر

محبت کامیاب ہو جائے تو کہانی نہیں بنتی، ناکام ہو جائے تو اس کا چرچا زمانوں تک رہتا ہے۔ ویسے تو محبت ہو جانا اس کی کامیابی کی دلیل ہے لیکن عام معنوں میں کامیاب محبت وہی کہلائی جاتی ہے جہاں فریقین کو وصل کی راحت نصیب ہو جائے اور انہیں فراق کی اذیت سے نہ گزرنا پڑے۔ اس مفہوم میں اگر دیکھا جائے تو تاریخ کا سینہ کامیاب محبت کی داستانوں سے خالی ہے لیکن ناکام عشق کے افسانے قدم

WWW.PAKSOCIETY.COM

قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ جب خداوند عالم نے انسان کو زمین پر بھیجا تو ساتھ ہی اسے زندگی گزارنے کے اسلوب سے بھی آگاہی دی اور ان جذبوں سے بھی آشنا کیا جو اس کے دل کی گہرائیوں سے جنم لیتے ہیں۔ انہی میں ایک جذبہ محبت کا ہے جو دوسرے جذبات کے مقابلے میں زیادہ قوی، زیادہ مضبوط اور زیادہ گہرا سمجھا جاتا ہے، جس کی شدت کو ناپنے کے لیے کوئی آلہ ایجاد نہ ہوسکا۔ اس کے باوجود روئے زمین پر بسنے والا ہر انسان اس جذبے کی شدت کو سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے بالخصوص ناکام عشق کی داستانیں اس کے دل کے تاروں پر حزنیہ ساز چھیڑ دیتی ہیں اور اس کی کسک تا دیر مضطرب کیے رکھتی ہے۔

شوبزنس کو ایک مصنوعی دنیا سمجھا جاتا ہے جہاں کے باسیوں کا طرزِ زندگی، ان کا اوڑھنا بچھونا، جذبات، تعلقات، ملنا ملانا سب کچھ بناوٹی ہے۔ وہ کیمرے کے سامنے جھوٹی محبت کا ناٹک رچاتے، آنکھوں میں گلیسرین بھر کر ٹپ ٹپ آنسو بہاتے اور جذباتی مکالمے بولتے بولتے فنکاری کے اس درجے پر فائز ہوجاتے ہیں جہاں نقل پر اصل کا گماں ہونے لگے۔ وہ پردے پر جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں، اسی کے حوالے سے عام فلم بین ان کی شخصیت کے بارے میں ایک تصور قائم کرلیتا ہے مثلاً ایک ولن کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ جیسا پردے پر نظر آتا ہے، عام زندگی میں بھی ویسا ہی ہوگا۔ اسی طرح ایک فلمی اداکارہ کو بھی ہر فلم میں مختلف اداکاروں کے ساتھ جوڑی بنانا پڑتی ہے۔ اگر کوئی جوڑی ہٹ ہوجائے اور فلم ساز انہیں اپنی فلموں میں مسلسل کاسٹ کرنے لگیں تو ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں منظرِ عام پر آنے لگتی ہیں۔ یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا کہ ان لوگوں کی بھی اپنی کوئی ذاتی زندگی ہے جو اسکرین ورلڈ سے بالکل مختلف بھی ہوسکتی ہے۔ ان کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے جو محبت کا جھوٹا ناٹک کرتے کرتے کبھی سچ مچ کسی کا دیوانہ ہوسکتا ہے۔

فلمی دنیا میں محبت کی ایسی کئی داستانوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کی یاد آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ فلمی دنیا کے لیجنڈ دلیپ کمار کے بارے میں مشہور ہے کہ ساتھ کام کرنے والی ہر ہیروئن ان پر فریفتہ ہوجاتی تھی۔ کامنی کوشل کے ساتھ دلیپ کمار کا تعلق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے ان دونوں کے منہ زور عشق کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ آرزو کے سیٹ پر ہاتھوں میں ہاتھ دیے بیٹھے رہتے۔ کامنی کوشل شادی شدہ تھی اور اس کے شوہر مسٹر سود بمبئی پورٹ ٹرسٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ایک بار کامنی کا بھائی بھرا ہوا پستول لے کر فلم کے سیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے کامنی کو دھمکی دی کہ اگر اس نے دلیپ کمار سے ترک تعلق نہ کیا تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور دلیپ کمار کا پہلا عشق اپنی موت آپ مر گیا۔

دلیپ کمار کی زندگی میں آنے والی دوسری ہیروئن مدھوبالا تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی اسکرین پر آج تک اس سے زیادہ خوبصورت اداکارہ نہیں آئی۔ ویسے تو مدھوبالا سر سے پاؤں تک حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی لیکن اس کی قیامت خیز مسکراہٹ دیکھنے والے کا قرار لوٹ لیا کرتی تھی۔ دلیپ کمار بھی اسی مسکراہٹ کا اسیر ہوا۔ فلم نذرانہ کی شوٹنگ کے دوران ان کا عشق زوروں پر تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ دونوں جلد ہی شادی کرلیں گے لیکن شاید مدھوبالا پوری طرح دلیپ کمار سے مخلص نہیں تھی۔ ایک طرف وہ اپنے شہزادہ سلیم سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھی تو دوسری جانب اس نے اداکار پریم ناتھ کو بھی امید کی ڈور سے باندھ رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دلیپ کمار سے تعلق استوار ہونے سے پہلے وہ پریم ناتھ کی محبت کا دم بھرتی تھی لیکن اس شادی میں اصل رکاوٹ مدھوبالا کا باپ عطاءاللہ خاں تھا جو کسی قیمت پر سونے کی چڑیا سے ہاتھ دھونا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بیٹی کو دلیپ کمار سے بدظن کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح دلیپ صاحب کا یہ عشق بھی ناکام محبت کی داستانوں میں شامل ہوگیا۔

اس کے علاوہ فلمی دنیا میں جن جوڑوں کے عشق کی داستان عام ہوئی ان میں ریکھا، امیتابھ بچن۔ وحیدہ رحمان، گورو دت۔ ٹینا منیم، راجیش کھنہ۔ ثریا، دیو آنند۔ راج کپور، نرگس۔ سری دیوی، متھن چکرورتی۔ اشوک کمار، نلنی جیونت۔ دھرمیندر، مینا کماری۔ سنی دیول، ڈمپل۔ سمیتا پاٹل، راج ببر۔ عامر خان، پوجا بھٹ۔ مادھوری، سنجے دت۔ بپاشا باسو، جان ابراہام وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے عشق کی ناکامی کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر تعلقات وقتی مصلحتوں، کاروباری ضرورتوں اور نفسانی خواہشات پوری کرنے کی غرض سے استوار کیے گئے تھے۔ اور ان میں خلوص و جذبے کا فقدان تھا۔ اس سلسلے میں صرف ایک مثال کا حوالہ دینا ہی کافی ہوگا۔ ایک زمانے میں

مادھوری اور سنجے دت کا افیئر زوروں پر تھا اور بہت سے لوگ یقین کر بیٹھے تھے کہ عنقریب یہ دونوں ستارے شادی کرلیں گے لیکن اس غبارے میں سے ہوا بہت جلد نکل گئی اور بظاہر بے حد مضبوط نظر آنے والا تعلق ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ جب سنجے دت کو غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں جیل جانا پڑا تو ممبئی کی پوری فلم انڈسٹری نے اس کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا لیکن مادھوری اس سے ملنے ایک مرتبہ بھی جیل نہیں گئی۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ اس تعلق میں غرض پنہاں تھی اور مادھوری نے محض اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کے لیے سنجے کے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچایا تھا۔

بے وفائی اور خودغرضی پر مبنی ان داستانوں میں سے ایک کا مرکزی کردار پروین بوبی بھی ہے۔ اس بے مثال اداکارہ نے ستر کی دہائی میں اپنے شاہانہ طرزِ زندگی، کھلے ڈلے اور بے باک انداز اور لاجواب اداکاری سے بولی ووڈ میں دھوم مچادی۔ بہت سے اداکار اسی طرح کا خاندانی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کی اکثریت متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جو طویل جدوجہد کے بعد خوش حالی کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ پروین بوبی کا تعلق جوناگڑھ کے نواب خاندان سے تھا۔ یہ افواہ بھی ایک عرصہ تک گردش کرتی رہی کہ وہ نواب آف جوناگڑھ کی ناجائز اولاد ہے اور اس کی ماں نواب کے محل کی ملازمہ تھی۔ ان شبہات کو اس وجہ سے بھی تقویت ملتی ہے کہ پروین نے اپنے کسی انٹرویو میں کبھی باپ کا ذکر نہیں کیا اور نجی محفلوں میں اس کے لیے نازیبا کلمات ہی استعمال کیے۔ البتہ پروین کی ماں جمال بخت بابی کے مطابق وہ ولی محمد خان کی بیٹی تھی جو نواب کے محل میں ملازم تھا اور نواب صاحب اس پر بے حد بھروسا کیا کرتے تھے۔ اس کی خدمات کے اعتراف میں نواب صاحب نے ایک محل نما حویلی اس کے نام کردی تھی جہاں جمال بخت شہزادیوں کی سی زندگی گزارتی تھی۔ پروین بوبی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی جس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ اس محل نما حویلی میں اسے زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ وہ اچھا کھاتی، اچھا پہنتی اور اس کی خدمت کے لیے اس محل نما حویلی میں ملازمین اور خادماؤں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن صحافیوں کو یہ حویلی دیکھنے اور پروین بوبی کی ماں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان کا کہنا ہے کہ نواب کے کسی ملازم کے لیے یہ شان و شوکت اور طرزِ رہائش اختیار کرنا ممکن نہیں اور یہ سب کچھ نواب آف جوناگڑھ سے تعلق کے بنا بخت بیگم کو

ساحر لدھیانوی اور امرتا پریتم کی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ساحر شعروادب کی پگڈنڈیوں پر بگٹٹ بھاگ رہا تھا۔ امرتا شادی شدہ تھی۔ چند نظمیں لکھ چکی تھی اور لاہور ریڈیو اسٹیشن پر بھی پروگرام کرنے جایا کرتی تھی۔ ساحر کا کلام ساحر سے سنتے ہی فدا ہوگئی۔ وہ ہندی اور گورمکھی میں ناولیں، کہانیاں، نظمیں، غزلیں، گیت لکھا کرتی تھی۔ اس نے ساحر کو اپنے گھر بلایا۔ ساحر میں یہ ہمت و حوصلہ کہاں تھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت سے ملاقات کے لیے تنہا چلا جاتا۔ اس لیے وہ دوستوں میں سے کسی کو ساتھ لے جاتا جبکہ امرتا کا عالم یہ تھا کہ وہ ساحر سے اپنے پیار کو کسی سے پوشیدہ نہیں رکھتی۔ اپنے شوہر اور گھر والوں کے سامنے بھی اپنے پیار کا اقرار کرتی جس کا ذکر اس نے ”رسیدی ٹکٹ“ میں بھی کیا ہے۔ مگر یہ محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ آدھی ادھوری رہ گئی۔

اقتباس: ساحر اور فن شاعری
از محمد اقبال مظفر پوری
مرسلہ: ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بھکر

حاصل نہیں تھا۔

اس ماحول میں پرورش پانے والی پروین عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ثابت ہوئی۔ ماں کے لاڈ پیار نے اسے خودسر، باغی، ضدی اور مغرور بنا دیا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی اور ذرا ذرا سی بات پر نوکروں کی بے عزتی کردیتی، جو چیز پسند آجاتی، اسے حاصل کیے بنا نہ رہتی۔ ایک مرتبہ وہ ماں کے ساتھ بازار گئی تو اس کی نظر ایک خوبصورت فراک پر گئی، اس وقت تو اس نے کچھ دھیان نہ دیا لیکن رات کے پچھلے پہر کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو اسے وہ فراک یاد آگئی اور اس نے رونا شروع کردیا۔ ماں نے بہت سمجھایا کہ صبح دکان کھلنے پر اس کی فرمائش پوری کردی جائے گی لیکن وہ

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

بضد تھی کہ اسے وہ فراک اسی وقت چاہیے۔ مجبوراً نوکروں کو دوڑایا گیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح دکان دار کے گھر پہنچے، اسے گہری نیند سے جگا کر دکان کھلوائی اور مطلوبہ فراک لے کر واپس آگئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پروین نے اس فراک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور ماں سے کہا کہ وہ اسے کپڑوں کی الماری میں ٹانگ دے۔

وہ فطری طور پر بلا کی ذہین اور تیز تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ بہتر رہا اور اپنے ساتھی طالب علموں سے ہمیشہ آگے رہی، گھریلو خوش حالی اور کسی قسم کی ذہنی پریشانی نہ ہونے کے سبب اس کے اندر خاصا اعتماد آگیا تھا۔ وہ بے فکری کی زندگی گزار رہی تھی اور نوعمری میں ہی لڑکوں سے فلرٹ اور دوستیاں کرنے لگی تھی۔ پروین کی ماں کا کہنا تھا کہ اس جیسی حسین اور ذہین لڑکی جونا گڑھ میں نہیں تھی۔ اسکول کے لڑکے اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ یہیں سے اس کے ذہن میں یہ سوچ پروان چڑھنے لگی کہ وہ ایک پرکشش لڑکی ہے جو مردوں کو دیوانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ٹین ایج میں ہی آزاد خیال اور اپنے پروں پر اُڑنے کے قابل ہوگئی تھی۔

پروین کی ہنستی کھیلتی زندگی کو پہلا بریک اس وقت لگا جب اس کے والد کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے۔ تکلیف نے انہیں بے حال کر رکھا تھا اور وہ کئی راتوں تک سکون سے نہ سو سکے جس کی وجہ سے پورا گھر پریشان تھا۔ پروین ویسے بھی بہت حساس طبیعت تھی۔ اس لیے باپ کی بیماری نے اس کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ پروین کے والد اس بیماری سے جانبر نہ ہوسکے اور بیوی و بیٹی کو روتا بلکتا چھوڑ کر آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔ اس حادثے نے شعوری طور پر ناپختہ پروین کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کیے۔ اسے اپنے باپ سے شکوہ تھا کہ وہ بہت جلد اسے تنہا کر کے چلے گئے۔ حالانکہ پروین کی ماں نے اسے کسی بھی مرحلے پر باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا اور پہلے سے زیادہ اس کے ناز نخرے اُٹھاتی رہی۔

باپ کے مرنے کے بعد اسے اور زیادہ آزادی مل گئی۔ وہ جونا گڑھ جیسی چھوٹی جگہ میں رہ کر اپنے آپ کو ضائع نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا اس نے اورنگ آباد میں اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سینٹ زیورز کالج، احمد آباد میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی وہ اپنی ذہانت، خوبصورتی اور خداداد صلاحیت کی بدولت لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کی آزاد خیالی نے لڑکوں کو بہت متاثر کیا اور وہ سب اس سے قریب رہنے کے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ انہی دنوں فلم ساز بی آر اشارہ اپنی فلم چرتیر کے لیے ایک بولڈ لڑکی کی تلاش میں تھے۔ انہیں کسی نے پروین کے بارے میں بتایا تو وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے کالج تک آگئے اور پروین کو اپنی فلم میں کام کرنے کی پیشکش کر دی۔ اسے وہ مشہور کرکٹر سلیم درانی کے بالمقابل ہیروئن کاسٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ کئی لڑکیوں کے آڈیشن کر چکے تھے لیکن انہیں کوئی بھی اس کردار کے لیے موزوں نظر نہیں آئی۔ پروین سے ملنے کے بعد انہیں لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔ اس طرح پروین کے فلمی سفر کا آغاز ہوا۔

ممبئی آنے کے بعد پروین کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہاں جونا گڑھ جیسی آسائشیں تو نہ تھیں لیکن نوابی ماحول سے اُکتائی ہوئی آزاد خیال لڑکی کے لیے یہ شہر خوابوں کا نگر ثابت ہوا جہاں وہ کسی روک ٹوک کی بنا اپنی خواہشات پوری کرسکتی تھی۔ اس شہر نے اسے اس بری طرح اپنے سحر میں جکڑا کہ پھر اس کے لیے جونا گڑھ واپس جانا ممکن نہ رہا۔ بڑے شہر انسانوں کو اسی طرح نگل لیتے ہیں۔ پروین نے بھی اپنی رہائش کے لیے جوہو کا علاقہ ہی منتخب کیا۔ یہ جگہ پروین کو اپنے مزاج کے مطابق لگی اور اس نے ایک لگژری فلیٹ لے کر ممبئی کو اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا۔ اس زمانے میں پروین اور زینت امان ہی ایسی لڑکیاں تھیں جو غیر فلمی اور قدامت پرست ماحول سے آکر ممبئی کی تیز رفتار زندگی میں اس طرح بس گئیں جیسے ان کا جنم ہی اس شہر میں ہوا ہو۔ ممبئی میں رہنا اور یہاں کے اسٹیٹس کو افورڈ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن پروین کو کبھی یہ خوف نہیں رہا کہ وہ تنہا لڑکی ہونے کی وجہ سے اس ماحول میں نہیں رہ سکے گی۔

پروین کی پہلی فلم کامیاب نہ ہوسکی لیکن اپنے لمبے قد، سیکسی امیج اور بولڈ سین کی وجہ سے وہ فلم سازوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ان دنوں امیتابھ کا لمبا قد فلم سازوں کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا اور انہیں اس کے مقابل کام کرنے کے لیے مناسب قد کی لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ پروین بوبی کے آجانے سے یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ امیتابھ بچن کے ساتھ آٹھ فلموں میں کام کیا جو سب سپر ہٹ یا ہٹ ثابت ہوئیں۔ اس کی دوسری کامیاب فلموں میں سہاگ، کالا پتھر، نمک حلال، کالا سونا اور جانی دوست وغیرہ شامل ہیں۔ وہ بھارت کی پہلی

www.paksociety.com

اداکارہ ہے جس کی تصویر ٹائم میگزین کے سرورق پر شائع ہوئی۔

یش چوپڑہ کی فلم دیوار، سے پروین بوبی کا ایک نیا امیج سامنے آیا پھر اسے اسی قسم کے کرداروں کی پیشکش ہونے لگی۔ ایک ایسی لڑکی جو مردوں کے معاشرے میں اپنے اصولوں کے ساتھ جیتی ہے۔ شراب پیتی اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہوئے نہیں ڈرتی۔ اس نے بولڈ اور شارپ امیج کے ساتھ ہلچل مچادی اور وہ راتوں رات اسٹار کے درجے پر فائز ہوگئی۔ ٹائم میگزین نے اس کی جو ٹائٹل اسٹوری شائع کی، اس کی سرخی تھی ''پروین بابی نے بولی ووڈ کا چہرہ اور ایکٹریس کی امیج بدل ڈالنے کی روایت قائم کی۔''

پروین بابی کا شمار ان چند ہیروئنز میں ہوتا ہے جن کے نام پر فلم بین سینما ہال کا رخ کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ پروین کا کیریئر تیزی سے مستحکم ہو رہا تھا کہ وہ عشق کے بخار میں مبتلا ہوگئی اور اس نے اپنے عروج کے دور میں پلے بوائے ٹائپ کبیر بیدی سے دل لگالیا۔ اس کی خاطر ممبئی چھوڑنا گوارہ کیا اور اس کے ساتھ اٹلی چلی گئی جس کے نتیجے میں اس کا کیریئر متاثر ہوا لیکن پروین کو اس وقت صرف کبیر ہی نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ کبیر بیدی کے ساتھ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں اس طرح گھومتی رہی جیسے ہنی مون پر گئی ہو۔

کبیر بیدی اور پروین بوبی کے عشق کی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کبیر کے پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔ اس کا تعلق ایک غیر فلمی گھرانے سے ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت اختیار کرلی اور صرف پانچ سال بعد ہی فلم کے شعبے کا سربراہ بن گیا۔ ابتدا میں اسے ہدایت کاری کے شعبے سے دلچسپی تھی لیکن تقدیر کی مہربانی سے اداکار بن گیا۔ وہ بیک وقت فلم، تھیٹر اور ٹیلی وژن کا اداکار ہے اور اس نے بھارت کے علاوہ امریکا اور یورپ میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

عورتوں کے معاملے میں اس کی شہرت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ اب تک تین شادیاں کرچکا ہے۔ پہلی شادی پرتما سے ہوئی جو ایک رقاصہ تھی۔ اس سے اس کے دو بچے پوجا بیدی اور سدھارتھ ہوئے۔ پوجا بیدی ہندی فلموں کی اداکارہ ہے اور ان دنوں اخبارات میں کالم لکھ رہی ہے۔ بیٹا سدھارتھ، امریکا کی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا کہ تیز وفرینا کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور اس نے چھبیس سال کی عمر میں خودکشی کرلی۔ پرتما سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد کبیر بیدی نے پروین بابی سے تعلق استوار کرلیا اور وہ اس کی محبت میں ایسی پاگل ہوئی کہ اپنا کیریئر داؤ پر لگا کر اس کے ساتھ اٹلی چلی گئی۔ گو کہ ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی لیکن وہ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون مناتے رہے۔ بہت جلد کبیر نے اپنی فطرت کے مطابق پروین بوبی سے بے رخی اختیار کرنا شروع کردی اور بہانہ یہ بنایا کہ ہالی ووڈ اور یورپ میں اس کی مقبولیت دیکھ کر پروین بوبی عدم تحفظ کا شکار ہوگئی تھی۔ اس کے بعد کبیر بیدی نے برطانوی فیشن ڈیزائنر سوسن ہمفر سے شادی رچائی۔ اس کے بطن سے ایک بیٹا آدم بیدی پیدا ہوا جو بین الاقوامی ماڈل ہے اور اس نے حال ہی میں بولی ووڈ کی فلم ہیلو کون ہے؟ سے اپنے ایکٹنگ کیریئر کا آغاز کیا ہے۔ یہ شادی بھی طلاق پر ختم ہوئی۔

1990ء کے آخر میں بیدی نے ٹی وی اور ریڈیو کی میزبان نکی بیدی سے شادی کی۔ اس سے کوئی بچہ نہیں ہوا اور ان دونوں کے درمیان 2005ء میں طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد بیدی نے سماجی محقق پروین دوسانج سے تعلقات قائم کرلیے۔ اس کے علاوہ بھی اس کا نام مختلف عورتوں کے ساتھ آتا رہتا ہے جبکہ اس کا کہنا ہے کہ وہ عورتوں کا شکاری نہیں ہے بلکہ وہ خود اس کے پیچھے آتی ہیں۔

اس کا دعویٰ کسی حد تک صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کم از کم پروین بابی کے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا۔ وہ اسے اتنا چاہتی تھی کہ تعلق قائم ہوجانے کے بعد ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارہ نہ تھی چنانچہ جب کبیر بیدی اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے اٹلی جانے لگا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی روانہ ہوگئی اور یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی کہ اس طرح اس کے کیریئر کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ واقعی جب انسان کی سر پر عشق کا بھوت سوار ہو تو اس کی عقل جواب دے جاتی ہے۔ کبیر بیدی کو اس کی محبت کی شدت کا احساس تھا۔ اس نے پروین کے ساتھ اپنے تعلق کو بڑے ہی جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔

''پروین میری زندگی میں اس وقت آئی جب پرتما کے ساتھ میری ریلیشن شپ ختم ہوچکی تھی۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ ذہین بھی تھی۔ جب میں یورپ گیا تو وہ بھی میرے ساتھ تھی لیکن وہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ میں یورپ میں اس کے مقابلے میں بڑا اسٹار

تھا جس کے نتیجے میں وہ احساس کمتری کا شکار ہوگئی اور اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ چنانچہ اس نے واپس آنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سارے معاملے میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔ میں نے اس سے چلنے کے لیے کہا اور نہ ہی واپس بھیجنے کی بات کی۔"

کبیر بیدی کی ان باتوں میں بڑا بھولا پن جھلکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یورپ میں اپنے کام کے حوالے سے وہ تھوڑی بہت شہرت رکھتا ہو لیکن جب پروین بوبی سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ بولی ووڈ میں دوسرے یا تیسرے درجے کا اداکار تھا اور اسے فلموں میں ثانوی رول ملا کرتے تھے گو کہ اس نے پچاس کے قریب فلموں میں کام کیا لیکن ان میں سے بیشتر ناکام رہیں، کبیر بیدی کو اپنا کیریئر آگے بڑھانے کے لیے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور جب پروین بوبی سے اس کی قربت بڑھی تو بیدی نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ نتھی ہوکر اس کے دن پھر جائیں گے لیکن اس کی یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہوگئی۔ پروین اس سے محبت تو کرسکتی تھی لیکن اسے فلمیں نہیں دلا سکتی تھی۔

اسکرین پر اپنی اداؤں اور گلیمر سے لاکھوں دلوں پر راج کرنے والی پروین عام زندگی میں بہت ہی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ کبیر بیدی کی چالوں کو نہ سمجھ سکی اور پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن گری۔ اسے ایک ایسے مرد کی ضرورت تھی جو اس سے سچی محبت کرسکے۔ اس نے پورے خلوص اور بے غرضی سے اپنی زندگی میں آنے والے ہر مرد پر چاہت کے پھول نچھاور کیے لیکن بدلے میں اسے صرف دھوکا اور جھوٹے وعدے ہی ملے۔ کبیر بیدی سے مل کر اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی کا خلا پر ہوگیا ہے۔ کبیر بیدی نے کچھ اتنی ہوشیاری سے محبت کا جال پھینکا کہ وہ خود بھی اس کی کشش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور دونوں کا زوردار افیئر شروع ہوگیا گو کہ کبیر بیدی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا لیکن اس کے باوجود پروین اس کی محبت میں آگے بڑھتی گئی۔

پروین بوبی اور کبیر بیدی کا تعلق ٹوٹنے کی کوئی بھی وجہ رہی لیکن اس کے بعد بھی کبیر بیدی نے پروین بوبی کی کبھی بُرائی نہیں کی بلکہ اکثر مواقع پر اس کی کئی خوبیوں کا فراخ دلی سے اعتراف کرلیا۔ پروین کے انتقال کے بعد ایک میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا "میں اور پروین اس گروپ میں شامل تھے جو تفریح کی غرض سے جوہو پر جایا کرتا تھا۔ اس طرح ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ اس گروپ میں اس زمانے کے نوجوان اداکار مثلاً ششی کپور، ڈینی، پرِکشت ساہنی، دیو آنند اور ان کا بھائی شامل تھے۔ دیو آنند کو میں نے نوجوان اس لیے لکھا ہے کہ انہوں نے اٹھاسی سال کی عمر میں بھی اپنے آپ کو بوڑھا نہیں سمجھا اور مرتے دم تک جوانوں کی طرح ایکٹ کرتے رہے۔

پروین کے ساتھ میں نے صرف ایک فلم بلٹ میں کام کیا جو 1976ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن ہمارا ذاتی تعلق بہت مضبوط تھا۔ ہمارے بیچ محبت بڑھتی گئی اور ہم تین سال تک ساتھ رہتے رہے۔ اس زمانے میں سبھی لوگ ہمارے تعلق کے بارے میں جانتے تھے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہم دونوں ساتھ رہ رہے ہیں۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت تھی اور دماغ سے زیادہ دل کی بات پر دھیان دیتی تھی۔ اس کی موت جن حالات میں ہوئی، اس کے بارے میں سوچ کر ہی افسوس ہونے لگتا ہے۔ بولی ووڈ میں ابتدائی کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود اس کی زندگی دکھوں سے عبارت تھی۔ جونا گڑھ سے آنے والی یہ لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے بولی ووڈ پر چھا گئی لیکن زندگی کے آخری ایام میں بیماری نے اس سے سب کچھ چھین لیا اور اس کی پوری کہانی ایک ٹریجڈی میں بدل گئی۔

مہیش بھٹ نے مجھے بتایا کہ اسے شیزوفرینا ہوگیا تھا جو کہ انتہائی خطرناک قسم کی بیماری ہے۔ اس سے آخری ملاقات میری پہلی بیوی پریتما بیدی کی یاد میں ہونے والی ایک تقریب کے موقعے پر ہوئی۔ وہ اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے آئی تھی جو میری نظر میں اس کی عظمت کی دلیل ہے حالانکہ پریتما نے اسے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اسے ایک ایسی عورت سمجھتی تھی جس نے مجھے اس سے چھین لیا۔ اس کے باوجود اس کی یاد میں ہونے والی تقریب میں پروین کا آنا ایک حیرت انگیز اقدام تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ اس کے جنازے میں فلمی صنعت کے بہت کم لوگ شریک ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ فلمی دنیا میں لوگوں کو وہی کچھ نظر آتا ہے جو سامنے ہوتا ہے۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل والا محاورہ اس انڈسٹری پر پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ پروین آخری دنوں میں کچھ نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار بھی رہی اور اس نے فلمی صنعت کے کئی لوگوں پر مختلف نوعیت کے الزامات

www.paksociety.com

عائد کیے تھے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں نے اسی ڈر سے جنازے میں شرکت نہ کی ہو کہ اس طرح وہ ان الزامات کو درست مان لیتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی، میں بھی ان میں شامل ہوں۔ کسی کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین لڑکی تھی۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع اور سوچ گہری تھی۔ عمر کے آخری حصے میں وہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہوگئی تھی جس نے اس کی ذہانت کو بھی متاثر کیا۔ بولڈ امیج کی وجہ سے بھی اس کی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ وہ محبت کی بھوکی تھی لیکن لوگوں نے اسے جسمانی تسکین کا ذریعہ جانا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ اسی لیے یورپ جانے سے پہلے میں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ میرا پیچھا کرنے کی بجائے بولی ووڈ میں رہ کر ہی اپنے کیریئر پر توجہ دے لیکن اس کی عقل میں میری بات نہیں آئی۔

بہت سے لوگ مجھے بھی پروین کی زندگی برباد کرنے کا ذمے دار سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے زندگی میں کسی عورت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا جبکہ وہ مجھے اپنی ملکیت سمجھتی تھی اور مجھ پر اپنا قبضہ جمائے رکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ یورپ گئی اور اس نے مجھے وہاں پرستاروں کے ہجوم میں گھرے دیکھا تو یہ اس سے برداشت نہ ہوسکا، اس نے مجھے دوسری عورتوں سے دور رکھنے کی کوشش کی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو ناراض ہوکر واپس چلی آئی۔ مجھے اس سے بچھڑنے کا وقتی طور پر افسوس تو ضرور ہوا لیکن عورت کو میں نے کبھی اپنے سر پر سوار نہیں کیا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی تو یہ بالکل غلط ہے۔ میری لغت میں محبت کا لفظ ہی نہیں ہے۔ میں عورتوں سے محبت نہیں کرتا بلکہ جو پسند آجائے، اسے ہم سفر بنالیتا ہوں جو مختصر یا طویل بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا انحصار وقت، حالات اور تعلقات کی نوعیت پر ہے۔"

یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا جس میں کبیر بیدی نے اپنے آپ کو بڑا معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور سارا ملبا پروین بوبی پر ڈال دیا ہے لیکن حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پروین بوبی کی آزاد خیالی اور کھلے ڈلے طرزِ زندگی کو دیکھتے ہوئے اس سے جذباتی تعلق قائم کرلیا۔ وہ اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا اور اس نے پروین کی تشنگی دور کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کبیر بیدی کے بارے میں اس کی پہلی بیوی پریتما نے انکشاف کیا کہ وہ ایک درندہ ہے جسے اپنے جیسے جانور کی تلاش رہتی ہے۔ پریتما کے بہ قول پروین بھی ایسی ہی ایک عورت تھی اور مردوں کے معیار پر پوری اُترتی تھی جب کبیر بیدی کا دل بھر گیا تو اس نے اپنی عادت کے مطابق دوسری عورتوں سے راہ و رسم بڑھانا شروع کردی۔ یہ رویہ پروین کے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور یہی ان کی علیحدگی کا سبب بنا۔

کبیر بیدی سے تعلق ختم ہوجانے کے بعد پروین بُری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس نے کبیر کو بڑے خلوص سے چاہا تھا لیکن جواب میں اسے بے وفائی کا زخم سہنا پڑا۔ وہ جو مردوں کی نفسیات سمجھنے کا دعویٰ کرتی تھی، کبیر بیدی کے معاملے میں ہار گئی۔ سگریٹ اور شراب سے اس کی پُرانی شناسائی تھی۔ کبیر سے بچھڑنے کے بعد اس نے ایک بار پھر

سدھا ملہوترا پس پردہ آواز کا جادو جگانے آئی تھی۔ قدرت نے اسے دولتِ حسن سے بھی نوازا تھا۔ وہ گلوکارہ کم اور ہیروئن زیادہ لگتی تھی۔ ایسے وقت میں جب لتا منگیشکر اینڈ فیملی نے نئی گلوکاراؤں کے راستے بند کر رکھے تھے۔ سدھا ملہوترا نے زبردستی اپنی جگہ بنائی۔ شریف اور قابلِ عزت گھرانے سے تعلق تھا اس لیے اسے مضبوط سہارا ملتا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لتا منگیشکر کی اجارہ داری کو توڑنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کے حسن جہاں خیز سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر وہ ہر ایک سے دامن بچا رہی تھی لیکن ایک مقام پر آکر اس کے دل نے بغاوت کردی۔ وہ نہایت دھیمی چال سے ساحر لدھیانوی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ مذہبی اعتبار سے دونوں دریا کے دو کنارے تھے مگر دل نہ پوچھے ذات پات، وہ بھی ہر پابندی کو پھلانگ کر ساحر کی بن جانا چاہتی تھی لیکن ساحر پتھر کا بت بنا رہا۔ اس نے مایوس ہوکر ایک دوسرے شخص کو ہم سفر بنالیا۔ ساحر نے اس موقع پر وہ مشہور نظم لکھی "چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔"

اقتباس: ساحر اور فنِ شاعری از محمد اقبال مظفر پوری

مرسلہ: ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بھکر

ان چیزوں کا سہارا لیا۔ ایسے میں فلم ساز وہدایت کار مہیش بھٹ آگے بڑھا اور اس نے پروین کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ مہیش بھٹ کے لیے مشہور ہے کہ پوری فلم انڈسٹری میں اس سے زیادہ چالاک اور شاطر شخص کوئی نہیں ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا لیکن اپنا کام نکالنے کے لیے دوسروں کو استعمال کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ اس نے پروین کی ذہنی اور قلبی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے اپنا جال بچھایا اور زخم خوردہ پروین ایک بار پھر محبت کے نام پر نئی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہوگئی۔

ویسے تو فلمی دنیا میں کوئی بھی شخص پارسائی اور شرافت کا دعویٰ نہیں کرسکتا لیکن مہیش بھٹ کے کیریئر پر نظر ڈالنے سے ہی اس کی شخصیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جسمانی عیاشی کو چھپایا جاسکتا ہے لیکن ذہنی عیاشی کسی نہ کسی انداز میں سامنے آجاتی ہے۔ مہیش بھٹ نے جتنی بھی فلمیں بنائیں ان میں سے بیشتر سیکس، تشدد اور جرائم پر مبنی ہیں۔ اس کی فلموں میں بولڈ مناظر کی بہتات ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی عیاشی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب مہیش بھٹ اور پروین بوبی کی ملاقات ہوئی تو وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس نے صرف بیس سال کی عمر میں لورین برائٹ سے شادی کرلی تھی۔ بعد میں اس کا نام کرن بھٹ رکھ دیا گیا۔ کرن سے اس کے دو بچے پوجا بھٹ اور راہول ہیں۔ پروین بوبی سے تعلق قائم ہوجانے کے بعد مہیش بھٹ اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہوگئی۔ پروین کے ساتھ اس کا افیئر بہ مشکل ڈھائی سال چل سکا پھر اس نے بھی پروین کی بیماری کا بہانہ بنا کر اس سے منہ موڑ لیا اور فلم ایکٹریس وہدایت کارہ سوانی رازداں سے شادی کرلی جس سے اس کی دو بیٹیاں شاہین بھٹ اور عالیہ بھٹ ہیں۔ عالیہ کو ہدایت کار کرن جوہر نے اپنی فلم اسٹوڈنٹ آف دی ائر میں کاسٹ کرلیا ہے۔

پروین بابی سے اظہار ہمدردی کے حوالے سے مہیش بھٹ نے بھی بڑے بلند وبانگ دعوے کیے ہیں اور اس معاملے میں وہ کبیر بیدی سے کئی قدم آگے نظر آتا ہے۔ اس نے پروین بوبی سے اپنے تعلق کو واضح کرنے کے لیے دو فلمیں ارتھ اور وہ لمحے بھی بنائیں۔ ارتھ کی کہانی کا مرکزی خیال یہی ہے کہ ایک فلم ڈائریکٹر، اداکارہ سے جنسی تعلق قائم کرنے کے بعد اپنی بیوی سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ اس طرح گویا اس نے دنیا کے سامنے اپنے اور پروین بوبی کے تعلق کو واضح کردیا۔ گویا وہ اس کی رکھیل تھی جسے وہ جب چاہتا بستر کی زینت بنالیتا تھا۔

ارتھ بنا کر بھی مہیش بھٹ کی طبیعت سیر نہیں ہوئی تو اس نے 2006ء میں وہ لمحے کے نام سے ایک اور فلم نمائش کے لیے پیش کی جو پروین بوبی کی زندگی اور مہیش بھٹ کے ساتھ اس کے معاشقے پر مبنی تھی۔ مہیش بھٹ کا کہنا ہے کہ اس نے یہ فلم پروین بوبی کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور ان یادوں کا اعادہ کرنے کے لیے بنائی ہے جو اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس فلم میں پروین بوبی کا کیریکٹر کنگنا رناوت نے کیا تھا۔ نقادوں نے فلم کے اسکرین پلے، ہدایت کاری اور کنگنا رناوت کی اداکاری کی تعریف کی لیکن تجارتی اعتبار سے یہ فلم اوسط درجے کی کامیابی حاصل کرسکی۔

مہیش بھٹ اور پروین بوبی کا تعلق صرف ڈھائی سال قائم رہ سکا۔ اس تعلق کے قائم ہونے اور ٹوٹنے کی کہانی مہیش بھٹ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے ’’اس سے میری پہلی ملاقات 1970ء کے آخر میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی جذباتی طور پر زخم خوردہ تھے۔ اس کی کبیر بیدی سے انہی دنوں علیحدگی ہوئی تھی اور وہ کافی دل شکستہ نظر آرہی تھی، ادھر میری ازدواجی زندگی کی ناؤ بھی ہچکولے کھارہی تھی اور کرن کے ساتھ میرے تعلقات بڑی حد تک کشیدہ ہوچکے تھے۔ یہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو، جیسی صورت حال تھی۔ بلاشبہ اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی بھی مرد کو دیوانہ بناسکتی ہیں لیکن مجھے اس کی ذہانت، سمجھ داری اور مسکراہٹ نے بے حد متاثر کیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی باکمال عورت نہیں دیکھی۔ وہ میری نظر میں ایک مکمل گلیمر گرل تھی جس نے اپنے طرز زندگی کے بارے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی۔

ہم دونوں کے راستے اس وقت الگ ہوئے جب اسے شیزوفرینا کا عارضہ لاحق ہوا جبکہ میں اس کے ساتھ ایک فلم شروع کرچکا تھا لیکن گیارہ ریلوں کے بعد مجھے اس فلم کو ڈبوں میں بند کرنا پڑا کیونکہ اس کی بیماری کے سبب فلم کی مزید شوٹنگ کرنا ممکن نہ رہا تھا، میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن ساتھ نباہ کرنے کی بھی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اپنی فلم وہ لمحے میں ان تمام یادوں کو یکجا کردیا ہے جو پروین کے حوالے سے میرے ذہن میں زوردار آندھی کی مانند چلتی رہتی ہیں۔ میں ایڈیٹنگ روم میں اس فلم کا آخری منظر دیکھ رہا تھا تب مجھے احساس ہوا کہ کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی ہماری یادوں میں زندہ رہتے ہیں۔ یہ فلم بھی پروین بوبی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی ایک کوشش ہے جس سے میں محبت کرتا تھا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں صبح کے وقت اس کے گھر سے رخصت ہورہا تھا۔ اس روز وہ شوٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی تھی۔ اس نے حسبِ عادت مجھے گرم جوشی سے رخصت کیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے آخری بار ہوش کے عالم میں مل رہی ہے۔ میں وہ منظر کیسے بھول سکتا ہوں جب شام کو گھر واپس آیا تو وہ فلمی کاسٹیوم پہنے، فلم میک اپ کیے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا۔

’’دروازہ بند کردو مہیش، وہ ہمیں مارنے کے لیے آرہے ہیں۔ جلدی کردو، دروازہ بند کردو۔‘‘

ان الفاظ کو سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ پروین کے ساتھ میری محبت، قربت، جوش وجذبہ کے دن ختم ہوگئے ہیں کیونکہ اس کی آنکھوں سے پاگل پن جھلک رہا تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جس پروین کو میں جانتا تھا، وہ مرچکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہماری محبت نے دم توڑ دیا۔ میں اسے بکھرتا ہوا دیکھ رہا تھا لیکن اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اس سے بہت قریب تھا لیکن ایسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا جو اپنے ماضی کا سایہ بن کر رہ گئی ہو۔ پروین کی ماں کو اس کی بیماری کا علم ہوا تو وہ ممبئی دوڑی چلی آئی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی پر جن آگئے ہیں جبکہ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسے یہ بیماری باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ علاج کے سلسلے میں امریکا بھی گئی لیکن میرا اس سے رابطہ ختم ہوچکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کردیا تھا اور اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، ہم نے پندرہ سال ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ آخری بار اس سے ہالی ڈے اِن کی بک شاپ میں آمنا سامنا ہوا تو ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل ہوچکی تھی اور وہ مجھے بالکل ایک مختلف شخصیت کے روپ میں نظر آرہی تھی۔

میرے نزدیک پروین کی موت دو دفعہ واقع ہوئی۔ پہلی بار اس وقت جب اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا اور دوسری بار جب اس کی طبعی موت واقع ہوئی۔‘‘

مہیش بھٹ نے پروین بوبی کے بارے میں جو کچھ کہا اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ اس نے ڈھائی سال ساتھ رہنے کے بعد پروین بوبی کو بیماری کی حالت میں کیوں تنہا چھوڑ دیا، کیا اسے صرف صحت مند پروین سے غرض تھی اور بیمار پروین اس کے لیے ایک ناکارہ شے بن گئی تھی۔ اگر اسی ایک پہلو کو لے کر مہیش بھٹ کی شخصیت اور کردار کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں اس سے زیادہ منافق، جھوٹا، خودغرض اور لالچی شخص نظر نہیں آتا۔ اس نے پروین کی زندگی پر جو دو فلمیں بنائیں، ان کا مقصد اسے خراجِ عقیدت پیش کرنا نہیں بلکہ اس کے نام کو کیش کروانا تھا۔ اس نے صرف اور صرف پروین کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا اور اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی آڑ میں اپنی ہوس پوری کی اور جب وہ اس کے کام کی نہ رہی تو اپنا راستہ بدل لیا۔ بے شک مہیش بھٹ نے پروین کو چاقو، چھری، پستول یا بندوق سے نہیں مارا لیکن اسے قبر تک پہنچانے میں اس کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پروین کی زندگی میں آنے والا تیسرا شخص امیتابھ بچن ہے جس نے اپنی جوانی کے دنوں میں بولی ووڈ کی ہر ہیروئن کو اپنے سحر میں گرفتار کر رکھا تھا اور تقریباً ہر چھوٹی بڑی اداکارہ کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ امیتابھ کے ساتھ کسی فلم میں کام کرے۔ امیتابھ کی نجی زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پورے کیریئر کے دوران امیتابھ کا نام رومانی طور پر تین اداکاراؤں جیہ بہادری، ریکھا اور پروین بوبی کے ساتھ رومانی طور پر جوڑا گیا۔ امیتابھ اور جیہ بہادری کی شادی کے بعد اس پریم کہانی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ البتہ ریکھا اور پروین بوبی کے ساتھ اس کے تعلق کی داستانیں کافی عرصہ تک بولی ووڈ کی فضاؤں میں گونجتی رہیں۔

جب پروین بوبی نے بولی ووڈ میں قدم رکھا تو امیتابھ کا طوطی بول رہا تھا۔ پروین اپنے خوبصورت چہرے اور لمبے قد کی وجہ سے فوراً ہی فلم سازوں کی نظروں میں آگئی اور اسے امیتابھ کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ ان دونوں کی پہلی فلم مجبور ہی سپرہٹ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی فلموں میں ایک ساتھ کام کیا جن میں سے بیشتر کامیاب رہیں۔ دیوار، امر اکبر انتھونی، نمک حلال، شان، کالیا، مہان، دو اور دو پانچ اور کالا پتھر وغیرہ میں اس جوڑی کو بہت پسند کیا گیا اور اس کے

www.paksociety.com

ساتھ ہی دونوں کے تعلق کی خبریں بھی اخبارات کی زینت بننے لگیں۔ ایک بار پھر پروین بوبی کی آنکھوں میں خواب اُتر آئے۔ وہ دونوں اکثر پارٹیوں میں ساتھ دیکھے جانے لگے پھر نہ جانے کیا ہوا کہ پروین اچانک ہی منظر سے غائب ہوگئی اور کافی عرصہ تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

چھ سال ممبئی سے دور رہنے اور پُراسرار انداز میں غائب ہونے کے بعد اچانک ہی اس کی آمد نے ایک دھماکا کردیا۔ ایک پریس کانفرنس میں اس نے ایتابھ پر الزام لگایا کہ اس نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی کیونکہ اس نے ایتابھ کے وائٹ کالر جرائم میں ملوث ہونے کا ثبوت تلاش کرلیا تھا۔ انہی دھمکیوں سے ڈر کر وہ امریکا چلی گئی تھی۔ ان انکشافات نے انڈسٹری میں ہلچل مچادی لیکن ایتابھ نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی اختیار کیے رکھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پروین بوبی محض اپنی ناکامی کا انتقام لے رہی ہے اور اس کا مقصد ایتابھ کو بدنام کرنا اور میڈیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا تھا۔ پروین بوبی نے ایتابھ پر یہ الزام بھی لگایا کہ اسے ایک فلم کے سیٹ پر حادثاتی موت مارنے کا پروگرام بھی بنایا گیا تھا جس کا اسے بروقت پتا چل گیا اور وہ محتاط ہوگئی۔

پروین بوبی کے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہرینِ نفسیات کا کہنا تھا کہ شیزوفیرینا کا مریض اپنے علاوہ ہر ایک پر شک کرنے لگتا ہے اور یہ مرض انتہائی ذہین شخصیات کو لاحق ہوتا ہے۔ ایسا شخص اگر کسی سے اپنی ذہانت شیئر نہ کرے تو وہ گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے اور تنہائی اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ بوبی بھی اسی ذہانت کے ہاتھوں برباد ہوئی کیونکہ کوئی دوسرا اس کی ذہانت اور حساسیت کو شیئر کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے جن مردوں پر تکیہ کیا، ان میں سے کسی نے بھی اس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اپنی غرض پوری کرنے کے بعد ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔

امریکا سے واپس آنے کے بعد پروین نے اپنے انتہائی قریبی دوستوں اور عزیزوں سے بھی ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جس بلڈنگ میں رہتی تھی، اس کے مکینوں سے بھی تعلقات نہ تھے۔ گم نامی کی زندگی اس نے خود قبول کی تھی کیونکہ جو بھی اس سے ملنے گیا۔ اسے بوبی کی جانب سے انتہائی بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنے آخری ایام بے حد اذیت میں گزارے۔ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ انڈسٹری کے لوگ بھی اسے فراموش کرچکے تھے۔

20 جنوری 2005ء کی صبح پروین کے پڑوسیوں نے محسوس کیا کہ کچھ خلافِ معمول ہوا ہے۔ پروین کے فلیٹ کے دروازے کے باہر اخبارات پڑے ہوئے تھے اور مرکزی دروازہ اندر سے بند تھا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی اور جب دروازہ کھولا گیا تو اندر کا منظر دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ تین کمروں کے اس فلیٹ میں اپنے دور کی نمبر ون اداکارہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی اور اس کی لاش کو اس حالت میں دو سے تین روز گزر چکے تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس کی موت طبعی ہے اور بروقت ڈاکٹر سے رجوع نہ کرنے کے باعث ہوئی ہے۔ اس کی تدفین کے موقع پر تینوں دوست یعنی مہیش بھٹ، کبیر بیدی اور ڈینی بھی موجود تھے جو پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنی محبوبہ کو منوں مٹی تلے دفن ہوتا دیکھ رہے تھے۔

پروین بوبی جو تمام عمر تنازعات اور اسکینڈلز میں اُلجھی رہی، اس کی موت پر بھی ایک تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ اس کی آخری رسومات کس مذہب کے تحت ادا کی جائیں کیونکہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ چرچ جاکر عبادت کیا کرتی تھی۔ اس سے بہت سے لوگوں کو گمان گزرا کہ کہیں اس نے عیسائی مذہب تو قبول نہیں کرلیا تھا' لیکن پروین بوبی کے خاندان والوں نے تصدیق کی کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی اور خود بھی آخر وقت تک مسلمان رہی، لہٰذا اس کی آخری رسومات بھی مسلم عقیدے کے مطابق ہی ادا کی جائیں گی۔

پروین بوبی اس دنیا میں نہیں رہی لیکن جب بھی ناکام عشق کی داستان چھیڑی جائے گی تو اس کا تذکرہ بھی ضرور ہوگا۔ وہ سچی محبت کی تلاش میں ایک کے بعد دوسرے مرد کا دامن تھامتی رہی لیکن اسے بے وفائی، دھوکے اور جھوٹے وعدوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ وہ بڑی فراخ دلی سے اپنے جسم کا خزانہ لٹاتی رہی اور یہ بھول گئی کہ عورت کی عزت ہی اس کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ اگر وہ اپنے فلمی امیج کو ذاتی زندگی سے الگ رکھتی تو شاید اس کی کہانی کچھ اور ہوتی۔ اسی بولڈ امیج کی وجہ سے اس کی زندگی میں آنے والا کوئی بھی مرد اس کے جذبوں کی سچائی سمجھنے سے قاصر رہا اور وہ اپنی کتابِ زندگی میں ناکام عشق کی داستان رقم کرتی رہی۔ کاش وہ محبت کے سراب کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اچھی اداکارہ بننے پر توجہ دیتی تو اسے قدم قدم پر بے وفائی کا دکھ نہ سہنا پڑتا۔

www.paksociety.com

فلمی الف لیلہ

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب' صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے' اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درد داستاں سرگزشت

قسط: 206

عشق ناکام نمبر

دراصل محبت کی وہی داستانیں مشہور ہوئیں جن کا انجام ناکامی پر ہوا اور آج بھی لوگ ان داستانوں میں دلچسپی لیتے ہیں مثلاً لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا، سسی پنوں، سہتی مراد، وغیرہ وغیرہ۔ یہ دنیا کی وہ مشہور داستانیں ہیں جن میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں عشق میں ناکامی ہوئی۔ ذرا خود سوچیے کہ اگر لیلیٰ مجنوں کو عشق میں ناکامی نہ ہوتی تو کوئی آج ان کا نام تک نہ جانتا۔

مثلاً ایک محبت کی کہانی یہ بھی ہے۔
ایک باغ میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے ہوئے تھے۔
ماحول بہت رومانٹک تھا۔
لڑکے نے اس محبت بھرے ماحول میں لڑکی سے پوچھا
''کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟''
لڑکی نے کہا ''ہاں۔''
اور دونوں آپس میں خوشی خوشی رہنے لگے۔

اس قسم کی کہانی کو بھلا کون یاد رکھے گا؟ ایسی ہزار کہانیاں ہیں مگر ہمیں ان میں سے ایک کہانی بھی یاد نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ وہ ناکام عشق کی کہانی نہیں ہے۔ یوں بھی عاشق وہی کہلاتا ہے جو عشق میں ناکام ہوا ہو ورنہ کون کسی کو یاد رکھتا ہے؟

ہماری فلمی دنیا میں ناکام عاشقوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ جس نے بھی عشق کیا کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

ناکام عشق کی جب بات چلتی ہے تو میڈم نور جہاں کا ذکر ضرور آتا ہے۔ انہوں نے شوکت حسین رضوی سے عشق کیا مگر وہ عشق یہاں قابلِ ذکر نہیں ہے کیونکہ انہوں نے شوکت حسین رضوی کو حاصل کرلیا لیکن، جب انہوں نے اداکار اعجاز سے عشق کیا تو قابلِ ذکر ٹھہرا...... کیوں؟ یہ میں آگے بتاؤں گا۔

جہاں تک ہمارے علم میں ہے، میڈم نور جہاں نے اگر دنیا میں کسی سے عشق کیا تو وہ اداکار اعجاز تھے۔

میڈم نور جہاں فلم ''خاندان'' کی نمائش کے بعد ملک گیر شہرت حاصل کرچکی تھیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک دنیا ان کی پرستار تھی۔ ان کا بہ طور گلوکارہ اور اداکارہ سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔ لاہور سے بمبئی جانے کے بعد اس زمانے میں وہ ایک فلم کا معاوضہ ستّر ہزار روپے وصول کرتی تھیں جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

فلم خاندان کی شوٹنگ کے دوران میں فلم کے ہدایت کار شوکت حسین رضوی اور ہیروئن نور جہاں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ اگر میڈم کے گھر والے درمیان نہ آجاتے اور عدالت میں ان سے بیان نہ دلوادیتے تو یہ عشق کامیاب ہوجاتا۔ نور جہاں اپنے خاندان والوں کے سامنے مجبور تھیں اور شوکت حسین رضوی سخت غضبناک تھے۔ بمبئی کے ایک فلم ساز نے معقول رقم پر انہیں بہ طور ہدایت کار سائن کیا لیکن شوکت صاحب یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی بے خبری میں نور جہاں کو اس فلم کی ہیروئن منتخب کرلیا گیا ہے۔ بہر حال، میڈم نور جہاں ایک روز اپنے گھر سے نکل کر کھڑکی کے راستے شوکت صاحب کی زندگی میں داخل ہوئیں اور ان کی شادی ہوگئی۔ بمبئی میں اس زمانے میں شوکت حسین رضوی اور نور جہاں خوبصورت ترین اور خوش لباس ترین جوڑا کہلاتا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد شوکت صاحب اور نور جہاں پاکستان آگئے جہاں میڈم کے خاندان والوں نے پھر انہیں گھیر لیا۔ ان کے زیرِاثر میڈم چوری چھپے وہ کام بھی کرنے لگیں جو شوکت صاحب کو پسند نہ تھا۔ کرکٹر نذر محمد سے ملنا بھی ان میں شامل ہے۔

کرکٹر نذر محمد اس زمانے میں انڈیا کے کامیاب دورے سے واپس آئے تھے۔ لاہور میں ان کی ملاقاتیں نذر محمد کے ساتھ شروع ہوگئیں۔ وہ نور جہاں سے ملنے ان کے گھر بھی آنے لگے۔ شوکت صاحب کو ایک دن کسی نے مطلع کردیا۔ وہ غصے میں بھرے ہوئے پہنچے تو نذر محمد کو پتا چل گیا اور وہ گھبرا کر بالکونی سے باہر کود گئے۔ اس طرح جان تو بچ گئی لیکن وہ معذور ہوگئے اور کرکٹ کھیلنے کے قابل نہ رہے۔ اسے بھی ناکام عشق کہا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں شوکت صاحب سے علیٰحدگی کے بعد کافی واقعات گزرے۔ اسکینڈل تو بہت مشہور ہوئے مگر بالآخر نور جہاں اور اعجاز کی شادی ہوگئی۔ میڈم نور جہاں نے اعجاز کے مطابق خود کو ڈھال لیا۔ کچھ عرصہ سکون سے گزرا لیکن پھر اعجاز، پنجابی کی مقبول ہیروئن فردوس کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔

ملکۂ ترنم نے شادی کے وقت اعجاز سے کہا تھا کہ وہ ان کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہیں۔ ان دنوں وہ گلوکاری کے ساتھ اداکاری بھی کرتی تھیں لیکن اعجاز کی خوشنودی کی خاطر انہوں نے اداکاری ترک کردی اور ان سے کہا کہ گانا میری زندگی ہے لیکن آپ کہیں گے تو میں گانا بھی چھوڑ دوں گی۔ اعجاز نے انہیں فلموں میں گلوکاری کی اجازت دے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فلم ساز، خصوصاً پنجابی فلم کا فلم ساز اپنی فلم میں ان کے گانے شامل کرنا ضروری سمجھتا تھا جس کی وجہ سے میڈم کے نغمات کے نرخ بھی بڑھتے گئے اور فلموں کی تعداد میں بھی بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ ایک ایک دن میں تین تین گانے ریکارڈ کراتی تھیں۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے ان کی آواز میں پہلے جیسی چمک اور دلکشی

باقی نہیں رہی تھی یہاں تک کہ خورشید انور جیسے عظیم موسیقار نے اپنی زیرِ تکمیل فلم ''تانی'' (تان سین کی محبوبہ) کو بنانے کا ارادہ ہی ملتوی کردیا اور میڈم کے بجائے ناہید نیازی اور دوسری گلوکاراؤں کی آواز استعمال کرنی شروع کردی۔

میڈم نور جہاں اس سے بے نیاز تھیں کیونکہ پیسا بارش کی طرح برس رہا تھا اور فلم ساز کئی کئی دن پہلے ان سے گانے کی ریکارڈنگ کے لیے وقت لیا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں وہ ایک بار ایور نیو اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل سے ناراض ہوگئیں جس کا اسٹوڈیو کے کاروبار پر بہت اثر ہوا اور آغا گل جیسے فلم انڈسٹری کے ستون ان کی بات ماننے پر آمادہ ہوگئے۔

موسیقار سازندے اور گلوکار بھی میڈم نور جہاں کو سربراہ قبول کرچکے تھے۔ اگر میڈم کسی موسیقار کا بائیکاٹ کردیں تو اس کا مستقبل تباہ ہوجاتا تھا۔ اس سلسلے میں فلم ''اجنبی'' کا واقعہ بیان کیا جاچکا ہے، جب میڈم کی رضا کے مطابق پلے بیک ایسوسی ایشن نے نثار بزمی جیسے تجربہ کار اور

نور جہاں لتا منگیشکر کے ساتھ

نامور موسیقار کا بائیکاٹ کردیا تھا۔ بہر حال، وہ ایک علیٰحدہ قصہ ہے۔ مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ میڈم نور جہاں کی آواز کے بغیر کوئی پنجابی فلم بنانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس زمانے میں فردوس کی وجہ سے میڈم اور اعجاز کے درمیان اختلافات پیدا ہوچکے تھے، یہاں تک کہ میڈم نے اعلان کردیا تھا کہ جس فلم کی ہیروئن فردوس ہوں گی اس فلم کے لیے وہ گانے نہیں گائیں گی۔ اس اعلان نے فلمی صنعت میں ہلچل مچادی کیونکہ میڈم کی آواز اور فردوس کی اداکاری دونوں پنجابی فلموں کے لیے لازم وملزوم سمجھی جاتی تھیں۔ میڈم نور جہاں نے پوری فلمی زندگی میں کبھی کسی سے ہار نہیں مانی تھی لیکن اعجاز کی فلم ''ہیر رانجھا'' کا معاملہ تھا جس کے فلم ساز اور ہیرو خود اعجاز تھے۔

نور جہاں اپنے بیٹے اکبر رضوی اور پوتے پوتیوں کے ہمراہ

فلم کے پہلے گانے کی صدابندی کے وقت تک ایک کشمکش کا سماں تھا۔ خواجہ خورشید انور نے اسٹوڈیو میں گانے ٹائٹل ریکارڈنگ کے لیے ریہرسل شروع کردی تھی۔ یہ طوفان کیا رنگ لائے گا۔ کوئی نہیں جانتا تھا؟

عین اس وقت جب گانے کی صدابندی شروع ہونے والی تھی، میڈم نور جہاں کا فون آیا کہ وہ گانے کی ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو پہنچ رہی ہیں۔ ماحول کا تناؤ اچانک کم ہوگیا۔ میڈم اپنے مخصوص انداز میں ساڑی باندھے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں اور ریکارڈنگ ہال میں پہنچ گئیں۔ اس کے بعد فلم ''ہیر رانجھا'' کے تمام گانے میڈم نور جہاں نے گائے۔ اس لڑائی میں جیت کس کی ہوئی اور ہار کس کی؟ بہ ظاہر اداکارہ فردوس کی جیت ہوئی تھی مگر درحقیقت اعجاز سے میڈم کی محبت کی جیت تھی۔ وہ عورت جو بڑے بڑے سربراہانِ مملکت سے اپنی ضد منواتی رہی تھی، عشق کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ یہ اعجاز سے میڈم نور جہاں کے عشق کی انتہا کا ثبوت تھا۔

ہمیں میڈم کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ مشاہدے اور تجربے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دراصل میڈم نور جہاں اعجاز سے عشق کرتی ہیں۔ اعجاز کی خاطر انہوں نے اپنی انا کو بھی قربان کردیا تھا۔

ایک بار ایک ریستوران میں چند قریبی لوگ موجود تھے۔ بات نکلی تو عشق تک پہنچ گئی۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

میڈم خاموشی سے بیٹھی سنتی رہیں، پھر ایک سرد آہ بھر کر بولیں ''اللہ کسی کو عشق کا روگ نہ لگائے۔ یہ انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔''

اس وقت میڈم اور اعجاز کی علیٰحدگی ہوچکی تھی۔ میڈم نور جہاں نے جس انداز میں یہ فقرہ کہا، اس نے سارے

www.paksociety.com

ماحول کو سوگوار کردیا۔ کافی دیر تک سب خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میڈم کے اس فقرے کے بعد کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

یہ بھی ایک ناکام عشق تھا۔ اس میں ہار ایک ایسی ہستی کی ہوئی تھی جو ساری زندگی فتوحات حاصل کرتی رہی تھی۔ یہ واقعہ ہمیشہ ہمارے دل پر نقش رہے گا۔ ناکام محبت کی اس سے بڑی مثال ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ میڈم کو اپنی کوٹھی سے اُٹھا کر اچانک فلم اسٹوڈیو تک لے جانے والی طاقت کون سی تھی؟ زندگی میں یہ میڈم کی پہلی ناکامی تھی۔

☆☆☆

پاکستان مزاحیہ اداکاروں کے اعتبار سے ہمیشہ ایک زرخیز خطہ رہا ہے۔ پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کو قدرت نے جو فطری خوبیاں عطا کی تھیں وہ انڈیا کے مزاحیہ اداکاروں کے حصے میں نہیں آئیں۔ ایک زمانے میں یعقوب بہت مشہور اداکار تھے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ ولن اور کامیڈین کا کردار یکساں مہارت سے ادا کرتے تھے۔ گوپ اپنے مٹاپے اور حرکتوں کے ذریعے کامیڈی کرتے تھے۔ انہیں کبھی اچھے مزاحیہ مکالمے بولنے کو نہیں ملے مگر ان کا مٹاپا اور مزاحیہ حرکتیں فلم بینوں کو ہنسایا کرتی تھیں۔ سب سے زیادہ شہرت چارلی کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنے چہرے کا انداز بھی ایسا بنالیا تھا کہ انہیں انڈیا کا چارلی چپلن کہا جاتا تھا۔ چارلی ایک بہت اچھے مزاحیہ اداکار تھے۔ مکالموں کے علاوہ وہ اپنی حرکات سے بھی کامیڈی پیدا کردیا کرتے تھے۔ وہ غالباً ہندوستان کے پہلے مزاحیہ اداکار تھے جنہوں نے فلموں میں ہیرو کے کردار ادا کیے اور یہ فلمیں کامیاب بھی ہوئیں مثلاً ان کی فلم سنجوگ کو دیکھنے والے کبھی نہیں بھول سکتے۔

انہی کے ہم عصر غوری بھی تھے۔ عام طور پر یہ دونوں فلموں میں یکجا کام کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں پاکستان آگئے تھے۔ چارلی نے دو فلموں میں کام کیا جو ناکام ہوگئیں۔ وہ دراصل پاکستانی فلمی صنعت کا ابتدائی دور تھا۔ فلموں، کہانیوں اور ہدایت کاری کا کوئی معیار نہ تھا اس لیے محض ایک کامیڈین فلم کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

پاکستان کے ابتدائی دنوں میں نذر بہت مشہور اور کامیاب تھے۔ بعد میں دلجیت مرزا، ساقی کا دور آیا۔ مگر ان میں سے نذر کے سوا بے پناہ مقبولیت کسی کے حصے میں نہیں آئی۔

پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کا نیا دور لہری، منور ظریف، سلطان کھوسٹ، نرالا، رنگیلا اور ننھا کے زمانے سے شروع ہوا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ محض مکالموں کی ادائیگی پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ نذر اور رنگیلا منہ بنا کر اور گرتے پڑتے بھی ہنسا دیتے تھے۔ رنگیلا کا مخصوص انداز تھا مگر اس کے لیے مخصوص کردار ضروری تھے۔

لہری اپنے زمانے کے منفرد مزاحیہ اداکار تھے۔ وہ سیٹ پر گر کر یا ٹھوکریں کھا کر کامیڈی پیدا نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی شکلیں بگاڑتے تھے۔ سادہ اور سنجیدہ چہرے کی مدد سے وہ بہت اچھی کامیڈی کرتے تھے جس میں برمحل مکالموں اور مکالموں کی ادائیگی کا مخصوص انداز فلم بینوں کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کردیتا تھا۔ علی اعجاز اچھے کردار اور مناسب مکالموں کے بغیر اچھی کامیڈی نہیں کرسکتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک گول مٹول، موٹا تازہ، ہنس مکھ مزاحیہ اداکار پردۂ فلم پر نمودار ہوا۔ یہ ننھا تھے۔ ننھا کو شہرت دراصل ٹی وی ڈراما سیریل ''الف نون'' سے حاصل ہوئی تھی۔ بنیادی طور پر یہ ڈراما صرف دو اداکاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک الف یعنی الن (کمال احمد رضوی) اور دوسرے نون یعنی ننھا۔ نون کا کردار ایک معصوم اور سیدھے سادے آدمی کا تھا جو اپنی حماقتوں کی وجہ سے بنا بنایا کام بگاڑ دیتے تھے لیکن دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک دلچسپ اور انوکھا تجربہ تھا۔ الف بہت چالاک، دھوکے باز، چرب زبان کردار تھا جبکہ ننھا بھولا بھالا، سچا اور معصوم آدمی تھا جس کی سچائی کے باعث ہمیشہ بنا بنایا کام بگڑ جاتا تھا۔

الف نون جیسا پروگرام پھر کبھی نہیں دیکھنے میں آیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مقبول پروگرام کو بند کیوں کیا گیا اور دوبارہ کیوں شروع نہ کیا گیا؟ یہ آج کے زمانے میں پہلے سے زیادہ مقبول ہوسکتا ہے کیونکہ اب میڈیا کو زیادہ آزادی ہے اور اس مزاحیہ اور طنزیہ پروگرام کے تحت ان حالات سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ جوڑی اب ادھوری رہ گئی ہے۔ ڈرامے کا ایک اہم کردار ننھا اب دنیا میں نہیں رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کمال احمد رضوی کے لکھے ہوئے کرداروں میں ننھا جان ڈال کر انہیں جیتا جاگتا انسان بنا دیتا تھا۔

رفیع خاور ننھا کا تعلق ایک بہت اچھے اور مہذب گھرانے سے تھا جس کا اظہار ان کی بات چیت اور شائستگی سے بھی ہوتا تھا۔

الف نون کے ذریعے مقبولیت حاصل کرکے ننھا نے فلموں میں بھی جگہ بنالی اور رفتہ رفتہ ایک مقبول مزاحیہ اداکار بن گیا۔ ننھا مجسم کامیڈی اور خوشی کا پیغام بر تھا۔ عام زندگی میں بھی اس کی آنکھوں میں شرارت جھلکتی تھی۔ اس کے بات کرنے کا انداز بھی دوسروں سے مختلف تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کرچکا ہوں، ہمارے مزاحیہ اداکاروں کو قدرت نے فطری ظرافت، حاضر جوابی اور شوخی عطا کی تھی اس لیے وہ فلم کی شوٹنگ کے دوران.... اپنی طرف سے بھی بہت خوبصورت فقروں کا اضافہ کردیتے تھے۔ ظریف سے لے کر ننھا تک یہ خوبی قدرت نے ہر ایک مزاحیہ کردار کو بخشی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اداکاری میں زندگی اور زندہ دلی تھی۔ ننھا بہ طور خاص ہر وقت لوگوں کو ہنساتا رہتا تھا۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور دوسروں کو بھی شادکام کردیتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ ایک بار پھر بیان کیا جارہا ہے کہ فلم ''پلے بوائے'' کا یونٹ شوٹنگ کے لیے یورپ جارہا تھا۔ یونٹ کے سبھی افراد ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کررہے تھے۔ ہماری بڑی بیٹی نادیہ کی عمر اس وقت پانچ سال کے قریب تھی۔ اس نے کبھی کوئی ایسا سکھ نہیں دیکھا تھا جو پگڑی کے ساتھ اپنی ڈاڑھی پر پٹی بھی باندھتا ہو۔

نادیہ سارے ہوائی جہاز میں گھومتی پھر رہی تھی۔ اپنی معصوم اور شریر حرکتوں کی وجہ سے سب کی نظریں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔ نادیہ گھومتی ہوئی عکاس کامران مرزا اور ننھا تک پہنچ گئی۔ ننھا کے ساتھ دوسری سیٹ پر ایک سردار جی بیٹھے تھے جنہوں نے اپنی ڈاڑھی کو بھی کپڑے کی مدد سے کس کر باندھا تھا۔ نادیہ نے یہ منظر دیکھا تو کچھ دیر تو حیران رہ گئی پھر بڑی معصومیت سے سردار جی کے پاس گئی۔ سردار جی نے بھی اس کو پیار سے اپنے پاس بٹھالیا۔ نادیہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

''مولوی صاحب، آپ نے اپنی ڈاڑھی پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟''

سردار جی تو مسکرانے لگے مگر ننھا نے بہت زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ''سردار جی، معاف کرنا اس نے کبھی منہ پر پٹی باندھے ہوئے سردار جی نہیں دیکھے۔''

نادیہ ہمدردی سے بار بار پوچھ رہی تھی ''مولوی صاحب، کیا آپ کو چوٹ لگی ہے؟''

ننھا کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ نادیہ کو گود میں لے کر ہر ایک کے پاس گئے اور یہ لطیفہ سنایا۔

اس کے بعد بھی جب کبھی ننھا سے ملاقات ہوتی، وہ یہ ضرور پوچھتے تھے کہ آپ کی بچی کا کیا حال ہے جو مولوی صاحب کا علاج کرارہی تھی۔

نور جہاں، شوکت رضوی بیٹی کے ہمراہ

ننھا کو ہم نے کبھی پریشان یا اُداس نہیں دیکھا، ہنستے مسکراتے ہی دیکھا۔ سوچتے تھے کہ یہ کس قسم کا انسان ہے جو کبھی پریشان ہی نہیں ہوتا۔

ہاں، ایک بار وہ پریشان نظر آئے تھے۔ ہم نے فلم ''آس'' شروع کی تھی جس کے ہدایت کار بھی ہم خود تھے۔ ننھا کے لیے ہم نے بہ طور خاص ایک کردار لکھا تھا۔

ننھا کو ہم نے خاص طور پر بلایا اور فلم کا اسکرپٹ پڑھنے کو دیا جو انہیں بہت پسند آیا۔ وہ اس کردار سے بہت خوش تھے۔ یکا یک سوچ میں پڑ گئے پھر بولے ''آفاقی صاحب، آپ نے محمد علی صاحب کو اسکرپٹ پڑھایا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ اس کردار کے لیے آپ مجھے سائن کررہے ہیں۔''

ہم نے حیران ہوکر پوچھا ''ننھا صاحب، یہ ہماری فلم ہے۔ محمد علی صاحب کی نہیں اور یہ کردار ہم نے آپ ہی کے لیے لکھا ہے۔''

ننھا نے بتایا کہ ان دنوں محمد علی ان سے ناراض تھے اور ان کی جگہ ایک اور کامیڈین کی سفارش کررہے تھے۔ وہ آبدیدہ ہوکر بولے ''آفاقی صاحب، مجھے تو شباب صاحب نے بھی اپنی فلم سے کٹ کردیا ہے۔''

ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہماری فلم میں ایسا نہیں ہوگا۔

دو روز بعد اسکرپٹ کے بارے میں محمد علی صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا ''آفاقی، کیا یہ کردار تمہارے نزدیک ننھا کے لیے موزوں ہے؟''

ہم واقعہ کا پس منظر جانتے تھے مگر سرسری طور پر کہا کہ یہ کردار ہم نے ننھا کے لیے ہی لکھا ہے، پھر ہم نے اس کی

www.paksociety.com

وجوہات انہیں سمجھائیں۔

وہ بولے ”سوچ لو، تم رائٹر اور ڈائریکٹر ہو۔“

اس کے بعد اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ سنتوش رسل اور ننھا کو ان کے کرداروں میں بہت پسند کیا گیا۔

سنتوش رسل کراچی میں رہتی تھیں۔ لوگوں نے ہمیں

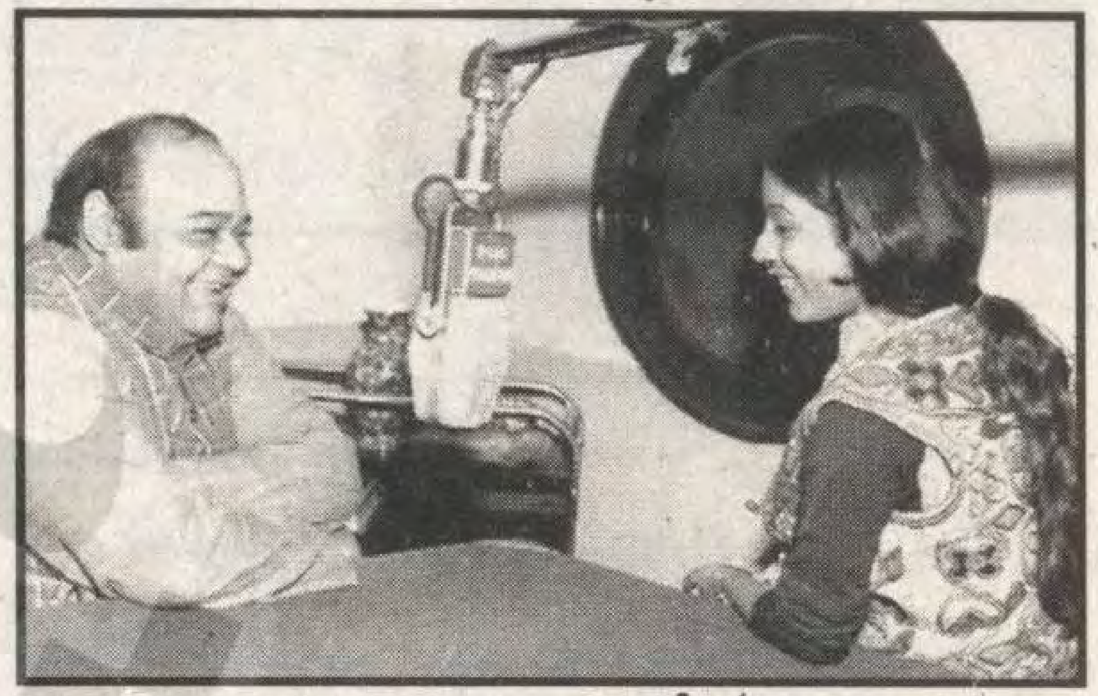

اداکار ننھا انٹرویو دیتے ہوئے

سمجھایا کہ بلاوجہ اتنا خرچا برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لاہور میں اس کردار کو کرنے والی ایکٹریسوں کی کمی ہے۔

ہم نے کہا ”وہ سب اچھی ایکٹریس ہیں مگر اس قسم کے کردار کئی بار کرچکی ہیں۔ سنتوش رسل کے لیے یہ ایک موزوں اور مختلف کردار ہے۔“

فلم کے کرداروں کے بارے میں ہم بہت حساس ہیں۔ عقیل جو اس زمانے میں ظلِ ہما کے شوہر اور میڈم نور جہاں کے داماد تھے، انہوں نے کردار تو بہت پسند کیا مگر کہا کہ میڈم نے انہیں فلموں میں کام کرنے سے منع کیا ہے۔

ہم نے میڈم کو بھی اس پر آمادہ کرلیا۔ عقیل خود بھی مانتے ہیں کہ محمد علی جیسے اداکار کے سامنے انہوں نے بہت اچھا کردار کیا ہے۔

دیکھیے ننھا سے بات کہاں پہنچ گئی۔

ننھا ایک خوش باش اور ہنس مکھ انسان تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے۔ اس ہنسی ہنسی میں ہی انہوں نے ایک فلمی رقاصہ نازلی سے دوستی کرلی۔ دوستوں کا خیال تھا، چند روز کی بات ہے، معاملہ ختم ہو جائے گا مگر ننھا اس معاملے میں سنجیدہ ہوگئے یہاں تک کہ ان کے قریبی دوستوں کے علاوہ فلمی صنعت میں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ گھر والوں نے بہت سمجھایا مگر ان کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔

فلم ”ہم اور تم“ کی شوٹنگ کے لیے ہم لندن گئے تو نازلی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ طور پر رشتے کا اعلان نہیں کیا تھا مگر ان کے بے تکلف دوست نازلی کو بھابی کہتے تھے۔

لندن کے گرد و نواح میں ویلز کے خوبصورت مقام پر فلم کا یونٹ ٹھہرایا گیا۔ سلمیٰ ممتاز کسی اور ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں مگر باقی سب ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ یہ بہت بے تکلف اور گھریلو ماحول تھا۔ باورچی پاکستان سے لے جایا گیا تھا۔ ہر ایک کے فلیٹ میں ہر طرح کی آسانیاں تھیں مگر ننھا جانتے تھے کہ ہم چائے بنانا بھی نہیں جانتے۔ ہدایت کار حسن عسکری کی بیگم بھی یہ بات جانتی تھیں۔ صبح سویرے ہماری کھڑکی پر دستک ہوئی اور بیگم عسکری چائے کی پیالی کے ساتھ کھڑی نظر آتیں یا ننھا صاحب موجود نظر آتے۔ ننھا نے ہمیں اپنے ہاتھ سے بنا کر اور نازلی سے پکوا کر انتہائی لذیذ مرغی بھی کھلائی۔

ہم نے ان دونوں کے مراسم کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ انہوں اس موضوع پر روشنی ڈالی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ننھا نازلی کے عشق میں سرتاپا غرق ہو چکے تھے۔

ہم لوگ لاہور واپس آئے تو فلمی دنیا میں اس سے پہلے یہ خبریں پہنچ چکی تھیں، ان دنوں زندگی میں پہلی بار ننھا کچھ پریشان اور اُلجھن میں نظر آئے، سنا تھا کہ وہ اپنی نئی تعمیر شدہ کوٹھی نازلی کے نام کررہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گھر والوں کو یہ بات ہرگز منظور نہ تھی۔

ایک دن ہم وحدت روڈ سے اسٹوڈیو جارہے تھے کہ ننھا نے کہا ”آفاقی، راستے میں میرا غریب خانہ ہے، چائے کی ایک پیالی پی لیں۔“

ہم فوراً رضامند ہوگئے۔ وحدت روڈ پر انہوں نے بہت خوبصورت گھر بنایا تھا اور اس کی سجاوٹ بھی خوب کی تھی۔ جتنی دیر میں چائے آتی وہ ہم سے ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتے رہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ننھا سے ہماری آخری ملاقات ہے۔

رمضان کا مبارک مہینا تھا، ایک روز علی الصباح یہ خبر ملی کہ ننھا نے خودکشی کرلی ہے۔

فوراً ان کے گھر گئے۔ اور بھی لوگ، فلمی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب حیران تھے کہ ننھا اور خودکشی! یہ کیسے ممکن ہے؟ گھر والوں نے بتایا کہ وہ کئی دن سے پریشان تھے اور اوپر کے حصے میں تنہا رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک رائفل بھی تھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ جس شخص کی دماغی کیفیت ایسی ہو اس کو تنہا کمرے میں رائفل کے ساتھ رہنے کیوں دیا گیا؟

www.paksociety.com

گھر والوں کے بیان کے مطابق سحری کے وقت بندوق چلنے کی آواز آئی۔ جب ان کے کمرے میں گئے تو وہ کرتہ پاجامہ اور گاؤن پہنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ خون کا کوئی قطرہ نہیں نظر نہ آیا۔ پولیس کو حیرت تھی کہ اگر انہوں نے خودکشی کی تو جسم سے خون کیوں نہ نکلا اور صوفہ بے داغ کیوں تھا؟ اگر انہوں نے کسی اور صوفے پر خودکشی کی اور پھر صوفے پر آکر بیٹھ گئے تو باقی خون کہاں گیا؟

پولیس نے بہت تفتیش کی، ان کے گھر والوں اور دوستوں نے مختلف تاویلیں پیش کیں مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ ننھا تو دنیا میں نہیں رہے تھے، جنازے اور نماز کے وقت ایک ہجوم تھا مگر رفتہ رفتہ سب نے ننھا کو بھلا دیا۔ اسی کا نام دنیا ہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

نازلی صورت شکل میں کوئی قابلِ ذکر نہ تھیں پھر ساری لڑکیوں کو چھوڑ کر ننھا ان پر عاشق ہوگئے۔ یہاں تک کہ گھر والوں سے اس بات پر اختلاف ہوگیا اور نتیجہ...... ایک بڑے فن کار کی موت۔

ایک ہنستے ہنساتے انسان کا یہ المناک انجام؟ شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

ننھا جیسا مختلف کردار ادا کرنے والے اداکار بہت کم ہیں۔ کامیڈی تو خیر وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض ڈرامائی اور ٹریجڈی کرداروں میں بھی جان ڈال دی تھی۔ ننھا کی موت آج تک ایک پُراسرار معمّا بنی ہوئی ہے۔

☆☆☆

آیئے، اب ایک یکطرفہ عشق کی کہانی سنیئے، عشق کرنے کے لیے دو کردار ہونے ضروری ہیں ورنہ وہی معاملہ ہوتا ہے کہ ”بس میری شادی میں پچاس فیصد کی کمی رہ گئی ہے۔“

”بھئی وہ کیسے؟“

”میں تو رضامند ہوں مگر دوسرا فریق آمادہ نہیں ہے۔“

اس کہانی کو مختلف انداز میں بیان کیا جاچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ناکام عشق کی ایک ایسی داستان ہے جس پر خود ہمیں بھی یقین نہیں آتا۔

اس کہانی کے مرکزی کردار اداکارہ شمیم آرا اور ہدایت کار فرید احمد ہیں۔

شمیم آرا اپنے عروج پر تھیں جب فرید احمد ان کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ شمیم آرا کی طرف سے ان کی دل شکنی کی گئی لیکن حوصلہ افزائی بھی نہیں ہوئی۔ شمیم آرا کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں میں تھی لیکن کچھ تو ان کی پسند

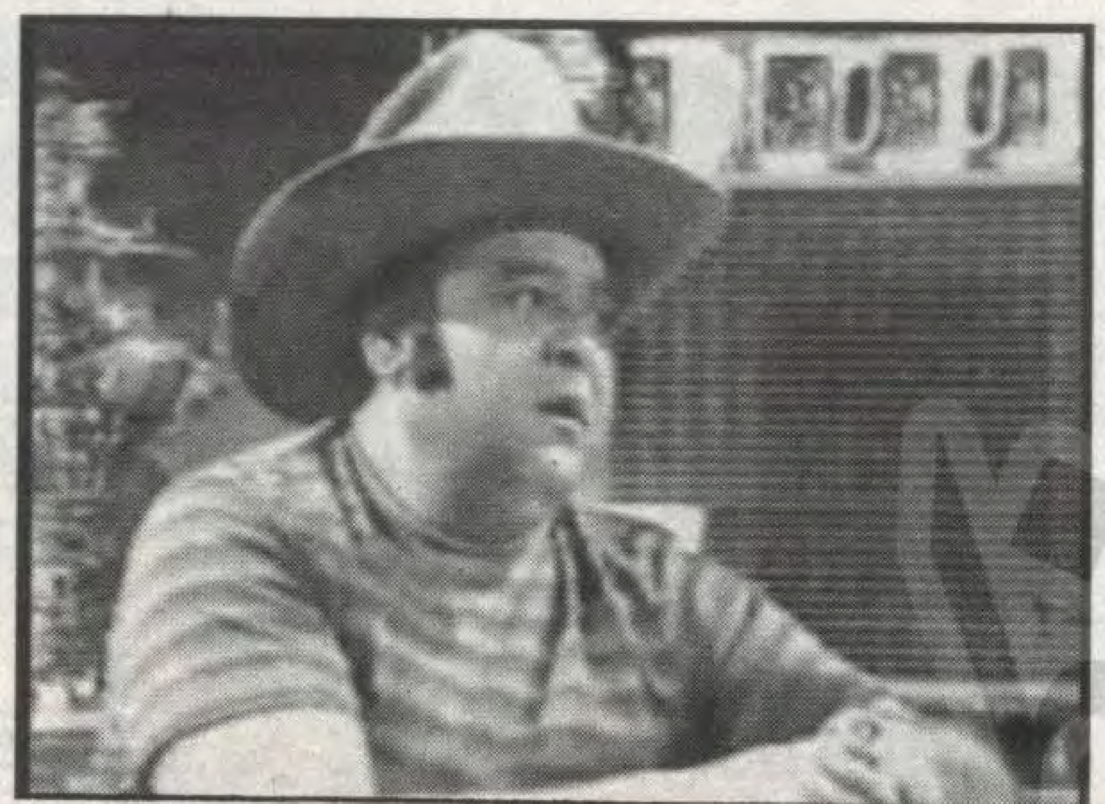

اداکار ننھا

اور کچھ ان کی نانی اماں کو ناپسند کے باعث ان کی شادی کی نوبت نہ آسکی۔ شمیم آرا ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنی ”ماں جی“ نانی کی تابع دار تھیں۔ ماں جی شمیم کے عروج کے زمانے میں ایک سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

شمیم آرا بہت اچھے کردار کی سادہ سی لڑکی تھیں اور ان کی یہی خوبی سب کو پسند تھی۔ وہ شرمیلی اور بہت شائستہ لڑکی تھیں لیکن دل تو ہر ایک کے سینے میں ہوتا ہے۔

اداکار کمال نے ان سے بہت ہمدردی جتائی یہاں تک کہ وہ شادی پر بھی رضامند ہوگئے۔ شمیم آرا کی چھوٹی بہن کے تعاون سے ایک رات انہوں نے رات کو بارہ بجے گھر سے نکلنے کا منصوبہ بنایا۔

شمیم آرا نے اپنی بہن کے مشورے سے کچھ زیورات اور قیمتی سامان اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے اور اندھیری رات۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں گھر کا پُرانا کتا بھونک کر سب کو نہ جگادے یا کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔

ایک ایک لمحہ ماہ و سال کی طرح گزر رہا تھا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ سورج کی روشنی نے رات کے ختم ہونے کا اعلان کیا تو شمیم آرا کی امیدوں کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ خدا جانے کمال نے کیا وجوہات پیش کیں مگر سید کمال شمیم آرا کے دل سے اُتر چکے تھے۔

شمیم آرا کی پہلی فلم کا نام کنواری بیوہ تھا۔ یہ نام بہت منحوس ثابت ہوا اور شمیم آرا جیسی ہیروئن کافی عرصے تک ”کنواری“ ہی رہی۔

اب شمیم آرا پہلے سے زیادہ سمجھ دار ہوگئی تھیں اور انہیں اچھے بُرے کی پہچان ہوچکی تھی۔ ان ہی دنوں اندرونِ خانہ شمیم آرا کے گھر میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ سردار رند بلوچستان کے ایک رئیس زادے اور رنگین مزاج انسان تھے۔ وہ شمیم آرا سے شادی کے خواہش مند تھے لیکن شمیم آرا اور ان کے

ماموں اس شادی کے خلاف تھے۔ سردار رند نے ہر طرح سے دولت کی بارش کردی تھی۔ ان کی قیمتی مرسیڈیز اکثر شمیم آرا کے استعمال میں رہتی تھی۔

ان ہی دنوں ان لوگوں نے بذریعہ کار لاہور سے کراچی جانے کا پروگرام بنایا۔ راستے میں سیہون شریف میں رکنا تھا۔

اچانک خبر آئی کہ شمیم آرا نے سردار رند سے شادی کرلی جبکہ صورتِ حال یہ تھی کہ شمیم آرا اس شادی پر رضا مند نہ تھیں۔ شمیم آرا کا بیان ہے کہ ان سے زبردستی نکاح نامے پر دستخط کرائے گئے اور وہ موقع پا کر سردار رند کی مرسیڈیز لے کر کراچی پہنچ گئیں۔

اخبارات میں بہت شور مچا۔ سردار رند کا دعویٰ تھا کہ ان کا باقاعدہ نکاح ہوا ہے لیکن شمیم آرا اسے جبر کہتی تھیں۔ شمیم آرا سردار رند سے طلاق کی خواہش مند تھیں مگر وہ انہیں طلاق دینے پر تیار نہ تھے۔ مقدمہ بازی پر آمادہ تھے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں ایک حادثے میں سردار رند ہلاک ہوگئے اور یہ قصّہ ختم ہوگیا۔

کچھ عرصہ گزر گیا۔ فرید احمد کا عشق بہ دستور جاری تھا بلکہ اس میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ وہ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے دولت مند ہیں۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پڑھے ہوئے تھے۔ بہت بڑے اور شہرت یافتہ باپ کے بیٹے تھے لیکن یہ خوبیاں شمیم آرا کو پسند نہیں تھیں۔

فرید احمد نے ثمینہ احمد سے شادی کی تھی۔ ان کے دو بچے ہیں۔ دونوں میں خاصی ہم آہنگی تھی لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ دونوں میں علیٰحدگی ہوگئی لیکن مراسم بہ دستور قائم رہے۔ دراصل ایک زمانے میں فرید احمد بیمار ہوگئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ باہر جا کر علاج کرائیں۔ وہ علاج کے لیے کینیڈا گئے تو ٹیسٹ کرنے کے بعد پتا چلا کہ بیماری کا سبب یہ تھا کہ پاکستان میں ڈاکٹروں نے انہیں دودھ اور دہی کھانے کا مشورہ دیا حالانکہ یہی ان کی بیماری کا سبب تھا۔ کچھ عرصے بعد فرید احمد پاکستان واپس آگئے لیکن شمیم آرا کے عشق کا بخار ان کے سر سے نہیں اُترا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ان کی کوٹھی کے چکر لگایا کرتے تھے۔ شمیم آرا ایک بار کراچی گئیں تو فرید احمد بھی وہیں چلے گئے۔ ایک دن اچانک اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ شمیم آرا نے فرید احمد سے شادی کرلی ہے۔ فرید احمد اور شمیم آرا کے دوستوں کے لیے یہ اچھی خبر تھی۔ مگر دو دن بعد خبر آئی کہ فرید احمد اور شمیم آرا میں طلاق ہوگئی۔ یہ عجیب معمّا تھا لیکن کیونکہ خالص ذاتی معاملہ تھا اس لیے کسی نے ان سے سوالات نہیں کیے۔ البتہ ایک بار جب ہم ان کے ساتھ بنکاک گئے تو ہوائی سفر کے دوران .... ذاتی قسم کی گفتگو میں ہم نے ان سے سوال کیا کہ بھئی آپ نے دو دن کے لیے شادی کیوں کی تھی اور پھر طلاق کیوں لے لی؟ انہوں نے بہت واضح جواب دیا تھا جو صرف ہمارے لیے تھا۔

پھر شمیم آرا نے اچانک ایک روز ایگفا گیورٹ کے چیئرمین مجید کریم سے شادی کرلی۔ یہ بھی ایک اچانک اور حیرت انگیز واقعہ تھا۔ شادی کے بعد پہلے بیٹے سلمان مجید کی پیدائش کے موقعے پر وہ لندن چلی گئیں۔ اس طرح سلمان پیدائشی برٹش شہری بن گئے۔

مجید کریم سے ان کی شادی ڈیڑھ دو سال سے زائد نہ چل سکی کیونکہ شمیم آرا کا اصرار تھا کہ شادی کا باقاعدہ اعلان کیا جائے مگر خاندانی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے مجید کریم ایسا نہ کرسکتے تھے اس لیے یہ رشتہ ختم ہوگیا۔

کچھ عرصہ بعد شمیم آرا نے کراچی کے دبیر الحسن سے شادی کرلی جو پہلے ہی شادی شدہ اور بڑی عمر کے بچوں کے باپ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ دبیر صاحب نے شمیم آرا کے تمام معاملات سنبھال لیے کیونکہ شمیم آرا کی کبھی اپنی رائے نہیں رہی۔ انہوں نے کچھ جانے بغیر رائس مل خریدی اور اس سودے میں لاکھوں کا نقصان اُٹھایا۔ پھر انہوں نے بڑے پیمانے پر ایک شاندار ایڈورٹائزنگ کمپنی قائم کی اور اس میں بھی لاکھوں کا نقصان ہوا اور بینکوں سے قرضے لینے پڑے۔ دبیر صاحب نے اپنے بیٹے کو ہیرو کاسٹ کرکے ایک فلم بنائی جو فلاپ ہوگئی۔ پھر انہوں نے شمیم آرا کو ایک ٹی وی ڈراما سیریل بنانے پر آمادہ کیا جو آج تک ریلیز نہیں ہوسکی، نہ ہی ہوگی۔ ان کی شوق سے بنائی ہوئی قیمتی کوٹھی پر کرائے دار نے قبضہ کرلیا جس کی قیمت آج کل پانچ چھ کروڑ ہے مگر شمیم آرا اس سے محروم ہیں۔

شمیم آرا پر کچھ عرصہ قبل فالج کا حملہ ہوا تھا مگر وہ اس سے سنبھل گئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد دوسرا شدید حملہ ہوا اور وہ ”کوما“ میں چلی گئیں۔ بیٹا انہیں اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ ایک انتہائی شاندار اور کامیاب زندگی کا اختتام بہت دکھ کا باعث ہے۔

یہ تو شمیم آرا پر گزرنے والی قیامت ہے۔ شمیم آرا نے ہمیشہ اپنے رشتے داروں کی بہت زیادہ مدد کی۔ ماموں کے بچوں بچیوں کو بہترین اسکولوں میں پڑھایا۔ ان کے لیے ایک کار الگ مخصوص تھی۔ ان کی شادیاں بھی کیں۔ ماں جی کی بہت خدمت اور تابع داری کی۔ خاندان کا کوئی شخص ایسا نہیں جس کی شمیم آرا نے ہر ممکن طریقے پر مدد نہ کی ہو۔ اخلاق ان کا ہمیشہ سے بہت اچھا تھا۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتی تھیں۔ حیرت ہے کہ ایک ایسی ہستی کا یہ انجام ہو؟ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ان سے فیض پانے والے رشتے دار بھی ان کے خلاف باتیں کرنے لگے۔

اداکارہ شمیم آرا

غلطیاں، گناہ اور کوتاہیاں تو سبھی سے ہوتی ہیں جنہیں اللہ بخش بھی دیتا ہے۔ ان کی واحد خامی یا غلطی تھی کہ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی رائے پر عمل کیا۔ جب تک مخلص و وفادار مشیر رہے فائدے میں رہیں، اس کے بعد سب کچھ اُجڑ کر رہ گیا۔ اللہ سب کو معاف کرنے والا ہے۔

یہ تو شمیم آرا کی کہانی ہے لیکن بد قسمتی سے فرید احمد نے بھی صرف غم اور ناکامیاں ہی سمیٹیں۔ بہ ظاہر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر نعمت سے نوازا تھا۔ اعلیٰ خاندانی پس منظر، اعلیٰ تعلیم، ذہانت، جب ہدایت کار بنے تو بہت کامیاب ہوئے اور ذہین ترین ہدایت کاروں میں ان کا نام شامل ہوگیا۔

فرید احمد سے ہماری گہری دوستی اور بے تکلفی تھی جو ہمیشہ رہی۔ ایک زمانے میں انہیں یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ شاید شمیم آرا کے معاملے میں ہم ان کے رقیبوں میں شامل ہیں مگر ایسی کوئی بات نہ تھی اور بہت جلد ان کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی۔

شمیم آرا سے شادی اور دو دن بعد طلاق کے واقعے نے

اداکارہ شمیم آرا کی فلم لاکھوں میں کا پوسٹر

انہیں ذہنی طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید پلٹ کر نہ دیکھتا مگر حقیقت میں فرید احمد کو شمیم آرا سے عشق تھا جس کا وہ اظہار بھی نہیں کرتے تھے، یہ ایک خاموش اور موم کی طرح آپ ہی آپ پگھلنے والا عشق تھا۔

شمیم آرا کی شادیاں ہوتی رہیں مگر فرید احمد کے عشق میں کوئی فرق نہ آیا۔ حالات سے تنگ آ کر وہ اپنے دوست کے پاس کینیڈا چلے گئے۔ ہنر مند آدمی تھے۔ وہاں فلم سازی کے شعبے میں ملازمت مل گئی۔ انہوں نے ادارے کے لیے اعلیٰ معیاری فلمیں بنائیں کہ محکمے متاثر ہو کر انہیں ایک فیچر فلم بنانے کی پیش کش کردی۔ یہ فرید احمد کی پسند کا کام تھا۔

فلم کی تیاری، موضوع اور دوسرے معاملات میں مشورے لینے کے لیے وہ لاہور آئے اور اپنے والد ڈبلیو زیڈ احمد کے ساتھ مشورے کیے۔ احمد صاحب نے انہیں موضوع اور فلم کی تیاری کے سلسلے میں بہت مفید مشورے دیے۔

فرید احمد دوبارہ کینیڈا چلے گئے اور فلم کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ لاہور میں احمد صاحب نے فلم کا اسکرپٹ لکھنا شروع کردیا۔ فلم کے شوق اور دیوانگی نے انہیں وقتی طور پر بہت مصروف کردیا۔

احمد صاحب نے فلم کا اسکرپٹ تیار کرلیا تھا جو شعبہ فلم کو پسند بھی آیا اور عملی طور پر فلم کی تکمیل کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس اثنا میں یہ تو ممکن نہیں کہ انہوں نے شمیم آرا کو بھلا دیا ہو مگر کم از کم آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی کیفیت ہوگئی۔

www.paksociety.com

اداکارہ شمیم آرا

ایک طرف یہ کامیابیاں ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں اور دوسری طرف تقدیر مسکرا رہی تھی۔

ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ فرید احمد کو کینسر ہوگیا ہے۔ ان کے دوست اور ہمدرد یہ سن کر بہت پریشان ہوئے۔ سب کا خیال تھا کہ پہلے کی طرح اس بار بھی یہ خبر غلط ثابت ہوگی مگر ایسا نہ ہوا۔

ہم ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کے پاس جاتے رہتے تھے۔ یہ افواہ ہم نے بھی سنی تھی۔ ہمت کر کے احمد صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا فرید احمد واقعی بیمار ہیں؟

احمد صاحب نے ان کی بیماری کی تفصیل بتائی اور بتایا کہ ڈاکٹروں نے اب ناامیدی ظاہر کردی ہے اور کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ زندہ رہ سکیں گے۔ یہ ایک انتہائی المناک خبر تھی۔

سچ پوچھئے تو ہمیں فرید احمد کے ساتھ دوستی کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کے تمام حالات ہمارے سامنے تھے مگر تقدیر کے لکھے کو بدلنا کس کے بس کی بات ہے؟

احمد صاحب نے بتایا کہ فرید بہت جلد واپس آرہے ہیں۔

ہم شام کو احمد صاحب کے گھر گئے تو احمد صاحب نے فرید کا بیڈ اپنے ڈرائنگ روم ہی میں لگوالیا تھا جسے بھی خبر ملی ان سے ملنے گیا۔ سابقہ بیگم ثمینہ احمد بھی بچوں کے ساتھ کئی بار ملنے گئیں۔ ثمینہ نے علیٰحدگی کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ ''احمد'' شامل رکھا تھا۔

جب سب رخصت ہوگئے تو ہماری اور فرید احمد کی باتیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے کینیڈا کے واقعات سنائے۔ یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ جو چاہے کھاؤ اور پیو۔ کوئی پرہیز نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں لاہور کی فلمی صنعت اور فلمی لوگوں کے بارے میں بات چیت ہوئی تو فرید احمد نے سرسری طور پر دوسروں کے تذکرے کے ساتھ شمیم آرا کے بارے میں بھی پوچھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ شمیم آرا ان دنوں لاہور ہی میں تھیں۔ چند روز کے بعد شوٹنگ کے لیے بنکاک جانے والی ہیں مگر ہم نے مصلحتاً جھوٹ بول دیا اور کہا کہ آج کل وہ اپنی فلم کی ایڈیٹنگ میں مصروف ہیں۔ مختلف ملکوں میں شوٹنگ کے لیے جاتی رہتی ہیں اس لیے لاہور میں کم ہی رہتی ہیں۔

فرید احمد سمجھ گئے کہ شمیم آرا جان بوجھ کر ان سے ملنے نہیں آئیں۔ یہ شمیم آرا کے بارے میں ان سے ہماری آخری گفتگو تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی شمیم آرا کا نام زبان پر نہ لائے۔

بہ ظاہر وہ معمولی سے کمزور نظر آتے تھے اور حسبِ معمول اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے مگر احمد صاحب نے ہمیں بتایا کہ ساری رات وہ گردن میں درد کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ احمد صاحب سے کہتے تھے کہ میری گردن کٹوا دیجیے۔

ایک نیک آکوپنکچر والے ڈاکٹر اقبال عباس کو ہم نے یہ حالات بتائے تو وہ بذاتِ خود علاج کے لیے پہنچ گئے۔ ان کے علاج سے اتنا فائدہ ہوا کہ ان کے درد اور تکلیف میں کمی ہوگئی۔ رفتہ رفتہ انہیں درد سے نجات مل گئی، یہ بہت بڑا فائدہ تھا۔

ڈاکٹر عباس بلانے پر آتے تھے، یہ سب دوستی میں ہورہا تھا۔ احمد صاحب مطمئن تھے کہ کم از کم فرید کو تکلیف سے تو نجات مل گئی تھی۔

ایک دن صبح سویرے احمد صاحب کا فون آیا کہ فرید کا انتقال ہوگیا۔ ہم فوراً پہنچے۔ بیڈ پر سفید چادر اوڑھے فرید احمد خاموش لیٹے تھے۔

احمد صاحب نے بتایا کہ وہ اسی کمرے میں سرہانے بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے۔ صبح جب ملازمہ کافی لے کر آئی تو احمد صاحب نے کہا کہ سنی سے بھی پوچھ لو اور کافی دے دو۔ ملازمہ نے پکارا مگر جواب نہ ملا۔ احمد صاحب نے دیکھا تو رات کو سوتے سوتے ہی فرید احمد کسی وقت چپکے سے دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر اقبال عباس نے ان کے لیے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔

حساب لگایا تو کینیڈا کے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق وہ ٹھیک تین ماہ بعد دنیا سے رخصت ہوگئے۔

فرید احمد جو دردِ عشق اپنے ساتھ لے گئے اس کا صرف ہم ہی کو اندازہ تھا۔ وہ بہت وضع دار اور صابر انسان تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

ہمیں اس بات پر بہت غصہ تھا کہ شمیم آرا سب کچھ جاننے کے باوجود آخری دنوں میں بھی ان سے ملنے نہیں گئیں۔ ایک بار ملاقات ہوئی اور فرید احمد کی وفات کا تذکرہ نکلا۔

ہم نے کہا ''شمیم، کم از کم انسانی ہمدردی کے تحت ہی تمہیں فرید کو دیکھنے جانا چاہیے تھا۔''

بولیں ''آفاقی صاحب! میں تو اس لیے نہیں گئی کہ وہ لوگ پسند نہیں کریں گے۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تو میں ضرور جاتی۔''

ہم نے صرف اتنا کہا ''شمیم! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔'' اور بات ختم ہوگئی۔

لیکن عشق کی ایک داستان اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

☆☆☆

یہ تو سب جانتے ہیں کہ بابرہ شریف ٹی وی کے اشتہاروں کے ذریعے فلمی دنیا میں داخل ہوئیں۔ ہم نے پہلی بار شباب اسٹوڈیوز میں فلم ''انسان اور آدمی'' کے سیٹ پر دیکھا تھا۔ ان کی بڑی بہن اس فلم میں رقص کررہی تھیں۔ بابرہ شریف دیکھنے میں اس وقت بارہ تیرہ سال کی نظر آئی تھیں۔ وہ آج بھی اتنی ہی بڑی نظر آتی ہیں جتنی کہ پہلی بار ہمیں نظر آئی تھیں۔

ٹی وی اشتہاروں میں مقبولیت حاصل کرنے کے بعد انہیں فلم نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، یہ سید سلیمان کی فلم ''بھول'' تھی۔ ندیم اور شبنم اس فلم میں مرکزی کردار تھے۔ منور ظریف اور بابرہ شریف معاون کردار ادا کررہے تھے۔

منور ظریف اس وقت تک مقبول ہوچکے تھے لیکن بابرہ کی یہ فلم میں پہلی جلوہ گری تھی۔ اداکاری وہ اس وقت بھی بہت اچھی کرتی تھیں لیکن منور ظریف جیسے حاضر جواب اور اپنی طرف سے فقرے چست کرنے والے اداکار کے سامنے ایک نو وارد اداکارہ کتنا مقابلہ کرسکتی ہے؟ اس کے باوجود انہوں نے بہت خود اعتمادی سے کام کیا۔

اس فلم کی شوٹنگ کے دوران۔۔۔ منور ظریف کی بے

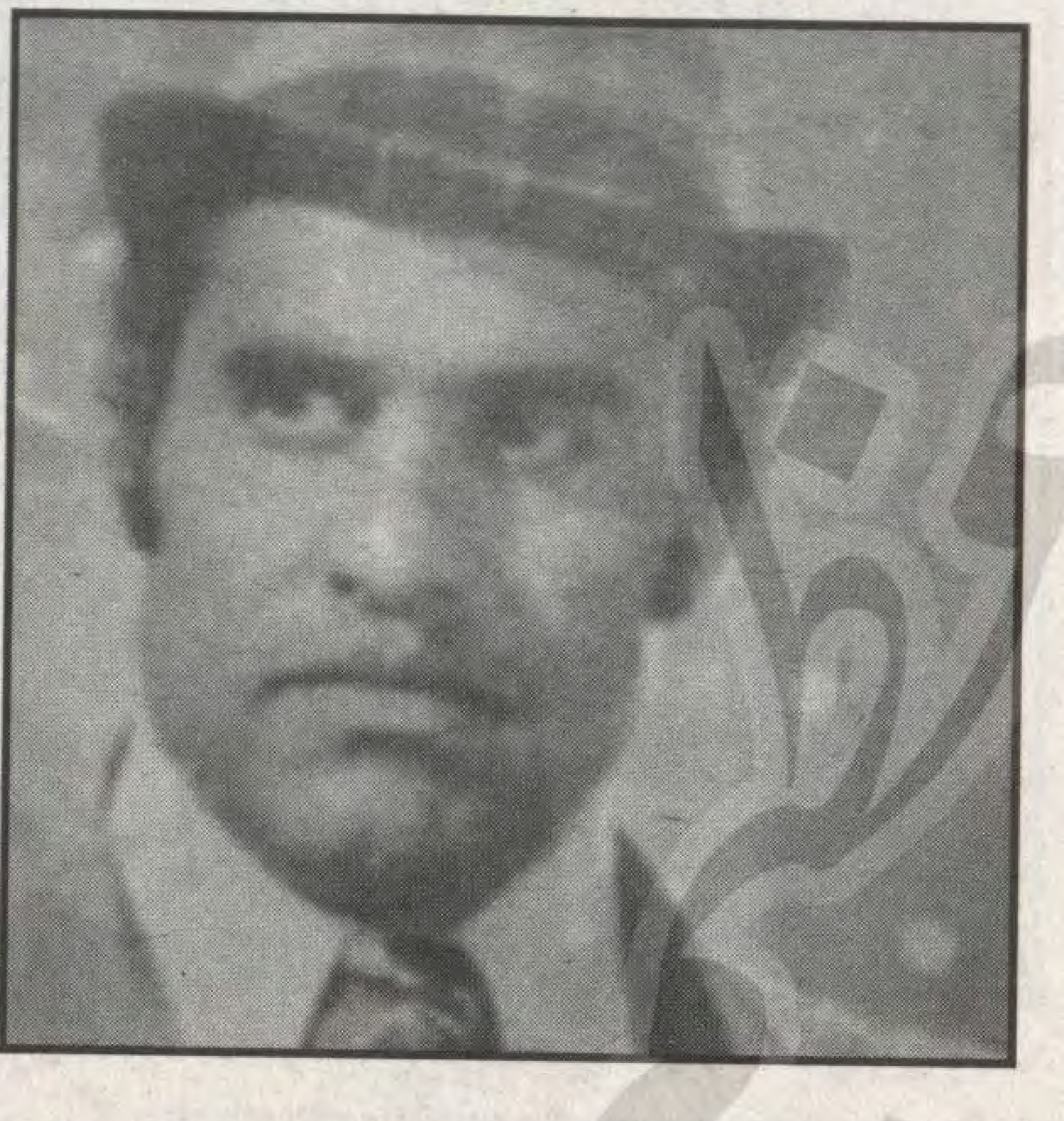

اداکار منور ظریف

تکلف اور شوخ مزاجی کے باعث وہ دونوں جلد ہی گھل مل گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ محبت کا آغاز تھا لیکن یہ محبت درحقیقت یکطرفہ تھی کیونکہ منور ظریف تو سنجیدہ ہوگئے تھے مگر شاید بابرہ کے لیے یہ محض وقت گزاری تھی۔

لیکن ایک ایسا راز تھا جو منظور ظریف نے اپنے آپ تک ہی رکھا، کسی اور کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ ان کے قریب ترین دوستوں کے سامنے بھی کبھی انہوں نے اظہار نہیں کیا۔ بہ ظاہر وہ بہت ہنس مکھ اور خوش و خرم انسان تھے اور کیوں نہ ہوتے، دنیا کی ہر نعمت اللہ نے انہیں دے دی تھی صرف ایک ایسی آرزو کہ جسے انہوں نے ہمیشہ اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھا۔

منور ظریف کا دل کا ایک آپریشن ہوچکا تھا۔ وہ کسی قسم کا پرہیز نہیں کرتے تھے بلکہ جان بوجھ کر زیادہ ہی بدپرہیزی کرنے لگے تھے۔

ایک بار ہم برمنگھم میں عابد شاہ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ منور ظریف بھی ان کے مہمان تھے۔ عابد شاہ کا مکان دراصل دوستوں کے لیے وقف تھا۔ اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

ایک روشن اور خوبصورت صبح ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہوکر بیٹھے تھے۔ عابد شاہ صاحب اپنے کام سے چلے گئے تھے۔ اب گھر میں ہم اور منور ظریف تھے۔ کچھ دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ منور ظریف سوٹ پہنے، ٹائی لگائے اور سر پر فلیٹ ہیٹ پہن کر چلے آرہے ہیں۔

www.paksociety.com

"کہاں کا ارادہ ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"یہ ...... بالکل نزدیک ہی جانا ہے اور آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔"

"کون سی جگہ ہے؟"

بولے "آفاقی صاحب، دیکھیے سچ بتائیے، کیا آپ کبھی پب میں گئے ہیں؟"

"نہیں، مگر اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہاں لوگ شراب پینے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"بس یہی تو فرق ہے شراب خانے میں انجانے لوگ بھی شراب پینے آجاتے ہیں اور تنہا بیٹھے شراب پیتے رہتے ہیں مگر پب میں وہ لوگ آتے ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور وہ محض شراب پینے کے لیے نہیں بلکہ آپس میں بات چیت کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہاں ہر موضوع پر بات ہوسکتی ہے۔ یہاں کا ماحول ہی بالکل انوکھا ہوتا ہے۔ آج میں آپ کو پب لے جارہا ہوں۔ یہ سامنے والی عمارت میں پب ہے، دو منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

"مگر ہم تو شراب نہیں پیتے۔" ہم نے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں، آپ کو کوک یا جوس پلادیں گے۔"

ہم بھی انگریزوں کے روایتی پب کا ماحول دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ چل پڑے۔

وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ سبھی انہیں جانتے ہیں۔ بارگرل، جس کا نام غالباً لالی تھا فوراً ان کی طرف آئی اور مسکرا کر استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی یہاں روزانہ آمدورفت ہے۔

"یہ ہمارے مہمان ہیں۔ پہلی بار اس پب میں آئے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر ہمیں بھی ہاؤ ڈو یو ڈو کہا۔

"کیا لیں گے؟" لالی نے آکر پوچھا۔

"میرے لیے وہسکی اور ان کے لیے کوئی جوس یا کوک۔"

ہم نے دیکھا کہ شفاف شیشے کے ایک بہت بڑے گلوب نما پیگ میں ایک صاحب سرخ رنگ کی شراب پی رہے تھے۔ اتنے بڑے گلوب کے پیندے میں یہ مختصر سرخ چیز بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ہم نے کہا "ہم اس گلوب میں کوک پئیں گے۔"

لالی یہ سن کر حیران ہوگئی مگر گلوب کے پیندے میں سرخ رنگ کا کوک لے کر آگئی جو دیکھنے میں بہت خوش رنگ لگ رہا تھا۔ ہم نے اس بڑے سے پیالے سے کوک کا ایک گھونٹ لیا۔ دیکھنے والے یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم وہسکی وغیرہ پی رہے ہیں۔

ہم نے تو ایک ہی کوک پر اکتفا کیا مگر منور ظریف دیکھتے ہی دیکھتے تین پیگ پی گئے۔

ہم نے کہا "منور، آپ کو ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے اور آپ یوں بد پرہیزی کررہے ہیں؟"

وہ اداس سی مسکراہٹ سے بولے "آفاقی صاحب، ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، چاہے آپ پرہیز کریں یا بد پرہیزی۔"

"مگر تم کو مے نوشی کی ضرورت کیا ہے، شکر کرو اللہ نے سب کچھ تمہیں دیا ہے۔"

وہ اداسی سے مسکرائے "اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔ اس نے مجھے جو کچھ دیا ہے میں اس کے قابل نہیں ہوں، مگر پھر بھی کسی ایک چیز کی کمی تو رہ جاتی ہے۔"

"تم آپریشن کرانے امریکا جانے والے ہو اور اتنی بد پرہیزی کررہے ہو۔"

"آفاقی صاحب، جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔" وہ ایک آہ بھر کر رہ گئے۔

اس کے بعد اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ ہم خود نہیں جانتے کہ منور ظریف زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس کرتے تھے۔ ہم ہی کیا، یہ راز کسی پر بھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور آج تک راز ہی ہے۔

لیکن اس میں شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ منور ظریف نے عشق میں ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ مگر وہ چہرہ کس کا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

☆☆☆

اب لوک کہانیوں کا سلسلہ چل نکلا ہے تو ایک اور تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ "انارکلی" کو برصغیر میں ناکام محبت کی مشہور داستان کہا جاتا ہے۔ اس کو لکھا گیا، اس کو اسٹیج کیا گیا، یہاں تک کہ فلمایا بھی گیا۔

کے آصف نے تو اپنی فلم مغل اعظم میں مصلحتاً انارکلی کو زندہ دیواروں میں چنوانے کے بجائے اس کو ایک خفیہ راستے سے رہائی دلادی لیکن سوال یہ ہے کہ انارکلی جو شہزادہ سلیم کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی، محض اپنی جان بچانے کے لیے اپنے محبوب کو چھوڑ کر اور

اپنی جان بچا کر کیوں اور کیسے چلی گئی؟

سید امتیاز علی تاج نے اس کہانی کو برصغیر میں مشہور کردیا۔ دراصل یہ ایک بنگالی کہانی سے خیال لیا گیا تھا۔ تاج صاحب نے اسے بنا سنوار کر ایک کلاسیکی ڈرامے کی حیثیت دے دی اور اس کا اتنا چرچا ہوا کہ لوگ اسے بالکل سچی کہانی سمجھنے لگے۔

آیئے، اب یہ جانتے ہیں کہ کیا انارکلی کی داستان میں واقعی حقیقت ہے؟

کہانی کی بنیاد یہ ہے کہ ہندوستان کا ولی عہد شہزادہ سلیم ایک حسین کنیز کے عشق میں گرفتار ہوجاتا ہے جسے انارکلی کا خطاب دیا گیا ہے۔ مغل بادشاہوں نے کنیزوں اور غیر مسلم خواتین سے بھی شادیاں کی تھیں مگر کبھی اس کو مسئلہ نہیں بنایا گیا تو پھر انارکلی سے شہزادہ سلیم کی شادی اگر ہوجاتی تو کون سی قیامت آجاتی؟ مغلوں کی خصوصاً اکبر کی آزادخیالی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے ایک راجپوتانی سے شادی کی جو سلیم کی ماں تھیں۔ تاریخ کہیں نہیں بتاتی کہ جودھا بائی نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ مطلب یہ کہ سلیم کا خالص مسلمان ہونا بھی مشتبہ ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ دراصل اکبر بذاتِ خود انارکلی میں دلچسپی لینے لگا تھا لیکن جب بیٹے نے اس سے عشق کیا تو بادشاہ کو رقابت ہوگئی۔

فلم مغل اعظم کے بعض مناظر میں خصوصاً شیش محل کے رقص کے دوران سلیم اور انارکلی کے مابین محبت بھرے جذبات کو دیکھ کر اکبر کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔

انارکلی کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ درحقیقت اس کا مقبرہ کہاں ہے؟ لاہور کے سول سیکریٹریٹ میں ایک عمارت انارکلی سے منسوب ہے۔ مگر انارکلی کا واقعہ دہلی یا آگرہ میں پیش آیا تھا تو پھر لاہور میں اس کا مقبرہ کیسے تعمیر ہوا؟

بہرحال، کہانی جو بھی ہو، انارکلی اور شہزادہ سلیم کے عشق کو بھی ایک ناکام کلاسیکی داستان کہا جاتا ہے۔ انارکلی کی خاطر شہزادہ سلیم نے اپنے باپ سے بغاوت کی اور بادشاہ نے بغاوت کے جرم میں شہزادے کو توپ سے اڑادینے کی سزا دی لیکن عین وقت پر شہزادے کی جاں بخشی کردی گئی۔

تو کیا انارکلی بھی دنیا کی معروف رومانی داستانوں کی طرح مشہور ہوگئی ہے؟

مگر مصنفوں اور فلم سازوں نے اس کو ایک حقیقی

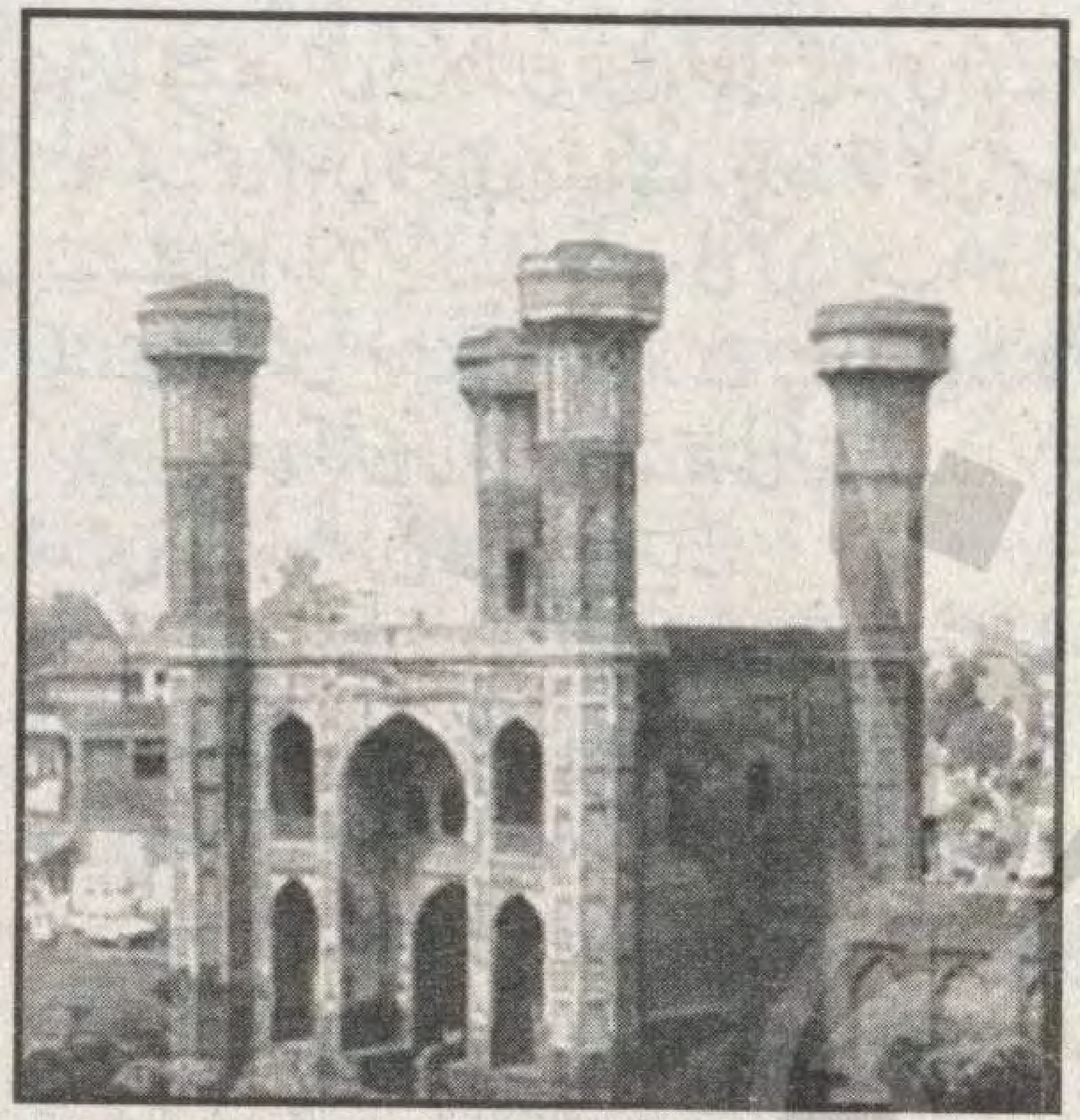

انارکلی کا مقبرہ

داستان کا رنگ دے دیا ہے۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا یہ کوئی نہیں جانتا؟ مگر برصغیر کی ناکام عشق کی داستانوں میں انارکلی کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ویسے بھی ایسی بہت سی داستانیں انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں۔

☆☆☆

پاکستان کی فلمی صنعت کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت ہندوستان سے ایس ایم یوسف، بابو صادق راکھن جیسے کہنہ مشق ہدایت کار بھی پاکستان آکر فلمیں بنارہے تھے۔

اسی زمانے میں ایک نوجوان فلم ساز ایم اکرم نے ایک اردو فلم بنائی۔ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے اودھم مچادیا۔ ہر طرف فلم قسمت کا چرچا تھا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یاد تھا کہ بمبئی ٹاکیز کی فلم "قسمت" نے بھی کئی لوگوں کی تقدیر بنادی تھی۔ اس زمانے میں بمبئی ٹاکیز کے مالک ایس مکر جی کا نام ہی کسی فلم کے معیار اور کامیابی کی سند سمجھا جاسکتا تھا۔ اس فلم میں بمبئی ٹاکیز کے بہترین کارکن شامل تھے۔ فلم کے ہدایت کار ایس مکرجی تھے۔ امیر بائی کرناٹکی، ارون کمار اور خان مستانہ نے پلے بیک گانے گائے تھے۔

اس فلم کے اداکاروں میں اشوک کمار اور ممتاز شانتی نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ یہ دونوں اس وقت بھی معروف اداکار تھے۔

"قسمت" کی ریلیز سے پہلے دس بارہ ہفتے چلنے والی فلم کامیاب سمجھی جاتی تھی لیکن قسمت وہ پہلی فلم تھی جس نے 25 ہفتے ایک ہی سینما میں چل کر سلور جوبلی منائی۔ بعد میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

پچاس ہفتے بعد اس کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ کسی ایک ہی سنیما میں کسی فلم کی کامیابی کا یہ ایک ریکارڈ تھا لیکن قسمت نئے نئے ریکارڈ قائم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جب کلکتہ کے ایک ہی سنیما میں قسمت نے ایک سو ہفتے چلنے کا ریکارڈ قائم کیا اور یہ ہندوستان کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی کہلائی۔ یہ اعزاز بعد میں بھی بہت فلموں نے حاصل کیا۔

''قسمت'' کی کہانی پر آج نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس فلم کی دو خوبیاں نمایاں تھیں۔ ایک اشوک کمار کی اداکاری اور دوسرے موسیقار انیل بسواس کی موسیقی۔ انیل بسواس کافی عرصے تک ہندوستانی فلموں میں رہے اور ایک سے بڑھ کر ایک کامیاب فلموں کی موسیقی دیتے رہے۔ قسمت کی کامیابی کا سہرا بھی انیل بسواس کے سر تھا۔ انہیں ہندوستانی فلمی موسیقی کا گرو بھی کہا جاتا ہے۔

لیجیے، پہلے تو اس فلم کی کہانی سنیے۔

ایک بچہ ماں باپ کی غربت اور استادوں کی سختیوں سے گھبرا کر گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ پتا نہ چلا کہ یہ بچہ کہاں گیا اور کس حال میں رہا؟ ہدایت کار نے بتایا کہ بیس سال گزرنے کے بعد یہ ایک بچہ ایک جرائم پیشہ نوجوان بن چکا ہے جس کا نام سن کر ہی لوگ تھرا جاتے ہیں۔ سب اس کو شیکھر بابو کہا کرتے تھے۔ بڑے بڑے غنڈے اور بدمعاش اس سے خوف کھاتے تھے۔

شیکھر کی ملاقات فلم کی ہیروئن رانی سے اس طرح ہوئی کہ رانی بے سہارا لڑکی تھی۔ اس کا سہارا صرف ایک مکان تھا جو سیٹھ کے پاس گروی رکھا ہوا تھا۔ وہ گھر کے ایک حصے میں اپنی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔ شیکھر ان کا کرایہ دار بن گیا تو آمدنی کا ایک ذریعہ مل گیا۔ جب ملاقاتیں بڑھیں تو دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔

سیٹھ کا نوجوان بگڑا ہوا بیٹا یہ برداشت نہ کرسکا۔ وہ رانی کی چھوٹی بہن نیناں کو پسند کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس کو پسند کرتی تھی۔

فلم کی ہیروئن رانی (ممتاز شانتی) ایک ٹانگ سے معذور تھی اس کے باوجود اسٹیج پر رقص کرکے گزارہ کرتی تھی۔ سیٹھ کا منشی اس پر مہربان تھا لیکن شیکھر کی وجہ سے اس سے دور رہتا تھا۔ سیٹھ نے کرائے کا تقاضا کیا ورنہ گروی گھر فروخت کرکے قرض اُتارنے کی شرط پیش کی۔ ایک روز پتا چلا کہ شیکھر دراصل سیٹھ کا گمشدہ بیٹا تھا۔ اس طرح وہ اپنے والدین سے مل گئے اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اس زمانے میں کیونکہ تمام فن کار صحیح اردو نہیں [بول] سکتے تھے اس لیے ایک مکالمہ سکھانے والا بھی یونٹ [میں] شامل ہوتا تھا جس کی بہت زیادہ قدر کی جاتی تھی۔

بہ ظاہر اتنے برس یعنی لگ بھگ 67 سال پہلے [ریلیز] ہوئی اس فلم میں کوئی نمایاں خوبی نہیں، پرنٹ بھی سیاہ پڑ [چکا] ہے۔

اس فلم کی سب سے بڑی خوبی انیل بسواس کی موسیقی تھی۔ فلم میں دس گانے تھے جو سب کے سب لوگوں کی زبان پر تھے۔ وہ آزادی کی تحریک کا زمانہ تھا اس لیے اس میں باغیانہ ترانے بھی شامل تھے۔ گانوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ دور ہٹو اے دنیا والو، ہندوستان ہمارا ہے
2۔ دھیرے دھیرے آرے بادل
دھیرے دھیرے آ
میرا ساجن سو رہا ہے
شور و غل نہ مچا۔
3۔ اب تیرے سوا کون میرا (امیر بائی کرناٹکی)
دھیرے دھیرے آ بادل والا گانا امیر بائی کرناٹکی اور ارون کمار کا دوگانا تھا۔ ارون کمار آج کے اداکار گووندا کے والد تھے۔
4۔ اب تیرے سوا کون میرا (امیر بائی)
5۔ ایک دن ہنسائے اک دن رلائے
(گلوکار، امیر بائی، ارون کمار)
6۔ گھر گھر میں دیوالی ہے، میرے گھر میں اندھیرا
7۔ کٹ گئے تیرے دکھ کے دن۔ (ارون کمار)
8۔ اے دنیا بتا ہم نے بگاڑا تیرا کیا؟
9۔ پیارے میرے پیار کیسے کیا جائے
10۔ اے دنیا بتا، ہم نے بگاڑا کیا تیرا؟

سچ تو یہ ہے کہ اس فلم کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ اس کی موسیقی تھی جو آج بھی زندہ ہے۔ فلم کے موسیقار انیل بسواس نے خاموش فلموں سے کام شروع کیا تھا اور آخر دم تک انہیں موسیقاروں میں بہت ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اس فن کے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ انیل بسواس اور نوشاد سے بڑھ کر موسیقار ہندوستانی فلموں میں نظر نہیں آئے۔

اشوک کمار اس زمانے میں مقبول ترین ہیرو تھے اور کم و بیش یہی حیثیت ممتاز شانتی کو بھی حاصل تھی۔ لیکن کسی ایک سنیما میں ڈھائی سال ایک فلم کی نمائش ایسا ریکارڈ ہے جسے آج بھی کوئی فلم توڑ نہیں سکی۔

☆☆☆

بھارت کی فلمی دنیا میں ناکام عشق کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔ مثلاً دلیپ کمار اور کامنی کوشل کا عشق، کامنی کوشل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خاندانی فنکارہ تھیں۔ ان کی زندگی بجائے خود ایک کہانی ہے۔

ان کی بڑی بہن کی شادی مسٹر سود سے ہوئی تھی۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں تو بچوں کی محبت اور نگرانی کی خاطر ان کی شادی اپنے بہنوئی مسٹر سود سے ہوگئی۔ مسٹر سود کا فلمی دنیا سے براہِ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں بھی وہ پس پردہ رہنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

کامنی کوشل شادی سے پہلے بھی لاہور ریڈیو اور اسٹیج پر نمایاں تھیں۔ بمبئی کی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا تو ان کے ہیرو دلیپ کمار بنے۔ فلم ''شہید'' تقسیم کے پس منظر میں بنائی جانے والی ایک رومانی اور حب الوطنی سے بھرپور فلم تھی۔ اس پر دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی بے ساختہ اداکاری نے حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد ان دونوں نے ندیا کے پار، اور آرزو میں کام کیا۔ آرزو دراصل ان کے عشق کی ناکامی کی داستان تھی جس میں ان دونوں کی زندگی کے صحیح واقعات پیش کیے گئے تھے۔ عصمت چغتائی اس کی مصنفہ اور ان کے شوہر شاہد لطیف اس فلم کے ہدایت کار تھے۔

ایک طرف تو فلمی دنیا میں ان کے پیار کی داستان کا چرچا تھا اور دوسری طرف کامنی کوشل کا خاندان اس ملاپ کا سخت مخالف تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کامنی کا فوجی بھائی پستول لے کر اس کے گھر پہنچ گیا اور کہا کہ اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تو وہ خود کو گولی مار لے گا۔ اس پر کامنی کوشل نے ہار مان لی اور پھر دلیپ کمار اور کامنی کوشل نے ایک ساتھ کسی فلم میں کام نہ کیا۔

اگرچہ بعد میں مدھو بالا کے ساتھ دلیپ کمار کی محبت کی داستانیں عام ہوگئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلیپ کمار کی پہلی اور آخری محبت کامنی کوشل ہی تھی۔ اس طرح حالات نے دونوں کو جدا کردیا۔ کامنی کوشل کی اداکاری میں وہ بے ساختگی اور والہانہ پن نہ رہا لیکن دلیپ کمار کے ٹوٹے ہوئے دل نے انہیں انڈین فلموں کا ٹریجڈی کنگ بنا دیا۔

دلیپ کمار کی دوسری ناکام محبت مدھو بالا سے ہوئی تھی اور دلیپ نے مدھو بالا کو منگنی کی انگوٹھی بھی پہنادی تھی مگر مدھو بالا کے والد خان عطا اس رشتے کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ فلم ''نیا دور'' میں یہ تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ مدھو بالا جو پہلے ہی دل میں سوراخ کی مریضہ تھی، اس ناکامی کے بعد مزید مرجھا گئی۔ اس نے اداکار و گلوکار کشور کمار سے شادی کرلی تھی لیکن یہ شادی نہیں ایک سمجھوتا تھا۔ بیماری، تنہائی اور محبت سے محرومی کے باعث مدھو بالا کی زندگی کے آخری دن بہت تکلیف میں گزرے، یہاں تک کہ وہ جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ مدھو بالا کو مشرق کی وینس کا لقب دیا گیا تھا۔

دلیپ کمار کی زبان سے پھر کبھی کسی نے مدھو بالا کا نام نہیں سنا۔ اس کا سبب بے وفائی تھا یا نفرت! یہ کوئی نہیں جانتا۔

دلیپ کمار نے کافی عرصے تک شادی نہیں کی حالانکہ انڈیا کی ہر ہیروئن خواہش مند تھی، متوسط عمر میں پہنچ کر انہوں نے بعض مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے سائرہ بانو سے شادی کرلی مگر یہ دلیپ کے لیے محض ایک رسم کی ادائی تھی۔ یوں تو وجنتی مالا اور دلیپ کمار کی داستانیں بھی بہت مشہور ہوئی تھیں۔ وحیدہ رحمٰن بھی امیدواروں میں شامل تھیں مگر سب کو مایوسی ہوئی۔

☆☆☆

ریکھا نے کئی سال تک انڈین فلموں پر راج کیا ہے۔ وہ مدراس کے ایک اداکار کی بیٹی تھیں۔ بمبئی میں انہیں بہت کامیابیاں حاصل ہوئیں مگر محبت میں وہ ناکام ہی رہیں۔

اس وقت ریکھا کو بالی ووڈ میں کام کرتے ہوئے 43 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ مدراس کی معروف فن کار جمنی اور اداکارہ پوشپاولی کی بیٹی ہیں مگر کامیابی انہوں نے والدین کے حوالے سے حاصل نہیں کی۔ وہ غضب کی رقاصہ اور بہت اچھی اداکارہ ثابت ہوئیں۔

یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ریکھا کی سات بہنیں اور بھائی ہے مگر ان میں سے کسی نے کامیابی اور شہرت حاصل نہیں کی۔

ریکھا نے تیرہ سال کی عمر میں فلموں میں اداکاری کا آغاز کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ تامل فلم تھی۔ فلم ''رنگوسوتم'' اتنی کامیابی حاصل کی کہ اس کو اردو میں بھی فلمایا گیا۔ اردو میں اس کا نام ''رنگیلا رتن'' تھا۔

www.paksociety.com

اردو فلموں میں بھی انہیں بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک زمانے میں وہ صفِ اوّل کی ہیروئن تھیں۔ آج 60 برس سے اوپر کی عمر میں بھی انہوں نے خود کو اسمارٹ اور فٹ رکھا ہے۔

ریکھا ایک دل پھینک فنکارہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ کئی فن کاروں کے ساتھ ان کے اسکینڈل بنے جن میں جتیندر، کرن کمار، ونود مہرا اور امیتابھ بچن شامل ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اصلی محبت انہیں امیتابھ بچن سے تھی جس کی رمق آج بھی باقی ہے۔

ریکھا نے دو شادیاں کیں مگر دونوں ناکام رہیں۔ پہلی شادی ونود مہرا سے کی جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اکشے کمار کے ساتھ بھی ان کا نام منسوب ہوتا رہا۔ امیتابھ اور جتیندر کے ساتھ بھی کافی عرصے ان کے مراسم رہے جن کا پوری انڈسٹری کو علم تھا اور ریکھا نے بھی کبھی انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ اصلی محبت انہوں نے امیتابھ بچن سے کی اور یہ ناکام ہی رہی۔

ونود مہرہ سے طلاق لے کر انہوں نے دوسری شادی ایک صنعت کار مکیش اگروال سے کی تھی۔ یہ ایک کامیاب شادی تھی مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔ صرف دو ماہ بعد مکیش کا قتل ہوگیا۔ اس کے بعد ریکھا نے صرف محبت اور اسکینڈلز پر گزارہ کرنے کی ٹھان لی۔ کچھ عرصے بعد اکشے کمار کے ساتھ ان کا اسکینڈل مشہور ہوا۔ لیکن اکشے نے ٹوئنکل کھنہ سے شادی کر کے ریکھا کا دل توڑ دیا۔

وہ محبت میں ناکام رہیں مگر فن کارہ کی حیثیت سے بہت کامیابیاں سمیٹیں۔ بمبئی میں 1970ء میں انہوں نے اردو فلموں میں کام شروع کیا۔ اس وقت وہ نہ تو ہندی اردو ٹھیک طرح بول سکتی تھیں اور نہ ہی اسمارٹ تھیں بلکہ موٹی کہلاتی تھیں۔ اس تنقید سے تنگ آ کر انہوں نے چھ سال تک اداکاری نہیں کی۔ 6 سال بعد فلم ناگن نے ریکھا کو ایک دم عروج پر پہنچا دیا۔ یہاں سے فلموں میں ریکھا کی کامیابیوں کا سفر شروع ہوا۔ ریکھا کی فلمیں پے در پے کامیاب ہوئیں جن میں مسٹر نٹور لال، مقدر کا سکندر، امراؤ جان اور خوبصورت اور خون بھری مانگ شامل ہیں۔

اب تک وہ 170 سے زائد فلموں میں کام کر چکی ہیں۔ آج بھی وہ بعض فلموں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اب وہ تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کو دنیا میں سب کچھ نہیں مل جاتا۔

بالی ووڈ کا ایک اور مشہور ناکام عشق ثریا اور دیو آنند کا عشق ہے۔ دیو آنند، ثریا کے لیے مسلمان ہونے کو بھی تیار تھا مگر ثریا کے ماموں، ماں اور نانی کو یہ ساتھ پسند نہ تھا۔ دیو آنند تو خیر مرد ہیں، انہوں نے شادی کر لی اگرچہ کامیاب نہیں ہوئی مگر ثریا نے ماں اور نانی سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی شادی نہیں کی۔ ثریا کو ہالی ووڈ کے اداکار گریگوری پیک بہت پسند تھے۔ ایک بار وہ بمبئی آئے تو ثریا کے گھر بھی گئے۔ ان کی شباہت دیو آنند سے ملتی ہے۔ ثریا گلوکارہ اور اداکارہ تھیں۔ دیو آنند بعد میں فلم ساز، ہدایت کار بھی بن گئے۔ ثریا نے عین عروج کے زمانے میں فلمی صنعت کو خیرباد کہا اور پھر کبھی انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ زندگی کے بہترین سال انہوں نے تنہائی میں گزار دیے۔ کسی فلم والے نے اس کے بعد انہیں نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ کسی تقریب میں شریک ہوئیں۔ انہوں نے ایک طرح کا بن باس لے لیا ہے۔

☆☆☆

ایک غمزدہ کہانی جو بہت مشہور ہے وہ گورو دت اور اداکارہ وحیدہ رحمٰن کی داستانِ عشق ہے۔ گورو دت ایک تعلیم یافتہ، خوبصورت اور کامیاب فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ وحیدہ رحمٰن ایک کامیاب ہیروئن تھیں۔ فلم گائیڈ اور پیاسا میں انہوں نے ایک ساتھ کام کیا۔ دونوں فلمیں یادگار سمجھی جاتی ہیں۔

وحیدہ رحمٰن کے عشق کی وجہ سے گورو دت کے گھریلو تعلقات بھی خراب ہو گئے۔ آخری دنوں میں وہ ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے اور اسی فلیٹ میں انہوں نے خودکشی کر کے جوانی میں بھارتی فلمی صنعت کو ایک بے مثال فلم ساز اور ہدایت کار سے محروم کر دیا۔ جب دلیپ کمار نے فلم پیاسا کی کہانی ناپسند کر دی تو گورو دت نے بذاتِ خود یہ کردار ادا کیا۔ یہ فلم بالی ووڈ کی یادگار فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ بعد میں دلیپ کمار نے کہا کہ پیاسا میں کام نہ کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ عشق نے ہندوستانی فلمی صنعت کو ایک بے مثال فن کار سے محروم کر دیا۔

وحیدہ رحمٰن پر بہ ظاہر اس خودکشی کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ دراصل انہیں گورو دت سے کبھی محبت نہیں تھی۔ بہرحال، یہ ناکام عشق کی کہانی ہمیشہ فلمی دنیا میں یادگار رہے گی۔ یہ تمام واقعات بہت تفصیل سے پہلے بھی بیان کیے جا چکے ہیں۔

جاری ہے

عشق کم نصیب

صائمہ اقبال

شادی ہوجانا عشق کا حاصل نہیں، عشاق کے لیے دل کا ملنا بھی ضروری ہے۔ وہ امریکا کی خاتونِ اوّل تھی۔ امریکی صدر کی شریکِ حیات تھی۔ اس نے جس سے عشق کیا اسے پالیا پھر بھی عشق اس سے روٹھا رہا۔ وہ زندگی کے آخری لمحے تک محبت پانے کی حسرت کو دل میں پالتی رہی۔ اس نے محبت سے محروم زندگی کو بھگتا مگر تاریخ داں اسے منفی کردار لکھتے رہے۔

ایک دکھی دل والی خاتون کے عشق ناکام کی بپتا

عشق ناکام نمبر

امریکی ریاست الی نوئے کے شہر اسپرنگ فیلڈ کے مضافات میں موسم بہار اپنے جلوے بکھیر رہا تھا۔ سورج کی شفیق کرنوں نے سرسبز و شاداب درختوں کا حسن دوبالا کر دیا تھا، مشرق کی سمت سے چلنے والی ہوا کے لمس نے پھولوں کو مسکراہٹ کا استعارہ بنا دیا تھا۔ الغرض ہر سمت مسرت دمک رہی تھی۔

گھنے درختوں میں گھرے بورڈنگ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں بھی چائے کی چسکیوں کے ساتھ ہلکے ہلکے، خوشگوار قہقہے رقص کر رہے تھے۔ ہال کی کھڑکی مشرق کی سمت کھلتی تھی جس سے شفاف، صحت بخش روشنی چھن کر آ رہی تھی۔

پُرفضا مقام پر واقع اُس بورڈنگ ہاؤس کی بااخلاق مالکہ انجیلینا نئے نویلے جوڑے کی خاطر میں لگی تھی جو اُس کے ہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوا تھا۔

انجیلینا کے سامنے والی کرسی پر اُس کا کم گو شوہر بیٹھا تھا جس کے ساتھ والی نشست پر ایک دراز قد آدمی براجمان تھا جو وکالت کے پیشے سے وابستہ تھا۔ انجیلینا کے دائیں جانب وکیل کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔

وکیل کے نزدیک انجیلینا کی تجربہ کار ملازمہ چائے کی کیتلی لیے کھڑی تھی۔ وکیل کسی موضوع پر اُس سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا۔

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

اچانک نہ جانے کیا ہوا... وکیل کی بیوی یکدم پھٹ پڑی۔ اُس نے سامنے پڑی گرم چائے کی پیالی اُٹھائی اور اپنے شوہر کے منہ پر دے ماری۔

یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ انجیلینا ششدر رہ گئی۔ جتنی دیر میں وہ کچھ سمجھ پاتی، یہ افسوسناک واقعہ رونما ہو چکا تھا جس نے اُس حسین صبح کو غارت کر ڈالا۔

غصے میں بپھری ہوئی وہ عورت کچھ دیر وہیں کھڑی کف اُڑاتی رہی پھر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اِس پورے عرصے میں اُس کے شوہر نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، اپنی بیوی کے کسی تلخ سوال کا جواب نہیں دیا، لعنت ملامت بھی نہیں کی۔ بس یونہی خاموش بیٹھا رہا۔

بالآخر بورڈنگ ہاؤس کی مالکہ نے اُٹھ کر ایک کپڑے سے اُس شریف النفس آدمی کا چہرہ صاف کیا۔

ڈائننگ ہال میں مکمل خاموشی چھائی تھی...

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ ایسا واقعہ جس کا میاں بیوی کے درمیان پیش آنا حیرت کی بات نہیں۔ محافل میں بھی اس کے رونما ہونے کے امکانات ہیں، جیسے اُس خوشگوار صبح بورڈنگ ہاؤس کی مالکہ کے سامنے یہ پیش آیا۔

اُس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے چند برسوں میں یہ معمولی واقعہ خصوصی اہمیت اختیار کر جائے گا کیونکہ اِس کا مرکزی کردار صدر امریکا کے منصب پر فائز ہوگا اور اُس کی بیوی خاتون اوّل کہلائے گی اور پھر یہ واقعہ تواتر سے دُہرایا جائے گا۔ مورخین اس کا ذکر کریں گے، محققین اس پر بحث کریں گے۔

حیرت انگیز طور پر اِس واقعے کو رونما ہوئے ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اس پر بحث جاری ہے۔ اِس کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ ہر تجزیے کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے:

"وہ شخص کس قدر عظیم تھا جس کی بدتہذیب، آداب سے عاری بیوی نے اُس پر گرم چائے اُنڈیل دی تھی، لیکن وہ خاموش رہا۔ اس میں کس قدر صبر تھا... بے شک وہ آدمی قابلِ تقلید تھا!"

بے شک معتبر دانشوروں کے یہ تجزیے قابلِ توجہ ہیں، انھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن بدقسمتی سے کسی تجزیہ کار نے اُس عظیم انسان کی غم سے نڈھال بیوی کے زخمی دل میں جھانکنے کی کوشش کی نہیں جو اُس حسین صبح تکیے میں سر دیے گھنٹوں آنسو بہاتی رہی تھی مگر کوئی اُس کی خبر گیری کے لیے نہیں آیا تھا۔

مستقبل میں خاتون اوّل بننے والی محبت سے محروم عورت اپنے مقدر میں بدبختی لکھوا کر لائی تھی!

☆☆☆

13 مارچ 1818ء کی شام جب پسینے سے شرابور رابرٹ اسمتھ ٹوڈ بگھی سے اُترا، تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی اور پیاس سے اُس کا گلا چیخ رہا تھا۔

امریکا کے بڑے حصے پر موسم بہار اپنے رنگ بکھیر رہا تھا تاہم ریاست کینٹکی میں حالات یکسر مختلف تھے، خصوصاً مشرقی شہر لیکسنگٹن کے آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

رابرٹ اپنی ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے اسپتال میں داخل ہوا۔ عمارت کا اندرونی حصہ نسبتاً ٹھنڈا تھا جہاں اس نے خود کو آرام دہ محسوس کیا۔ تیزی سے زینہ عبور کرتے ہوئے وہ پہلے فلور پر پہنچا، جہاں اُس کی حسین بیوی الزبتھ پارکر ٹوڈ ایڈمٹ تھی جس نے چند گھنٹوں قبل ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔

باپ بننے کی خوشی سے سرشار رابرٹ اِس بات پر شرمندہ تھا کہ اتنے نازک موقع پر اسے اپنی بیوی کو اسپتال میں چھوڑ کر جانا پڑا، لیکن وہ مجبور تھا۔

تیزی سے بدلتے ملکی حالات نے بینکاروں کی نیندیں اُڑا دی تھیں اور شہر کے ایک معروف بینکار کی حیثیت سے رابرٹ بھی ان دنوں خاصا پریشان تھا۔ اس کے کاندھوں پر کئی بڑے کھاتوں کی ذمہ داری تھی، اسی وجہ سے اُسے عجلت میں اپنی پیاری بیوی کو چھوڑ کر جانا پڑا، تاہم اسپتال واپسی پر جونہی رابرٹ کی نظر اپنی دلکش بیوی کے کھلے ہوئے چہرے پر پڑی، اُس کی تھکن غائب ہوگئی۔

اس نے الزبتھ کے ہونٹوں پر بوسہ دیا اور جھولے میں لیٹی اپنی بیٹی پر جھک گیا جس کے نین نقش اپنی خوبصورت ماں سے مشابہہ تھا۔

بیٹی کو گود میں اُٹھاتے ہی وہ موسم کی ستم ظریفی، سفر کی تھکان اور کھاتوں کے مسائل سب بھول گیا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ اُس نے اپنی بیٹی کا نام "میری" تجویز کیا، میری ٹوڈ!

☆☆☆

رابرٹ اور الزبتھ نے بڑے ناز و نعم سے اپنی بیٹی کی پرورش کی۔ کم سن میری کو ہر سہولت میسر تھی، چاہنے والے ماں باپ، پڑھا لکھا ماحول، اچھا خاندان... تاہم حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ وقت بدلتا ہے اور زندگیوں پر اَن مٹ نشانات چھوڑ جاتا ہے۔

جب وہ چھ برس کی تھی، اس کی پیاری شفیق ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُسے چھوڑ گئی، بہت دور، جہاں جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔

اس سانحے نے رابرٹ کے خاندان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سنبھال لیا، البتہ... ننھی میری کی زندگی بے روح ہوگئی۔ وہ ماں جو ہر پل اپنی شفقت اس پر نچھاور کیا کرتی تھی جہان فانی سے کوچ کر چکی تھی اور وہ ممتا کی گھنی چھاؤں سے محروم ہوگئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، دل میں کرب تھا پر وہ الفاظ کی صورت اپنے جذبات بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر... ایک اور ایک سانحہ رونما ہوا!

جب وہ آٹھ برس کی تھی، اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میری کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ گھر کی ویرانی میں اپنی ماں کی یادوں کو حرکت کرتے ہوا دیکھا کرتی تھی۔ دراصل اُس نے اپنی محرومیوں کی تلافی کے لیے یادوں میں اپنی ماں کو زندہ رکھا تھا۔ لیکن جس دن سوتیلی ماں نے گھر میں قدم رکھا، وہ اُن حسین یادوں سے محروم ہوگئی۔

جب رابرٹ نے اپنی نئی بیوی کو یہ کہتے ہوئے متعارف کروایا۔ "پیاری میری، یہ تمہاری ماں ہے... نئی ماں!"

وہ بپھر گئی۔ "نہیں... یہ میری ماں نہیں ہے۔" اور روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"بچی ہے، سنبھل جائے گی۔" رابرٹ نے اپنی نئی شریکِ حیات سے کہا جس کی آنکھوں میں بے عزتی کا احساس تھا۔ جس طرح میری نے اس عورت کو قبول نہیں کیا تھا، گھر کی نئی مالکن کو بھی یہ بچی پسند نہیں آئی تھی۔

جلد ہی نئی ماں نے سوتیلی ماں کا روپ اختیار کر لیا۔ اُسے میری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن رابرٹ کی وجہ سے وہ اپنے ہونٹ سی لیتی۔ البتہ دونوں کے درمیان سردمہری تیرتی رہتی جس کی وجہ سے گھر کا ماحول تناؤ کا شکار ہوگیا۔

1832ء میں یہ خاندان لیکسنگٹن کے متمول علاقے کی ایک شان دار کوٹھی میں منتقل ہوگیا۔ گو کہ معاشی بحران کے اس زمانے میں بیش تر افراد کی حالت خستہ تھی لیکن رابرٹ اس وقت بھی خاصا مستحکم تھا۔ اسی کوٹھی میں میری نے حقیقی معنوں میں شعور کی آنکھ کھولی۔

اس کے نئے گھر میں 14 کمرے تھے۔ وہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا لیکن وہ ویران نہیں تھا۔ دراصل دونوں شادیوں سے رابرٹ کے چودہ بچے تھے، اسی باعث کوٹھی میں ہمیشہ شور گردش کرتا۔ شرارتوں کی قلقاریاں گونجتیں، اشیاء ٹوٹتی رہتیں۔

میری ان سرگرمیوں سے دور ہی رہتی۔ البتہ وہ ان سے محظوظ ضرور ہوتی۔ وہ فاصلے سے بچوں کو شرارتیں کرتے ہوئے دیکھتی اور من ہی من میں مسکراتی۔

جب اُس کی سوتیلی ماں بچوں کو اُدھم مچانے سے روکتی، بھونڈے انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کرتی تو میری خاموشی سے اپنے کمرے میں آجاتی جہاں کتابیں اُس کی منتظر ہوتیں۔ کتابوں ہی نے اُسے تہذیب سے روشناس کروایا، محافل کے آداب کی تربیت دی، گفتگو کا ہنر سکھایا۔ اِس ضمن میں اُس کی حقیقی ماں کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ گو کہ میری کو فقط چھ برس اُس بااخلاق عورت کا ساتھ میسر رہا لیکن اس مختصر سے عرصے ہی میں اُس نے میری کو اخلاقیات کی اہمیت و ضرورت سے آگاہ کر دیا۔

میری کے کمرے میں اُس کی ماں کا ایک خوبصورت پوٹریٹ آویزاں تھا جسے نیویارک کے ایک معروف آرٹسٹ نے بنایا تھا۔ ایک دیوار پر اُس کے دادا ڈیوڈ ٹوڈ کی پینٹنگ بھی لگی تھی۔

مرحوم ماں الزبتھ اکثر میری کو اُس کے دادا کے قصّے سنایا کرتی تھی "وہ ایک تعلیم یافتہ اور محنتی انسان تھے۔ انہوں نے آئرلینڈ میں آنکھ کھولی پھر ہجرت کر کے کینٹکی آن بسے۔ یہیں تمہارے والد کی پیدائش ہوئی اور یہیں تم پیدا ہوئیں!"

اُس کے کانوں میں اکثر اپنی پیاری ماں کی آواز گونجا کرتی جسے اپنی یادوں میں زندہ رکھنا اُس کا اکلوتا مقصد تھا۔

☆☆☆

رابرٹ کو میری کی بہت فکر تھی۔ وہ ایک شفیق باپ تھا اور جانتا تھا کہ اس کی بیٹی تاحال ایک سانحے کے زیرِ اثر ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ فیصلہ میری کی زندگی کو نیا رخ دے گا، اُس کی مصروفیات میں نئے رنگ بھر دے گا۔ سو وہ انتظامات میں مصروف ہوگیا اور جب انتظامات مکمل ہوئے، وہ اپنی بیٹی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"میری، کیا تم جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟"

www.paksociety.com

"میرے علم میں ہے فادر!" وہ مسکرائی۔ "آپ نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، ایسے فیصلے کیے جو میرے حق میں سود مند ثابت ہوئے۔ بے شک آپ کی محبت وہ قیمتی ترین شے ہے جو اِس دنیا میں مجھے میسر ہے۔"

"شکریہ بیٹی۔" رابرٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "تمہارے الفاظ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ جانتی ہو، تم بالکل اپنی ماں کی طرح ہو، اُسی کی طرح تہذیب یافتہ اور با اخلاق! میں چاہتا ہوں کہ تم اُس کے نقشِ قدم پر چلو... میں نے ایک فیصلہ کیا ہے!"

"مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے۔" میری کے لہجے میں احترام کا عنصر تھا۔

چند روز بعد کم سن میری نے گھر چھوڑ دیا۔

آنے والے برس اُسے شہر کی سب سے معتبر درس گاہ کے ہاسٹل میں گزارنے تھے اور وہ بہت خوش تھی۔ کیونکہ اب وہ آزاد تھی، ہر وہ کام کرنے کے لیے جس کی وہ خواہش مند تھی۔

اس درس گاہ کا نصاب اور انتظام اس قدر اعلیٰ تھا کہ شہر کے بیشتر متمول خاندان خواہش کیا کرتے تھے کہ اُن کے گھرانے کی لڑکیاں یہاں تعلیم حاصل کریں۔ درس گاہ کی منتظمہ ایک تہذیب یافتہ فرانسیسی خاتون تھیں جن کی قربت اور شفقت میری کو اُس کی مرحوم ماں کی یاد دلاتی۔

اسکول کا علمی وادبی ماحول اُس کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ شب و روز کی محنت سے چند ہی برسوں میں اُس نے فرانسیسی زبان پر عبور حاصل کرلیا۔ رقص بھی سیکھا۔ ساتھ ہی ڈرامے کے میدان بھی خاصی فعال رہی۔ یوں جب میری 20 برس کی ہوئی، وہ حس مزاح اور سیاسی شعور کی حامل ایک ایسی پُراعتماد لڑکی کا روپ دھار چکی تھی، جو گروہی وادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا پسند کرتی تھی۔

تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس گھر نہیں جائے گی جس کی ہر شے پر اس کی سوتیلی ماں کا قبضہ تھا۔ اس نے رہائش کے لیے اپنی بڑی بہن الزبتھ ایڈورڈ کے گھر کا چناؤ کیا، جو اسپرنگ فیلڈ (ریاست الی نوئے) کے علاقے میں مقیم تھی۔ اکتوبر 1839ء میں وہ اسپرنگ فیلڈ منتقل ہوگئی جہاں ایک معنوں میں اُس کا دوسرا جنم ہوا۔

میری کی بڑی بہن الزبتھ کی شادی ایک تعلیم یافتہ سیاسی گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر ننیان ایڈورڈ ریاست کے سابق گورنر کا بیٹا تھا اور سماجی و سیاسی حلقوں میں خاصا مقبول تھا۔

آنے والے برسوں میں الزبتھ اور ننیان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نے میری کو یکسر بدل دیا۔ وہ سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔

محافل میں وہ توجہ کا مرکز بنی رہتی۔ فرانسیسی زبان اور رقص پر عبور کی وجہ سے اُس نے جلد ہی شہر کی اشرافیہ میں جگہ بنا لی اور پھر وہ ایک بڑی تبدیلی سے گزری!

☆☆☆

ہر دل عزیز میری بدل رہی تھی...

وہ محبت کے حسین، لطیف احساس کے زیرِ اثر تھی جس نے اس کی زندگی کو شوخ رنگوں سے بھر دیا تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اُس نے اسپرنگ فیلڈ کے کئی باصلاحیت نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا لیکن اُن میں سے ایک اُس کے خاصا قریب تھا۔ اس نوجوان کا نام اسٹیفن ڈگلس تھا جو ایک اُبھرتا ہوا وکیل اور سیاست داں تھا۔

چند ہی دنوں میں اُن کے رابطے دوستی کے زرخیز میدان میں داخل ہوگئے جہاں سے محبت کی حسین وادی کی جانب جانے میں اُنہیں وقت نہیں لگا۔

وہ اکثر ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، سرسبز درختوں کی گھنی چھاؤں میں محوِ گفتگو!

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُنہوں نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی کے طور پر قبول کرلیا ہے۔

وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھے۔ میری پہلی بار عشق کے ذائقہ سے روشناس ہوئی تھی جو بہت ہی شیریں تھا۔

اُس کی بڑی بہن الزبتھ بھی بہت مسرور تھی۔ اسے یقین تھا کہ ماں سے محرومی کے سانحے نے میری کو جو زخم دیے تھے، وہ بھرنے کو ہیں، لیکن وہ غلط تھی۔

خوبرو اسٹیفن ایک عاشق مزاج نوجوان تھا۔ چند ماہ تو وہ میری پر اپنی محبت نچھاور کرتا رہا لیکن پھر وہ اُس کے دل سے اُتر گئی اور اس نے بڑی ہی خاموشی سے معصوم میری سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

ایک اور سانحہ... ایک بار پھر محرومی کا کرب... تاریکی اور تنہائی کے سائے میری کا مقدر بن گئے۔ وہ قنوطیت کی شکار ہوگئی بکھر گئی۔ عشق میں ناکامی کا ذائقہ تلخ تھا!

خوش قسمتی سے یاسیت کے اس زمانے میں اس نے سماجی حلقوں سے دوری اختیار نہیں کی جس کے طفیل دھیرے دھیرے ہی سہی، پر یہ زخم بھرنے لگا کیونکہ کئی اور نوجوان اُس کے قرب کے متمنی تھے اور عشق میں ناکامی کے باوجود وہ زخمی لڑکی ہر دل عزیز تھی، توجہ کا مرکز تھی۔

دسمبر 1839ء میں ایک تہذیب یافتہ، دراز قد نوجوان نے اُس کے دُکھی دل کے دروازے پر دستک دی۔ میری کے اندرون نے احتیاط برتنے کا مشورہ دیا کہ وہ ایک بار ٹھوکر کھا چکی تھی، تاہم اس نوجوان کے اخلاق کے سامنے ہر تنبیہ بے کار ثابت ہوئی۔ میری اُس وکیل کو دل دے بیٹھی۔

جلد ہی اُن کے رشتے میں اتنی پختگی آ گئی کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ البتہ اس معاملے میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا اس جوڑے کی سماجی حیثیت میں خاصا فرق تھا۔

میری ریاست کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی تھی لیکن جس نوجوان سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی، وہ زمانہ طالب علمی میں ایک نالائق شاگرد کی شہرت رکھتا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ اکثر اسکول سے غیر حاضر رہتا تھا۔ میری فرانسیسی زبان اور تلفظ پر عبور رکھتی تھی جبکہ اُس کے محبوب کا معاملہ مختلف تھا۔ میری کا تعلق ایک بڑے خاندان سے تھا، اُس کے کئی رشتے دار فوج اور ریاستی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور اُسے اپنے خاندان پر فخر تھا جبکہ اُس کا محبوب اپنے شجرہ نسب کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

اتنا تضاد... دو انسانوں میں اتنا فرق پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ایک ہو جاتے؟ لیکن وہ کہتے ہیں ناں عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب!

سو اختلافات، تضادات کے باوجود ایک دوسرے پر فریفتہ یہ جوڑا دسمبر 1840ء میں منگنی کے بندھن میں بندھ گیا۔ شادی کے لیے یکم جنوری 1841ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔

شاید چند مورخین میری کو خوش قسمت تصور کرتے ہوں کیونکہ جس اُبھرتے ہوئے وکیل سے اُس کی منگنی ہوئی تھی وہ مستقبل قریب میں امریکا کے سولہویں صدر کی حیثیت سے حلف اُٹھانے والا تھا، تاہم حقیقتاً یہ میری کی بدبختی کا آغاز تھا۔

اُس کے منگیتر کا نام ابراہام لنکن تھا!!

☆☆☆

آج ہم جانتے ہیں کہ میری ٹوڈ اور ابراہام لنکن کی شادی اپنے عہد کا سب سے بڑا ازدواجی المیہ ثابت ہوئی۔ بیشتر تجزیہ کار اِس معاملے میں میری ٹوڈ کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ اسے ایک مغرور اور ضدی عورت کے طور پیش کرتے ہیں جو نمود و نمائش کی شوقین اور شیخی خور تھی جس کی وجہ سے یہ رشتہ ناکامیوں کی علامت بن گیا لیکن کیا یہی سچ ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ابراہام سے شادی کرنے کے فیصلے پر اُسے خاندان بھر میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا، خصوصاً سوتیلی ماں نے تو اُس پر طنز کے اتنے تیر برسائے، اتنے دل شکن تبصرے کیے کہ وہ زخمی ہوگئی۔

بے شک اُس کے اور ابراہام کے خاندان اور اُن کے طرزِ زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا، لیکن میری دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی، اسی وجہ سے اُس نے ہر مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس سے منگنی کر لی، لیکن منگنی کے بعد کیا ہوا؟

انگوٹھیوں کے تبادلے کے چند روز بعد رونما ہونے والے ایک واقعے سے اِس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شادی کی ناکامی کا اصل ذمہ دار کون تھا!

منگنی کے بعد ایک جانب جہاں میری خوشی سے لبریز تھی، وہیں ابراہام بدترین تذبذب کا شکار تھا۔ وہ گھنٹوں اس بابت سوچ بچار کرتا اور ہر بار مایوسی کے زیرِ اثر یاسیت کی تاریکی میں ڈوب جاتا۔ بالآخر اس نے اپنی منگیتر کے نام ایک بھونڈا خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے لکھا۔

"میری، میں تم سے اتنی محبت نہیں کرتا کہ تم سے شادی کرلوں!"

وہ میری کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، سو یہ خط اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا کہ وہ اُسے اُس کی منگیتر تک پہنچا دے۔ دوست نے جب خط پڑھا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ سب کیا ہے؟ اس لڑکی نے تم سے شادی کرنے کے لیے خاندان بھر کی مخالفت مول لی اور تم اسے محبت کا یہ صلہ دے رہے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے وہ خط پھاڑ دیا اور متذبذب، گھبرائے ہوئے ابراہام کو مشورہ دیا کہ وہ خود ہی اپنی منگیتر سے ملے۔

بہت سوچ بچار کے بعد ابراہام نے میری سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

جس شام وہ اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے گیا، آسمان پر دبیز بادل چھائے تھے۔

"اوہ، ابراہام... صحیح وقت پر آئے۔ دیکھو موسم کتنا خوشگوار ہے، آج بارش کی پیش گوئی ہے۔" جونہی میری نے اسے دیکھا، اس کی باچھیں کھل گئیں۔ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ

www.paksociety.com

گئی جس نے ابراہام کو خوفزدہ کر دیا۔

میری اُس کے ارادوں سے لاعلم تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ابراہام شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہے سو وہ کافی دیر تک بڑے ہی پُر جوش انداز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرتی رہی۔ ابراہام نے کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پوری ملاقات کے دوران اُس نے دو تین جملے ہی کہے۔

میری کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، اس کا منگیتر خاصا پریشان ہے۔ جب اس نے ابراہام کو کریدا تو اُس نے اعتراف کر لیا کہ وہ ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنے کے ارادہ سے آیا ہے۔

''بولو میں سن رہی ہوں۔'' میری کی آنکھوں میں محبت تھی۔

''وہ میں...'' ابراہام ہکلانے لگا۔ چند ساعت خاموش رہا، پھر ہمت مجتمع کی اور کہہ دیا۔ ''میں تم سے شادی نہیں کر سکتا!''

میری کو یوں لگا جیسے کمرے کی تمام روشنیاں یکدم بُجھ گئی ہوں، ہر طرف تاریکی چھا گئی ہو، جیسے وقت تھم گیا ہوا... ایک بار پھر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا، ایک بار پھر کرب کے عفریت نے اُسے نگل لیا تھا،

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

بوکھلائے ہوئے ابراہام کے لیے یہ صورتِ حال بڑی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ میری کو چپ کروانے لگا۔ اسے دلاسے دینے لگا۔

جب میری کے آنسو تھمنے لگے، اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ''ابراہام... میں تم سے محبت کرتی ہوں... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

ابراہام پگھل گیا۔ محبت بھرے آنسوؤں نے اُس کے سخت دل کو نرم کر دیا۔ اُس نے میری کو بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔''

کمرے میں خاموشی چھائی تھی اور باہر اُداسی برس رہی تھی۔

اُس رات میری اندیشوں کی پھوار میں بھیگتی رہی۔

☆☆☆

اندیشے دُرست تھے۔ ابراہام کی طبیعت میں بہت زیادہ اضطراب اور تذبذب پایا جاتا تھا، گو کہ وہ متعدد بار اس کے سامنے یہ اقرار کر چکا تھا کہ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے لیکن اس کی بوکھلاہٹ روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اُس کے بارے میں میری کو عجیب وغریب خبریں بھی مل رہی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ ابراہام ماضی میں کئی عشق لڑا چکا ہے تاہم اسے یہ علم نہیں تھا کہ پُرانی معاشقائیں تاحال اس کے رابطے میں ہیں۔

جب اس موضوع پر میری اور ابراہام کا مکالمہ ہوا تو صورتِ حال مزید بگڑ گئی۔ ابراہام اپنی توجیہات سے اسے مطمئن نہیں کر سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے، اُن کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے۔

شادی کی تاریخ یکم جنوری 1841ء مقرر ہوئی تھی اور یہ دن میری کی زندگی کا سب سے کربناک دن ثابت ہوا۔

تقریب والے روز میری بہت خوش تھی۔ اس کا پہناوا شان دار تھا۔ اُسے خوب سجایا گیا تھا۔ ہر شخص مسرور تھا۔ ہر چہرے پہ مسکراہٹ تھی لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا، میزبان اور مہمانوں کی مسکراہٹیں دھیمی پڑتی جا رہی تھیں کیونکہ دولہا غائب تھا۔

ابراہام تاحال وہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے لاپتا تھا اور تقریب میں موجود اس کے دوستوں کے چہروں سے فکرمندی عیاں تھی۔

''وہ پاگل شخص کہاں چلا گیا؟'' بالآخر میری کی بڑی بہن نے اپنا غصہ دباتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتی۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی۔

بعد میں پتا چلا کہ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے ابراہام لنکن اپنا ذہنی توازن کھوتا جا رہا تھا۔ وہ شدید صدمے کے زیرِ اثر تھا جس نے اُس کے اعصاب کو مفلوج کر دیا تھا۔

دوستوں نے اُسے کافی سمجھایا لیکن اس نے یاسیت کا دامن نہیں چھوڑا۔ خود کو تنہا کر لیا اور مجلسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گیا۔ ان ہی دنوں اس نے ایک قریبی دوست کو غم میں ڈوبا ایک خط لکھا جس میں کچھ یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا:

''میں قابلِ رحم اور بدقسمت ترین انسان ہوں... میری حالت کبھی بہتر نہیں ہو گی... مجھے مر جانا چاہیے، یہی میرے دکھ کا واحد علاج ہے!''

جب میلوں دور بیٹھے اُس کے دوست کو یہ خط موصول ہوا، اسے اندیشوں نے گھیر لیا۔

شادی والے روز ابراہام نے خود کو کمرے میں بند کر لیا

اور یہ الفاظ دُہرانے لگا ''میں مزید زندہ نہیں رہنا چاہتا!''

جب خیر خواہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اُس کے کمرے تک پہنچے، مستقبل کا صدر بے بسی کی تصویر بنا اپنے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے جیب سے ایک چاقو بھی برآمد ہوا۔

قوی امکان تھا کہ اگر دوست وقت پر نہیں پہنچتے تو وہ کمزور شخص اپنی جان لے لیتا۔

☆☆☆

میری شاید بدنصیبی اپنے مقدر میں لکھوا کر لائی تھی کیونکہ جس شخص کو وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی، وہ وحشت کے زیرِ اثر دیوانہ ہو گیا تھا۔

شادی کے روز رونما ہونے والے افسوسناک واقعے کے بعد منگنی ٹوٹ گئی۔

میری کے لیے وہ دن اذیت ناک تھے۔ اس نے اپنے محبوب کے غم میں خود کو کمرے میں بند کر لیا، جہاں قنوطیت کی تاریکی تھی، گریہ کا موسم تھا۔ عشق کے روگ نے اُسے شکستگی کی تصویر بنا دیا تھا۔

کئی روز تک بدبخت میری اس گھٹن زدہ کمرے میں پڑی اپنے محبوب کو پکارتی رہی لیکن وہ سخت دل شخص خبر گیری کے لیے نہیں آیا۔

آخر کار اس نے زندگی کی جانب لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا، تاہم میری ایک باہمت لڑکی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنی کھوئی ہوئی شادابی حاصل کرنے کے لیے اس نے خوب زور مارا اور ایک بار پھر سماجی سرگرمیوں میں شرکت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وہ مجلسوں میں خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرتی لیکن جونہی تنہائی اس پر سایہ فگن ہوتی، وہ پھر اپنے محبوب کو یاد کرنے لگتی جو بے وفا نکلا، جس نے اس کی محبت کو حقیر جانا اور اس کے جذبات کا قتل کیا۔

غموں کی ماری میری زندگی میں واپس آ گئی تھی لیکن شاید بدبختی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا... ایک روز، اچانک ایک محفل میں اس کا ابراہام سے سامنا ہو گا۔

اپنے محبوب کو سامنے دیکھ کر میری کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اُس شام وہ بہت روئی۔ ابراہام اسے دلاسا دیتا رہا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور تاسف کے آثار تھے۔

اس ملاقات کے چند روز بعد وہ دونوں اتفاقاً ایک شادی کی تقریب میں پھر ملے۔ ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں نمی تیری، ایک بار پھر ابراہام نے اسے دلاسا دیا۔ دھیرے دھیرے ان کی ملاقاتیں بڑھنے لگی۔ میری جو بہ مشکل اس کے سحر سے نکلی تھی پھر اس کی گرفت میں آ گئی کیونکہ وہ تاحال عشق کے مرض میں مبتلا تھی، تاحال ابراہام کی توجہ کی طالب تھی۔

ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، اُنسیت کا جذبہ پھر پنپنے لگا۔ میری کے چہرے کی شادابی لوٹنے لگی۔ وہ پھر مسکرانے لگی۔

بالآخر 4 نومبر 1842ء کو بدبختی کا ستارہ عروج پر پہنچ گیا... اُس روز میری اور ابراہام شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

وہ بہت خوش تھی، اس کی آنکھوں میں سپنے تھے، دل میں امید کے چراغ روشن تھے تاہم... آگے فقط تاریکی تھی!

اس روز بھی ابراہام پر شکستگی کا دورہ پڑا۔ تقریب میں شرکت سے قبل وہ کافی دیر تک اپنے بستر پر پڑا رہا۔

جب وہ اپنی دلہن لینے جا رہا تھا، کسی نے سوال کیا ''کہاں جا رہے ہیں جناب؟''

''غالباً جہنم میں...'' اس نے جواب دیا۔

وہ اس معاملے میں درست تھا کیونکہ ایک ناکام شوہر کی حیثیت سے ابراہام اپنی اور میری کی زندگی کو دوزخ ہی کی شکل دینے والا تھا۔

☆☆☆

جب میری اسپرنگ فیلڈ میں موجود اپنی بہن کی عالی شان کوٹھی سے جہاں درجنوں ملازم اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے، اپنے سسرال آئی، اُسے پہلا جھٹکا لگا۔

یہ ایک نئی دنیا تھی جہاں وہ آسائشیں نہیں تھیں جو کل تک اسے میسر تھیں۔ یہ وہ جنت نہیں تھی، جس کا اس نے سپنا دیکھا تھا۔ البتہ وہ خوش تھی کہ اب وہ اپنے محبوب کے پہلو میں تھی۔ اُس انسان کی قربت اسے میسر تھی جس کے حصول کے لیے اس نے آگ کا دریا پار کیا تھا۔

اس نے خود کو کلی طور پر بدل لیا۔ گھریلو ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ باورچی خانے کی گرمی میں بھی خود کو خوش وخرم رکھنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا جو کل تک اُس کے ملازمین کیا کرتے تھے۔

محبت نے اُسے یکسر بدل دیا تھا۔ اب وہ پہلی والی میری نہیں تھی۔ کل کی شہزادی آج حقیقی معنوں میں خود کو سگھڑ بیوی ثابت کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے جی جان سے محنت کر رہی تھی۔

اس وقت وکیل کی حیثیت سے ابراہام زیادہ معروف

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں تھا، اس کی آمدنی معمولی تھی لیکن میری نے بڑی مہارت سے گھر کا بجٹ ترتیب دیا۔ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر کم آمدنی میں گزارہ کرنے کے ذرائع تلاش کر لیے، خواہشات تج دیں اور قناعت پسند ہوگئی۔

"میری خوشی، میرے شوہر کی خوشیوں سے وابستہ ہے۔" وہ اکثر خود سے کہا کرتی۔

بے شک وہ مسرور تھی لیکن کبھی کبھار اُسے لگتا جیسے ابراہام اس کی محبت کا اس طرز پر جواب نہیں دیتا جیسے ایک شوہر کو دینا چاہیے۔ کسی کسی موقع پر تو وہ اُسے نظرانداز بھی کر دیتا تاہم وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ اس بے چاری کے لیے تو یہی بہت تھا کہ اُسے ابراہام کا ساتھ میسر ہے۔

شادی کے اگلے ہی برس جب اُس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا، تکمیل کے احساس نے اسے مدہوش کر دیا۔

"میں دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوں۔" اس نے خود سے کہا اور اپنے بیٹے کا ماتھا چوما جس کا نام رابرٹ رکھا گیا تھا۔ 1844ء میں ابراہام نے اسپرنگ فیلڈ میں اپنے دفتر کے قریب ایک مکان خرید لیا۔

کتنی خوش تھی وہ اس دن... حالانکہ جس کوٹھی میں اس کا بچپن گزرا، یہ مکان رقبے کے لحاظ سے اس کے دالان سے بھی چھوٹا تھا لیکن وہ مطمئن تھی۔ وہ اس مکان کو گھر بنانا چاہتی تھی لیکن وہ کبھی گھر نہیں بن سکا، بلکہ جہنم بن گیا۔

☆☆☆

دھیرے دھیرے ابراہام کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا، اس کی آمدنی بڑھ رہی تھی، حلقہ اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

دوسری جانب کل تک محافل میں توجہ کا مرکز بنی رہنے والی میری نے خود کو ایک گھریلو عورت کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور یہ تبدیلی اس محبت کے طفیل آئی جو اس کے دل میں موجزن تھی۔

اس نے تمام تضادات کو قبول کر لیا تھا، خود کو سمجھا لیا تھا۔

"کیا ہوا جو میرا شوہر کھانے کی میز پر چھری کانٹے کے استعمال سے ناواقف ہے۔ یہ کوئی بُری بات تو نہیں، ہزاروں لوگ اشرافیہ کی ضیافتوں کے اس طریق کے بارے میں علم نہیں رکھتے... کیا ہوا جو وہ لباس کے معاملے میں بے پروا ہے، وہ ایک مصروف شخص ہے جو عظیم مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، ایسے میں لباس کی جانب کیوں کر دھیان دے سکتا ہے... کیا ہوا جو وہ میری طرح پڑھا لکھا نہیں، اس کی صلاحیتوں سے تو کسی کو انکار نہیں ہے..." اس طرح کے جملوں سے وہ خود کو دلاسے دیتی اور اپنے ذہن کو منفی باتوں سے پرے رکھنے کے جتن کرتی۔

جب شام میں تھکا ہارا ابراہام گھر لوٹتا، وہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتی۔ فوراً گرما گرم کافی پیش کرتی، بجٹ میں رہتے ہوئے اس کے لیے رات کا بہترین کھانا تیار کرتی مگر... ابراہام نے کبھی اس گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی میری منتظر تھی۔

دراصل وہ زود رنج شخص تا حال تذبذب کا شکار تھا۔ جب اضطراب حد سے بڑھ جاتا تو وہ اپنے قریبی دوستوں کے سامنے یہ کہہ بیٹھتا کہ شادی کر کے اس نے بہت بڑی غلطی کر دی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی سے قطعی خوش نہیں۔

ایسا نہیں تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ اپنی بیوی سے اکتا گیا تھا، یہ کیفیت تو ابتدا ہی سے اُس پر طاری تھی۔ شروع ہی سے وہ اپنی شادی کے بارے میں بات کرنے سے کتراتا تھا۔

اس رشتے میں بندھنے کے فقط ایک ہفتے بعد اس نے ایک کاروباری خط اپنے دوست سیموئل مارشل کو روانہ کیا تھا جس میں شادی کے متعلق فقط ایک سطر تھی۔

"میری شادی کے سوا اور کوئی قابلِ ذکر خبر نہیں اور یہ معاملہ میرے لیے کسی حیرت سے کم نہیں!"

☆☆☆

اب ابراہام خاصا مصروف رہنے لگا تھا۔ صبح گھر سے نکلتا، رات گئے لوٹتا۔ کئی کئی دنوں تک اُن کے درمیان محبت کے ایک جملے کا بھی تبادلہ نہیں ہوتا۔

ان ہی دنوں خدا نے میری کو ایک اور بیٹے سے نوازا، جس کا نام ایڈورڈ رکھا گیا۔

اب اس کے سر پر دو بیٹوں کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ گھر الگ سنبھالنا تھا، سچ تو یہ ہے کہ اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

کبھی کبھار جب ابراہام مسکرا کر اس کی جانب دیکھ لیتا، اُس غمگین عورت کی تمام تھکن اُتر جاتی۔ 1850ء میں اس کا تیسرا بیٹا ولیم پیدا ہوا جس کے تین برس بعد 1853ء اس نے چوتھے بیٹے تھامس کو جنم دیا۔

وہ سیاسی طور پر بہت ہی پُرآشوب دور تھا۔ غلامی کی رسم کے متعلق جاری کیے جانے والے نئے قوانین نے امریکا میں انتشار پھیلا دیا تھا۔

ہیرٹ بیچر اسٹوو کا غلامی کی قبیح رسم کے خلاف لکھا جانے

والا شہرہ آفاق ناول Uncle Tom's Cabin شائع ہو چکا تھا، جس نے خانہ جنگی کی چنگاری کو اتنی ہوا دی کہ پوری ریاست میں "سول وار" کی آگ بھڑک اُٹھی۔

اس وقت غلامی کی رسم کا مخالف ابراہام سیاست میں قدم رکھ رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کی مصروفیت دوچند ہوگئی تھی۔ وہ اکثر طویل دوروں پر بیرونِ شہر چلا جاتا اور میری تنہائی کا شکار ہو جاتی۔ اگر کبھی قسمت مہربان ہوتی تو ابراہام چند ہی روز میں لوٹ آتا لیکن اکثر دوری کا یہ وقفہ کئی کئی ہفتوں پر محیط ہوتا۔

ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اُس کا شوہر عظمت کے حصول کے لیے کوشاں تھا، میری ایک مخلص بیوی کی طرح گھر سنبھال رہی تھی، شفیق ماں کی طرح بچوں کی پرورش کر رہی تھی اور ایک سچے جیون ساتھی کے مانند اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی بساط بھر کوشش کر رہی تھی۔

بدقسمتی سے محبت سے لبریز میری کی یہ کوششیں لاحاصل ثابت ہوئیں کیونکہ جس شخص سے محبت وہ کرتی تھی، اس نے خود کو مصروفیت کے جال میں اتنا اُلجھا لیا تھا کہ اسے اپنی بیوی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ جب بھی ابراہام گھر آتا، وہ بچوں کو گود میں لے کر بیٹھ جاتا، اُنہیں خوب پیار کرتا لیکن میری کی جانب توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

کبھی کبھار وہ سوچتی "کیا میں نے ابراہام سے شادی کر کے غلطی کی؟ کل تک میں شہزادی جیسی زندگی گزار رہی تھی اور آج میں ایک معمولی گھریلو عورت ہوں!"

وہ اپنا سر جھٹک دیتی لیکن سوالات پیچھا نہیں چھوڑتے، اندیشے کانوں میں سرگوشیاں کرتے:

"کیا تمہارا شوہر واقعی تم سے محبت کرتا ہے؟ وہ کبھی اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کرتا؟ ایسا تو نہیں کہ وہ کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے؟"

وہ سرگوشیوں کو نظرانداز کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی لیکن تنہائی کے سوگ میں ڈوبی راتوں میں خدشات بہت قوی ہو جاتے، اس کے دل میں جگہ بنا لیتے، اس کا سکون تہ و بالا کر دیتے۔

پھر 1858ء میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

سیاسی سطح پر ایک شخص ابراہام کے مدِمقابل آ گیا۔ ایک ایسا شخص جسے میری بہ خوبی جانتی تھی کیونکہ اس کا نام اسٹیفن ڈگلس تھا۔ میری کی پہلی محبت!

ریاست الی نوئے میں اس وقت دو ہی آدمیوں کی بابت خبریں شایع ہوتی تھیں، ایک ابراہام، دوسرا ڈگلس... وہ امریکی سینیٹ میں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے اور ان کے درمیان جاری مباحثے نے الی نوئے سمیت ملک بھر میں توجہ حاصل کر لی تھی۔

ان دنوں جب ریاست میں ایک عظیم سیاسی مکالمہ جاری تھا، میری اکثر ماضی میں پہنچ جاتی۔ سوچ بچار کے دوران اُس کے سامنے اس کا شوہر اور اس کا پُرانا محبوب آن کھڑے ہوتے۔ وہ ان دونوں کا سیاسی موازنہ کرتی، سماجی رتبے کے پلڑے میں انہیں تولتی، علمیت کی بنیاد پر حکم لگانے کی کوشش کرتی... اور ہر بار ڈگلس فاتح ٹھہرتا۔

وہ جھلا جاتی۔ سر جھٹک دیتی۔ زیرِلب دعائیں پڑھتی کہ ابراہام، اُس کا شوہر اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود یہ مقابلہ جیت جائے اور ڈگلس اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود خاک میں مل جائے۔

اِس سوچ کا محرک عشق میں ناکامی کا تلخ تجربہ تھا۔ کبھی وہ ڈگلس سے عشق کیا کرتی تھی لیکن پھر وہ شخص کسی اور کی زلف کا اسیر ہو گیا اور اسے بُھلا بیٹھا جس کی وجہ سے کئی روز تک غم میری کا جسم کھاتا رہا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ ابراہام الیکشن میں اُسے شکست دے۔

اس کا شوہر غلامی کی رسم کے خلاف تھا۔ وہ ایسی قانونی ترمیم کا خواہش مند تھا جس سے غلامی کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور میری کے لیے یہ نظریہ کسی طور قابل قبول نہیں تھا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں غلامی عام تھی۔ اس کے خاندان کے تحویل میں کئی غلام تھے۔

اِس نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ چاہتی تھی کہ اُس کا شوہر فاتح ٹھہرے۔ ایک طرح وہ ڈگلس سے خود کو رد کیے جانے کا انتقام لینا چاہتی تھی، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔

ابراہام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس واقعے نے میری کو توڑ دیا!

☆☆☆

معروف مصنف ڈیل کارنیگی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ابراہام لنکن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اُس کی شادی تھی!"

اِسی طرح بیس برس تک وکالت میں ابراہام کے شریک کار رہنے والے ولیم، ایچ برڈن نے کہا تھا:

"اپنی ازدواجی زندگی میں اگر وہ کسی روز خوش رہا ہو، تو مجھے اس کا علم نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی شادی ہی اُس کے

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

غموں کی سب سے بڑی وجہ تھی!"

اِس ضمن میں مورخین کی کتابوں سے سیکڑوں اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ابراہام کی میری سے شادی ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا خمیازہ اسے بھگتا پڑا لیکن وہ عظیم شخص کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ہر شخص ابراہام کو مظلوم بنا کر پیش کرتا ہے، کسی نے بھی بدنصیب میری کی جانب توجہ نہیں دی جس نے اپنا سب کچھ تج کر ایک ایسے انسان سے شادی کی، جو نہ تو سماجی حیثیت میں اُس کے برابر تھا، نہ ہی اس کی طرح تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے باوجود اُس نے اپنے شوہر کو ٹوٹ کر چاہا اور اِسی چاہت نے اسے توڑ دیا۔

اس کا شوہر کبھی تبدیل نہیں ہوا، اس نے ہمیشہ اپنی بیوی کو نظر انداز کیا۔ اِسی وجہ سے ان کے درمیان جھگڑوں کا آغاز ہوا جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اتنی شدت آگئی کہ اُن کی زندگی اجیرن ہوگئی۔

ایک بار میری نے اپنی سہیلی سے کہا۔

"وہ مجھے درخور اعتنا نہیں جانتا۔ جب میں سوال کرتی ہوں تو مجھے نظر انداز کر دیتا ہے۔ جب میں جھگڑا کرتی ہوں، وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھے اہمیت ہی نہیں دیتا لیکن اِس کے باوجود میں اُس سے شدید محبت کرتی ہوں، نہ جانے کیوں؟"

میری کو یہ اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ اُس کا شوہر سماجی حلقوں میں فعال خواتین کا منظورِ نظر ہے جو تقریبات میں اُسے گھیرے رکھتی ہیں۔ ان خواتین میں چند ایسی بھی تھیں، جن سے ابراہام کا ماضی میں بھی تعلق رہا تھا۔

جب ایک شام اس نے اس بابت ابراہام سے سوال کیا، اس نے جواب دینے کے بجائے ایک سرد آہ بھری اور اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میری چلّائی "میں تمہاری بیوی ہوں، مجھے پوچھنے کا حق ہے۔ مجھے جواب دو؟" لیکن وہ جا چکا تھا۔

چند مورخین کہتے ہیں کہ میری ایک حاسد عورت تھی۔ شاید اُنہوں نے ایک مرد کی حیثیت سے سوچا ہو کیونکہ اگر وہ خود کو تنہائی کی شکار، توجہ کی منتظر میری کی جگہ رکھ کر سوچتے تو کبھی ایسا کہنے کی ہمت نہیں کرتے!!

غم کی ماری میری جب محافل میں یہ دیکھتی کہ ابراہام دیگر خواتین سے ہنس ہنس کر بات کر رہا ہے، اُن کی گفتگو توجہ سے سن رہا ہے، وہ آگ بگولا ہو جاتی۔ اور وہ غصہ میں آنے پر حق بجانب تھی۔ شادی کے اتنے برسوں میں کبھی اُس کے شوہر نے اُس سے تو ہنس کر بات نہیں کی، کبھی اس کی گفتگو توجہ سے سُننے کی زحمت گوارا نہیں کی، کبھی اس کی محبت کا گرم جوشی سے جواب نہیں دیا، کبھی اس کی کاوشوں کو نہیں سراہا۔

جلد ہی گھر کے باہر بھی اُن کے جھگڑوں کی بازگشت سُنائی دینے لگی۔ محافل کے دوران بھی ان کے درمیان چند جھڑپیں ہوئیں۔ اِن ہی میں اسپرنگ فیلڈ کے بورڈ ہاؤس میں رونما ہونے والا واقعہ بھی شامل ہے، جب میری نے چائے کی گرم پیالی اُس کے منہ پر دے ماری تھی۔

ابراہام ہر بار اپنے روایتی طریق کے مطابق خاموش رہا۔

انہی جھڑپوں کو بنیاد بنا کر تاریخ کے صفحات پر میری کی ایک منفی تصویر پینٹ کی گئی۔

دراصل میری پوری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ شادی کے ابتدائی زمانے میں جن اندیشوں کو وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی، وہ اب اتنے قوی ہو گئے تھے کہ اُن سے کترانا تقریباً ناممکن تھا۔

جب خدشات اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے، اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ اور جب تنہائی اس پر حملہ آور ہوتی، وہ اپنا دفاع کرنے میں ناکام رہتی۔

واضح رہے کہ اس کا دوسرا بیٹا ایڈورڈ فقط چار برس کی عمر میں (1850ء میں) فوت ہو گیا تھا۔ اس سانحے نے بھی میری پر انتہائی منفی اثرات مرتب کیے، البتہ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن جب ابراہام اُسے تواتر کے ساتھ نظر انداز کرنے لگا، یہ زخم پھر تازہ ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے کو یاد کر کے آنسو بہانے لگی۔

اسے صحت کے مسائل نے بھی گھیر رکھا تھا۔ کم سنی ہی سے اسے سر درد کی شکایت تھی۔ ڈپریشن کے دورے بھی پڑا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو وہ خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیتی تھی لیکن شادی کے بعد ابراہام کے منفی رویّے نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اسی باعث ڈپریشن کے دورے تواتر سے آنے لگے۔ بدقسمتی سے بیماری کے دنوں میں بھی شوہر اُس کی خبرگیری کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ وہ کسی سیاسی محاذ پر ملک کو متحد رکھنے کی جنگ میں مصروف ہوتا، ایسی جنگ جسے جیتنے کی خواہش میں وہ اپنے گھر کو بھلا بیٹھا تھا۔

☆☆☆

1860ء میں میری کو اپنی رہائش گاہ بدلنی پڑی۔ اسے اپنا گھر چھوڑنا پڑا، جس کی بنیادی وجہ اُس کے شوہر کا صدر امریکا منتخب ہونا تھا۔ اب اِس جوڑے کو وائٹ ہاؤس میں ڈیرا ڈالنا تھا۔

میری اب دنیا کے سب سے طاقتور شخص کی بیوی تھی، جو اندر سے بہت کمزور تھی، کیونکہ وہ محبت سے محروم تھی اور یہ محرومی اُس کی روح کو بے چین رکھتی تھی۔

مارچ 1860ء میں میری نے وائٹ ہاؤس میں قدم رکھا۔ مشہور مقولہ ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے لیکن میری کا معاملہ مختلف تھا کیونکہ وائٹ ہاؤس میں رہائش اختیار کرنے کے بعد اُس کے غموں میں اضافہ ہی ہوا۔

اُس وقت امریکی خانہ جنگی عروج پر تھی اور صدر انتہائی مشکلات کا شکار تھا لیکن وہ تنہا مصائب برداشت نہیں کر رہا تھا، امریکی خاتونِ اوّل بھی ایک عذاب میں مبتلا تھی۔

ازدواجی محاذ پر اُسے سخت مشکلات کا سامنا تھا جس کا بنیادی سبب بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے۔

میری کے خاندان کا تعلق امریکا کے سرحدی علاقے سے تھا، جہاں کبھی غلامی کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ اُس کے خاندان کے بھی کئی غلام تھے لیکن اب ابراہام لنکن اور اُس کے حواری غلامی کی رسم کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اِس تضاد کی وجہ سے میری شدید ذہنی اذیت کا شکار رہی۔

ایک جانب وہ اپنے شوہر کی حمایت کر رہی تھی، وہیں اپنے خاندان کو درپیش مسائل پر بھی اُس کی نظر تھی جن میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔

جب غلامی کے قوانین میں تبدیلی کی گئی، تو کینٹکی کے روساء میں شاید ہی کوئی ٹوڈ خاندان جتنا متاثر ہوا ہو۔ حالانکہ اِس خاندان کے باصلاحیت افراد نے امریکا کے لیے کئی قربانیاں دیں لیکن صدر کے قلم کی ایک جنبش نے اُن قربانیوں کو بے حیثیت کر دیا۔ جائیدادیں ضبط کی گئیں، عہدے ختم کیے گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ خاتونِ اوّل کے خاندان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں برتی گئی، بلکہ وہ کینٹکی کے دیگر خاندانوں کے برعکس پہلے زیرِ عتاب آیا۔

چند حلقوں کا خیال ہے کہ ابراہام لنکن کے اِس اقدامات کا مقصد یہ پیغام دینا تھا کہ اگر وہ اپنے سسرالیوں کے خلاف فیصلہ کُن اقدام کر سکتا ہے، تو دوسروں کو بھی نہیں بخشے گا۔ تاہم چند تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ میری سے انتقام لینے کی بھونڈی کوشش کی تھی۔

وجہ جو بھی رہی ہو، نئے قوانین نے میری کے خاندان کو شدید متاثر کیا، جس کی وجہ سے وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی۔ اس موضوع پر اُس سے کئی تلخ سوالات بھی کیے گئے لیکن اس نے ہر بار اپنے محبوب، اپنے شوہر کی حمایت کی، حالانکہ یہ کسی طور آسان نہیں تھا۔

ابراہام لنکن کے مخالفین جانتے تھے کہ میری کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس کی تحویل میں کئی غلام ہیں اور جو غلامی کی رسم کے تعلق سے بننے والے قوانین کا مخالف ہے۔ اِس بات کو جواز بنا کر اس مظلوم عورت پر خاصی تنقید کی گئی اور خاتونِ اوّل کا عہدہ اس کے لیے عذاب بن گیا۔

اُس کا تعلق مغربی علاقے سے تھا، جب کہ اس زمانے میں امریکی سیاست میں مشرقی اور جنوبی علاقے کے افراد کا رسوخ زیادہ تھا، جن کے لیے یہ تہذیب یافتہ خاتون کسی طور قابلِ قبول نہیں تھی۔ ان مشکل حالات میں اُسے امید تھی کہ ابراہام اُس کا ساتھ دے گا لیکن اس شخص کے پاس تو فرصت ہی نہیں تھی۔

وائٹ ہاؤس میں قیام کے زمانے میں اخبارات میں میری کی بہت منفی شبیہہ پیش کی گئی۔ اس کی بابت یہ تک لکھا گیا کہ اُسے محافل کے آداب کا قطعی علم نہیں ہے۔ دوسری جانب اخبارات نے ابراہام کو ایک ایسے جری انسان کے طور پر پیش کیا، جسے نہ صرف سیاسی بلکہ ازدواجی محاذ پر بھی مشکلات کا سامنا ہے۔

اُن برسوں میں اُسے صحت کے مسائل نے بھی گھیرے رکھا۔ ڈپریشن کے دورے تواتر سے پڑنے لگے تھے۔ وہ اکثر سر درد کی شکایت کیا کرتی تھی۔ تکلیف کے ایام میں بھی وہ اپنے شوہر کی توجہ کو ترستی رہتی۔ طبّی دستاویز بتاتی ہیں کہ وہ Bipolar disorder نامی مرض میں مبتلا ہو گئی تھی، جس میں انسان جذباتی ترتیب کھو بیٹھتا ہے اور اُس کا رویّہ غیر معمولی تبدیلیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

وائٹ ہاؤس میں قدم رکھنے کے بعد اُسے اپنے تیسرے بیٹے ولیم سے محرومی کا کرب بھی سہنا پڑا تھا، جس نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی اور وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ وحشت کے شکنجے میں کستی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ایک جانب بیماری اور دوسری جانب غافل شوہر، جس

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

نے عدم توجہی اپنی عادت بنالی تھی۔

مظلوم میری کو دو بیٹوں کی جدائی کا بھی غم تھا، ایسے میں اُس نے اپنی توجہ مثبت باتوں پر مرکوز کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔

وہ باقاعدگی سے اسپتالوں کا دورہ کرنے لگی جہاں وہ مریضوں میں پھل اور پھول تقسیم کرتی۔ وہ زخمی نوجوان سپاہیوں سے خاصی شفقت سے پیش آتی جن میں اسے اپنے مرحوم بیٹے نظر آتے تھے۔

شوہر کی توجہ سے محرومی کے باوجود اس عظیم عورت نے اُس کا بھرپور ساتھ دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ باقاعدگی سے ابراہام کے ساتھ جنگی محاذوں کے دورے کیا کرتی تھی۔ وائٹ ہاؤس میں سماجی تقریبات بھی منعقد کرواتی۔ گوکہ اِس عمل کو چند حلقوں کی جانب سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن آج کے تجزیہ نگار تسلیم کرتے ہیں کہ اس سرگرمی سے ابراہام لنکن کے امیج کو فائدہ پہنچا۔

بالآخر اپریل 1865ء میں خانہ جنگی اختتام کو پہنچی۔ امن کا دور شروع ہو، جس کا سہرا ابراہام لنکن کے سر جاتا تھا۔

جب دھیرے دھیرے سیاسی تناؤ ختم ہونے لگا، تو میری کے دل میں یہ امید جاگی کہ شاید اب شوہر اُس کی جانب توجہ دے گا، اُسے التفات سے نوازے گا، اس کی زخموں پر مرہم رکھے گا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ برسوں بعد موسم سرما کی ایک خوشگوار شام ابراہام نے اُس کے تیار کردہ شوربے کی تعریف کی اوراس کے لباس کی بابت اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

وہ مظلوم عورت مسرت سے بھر گئی۔ برسوں سے وہ منتظر تھی کہ شوہر اُسے محبت سے مخاطب کرے۔

عشائیہ کے اختتام پر جب وہ خواب گاہ کی جانب جا رہی تھی، اس نے خود سے سوال کیا۔

''کیا اذیت کے دن تمام ہوگئے؟ کیا محبت سے محرومی کے المیے نے ناکامیوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا؟'' اس لمحے تذبذب کی شکار میری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اگلے روز جب ایک بار پھر امریکا کے صدر نے اُسے مسکرا کر دیکھا، اُس کے زخمی دل میں خوشی کے پھول کِھل اُٹھے۔ اُس روز وہ برسوں بعد ہشاش بشاش نظر آئی۔ وہ واقعی خوش تھی اور پُرانے دکھوں کو یاد کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''میں ایک ناکام بیوی نہیں ہوں۔ میرا شوہر مجھ سے محبت کرتا ہے!'' اُس نے خود سے کہا۔

گوکہ اگلے چند دنوں میں ابراہام کی مصروفیات نے اسے گھیرے رکھا، تاہم کوئی دل شکنی والی بات نہیں ہوئی۔ میری نے بھی اُس کی خوشنودی کے لیے ہر وہ کام کیا جسے ابراہام پسند کرتا تھا۔

ابھی اس کا پیاسا دل محبت کی پھوار میں پوری طرح بھیگا بھی نہیں تھا کہ 14 اپریل اپریل کا منحوس دن آن پہنچا، جس کا آغاز ایک انتہائی حسین صبح سے ہوا۔

وہ اُس صبح وائٹ ہاؤس سے ملحقہ پارک میں بیٹھی تھی، جب خادمہ نے اُسے صدر کا پیغام پہنچایا کہ آج رات وہ خاتونِ اوّل کے ساتھ فورڈز تھیٹر کا رُخ کریں گے، جہاں Our American Cousin نامی کھیل پیش کیا جارہا ہے۔

''ضرور، میں اُن کی شکر گزار ہوں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

مقرر وقت پر تیار ہونے کے بعد اُس نے آئینے پر نظر ڈالی، جس سے ایک ادھیڑ عمر عورت کا عکس جھلک رہا تھا جس کے چہرے پر دُکھ کے باوجود مسکراہٹ تھی۔ اُس نے خود سے کہا ''میں نے برسوں کے تلخ انتظار کے بعد غموں سے، عدم توجہ سے نجات حاصل کرلی ہے۔''

وہ غلط تھی... محرومیاں تاحال اِس کے تعاقب میں تھیں کہ بدبختی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

اُس ہیبت ناک رات فورڈز تھیٹر ہال میں ڈراما دیکھتے ہوئے ایک نامور اداکار جون بوتھ نے پشت سے ابراہام لنکن پر فائر کیا۔ گولی سیدھی اُس کے سر میں اُتر گئی۔

اُس دہشت ناک منظر کو دیکھنے والا ہر شخص سکتے میں تھا لیکن میری جس کیفیت سے گزری، اُسے بیان کرنے کے لیے شاید ہزاروں حزنیہ الفاظ بھی کم پڑ جائیں۔ اس کا محبوب، وہ شخص جس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ تج دیا، جس کی محبت کے لیے وہ ترستی رہی، اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا۔

وہ زخمی ابراہام کے ساتھ گریہ کرتی ہوئی صدارتی محل لوٹی، جہاں اُس پر مسلسل غشی کے دورے پڑتے رہے۔

پوری رات ابراہام کا بڑا بیٹا، رابرٹ باپ کے سرہانے بیٹھا رہا، جس نے 15 اپریل کی صبح سات بجے دم توڑ دیا۔

اُس وقت میری غم سے اس قدر نڈھال تھی کہ سیکریٹری آف وار کے حکم پر اُسے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔

''خاتونِ اوّل کی حالت بہت خراب ہے، اُنہیں یہاں سے لے جائیں۔'' مضبوط اعصاب کے حامل اُس بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں نمی تھی۔

میری کمرے سے باہر ضرور چلی گئی تاہم اُس کی چیخیں اُس اُداس کمرے کی دیواروں سے ٹکراتی رہیں، جہاں ابراہام کی نعش رکھی تھی۔

وہ اُس شخص کے لیے گریہ کررہی تھی، جس نے کبھی اُس سے محبت نہیں کی!

☆☆☆

اُس کے سامنے تعزیتی پیغامات کا ڈھیر لگا تھا۔ ہزاروں خطوط تھے، جنہیں وہ پُرنم آنکھوں کے ساتھ پڑھتی اور قلم لے کر بیٹھ جاتی، تاکہ تعزیت کرنے والوں کا شکریہ ادا کرسکے۔

ایک خط برطانیہ کی فرماں رواں ملکہٗ وکٹوریا کی جانب سے تھا، جس کے جواب میں میری نے لکھا:

''ملکہ عالیہ، مجھے آپ کا تعزیتی خط موصول ہوا، جسے لکھنے کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں۔ میں آپ کی ہمدردی کے لیے شکر گزار ہوں، جو ایک ایسے دل میں پیدا ہوئی، جو اُس دُکھ کو واضح طور پر محسوس کرسکتا ہے جس سے میں گزر رہی ہوں!''

واضح رہے کہ ابراہام لنکن کی موت سے چار برس قبل ملکہٗ وکٹوریا کو اپنے شوہر شہزادہ البرٹ کی موت کا غم برداشت کرنا پڑا تھا، جس سے وہ شدید محبت کرتی تھی لیکن میری اور ملکہ وکٹوریا کے غم میں زمین آسمان کا فرق تھا... ملکہ کو اپنے محبوب شوہر کی محبت میسر تھی، اُس کا غم بجا تھا، تاہم جس کرب سے میری گزر رہی تھی، اُس کی توجیہہ مشکل تھی کیونکہ ملکہ کے برعکس اُسے کبھی اپنے شوہر کی محبت نصیب نہیں ہوئی۔

آنے والے برسوں میں بھی محرومیوں نے اس مظلوم عورت کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اپنے دو بیٹوں اور شوہر کی موت کا کرب سہنے والی میری پر جولائی 1871ء میں اُس وقت غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، جب اُس کا بیٹا تھامس بھی دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اس سانحے کے بعد وہ درد کی گہری کھائی میں اُتر گئی جہاں تاریکی تھی، تنہائی تھی۔

اب فقط ایک بیٹا رابرٹ زندہ تھا، جس کے سلسلے میں وہ اکثر پریشان رہتی۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہوگئی تھی اور اُسے یہ خدشہ پریشان رکھتا تھا کہ رابرٹ بھی جلد اُس سے جدا ہوجائے گا۔ وہ اپنی زندگی کے حوالے سے بھی اندیشوں کا شکار تھی۔

شگاگو میں قیام کے دوران اُس نے کئی بار یہ بات دُہرائی کہ ریل کے سفر کے دوران ایک مشکوک شخص نے اُسے زہر دینے کی کوشش کی تھی۔

شوہر کے انتقال کے بعد اُس نے شوخ رنگ پہننے چھوڑ دیئے تھے، اب وہ فقط سیاہ رنگ کا ماتمی لباس پہنتی جس میں اس کی بے چارگی کئی گنا بڑھ جاتی۔

غموں کے اُس زمانے میں اس نے کئی عجیب وغریب حرکات کیں۔ وہ بے تحاشہ شاپنگ کرنے لگی، کئی ایسی اشیاء خریدیں، جنھیں اس نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اُسے غربت کے خوف نے بھی جکڑ رکھا تھا۔

اپنے شوہر کی جدائی کے غم سے نڈھال اس مظلوم عورت نے کئی بار بڑے ہی بھونڈے انداز میں خودکشی کی بھی کوشش کی۔

اِن ہی حرکات کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے رابرٹ کی توجہ سے بھی محروم ہوگئی اور یوں اُس کی زندگی کا المیہ دوچند ہوگیا۔ اس زمانے میں مختلف نوع کے مقدموں نے بھی اُسے پریشان رکھا۔ بالآخر وہ 1876ء میں اپنی بڑی بہن الزبتھ کی تحویل میں آگئی۔ آخر کے چند برس وہ صحت کے گوناگوں مسائل میں گھری رہی۔ بڑی بہن نے اس کا خیال رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

الزبتھ اپنی چھوٹی بہن کے سرہانے بیٹھ کر اُسے دلاسے دیتی، جس کے ذہن پر آج بھی ابراہام لنکن سے جدائی کا سانحہ سوار تھا۔ گوکہ میاں بیوی کی زندگی میں خوش گوار لمحات کم ہی آئے، لیکن اسپرنگ فیلڈ میں بستر مرگ پر میری نے اپنے شوہر، اپنے محبوب کو کئی بار پکارا۔ اپنی 23 سالہ شادی شدہ زندگی کے اُن ہنستے مسکراتے پَلوں کو یاد کرنے کی بساط بھر کوشش کی، جو کبھی آئے ہی نہیں!

جب مظلوم میری ابراہام کو پکارتے پکارتے نیند کی وادی میں اُتر جاتی الزبتھ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ جانتی تھی کہ اب میری کی حالت میں سدھار ممکن نہیں!

بالآخر عشق سے محروم، توجہ کی طالب میری ٹوڈ لنکن 63 برس کی عمر میں 16 جولائی 1882ء کو جہان فانی سے کوچ کرگئی۔

اپنے عہد کی بدنصیب ترین خاتونِ اوّل کو اُس کے بے وفا شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

شکستِ عشق

ابنِ کبیر

وہ میدان جنگ کا فاتح تھا، تاریخ اسے فاتح اعظم قرار دیتی ہے مگر محبت کے محاذ پر وہ مفتوح قرار پایا۔ شکست اس کا مقدر ٹھہری۔ عشق کی معراج پر پہنچ کر اس کا عشق ناکام ثابت ہوا۔ اس نے پہلے عشق کی ناکامی پر سوگ منایا مگر دوسرے عشق نے بھی چین لینے نہ دیا، جس وارثِ تخت کی خاطر اس نے پہلی محبت کو ٹھکرایا، اس نے بھی وفا نہ کی اور وارث کو نگاہوں سے دور رکھا۔

ایک ایسے شہنشاہ کی ناکام محبت کا قصہ جس نے یورپی تاریخ پر اثرات مرتب کیے

عشق ناکام نمبر

1933ء کی وہ صبح کچھ زیادہ ہی سرد تھی۔ لندن کے آسمان پر دبیز بادل چھائے تھے۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے گر چکا تھا اور برف باری کی پیشگوئی دُرست ہونے کے خدشات سر اُٹھا رہے تھے، اِس کے باوجود اُس صبح شہر کے ٹھٹرتے باسیوں کے رگ وپے میں تجسّس دوڑ رہا تھا کہ آج تاریخی اہمیت کے حامل، شدتِ جذبات سے لبریز ایسے خطوط نیلامی کے لیے پیش کیے جانے تھے، جن کی ہر سطر سے محبت ٹپکتی تھی... ایسی محبت جس نے تاریخ کے صفحات پر ایک حزنیہ داستانِ عشق کو جنم دیا۔

نیلامی کا وقت آن پہنچا۔ گوکہ پالا پڑ رہا تھا، ژالہ باری جاری تھی پھر بھی میوزیم کے سامنے کافی بھیڑ تھی۔ وہ لاکھوں شہری جو میوزیم نہیں پہنچ سکے تھے، اُن کی توجہ بھی نیلامی ہی پر مرکوز تھی۔ آخرکار وہ خبر آ ہی گئی جس کا اُنہیں انتظار تھا۔ خطوط کو چار ہزار پونڈز کے عوض خرید لیا گیا تھا!

کوئی حیران نہیں ہوا۔ یہ متوقع تھا۔ ہر شخص اُن اوراق کے گراں نرخوں پر فروخت ہونے ہی کی توقع کر رہا تھا۔

موسم سرما میں نیلامی کی غرض سے پیش کیے جانے والے اُن محبت ناموں کو اٹھارویں صدی کے اواخر میں اٹلی کے محاذ پر فرانسیسی مفادات کی جنگ لڑنے والے جذبۂ عشق سے سرشار ایک سپہ سالار نے اپنی محبوبہ کے نام بھیجا تھا، جو آنے والے برسوں میں بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے فرانس کا بادشاہ بن گیا اور اُس کی محبوبہ فرانس کی ملکہ... لیکن اس منحوس عہدے نے اُس کے فسانۂ محبت کو المیے کی شکل دے دی۔

وہ بدقسمت نپولین بوناپارٹ تھا۔ تاریخ کا عظیم ترین جنگجو، ایک سخت جان شخص۔ جسے دشمن تو دشمن، دوست بھی ''قصاب'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اُس نے کئی محاذوں پر حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی لیکن محبت کے محاذ پر اُسے بدترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے باوجود شکستگی کے شکار اِس عاشق کا سوختہ دل برسوں محبت کے مذبح خانے میں تڑپتا رہا۔ زندگی کی بازی ہارنے سے قبل اُس بدنصیب نے اپنی محبوبہ ہی کو پکارا تھا۔ ''...جوزفین!''

☆☆☆

جولائی 1784ء کی اُس رات پیرس کی ایک سیلن زدہ، گرم کوٹھری میں قید روز کا ذہن اندیشوں میں اُلجھا تھا جنہیں گزرتے سیاہ لمحات مہمیز کر رہے تھے۔

روز کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا تاہم وہ اِس بات سے واقف تھی کہ حکومت اُس کے شوہر الیگزینڈر رڈی بیوہارنس کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔

جوں جوں وہ اِس بابت سوچتی، وحشت ناک اندیشوں میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس

کے دل کو مٹھی میں بھر کر بھینچ رہا ہے۔

بالآخر شدت غم سے اُس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور وہ نڈھال ہو کر ادھڑے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اب تعفن زدہ کوٹھری میں سسکیاں گونج رہی تھیں!

اُس کا پورا نام ''ماری جوزف روز تاشر لا پیکروی'' تھا تاہم وہ روز کے نام سے معروف تھی۔ ہاں... آنے والے برسوں میں اُسے فرانس کے سالارِ اعظم کی جانب سے نیا نام ملنے والا تھا... جوزفین! اور اِسی نام کے ساتھ اُسے شاہی تخت پر بیٹھنا تھا لیکن یہ تو بعد کی بات تھی، اُس وقت وہ فقط روز تھی۔ ایک بے سہارا عورت جس نے 23 جون 1723ء کو بحیرۂ کیریبین کے ایک جزیرے مارٹینیک کی ساحلی بستی میں آنکھ کھولی تھی۔

روز کی ابتدائی زندگی خاصی خوشگوار تھی۔ علاقے کے دیگر خاندانوں کے برعکس اس کے گھرانے کو کئی ایسی آسائشیں میسر تھیں جن سے استفادہ کرنے کا تصور بستی کی نصف آبادی کے لیے محال تھا۔ بالائی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا اُس کا خاندان شکر سازی کے کاروبار سے وابستہ تھا۔ اُس کا باپ جوزف اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کارخانے کی اوپری منزل میں مقیم تھا۔ آئرش النسل اُس کی ماں کلیری ایک تہذیب یافتہ عورت تھی جس نے اپنی اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔

روز نے علاقے کے کانوینٹ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی جہاں اُسے اخلاقی اقدار واطوار سے لیس کیا گیا۔ وہ محافل کے آداب سے بخوبی واقف تھی۔ لہجے میں ایک خاص قسم کی شائستگی تھی جو اُس زمانے میں متمول گھرانوں کی لڑکیوں ہی میں نظر آتی۔ گوکہ اس کا شمار خوبصورت ترین لڑکیوں میں نہیں ہوتا تھا، تاہم وہ بلا کی پُرکشش تھی۔ آنکھوں میں ذہانت دمکتی تھی۔ اور ان ہی آنکھوں میں روز نے ایک شان دار مستقبل کے سپنے سجائے تھے ایک تہذیب یافتہ انسان سے شادی کرنے کا خواب دیکھا تھا۔

چھوٹی بہن کیتھرین بھی روز کے نقوش پا کا تعاقب کرتی۔ اُسی کے مانند سپنے دیکھتی، محافل میں اُس کے انداز کی نقل کرتی۔ وہ دونوں بہنیں خواب دیکھنے کا حق رکھتی تھیں کیونکہ خوبرو تھیں، تعلیم یافتہ، باشعور اور ذہین تھیں،

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

لیکن... وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔

وہ برس... اُس گھرانے کے لئے انتہائی اذیت ناک ثابت ہوا۔ ماہی گیروں کی وہ بستی بدترین سمندری طوفان کی زد میں آگئی۔ ایسا طوفان جو خوشیاں نگلنے کا ارادہ کئے ہوا تھا۔ طوفان کا قہر کیا کم تھا کہ آسمان بھی پوری قوت سے برسنے لگا۔ کئی روز تک جاری رہنے والی بارشوں سے سیکڑوں جانوں کا ضیاع ہوا، مکانات ڈھے گئے، مواصلاتی نظام درہم برہم ہوگیا۔ اگلے چند ماہ تک پانی قصبے میں کھڑا رہا اور وہاں کے باسی بے بسی کی تصویر بنے رہے۔ جب پانی اُترا، آنکھوں کے سامنے فقط تباہی تھی۔

اُس طوفان نے روز کے گھرانے کا کاروبار برباد کر دیا۔ اُنہیں توڑ دیا۔ اب معاشی بدحالی کا عفریت سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ بُرے دنوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔

شکر سازی کے کارخانے کی اوپری منزل میں جہاں کبھی قہقہے رقص کیا کرتے تھے، اب سناٹا رہنے لگا تھا۔ اس منزل کی کشادگی یکدم گھٹ گئی تھی۔ روشنی ماند پڑ گئی تھی۔

طوفان کا آسیب یوں اُس گھرانے سے چمٹ گیا تھا کہ روز اور کیتھرین کی آنکھوں سے جن میں حسین سپنے تھے، اب نقاہت جھلکنے لگی تھی۔ اُن کے اطوار میں گہری یاسیت در آئی تھی اور وہ قنوطیت کے دریا میں اُتر گئی تھیں۔

جب کبھی کلیری کی نظر اپنی دونوں خوبرو لیکن اُداس بیٹیوں پر پڑتی، اُس کے دل میں غم کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا اور وہ دُکھی عورت، آنسو چھپاتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ رات رات بھر دعائیں مانگتی کہ خدا اُس کی بیٹیوں کی کسی اچھے گھرانے میں شادی کروا دے، تاکہ اُن کی شادابی لوٹ آئے۔

کلیری ایسے رشتوں کی تلاش میں تھی جن کے طفیل اُس کے خاندان کی معاشی حالت بھی سُدھر جائے۔ اس ضمن میں اُس نے چند کوششیں بھی کیں لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ وجہ بہت سادہ تھی، اب اس کا خاندان مقروض تھا، کسمپرسی کا شکار تھا۔ ایسے میں کون اُس کی بیٹیوں سے رشتہ کرنے کی ہامی بھرتا؟

خوش قسمتی سے مشکل کی اس گھڑی میں روز کی خالہ ایدمی نے اُس خستہ حال گھرانے کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایدمی نے فرانسیسی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک بااثر شخص فرینکوس کو اپنی زلف کا اسیر بنا رکھا تھا۔ اُس نے کلیری سے وعدہ کیا کہ جب تک وہ اپنی بھانجیوں کا کسی اچھے گھر میں رشتہ نہیں کروا دیتی سکون سے نہیں بیٹھے گی۔

ایدمی واقعی ارادوں کی پکی تھی۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح فرینکوس کو راضی کر لیا کہ وہ اُس کی بارہ سالہ بھانجی کیتھرین کی شادی اپنے انیس سالہ بیٹے الیگزینڈر سے کر دے۔ جوں ہی اُس کے عاشق نے رشتے کے لیے ہامی بھری، اس نے خوشخبری کا تار مارٹینیک روانہ کر دیا۔

اگلے روز جب دُکھوں سے اُلجھتی کلیری کو اپنی بہن کا تار موصول ہوا، وہ مسرت سے بھر گئی۔

''بُرے دن تمام ہوئے!'' اُس نے خود سے کہا۔ دوڑی دوڑی اپنے شوہر کے پاس پہنچی تاکہ اسے مطلع کر سکے کہ خوشحالی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

اگلے ہی روز سے شکر ساز کے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں، جن میں روز نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ اپنی بہن کو عروسی جوڑے میں دیکھنے کی خواہش اُس کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی، تاہم وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی!

فرانس روانہ ہونے سے فقط چند روز قبل اکتوبر 1777ء میں بارہ سالہ کیتھرین مختصر علالت کے بعد دنیائے فانی سے کوچ کر گئی اور شادی کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔

یہ صدمہ بہت بھاری تھا۔ گھرانے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اندیشے سر اُٹھانے لگے کیونکہ اِس سانحے سے ایدمی کی کوششیں ضائع ہونے کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا، فرینکوس اپنا فیصلہ بدل سکتا تھا اور قسمت میں سُدھار کا یہ موقع ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

وقت کم تھا۔ میاں بیوی نے سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی روز کو کیتھرین کی جگہ اُس سرزمین کی طرف روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کی ملکہ بننا اُس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔

اکتوبر 1779ء میں اپنے باپ جوزف کے ساتھ روز فرانس پہنچ گئی اور اگلے ہی ماہ وجیہہ الیگزینڈر کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئی۔ نوجوان الیگزینڈر ایک فوجی افسر کی حیثیت سے تیزی سے ترقی کا زینہ عبور کر رہا تھا اور فرانس کی سیاست میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا تھا۔ روز کو یقین تھا کہ وہ اُس تہذیب یافتہ نوجوان کی جیون ساتھی بننے کے بعد محبت کے حسین وادی میں داخل ہو جائے گی جہاں مسرت کی نہریں بہہ رہی ہوں گی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

بے شک وہ تعلیم یافتہ تھی، محافل کے آداب کی شُدبُد رکھتی تھی لیکن اس کی قابلیت کا الیگزینڈر سے کوئی موازنہ نہیں تھا جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ پیرس میں منعقد ہونے والی سماجی تقریبات کی جان تھا، بہترین رقاص تھا جبکہ رقص کے فن میں روز نیم پختہ تھی۔

یہ شادی خوش گوار ثابت نہیں ہوئی۔ اپنی ذہانت اور شائستگی کے باوجود روز الیگزینڈر کے دل میں جگہ نہیں بنا سکی۔ اسے نہیں جیت سکی اور اس صدمے نے اُس کی روح کو اضطراب سے بھر دیا۔

ہاں، اسے ہر سہولت میسر تھی، آسائشوں کی کمی نہیں تھی، اِس شادی کے طفیل مارٹینیک میں بیٹھا اُس کا خاندان بھی معاشی طور پر سنبھل گیا تھا لیکن روز کی زندگی میں ایک خلا تھا۔ محبت سے محرومی کا خلا!

وہ رات رات بھر اِس نفسیاتی مسئلے سے اُلجھتی رہتی کہ کہیں اپنی مری ہوئی بہن کی جگہ لے کر اس نے غلطی تو نہیں کر دی۔ وہ اکثر دل سے یہ سوال کرتی جو جواباً خاموش رہتا۔

آنے والے برسوں میں اُس نے ایک بیٹے ایوجن اور بیٹی ہارٹینس کو جنم دیا۔ لوگ کہنے لگے۔ ''روز کا خاندان مکمل ہوگیا... وہ کتنی خوش نصیب ہے!''

لیکن یہ تو وہی جانتی تھی کہ زندگی میں خوشیوں کی کسی قدر کمی ہے۔ شادی کے پہلے ہی سال شوہر نے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی تھی، بچوں کی پیدائش کے بعد تو وہ بالکل ہی بیگانہ ہوگیا۔ غیر عورتوں میں اُس کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کھلم کھلا اپنی بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہونے لگا۔

اُن دنوں فرانس سے میلوں دور امریکی زمین پر آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی جس میں الیگزینڈر کو بھی حصہ لینا تھا۔ وہ سخت دل انسان بیوی کو ساتھ لے جانے کے بجائے اپنی محبوبہ کو بغل میں دبائے امریکا پہنچ گیا جہاں اُس عورت نے کئی ناجائز بچے پیدا کیے۔

دوسری جانب کرب میں ڈوبی روز بچوں کے ساتھ سامان اُٹھائے کانوینٹ پہنچ گئی۔ بعد کے دن اُسے نے وہیں گزارے۔ کانوینٹ میں اعلیٰ طبقے کی کئی ایسے خواتین مقیم تھیں جن کے شوہر امریکی مفاد کی جنگ لڑنے میلوں دور چلے گئے تھے۔

وہ دورانیہ اُس کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ اُس نے اُن پڑھی لکھی خواتین سے بہت کچھ سیکھا۔ دھیرے دھیرے سماجی حلقوں میں متحرک ہونے لگی، رقص کے فن پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ اس دوران چند بااثر سیاسی شخصیات سے بھی تعلق قائم ہوگئے جن کی آنکھوں میں اُس کے لیے نہ صرف پسندیدگی بلکہ لَو اور پیغامات بھی تھے لیکن اُس نے اپنے دامن پر کوئی داغ نہیں لگنے دیا۔ وہ واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ وہ بہت شاہ خرچ ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے اُس کا ہاتھ تنگ رہتا۔

1788ء میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے میکے مارٹینیک چلی گئی جہاں وہ دو برس مقیم رہی۔

جب وہ پیرس لوٹی، الیگزینڈر امریکا سے واپس آچکا تھا۔ گوکہ دونوں کے دل ایک دوسرے سے بہت دور جاچکے تھے لیکن اُنہوں نے اِس رشتے کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا اور سماجی سرگرمیوں میں میاں بیوی کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے۔ شاہ خرچیوں کی وجہ سے اس زمانے میں بھی روز پریشانیوں میں گھری رہی اور الیگزینڈر اس کی فضول خرچی کی عادت کو تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔

بیزاری کے اُن ہی دنوں فرانسیسی انقلاب اُس خونی دور میں داخل ہوگیا جسے تاریخ میں ''ریجن آف ٹیرر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حکومت فرانس نے مخالفین کو عقوبت خانوں میں ڈال دیا، اُن پر بہیمانہ تشدد کیا، کئی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اِس ضمن میں فیصلے صادر کرنے کا اختیار ''کمیٹی آف پبلک سیفٹی'' نامی گروہ کے ہاتھ میں تھا جو حکومتی مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔

اسی کمیٹی کی جانب سے مارچ 1794ء میں مختلف الزامات کے تحت الیگزینڈر کو گرفتار کر کے عقوبت خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ انقلاب کا پُرزور حامی تھا اور حکومت اُسے اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگی تھی۔ کمیٹی نے اسی پر بس نہیں کیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس عمل میں الیگزینڈر کی بیوی روز نے بھی اُس کا بھرپور ساتھ دیا ہے جو اُس وقت انقلاب کے حامیوں میں خاصی سرگرم تھی۔ سو ماہ اپریل میں اُس دل گرفتہ عورت کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے گئے جو پہلے ہی اپنے شوہر کے ہاتھوں کافی عذاب جھیل چکی تھی۔

بے نصیب روز کو ایک تاریک، گرم کوٹھری میں ڈال دیا گیا جہاں ہر گزرتا لمحہ اس کے اندیشوں کو مہمیز کرتا رہا، تاآں کہ غم کے بوجھ تلے سسکتی اُس عورت کو نیند کے عفریت نے آ پکڑا!!

☆☆☆

23 جولائی کی صبح اذیت کی پُرقوت لہر روز کے ناتواں وجود سے یوں ٹکرائی جیسے برسوں قبل ایک ہولناک سمندری طوفان ماہی گیروں کی بستی سے ٹکرایا تھا۔

www.paksociety.com

اُسے ایک ہمدرد جنرل لوئس لیزیری نے یہ خبر پہنچائی کہ اُس کے شوہر کو ملک دشمن قرار دیتے ہوئے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ہے۔

اُس منحوس اطلاع نے اُسے کرب کی کھائی میں دھکیل دیا۔

''وہ شخص جس سے میں محبت کرتی تھی، ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہوگیا!'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گریہ کرتے کرتے بے ہوش ہوگئی۔

جب ہوش آیا، سورج آسمان پر چمک رہا تھا اور دُھوپ کوٹھری میں داخل ہو رہی تھی۔

چند ساعتوں تک روز سمجھ ہی نہیں سکی کہ اُس کے ساتھ کیا واقعہ بیتا ہے لیکن جوں ہی اُسے یاد آیا کہ اُس کا شوہر موت کے گھاٹ اُتارا جاچکا ہے، ایک بار پھر اُس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ پورا دن روز نے اُس عیاش شخص کی یاد میں ماتم کرتے گزارا جس کی نظرِ کرم کے لیے وہ برسوں تڑپتی رہی۔

پانچ روز تک سوگ منانے کے بعد اُسے جنرل لوئس لیزیری نے یہ غیر متوقع خوشخبری سنائی کہ حکومت نے اُسے رہا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

اس خبر نے اسے تذبذب میں دھکیل دیا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ شوہر کی موت کے بعد اب وہ زندہ رہ کر کیا کرے گی؟

''مجھے بھی مرجانا چاہیے!'' اس نے خود سے کہا۔

وہ انہی خیالوں میں غلطاں تھیں کہ اچانک اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ شاید اس کا ہمدرد جنرل خبر گیری کے لیے آیا ہو لیکن سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک جلاد صفت فوجی افسر کھڑا تھا۔

''اُٹھو۔'' اس کی کرخت آواز کوٹھری میں گونجی۔ ''تمہیں آزاد کیا جاتا ہے!''

''آزاد...'' روز گڑبڑائی۔ ''لیکن ... اب میں کیا کروں گی؟ میرے لیے تو زندگی بے معنی ہے!''

''تو یہ بے معنی زندگی گزارو!'' اُس کے پتھریلے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ چند ساعتوں بعد وہ اس بھیانک قید خانے کے باہر کھڑی تھی جہاں انتہائی گرم دن اس کا منتظر تھا۔

چند لمحات تک یونہی کھڑے رہنے کے بعد وہ لڑکھڑاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگی۔ اس عزم کے ساتھ کہ وہ زندہ رہے گی، ہر صورت میں... گوکہ وہ جانتی تھی کہ یہ آسان نہیں ہے!

بعد کی کہانی ایک غریب عورت کی کہانی ہے، جس کے شوہر کو غدار قرار دے کر قتل کر دیا گیا، جائیداد ضبط کرلی گئی اور مراعات سے محروم کر دیا گیا۔

اُس پر دو معصوم بچوں کی پرورش کی بھاری ذمے داری تھی اور حالات اتنے کٹھن تھے کہ وہ خود کو اس فرض کی ادائیگی میں مکمل طور پر ناکام پاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کوڑی کوڑی کی محتاج ہوگئی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ قرضوں کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔

گوکہ غربت نے روز کو یاسیت کی کھائی میں دھکیل دیا تھا، وہ تیس برس کی ہوگئی تھی لیکن تاحال حسین تھی اور کسی بھی مرد کا دل بہ آسانی جیت سکتی تھی۔

اذیت کے ان دنوں میں روز کو اپنی اس قابلیت کا چنداں احساس نہیں تھا، یہ تو اس کی شاطر سہیلی شازے تھی، جو اُسے یہ باور کروانے میں کامیاب رہی کہ اُسے دوبارہ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے، تاکہ ایک ایسا مرد تلاش کرسکے جو اُس کا سہارا بنے۔

بات روز کے سمجھ میں آگئی۔ بادل ناخواستہ ہی سہی، اس نے اپنے حالات میں سدھار کے لیے شوہر کی تلاش شروع کر دی جو اُس کے بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھ سکے۔

اگرچہ ابتداً اس عمل کی انجام دہی میں اُسے سخت اذیت سے گزرنا پڑا کہ جب بھی وہ کسی مرد میں مستقبل کا شوہر تلاش کرنے کی کوشش کرتی، آنکھوں کے سامنے اپنے محبوب الیگزینڈر کا چہرہ گھوم جاتا اور اُسے یوں لگتا جیسے وہ اپنے شوہر کی روح کو دھوکا دے رہی ہے۔

لیکن وقت بہت ظالم شے ہے، وہ انسانی قدروں کو تباہ کر ڈالتا ہے۔

مجبوری کی قوت کے زیرِ اثر اُن برسوں میں روز نے کئی نوجوانوں سے عشق لڑایا۔ شروع میں تو اسے اِس عمل سے کراہت محسوس ہوتی تھی لیکن دھیرے دھیرے وہ اس سے لطف اندوز ہونے لگی جس کا سبب واضح تھا۔ وہ ایک مرد کے مظالم سہہ چکی تھی اور اب کئی مردوں کو اپنے اشاروں پر نچا رہی تھی، جو اگر خوش ہوتے تو اُس پر تحائف کی بارش کر دیتے۔ الغرض یہ آزادی کا طاقتور احساس تھا جو روز کو بدل رہا تھا۔

وہ ازدواجی زندگی کا گہرا تجربہ رکھتی تھی اور مردوں کو قابو کرنے کا فن بھی جانتی تھی جس کے طفیل اُس نے اشرافیہ کے طبقے میں رسائی حاصل کرلی۔

اس کی خواہش تو یہی تھی کہ کوئی بااثر شخص اس سے شادی کرلے لیکن اس کی محبت کا دم بھرنے والے کسی بھی آدمی نے شادی کی ہامی نہیں بھری۔ وہ ایک تیس سالہ بیوہ کو اپنی شریکِ حیات بنانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسی باعث وہ تیزی سے اپنے عاشق بدلتی رہی اور آخر کار فرانس کی معروف و مضبوط ترین سیاسی شخصیت پال بیریس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کے بارے میں یہ رائے پائی جاتی تھی کہ وہی فرانس کا اگلا حکمران ہوگا، تاہم اس رشتے نے بھی اُسے سکون نہیں دیا!

☆☆☆

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب فرانس میں شہر تولون کا محاصرہ موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ فرانسیسی سورما انگریزوں کو شکست دینے کے بعد گھر لوٹ چکے تھے اور ہر محفل میں اپنی بہادری کی داستانیں سنا رہے تھے۔

ایسی ہی ایک محفل میں جس کا انعقاد پال بیریس نے کیا تھا، روز نے جنگ سے لوٹنے والے ایک نوجوان سپہ سالار کو دیکھا جس کا نام نپولین بوناپارٹ تھا۔

نپولین اُس وقت اتنا مشہور نہیں تھا۔ وہ تازہ تازہ تولون کے محاصرے سے لوٹا تھا جہاں وہ توپ خانے کا نگراں تھا اور سر پر لگنے والے گہرے زخم کی وجہ سے اس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ وہ روز سے چھے برس چھوٹا تھا۔ اِسی سبب وہ زیادہ متاثر نہیں ہوئی اور اُس سے بات کرنے سے احتراز برتا۔

نپولین کو نظر انداز کرنے کا بنیادی سبب پال کی قربت تھی، جس کا اثر و رسوخ فرانس میں بڑھتا جارہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شاطر پال نوجوان نپولین کو سیاسی سطح پر فعال بنانے کی کوششوں میں جتا ہے تاکہ آنے والے برسوں میں اُس کے رسوخ سے فائدہ اُٹھا سکے۔

اُس تقریب کے چند روز بعد جب اس کی سہیلی شازے نے اچانک اس کے سامنے نپولین کی ستائش شروع کردی تو وہ تھوڑی حیران ہوئی۔

شازے نے اُبھرتے ہوئے سپہ سالار کی تعریف کرتے ہوئے اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ آنے والے برسوں میں وہ فرانس میں خاصا رسوخ حاصل کرلے گا۔

''تمہیں اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' شازے کے چہرے پر ذومعنی مسکراہٹ تھی۔ ''اجاسیو کے اس نوجوان نے فقط سولہ برس کی عمر میں فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کا عہدہ حاصل کرلیا تھا۔ تولون سے لوٹنے کے بعد اُسے بریگیڈیر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے!''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ مجھے اس پر توجہ دینی چاہیے؟ وہ طفلِ مکتب معلوم ہوتا ہے!'' روز کے لہجے میں تذبذب تھا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں نے بڑی مشکل سے پال کی توجہ حاصل کی ہے ایسے میں...''

''میری عزیز سہیلی!'' شازے نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''پال کے مزاج سے ہم دونوں واقف ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اب وہ تم سے کترانے لگا ہے۔ جہاں تک نپولین کا تعلق ہے، وہ نوجوان ہے، ناتجربہ کار ہے۔ تم بہ آسانی اُسے اپنے دامِ عشق میں پھنسا سکتی ہو اور یاد رکھو، اس کا مستقبل روشن ہے!''

مورخین کا خیال ہے کہ روز کو نپولین کی جانب متوجہ کرنے کا عمل ایک باقاعدہ منصوبہ تھا جس کا سرغنہ پال ہی تھا جو اب روز سے اُوب چکا تھا۔ اور اس نے اپنے مقصد کے لیے روز کی قریبی سہیلی کو استعمال کیا۔

چند غیر مستند دستاویز کے مطابق پال نے بذاتِ خود روز کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ نپولین کے قریب ہونے کی کوشش کرے۔ جب روز نے انکار کر دیا تو اُس نے دوٹوک الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اب وہ اُس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا بہتر ہے کہ وہ کوئی اور کاندھا ڈھونڈے۔

حقیقت جو بھی ہو لیکن اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روز نے نوجوان سپہ سالار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں نپولین کو اٹلی کے محاذ پر قیادت سونپنے کی خبریں بھی گردش میں تھیں۔

روز کو یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ پال اُسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کی تیاریاں مکمل کرچکا ہے، ایسے میں اگر اُس نے فوراً کوئی سہارا تلاش نہیں کیا تو زندگی ایک بار پھر بے بسی کی تصویر بن جائے گی۔ سو اُس نے خاصی سوچ بچار کے بعد نپولین کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

جب اُس نے نوجوان سپہ سالار کو جیتنے کی کوششوں کا آغاز کیا تو پہلا جھٹکا اُسے یہ جان کر لگا کہ وہ اشرافیہ سے تعلق

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

رکھنے والی ایک دوشیزہ ڈیسیری کلیرے سے منگنی کر چکا ہے جو نپولین کے بڑے بھائی جوزف کی سالی ہے۔

وہ ڈیسیری کو جانتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس معصوم حسینہ کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں ہوگئی اور اگر وہ کوشش کرے تو نپولین اس کا ہوسکتا ہے۔

نپولین سے باقاعدہ ملاقات کے لیے روز کو ایک جواز کی ضرورت تھی۔ اور پھر قدرت نے اسے ایک جواز فراہم کردیا۔

دراصل پیرس میں پھوٹ پڑنے والے فسادات کے بعد حکومت نے ایک قانون پاس کیا تھا کہ کوئی بھی شہری گھر میں ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔ شہر کو اسلحے سے پاک کرنے کی ذمّے داری نپولین ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نپولین کے سپاہیوں نے روز کے دروازے پر بھی دستک دی تھی اور اس کے مرحوم شوہر کی خاندانی تلوار ساتھ لے گئے تھے۔

ذہین روز نے نپولین سے ملنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے بیٹے کو اُس کے دفتر بھیج دیا جس نے نپولین سے درخواست کی کہ وہ اپنی خاندانی تلوار آخر بار دیکھنے کا آرزومند ہے۔

نوجوان سپہ سالار نے بچے کی معصوم خواہش کو قبول کر لیا۔ اگلے دن صبح ہی صبح روز بن سنور کر، آنکھوں میں تشکر کے آنسو لیے نپولین کے دفتر پہنچ گئی۔

جوں ہی نقشوں پر جھکے نپولین کے نتھنوں سے بھینی بھینی خوشبو ٹکرائی، اُس نے سر اُٹھایا۔

وہ ایک قاتل لمحہ تھا۔ روز کے حسن سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ وہ سکتے میں تھا اور تجربہ کار حسینہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

اس مختصر سی ملاقات میں جیسے روز نے نپولین پر جادو کردیا۔ وہ اُس کا دیوانہ ہوگیا اور ایسا ہونا متوقع تھا کہ اِس کے پیچھے ایک گہری سازش تھی۔

پال اپنے منصوبے کے مطابق چند روز قبل نپولین کو بتا چکا تھا کہ پیرس کی کئی حسینائیں نپولین پر فریفتہ ہوگئی ہیں لیکن اگر کوئی اُس کی محبوبہ بننے کی حق دار ہے، تو فقط روز ہے!

پہلی ہی ملاقات میں ہتھیار ڈال دینے کا ایک سبب نپولین کی ناپختگی اور روز کی مہارت بھی تھی جو مردوں کو گرویدہ بنا لینے کے فن سے کماحقہ واقف تھی۔

دمِ رخصت روز نے اُسے چائے کی دعوت دے ڈالی جس پر نپولین خوشی سے پھولے نہ سمایا۔

"ضرور، یہ میرے لیے اعزاز ہوگا کہ آپ جیسی حسین اور تہذیب یافتہ خاتون کے ساتھ چائے نوش کروں!" اُس نے جواباً کہا۔

دو دن بعد وہ روز کے مکان میں تھا جہاں اُس تجربہ کار عورت نے بڑی مہارت سے اُسے شیشے میں اُتار لیا۔

رخصتی کے وقت اُس نے نپولین کا ہاتھ تھام کر محبت سے تر بہ تر لہجے میں کہا۔ "آپ جلد فرانس کے عظیم ترین جنرل بنیں گے۔ پیرس آپ سے محبت کرتا ہے۔ وہ لڑکی واقعی خوش نصیب ہوگی جسے آپ اپنی دلہن بنائیں گے۔"

روز جانتی تھی کہ نپولین کی منگنی ہوچکی ہے، تاہم اُس نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ یہ جانتی تھی کہ اگر نپولین نے منگنی کی بات چھپانے کی کوشش کی تو اِس امر پر تصدیق کی مُہر ثبت ہوجائے گی کہ وہ روز کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ نپولین نے اپنی منگیتر کا ذکر نہیں کیا۔

جب وہ گھر لوٹ رہا تھا، اُسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ ہوا میں اُڑ رہا ہو۔

دوسری جانب اُسے الوداع کہنے کے بعد کھڑکی میں کھڑی روز کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔

نوجوان نپولین جال میں پھنس چکا تھا!

☆☆☆

سپہ سالار دیوانہ ہوگیا تھا۔ اُسے روز کے سوا کچھ سُوجھتا ہی نہیں تھا۔ ہر پَل اُسی کی یاد میں کھویا رہتا۔ روز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

دعوت سے لوٹنے کے بعد اب وہ اُس حسینہ سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ بالآخر چند ہی روز بعد ایک دعوت میں اُس کا روز سے سامنا ہوگیا، جہاں وہ اپنے جذبات چُھپانے میں کُلی طور پر ناکام رہا۔ بے شک وہ بوکھلایا ہوا تھا اور روز اُس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہورہی تھی۔

اگلے ہی دن پیرس کے میوزیم میں پھر ملاقات ہوگئی جہاں منعقدہ تقریب میں اسے پال نے مدعو کیا تھا جو بڑی مہارت سے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب ہونے کا مواقع مہیا کررہا تھا۔

دھیرے دھیرے ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ سپہ سالار کا سفر منزلِ عشق کی جانب جاری وساری تھا۔ شاطر روز نپولین کے جذبات کو ہوا دیتی رہی، یہاں تک کہ اُس نے ایک آتش فشاں کی شکل اختیار کر لی۔ اور پھر دسمبر کی ایک سرد رات روز کی خواب گاہ میں وہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔ ملن کی اُس شب روز نے نپولین پر محبت کے ایسے خطرناک وار کیے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہوگیا۔

منہ اندھیرے گھر لوٹتے وقت وہ مسرت سے لبریز تھا۔ پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز عبور کرتے ہی وہ روز کے نام ایک خط لکھنے بیٹھ گیا جو خوش قسمتی سے آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ نپولین نے اُس محبت نامے میں یوں اپنے جذبات بیان کیے:

"میں تمہاری خوشبو سے معطر ہوں۔ تمہارے عکس اور کل رات کے نشے نے میرے حواس معطل کردیے ہیں۔ نہ جانے تم نے کیسا جادو کردیا ہے!"

جب روز کو یہ خط موصول ہوا، وہ مسکرائی۔ نپولین اُس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار ہوچکا تھا لیکن وہ مسرور نہیں تھی، قطعی نہیں... بلکہ تذبذب کا شکار تھی۔

دراصل اُسے نیم پختہ نپولین پسند نہیں آیا تھا۔ اُسی کی روح تو اب بھی پال میں اٹکی تھی۔ اور پھر ایک ایسے نوجوان کی شریکِ حیات بننے کا فیصلہ کرنا جو ابھی سیاسی وسماجی حلقوں میں زیادہ مقبول نہیں، خاصا مشکل تھا۔

روز نے اِس بابت شازے سے بھی مشورہ کیا، اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ نپولین تہذیبی سطح پر اُس سے پست ہے، تاہم شازے نے ہر دلیل رد کردی۔

"پیاری روز، کیا تم نے غور کیا؟ تم تیزی سے ادھیڑ عمری کی جانب بڑھ رہی ہو۔ اپنے شاطر عُشاق کو بھول جاؤ۔ اُنہیں اپنے مفادات کی فکر ہے، تم اپنے مفادات کی فکر کرو۔ اور ہاں، یہ فیصلہ کیا جاچکا ہے کہ نپولین ہی اٹلی کے محاذ پر فوج کی کمان سنبھالے گا۔ سمجھنے کی کوشش کرو!"

شازے کے موقف نے روز کے خدشات دور کردیے اور اُس نے نپولین سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

اُن ہی دنوں نپولین نے روز کا نیا نام تجویز کیا... جوزفین!

روشن مستقبل کی متلاشی روز نے بہ خوشی یہ نام قبول کر لیا۔ یوں وہ روز سے جوزفین ہوگئی اور بعد میں تاریخ میں اِسی نام سے زندہ رہی۔

کہتے ہیں، عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ جلد ہی نپولین اور جوزفین کی داستانِ محبت پیرس میں گرما گرم موضوع بن گئی۔ یہ خبریں بھی گردش کرنے لگیں کہ وہ جلد شادی کرلیں گے۔ جب نپولین کے اہلِ خانہ کو یہ خبریں ملیں، وہ غصے سے آگ بگولا ہوگئے۔

بڑے بھائی جوزف نے اُس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سمجھایا کہ اُس کی منگنی ہوچکی ہے۔ "عشق لڑانے کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن شادی کا خیال ذہن سے نکال دو!"

لیکن نپولین نے اُس کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اُسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ جوزفین عمر میں اُس سے بڑی ہے اور ماضی میں کئی عشق لڑا چکی ہے۔

جوزف کی ناکامی کے بعد نپولین کی ماں لیٹیکیا نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ "جوزفین فقط تمہاری زندگی میں تباہی لائے گی!"

تجربہ کار ماں کی باتوں کا بھی عشق میں اندھے نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اہلِ خانہ کی جانب سے جوزفین کی مخالفت نے آتشِ عشق کو مزید ہوا دی۔ وہ سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔

بالآخر ایک رات اُس نے جذبات سے بھرا ایک خط جوزفین کے نام روانہ کردیا، شادی کی درخواست کردی۔

جواب میں چالاک جوزفین نے سوچ بچار کے لیے کچھ وقت کا تقاضا کیا لیکن یہ رسمی تقاضا تھا، اُس وقت تک شاطر جوزفین یہ سمجھ چکی تھی کہ نوجوان جنرل سے شادی کرنا فائدے کا سودا ہے۔

"اُس کی زندگی کا بڑا حصہ تو محاذ ہی پر گزرے گا، یوں مجھے آزادی کے ساتھ اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا موقع مل جائے گا۔" اُس نے خود سے کہا۔ "اور پھر اس کا مستقبل روشن ہے!"

دراصل جوزفین کو حالات کی سنگینی کا ادراک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پال جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی، اب اُس میں دلچسپی کھو چکا ہے۔ دوسرا مفاد پرست عاشق جنرل لوئس نے بھی اُسے خاصا مایوس کیا تھا۔ لوئس سے اُس زمانے میں ملاقات ہوئی تھی جب وہ پیرس کے ایک قید خانے میں صعوبتیں برداشت کررہی تھی۔ لوئس ہی وہ پہلا مرد تھا جس نے الیگزینڈر کی موت کے بعد اُس کے زخمی دل پر مرہم رکھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے بھی لگی تھی لیکن اس نے جوزفین کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑنے سے انکار کردیا تھا۔ سو اَب جوزفین کے پاس نپولین کی درخواست قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور اُسے یہ فیصلہ فوری کرنا تھا کیونکہ وہ

www.paksociety.com

نپولین کے مزاج سے واقف تھی جسے جنگی محاذ سے عشق تھا۔

جوزفین کو احساس تھا کہ اگر اس نے تاخیر کی اور نپولین کسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے نکل گیا تو عین ممکن ہے وہ اُسے بھول جائے۔ عشق کی سُلگتی چنگاری بجھ جائے۔ سواُس نے شادی کے لیے اپنا ذہن بنالیا۔

نپولین کے مانند جوزفین کے چند احباب نے بھی اس رشتے کی مخالفت کی جن میں اس کی بیٹی ہارٹینس پیش پیش تھی۔ جوزفین کو علم تھا کہ اُس کی جواں سال بیٹی کے اندیشوں کا سبب کیا ہے۔

''کیا تم سوچتی ہو کہ میں ایک نوجوان جنرل سے شادی کرکے تمہیں بھول جاؤں گی؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی بیٹی سے سوال کیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوگا، میرا یقین کرو۔ وہ شخص ہر ممکن طریقے سے تمہارا خیال رکھے گا۔''

☆☆☆

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس برس موسم سرما میں پیرس کے باسیوں کے پاس نپولین اور جوزفین کی شادی کے علاوہ بات کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں تھا۔

جس شام جوزفین نے رضامندی ظاہر کی، نپولین تک یہ خبر پہنچنے سے قبل آدھا شہر اس سے آگاہ ہو چکا تھا۔

شاطر فطرت پال اور لوئس تو بہت ہی خوش تھے کہ چلو روز سے... جو اَب جوزفین ہوگئی تھی... جان چھوٹی۔

جب نپولین کو اطلاع ملی کہ اُس کی محبوبہ راضی ہوگئی ہے، اُس نے فوراً ڈیسیری کلیرے سے منگنی توڑنے کا اعلان کردیا جس پر اس کے خاندان نے بہت لعن طعن کی لیکن نوجوان سپہ سالار کو اپنی پُرکشش محبوبہ کے سوائے کسی کی پروا نہیں تھی۔

شادی کے لیے 9مارچ 1796ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ وصل کی خواہشِ شدت میں مبتلا نپولین نے ایک ایک دن گن کر گزارا۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا۔ شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے تمام مہمانوں کو رات آٹھ بجے سول کورٹ پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ پال نے تمام انتظامات سنبھال رکھے تھے۔ وہ نپولین کی طرف سے گواہ تھا۔

جوزفین اُس رات بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے نپولین کی جانب سے تحفے میں دیا جانے والا ایک قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا جس کی تیاری پر خاصا خرچہ کیا گیا تھا۔

اس شام سول کورٹ سے سو میٹر دور کھڑا شخص بھی بہ آسانی یہ بتا سکتا تھا کہ وہاں ایک شان دار تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں پیرس کی تمام بڑی ہستیاں مدعو ہیں۔ بڑے بڑے فوجی افسران، سیاست دان، کھلاڑی، دانش ور... سب!

اور واقعی وہاں کئی قد آور شخصیات تھیں، جو تقریب میں شرکت کی غرض سے وقت پر پہنچ گئی تھیں، ماسوائے ایک شخص کے... اور وہ تھا نپولین۔ اور یہ حیرت انگیز تھا۔ نپولین وقت کا بہت پابند تھا، وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ''وقت ہی سب کچھ ہے۔ میں جنگ ہار سکتا ہوں لیکن وقت ضایع نہیں کرسکتا!''

اور پھر وہ تو جلد از جلد جوزفین کو اپنا بنا لینا چاہتا تھا کہ اس فتنہ پرور حسینہ سے دوری اس کے لیے جان لیوا ثابت ہونے لگی تھی۔ لیکن اس شام وہ وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ چند لمحوں کی تاخیر کا تو عذر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن معزز مہمانوں کو پورے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ سرکاری اہل کار جمائیاں لیتے لیتے بالآخر سو گئے۔ دیگر مہمانوں کے چہروں سے بھی اُکتاہٹ عیاں تھی۔ جوزفین بھی اندیشوں میں مبتلا تھا۔

جب تناؤ بڑھنے لگا تو پال نے معاملات سنبھالے جسے اطلاع مل چکی تھی کی نپولین کورٹ پہنچنے کے لیے گھر سے نکل چکا ہے۔

''صاحبو...'' اس نے مسکراتے ہوئے مہمانوں کو مخاطب کیا۔ ''میں آپ سے معذرت خواہ ہوں لیکن آپ نوجوان نپولین کو تو جانتے ہی ہیں، جس کے کاندھوں پر فرانسیسی فوج کی قیادت کی ذمّے داری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہی ہمارا محافظ ہے۔ بے شک آپ کو انتظار کی اذیت برداشت کرنا پڑی لیکن جب آپ کو اس کی وجہ پتا چلے گی، آپ کا غصہ ٹھنڈ ہوجائے گا۔ دراصل... ہمارا نوجوان دوست اٹلی کی مہم کی تیاری میں جتا ہے کیونکہ شادی کے فوراً بعد اسے میدانِ جنگ کی جانب کوچ کرنا ہے۔ وہ تیاریوں میں اتنا مصروف ہے کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا، اِسی وجہ سے آپ کو انتظار کرنا پڑا... ارے دیکھیے وہ آ گیا!''

اُسی وقت نپولین کورٹ میں داخل ہوا۔ وہ تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پال کی تقریر سے متاثر ہونے والے وہاں موجود تمام مہمانوں نے اُس کے لیے احترام محسوس کیا۔

وہ تقریب کسی طور روایتی نہیں تھی۔ دولہا کے تاخیر سے پہنچنے کے علاوہ اور بھی کئی عجیب و غریب چیزیں رونما ہوئیں۔ سرکاری کاغذات میں جوزفین نے اپنی عمر چار برس کم کرکے لکھوائی۔ نپولین نے اٹھارہ مہینے بڑھا کر بتائے، یوں سرکاری کاغذات کی حد تک اُن کی عمروں کا فرق مٹ گیا۔

کاغذی کارروائی کے بعد جوزفین نے نپولین کا ہاتھ تھام کر اُس مکان کا رُخ کیا جو اُس کا نیا گھر تھا جہاں حجلۂ عروسی ان کا منتظر تھا۔

گوکہ مہمان خاصے تھک چکے تھے لیکن انہوں نے اُبھرتے ہوئے جنرل کی خوشی کی خاطر عشائیہ میں شرکت کی۔

ملن کی اُس رات کے تعلق سے چند عجیب و غریب کہانیاں ملتی ہیں، تاہم سنجیدہ مورخین اُنہیں غیر حقیقی گردانتے ہیں۔

بہرحال، شادی کے دوسرے روز نپولین نے جوزفین کے دونوں بچوں سے ملاقات کی، جو اپنے سوتیلے باپ کے بارے میں طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھے۔ شفیق نپولین نے اپنی محبت سے تمام اندیشے رفع کردیے۔ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ ان کے اسکولوں کا بھی دورہ کیا۔ الغرض اس نے ثابت کردیا کہ جوزفین کی اولاد اس پر بھروسا کرسکتی ہے۔ اب وہی ان کا سرپرست، ان کا باپ ہے!

☆☆☆

جس عورت کے حصول کے لیے اُس نے زمانے بھر کی مخالفت مول لی تھی، اس کے ساتھ وہ فقط اڑتالیس گھنٹے گزار پایا کہ جنگ کا طبل بج گیا، اٹلی کا مشکل محاذ منتظر تھا، جہاں اسے کڑے امتحان سے گزرنا تھا کہ اس کی فوج کی حالت خاصی خستہ تھی۔

رخصتی کے وقت گوکہ آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔ اس نے جوزفین کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''اگرچہ میں دور جارہا ہوں، لیکن اپنا دل یہیں تمہارے پاس چھوڑے جارہا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں پیارے نپولین۔ جاؤ، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہمارے محافظ ہو!'' جوزفین کی آنکھیں مسکرا رہی تھی۔

اور یوں نپولین دکھی دل لیکن بلند حوصلے کے ساتھ میدانِ جنگ کی جانب چل دیا جہاں آنے والے چند دنوں میں اس نے ایک ایسی جنگ لڑی جس نے پورے یورپ میں برقی رو دوڑا دی۔

مورخین کہنے لگے۔ ''ہم نے یورپ کی ہزار سالہ تاریخ میں نپولین جیسا جنگجو نہیں دیکھا۔''

دلچسپ امر یہ ہے کہ زندگی کی اہم ترین جنگ لڑنے والے نوجوان سپہ سالار کا دل پیرس میں اٹکا تھا۔ وہ ہر روز جوزفین کو خط لکھتا۔ شدتِ جذبات، محبت اور امید سے لبریز خط۔ محاذ سے لکھے نپولین کے چند خط آج بھی محفوظ ہیں، جس میں سے ایک میں اُس نے یوں اپنے جذبات صفحۂ قرطاس پر بکھیرے:

''میری محبوبہ، تم نے مجھے ایک ایسی محبت سے روشناس کروایا، جو میرے ہوش و حواس پر چھا گئی ہے۔ کاش میں میدانِ جنگ چھوڑ کر پیرس لوٹ سکتا، تمہارے قدموں سے لپٹ جاتا۔ تم نے میرے اندر لامتناہی محبت بھر دی ہے، میں ہر وقت وجدانی کیفیت میں رہتا ہوں!''

ایک اور یادگار خطوط کچھ یوں تھا۔

''جاناں! یہ تم ہی ہو... جسے فطرت نے اپنی روح، شائستگی اور اپنا حسن عطا کیا۔ تم... فقط تم میری دل کی ملکہ ہو۔ اور اپنی سلطنت کی حدود اربعہ سے کماحقہ واقف ہو۔ میری جان، میری پیاری!''

اِس نوع کے محبت ناموں کے لیے عورتیں ترستی ہیں، دعائیں کرتی ہیں کہ کبھی عشاق کی جانب اُنہیں بھی اِس ڈھب پر یاد کیا جائے، اور بدلے میں وہ اپنی روح میں دوڑتی توانائی، انگ انگ میں بھری مسرت اُن پر نچھاور کردیں لیکن... شاطر جوزفین کو ان محبت ناموں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اظہارِ عشق کا یہ طریق اُسے بیزار کن لگتا۔ وہ اُن خطوط کو نپولین کا بچپنا گردانتی۔ سچ تو یہ ہے کہ نپولین کے رخصت ہوتے ہی اُس رنگین مزاج عورت نے اپنے پُرانے مشغلوں کا آغاز کردیا تھا۔

وہ اُن خطوط کا انتہائی مختصر جواب دیتی جن میں یہ دعویٰ کرتی کہ وہ بھی اسے بہت یاد کرتی ہے، اُڑ کر اس تک پہنچ جانا چاہتی ہے، لیکن حقیقتاً وہ فقط دکھاوا کررہی تھی۔ قطعی دُکھی نہیں تھی، بلکہ باقاعدگی سے سماجی تقریبات میں شرکت کررہی تھی۔

دوسری جانب اٹلی کے محاذ پر نپولین اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا۔ اس نے جوزفین کو فوراً اٹلی پہنچنے کی ہدایت کی،

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

تا کہ وہ فراق کا غم بھلا کر جنگ پر توجہ دے سکے، تاہم جوزفین کو یہ قطعی گوارا نہیں تھا۔ پیرس میں اُسے پُرآسائش زندگی میسر تھی، جبکہ جنگ کا محاذ اسے بیزار کن لگتا تھا، اِس لیے وہ مختلف بہانے بنا کر اس معاملے کو ٹالتی رہی اور رقص و سرود کی محافل میں شرکت کا سلسلہ جاری رکھا۔

جب نپولین کے تقاضوں میں شدت آنے لگی، وہ منہ بسورتے ہوئے اپنے پُرانے محبوب پال کے پاس پہنچ گئی اور درخواست کی کہ نپولین کو ٹالنے کی کوئی صورت نکالے۔ پال نے پُرانے تعلقات کی بنیاد پر اُس پری پیکر کا ساتھ دیا اور نپولین کو لکھ بھیجا کہ موجودہ حالات میں ایک بہادر اور مخلص سپہ سالار کی طرح اُسے ملکی مفادات پر توجہ دینی چاہیے، بہتر ہے کہ وہ جوزفین کو پیرس ہی میں رہنے دے اور فرانسیسی عوام کو جیت کا تحفہ دے جو اُس سے محبت کرتے ہیں۔

پال کی کوششیں زیادہ عرصے نپولین کو پابند نہیں رکھ سکیں۔ وہ اندر ہی اندر سُلگ رہا تھا۔ جوزفین کو اپنے پہلو میں دیکھنے کی خواہش ہر خواہش پر حاوی آگئی تھی۔

اس نے پال کے خط کو نظر انداز کر دیا، وہ سرکاری حکم نامہ نہیں تھا اور اپنے ایک افسر میورٹ کو یہ ذمّے داری سونپی کہ وہ فوری پیرس جائے اور جوزفین کو ساتھ لے کر لوٹے۔

اپنے سپہ سالار کے حکم پر پیرس پہنچنے کے بعد جس پہلے معاملے سے میورٹ کا سامنا ہوا، وہ جوزفین کے بابت گردش کرتی افواہیں تھیں۔

جب وہ جوزفین سے ملا اور اس کے سامنے نپولین کا حکم پڑھ کر سنایا تو ایک لمحے کے لیے وہ ہڑبڑا گئی لیکن جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس سے قبل کہ میورٹ کا شک یقین میں بدلتا، جوزفین نے بڑے احترام کے ساتھ اسے ظہرانے کی دعوت دے ڈالی جسے سنجیدہ طبع فوجی افسر نے قبول کیا۔ اس نے میورٹ کی خوب آؤ بھگت کی، پُرنم اور رندھی ہوئی آواز کے سہارے اسے یقین دلاتی رہی کہ وہ نپولین سے کتنی محبت کرتی ہے۔

”میں ایک ایک دن گن کر گزار رہی ہوں!“ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

البتہ آخر میں اس چالاک عورت نے یہ کہتے ہوئے ساتھ چلنے سے معذرت کرلی کہ وہ حاملہ ہے۔

”ان حالات میں سفر مناسب نہیں!“ کمالِ مہارت سے اس نے چہرے پر نقاہت کی سیاہی بکھیر دی۔ ”میری درخواست ہے نوجوان میورٹ کہ تم میرے شوہر کو یہ خوشخبری سنا دینا!“

جب محاذ پر لوٹ کر میورٹ نے اپنے افسر اعلیٰ کو یہ اطلاع دی تو وہ مسرت سے بھر گیا لیکن یہ مسرت عارضی ثابت ہوئی۔

دراصل چند ہی ہفتوں بعد میورٹ کو پھر کسی کام سے پیرس جانا پڑا اور اِس بار اس کا شک یقین میں بدل گیا کیونکہ اُس نے خود ایسی چند تقریبات میں شرکت کی، جن میں جوزفین جانِ محفل بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی طور حاملہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ محاذ پر لوٹنے کے بعد اس نے بڑے ہی نپے تلے الفاظ میں نپولین کو یہ بتا دیا کہ پیرس میں جوزفین کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں گردش کر رہی ہیں۔

”یہ خیال عام ہے کہ وہ آپ کو بیوقوف بنا رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میورٹ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

نپولین آگ بگولا ہوگیا۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اس نے محاذِ جنگ چھوڑ کر پیرس جانے کا اعلان کر دیا۔

فوج میں موجود پال کے حامیوں نے فوراً ہی یہ اطلاع پیرس بھجوا دی۔ پال کے سیاسی مفادات جنگ سے وابستہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نپولین ہی وہ واحد شخص ہے جو یہ جنگ جیت سکتا ہے، سو اس نے جوزفین کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی عیاشیاں ترک کرتے ہوئے فوراً رختِ سفر باندھے۔

بادل ناخواستہ جوزفین نے نپولین کو ایک محبت بھرا خط لکھ ڈالا: ”جاناں، میں تمہارے پاس آرہی ہوں!“

پال کے منصوبے کے عین مطابق خط وصول کرنے کے بعد نپولین نے پیرس لوٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنی بیوی کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنی قیام گاہ میں وہ تمام انتظامات بھی کروا دیے، جن کی حاملہ عورت کو ضرورت پڑ سکتی ہے کیونکہ اُس کے اندازے کے مطابق زچگی کے دن قریب تھے۔ لیکن جب جوزفین سامنے آئی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اِس سے قبل کہ محبت کا مارا وہ شخص کوئی سوال کرتا، شاطر جوزفین نے آنکھوں میں آنسو لیے اُسے مطلع کیا۔

”میرے محبوب، میں کیسے بیان کروں کہ یہ دکھ عظیم تر ہے... میں اسقاط حمل کے عذاب سے گزری... اور ہم وارث سے محروم ہوگئے... شاید قدرت کو یہی منظور تھا!“

معصوم نپولین کے لیے یہ خبر شدید صدمے کا باعث بنی، وہ کئی گھنٹے گُم صم رہا لیکن پھر جوزفین کے شیریں لہجے، چمکتی آنکھوں اور گداز بدن نے اس کے سوختہ دل پر ایسا

مرہم رکھا کہ وہ سکون کی وادی میں اُتر گیا۔

☆☆☆

اٹلی میں نپولین نے شان دار فتوحات حاصل کیں، پیرس واپسی پر اُس کا استقبال ایک ہیرو کے مانند ہوا۔ ہر کوئی اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا لیکن اِس دیوانے کو تو فقط ایک ہستی کی نوازشات درکار تھیں، اور وہ تھی جوزفین!

پیرس میں قیام کے زمانے میں جوزفین نے خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اپنے شوہر کا بھرپور خیال رکھا۔ اُسے مسرت سے ہم کنار کیا۔

اُن دنوں پیرس میں مصر کی مہم زیرِ بحث تھی جس کا مقصد ہندوستان تک رسائی حاصل کر کے انگلستان پر کاری ضرب لگانا تھا۔

پال جانتا تھا کہ جنگ کے عشق میں مبتلا نپولین ایک محفل میں اِس مہم کی قیادت کی خواہش کا اظہار کر چکا ہے۔

”اِس وقت نپولین اپنے عروج پر ہے۔ بہتر ہے اُس سے جتنا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، اُٹھا لیا جائے!“ اس نے خود سے کہا اور فوراً نپولین کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

1798ء میں فرانسیسی فوج نے جوش سے بھرے نپولین کی قیادت میں مصر کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

شوہر کے پیرس چھوڑتے ہی جوزفین اپنی پُرانی جون میں لوٹ آئی۔ وہی دعوتیں، رقص و سرود کی محافل، موج مستی!

اُس نے یہ سب اِس قدر شدت سے انجام دیا کہ پیرس کی اشرافیہ میں بے چینی پھیلنے لگی۔ کئی افراد نے اسے متنبہ کیا کہ وہ احتیاط کرے۔ پال نے بھی اُسے اپنے اندیشوں سے آگاہ کیا۔ ”اِن بے لگام سرگرمیوں کی خبر نپولین تک پہنچ سکتی ہے۔“

لیکن اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی!

یہ 19 جولائی 1798ء کی گرم دوپہر تھی، جب نپولین کی قیادت میں مصر کی جانب پیش قدمی کرتی فرانسیسی فوج نے پیرس کی سمت سے ایک مشکوک گھڑ سوار کو آتے دیکھا۔ قریب آنے پر اُس نے اپنی شناخت کروائی اور نپولین کے دستِ راست جنرل جوناٹ کے خیمے میں داخل ہوگیا۔

کچھ دیر بعد جوناٹ چہرے پر تذبذب اور تاسف لیے خیمے سے برآمد ہوا اور نپولین کے خیمے کی جانب بڑھنے لگے۔

نپولین کا سیکریٹری بوریَنی اندیشوں میں لپٹا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد نپولین اور جوناٹ خیمے سے باہر نکلے اور سپاہیوں سے کچھ دُور جا کر کھڑے ہوگئے۔ بوریَنی فاصلے کے باعث اُن دونوں کی گفتگو تو نہیں سن سکا لیکن اس نے صاف محسوس کیا کہ نپولین کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے، آنکھوں میں وحشت سمٹ آئی ہے۔

جب جوناٹ اور اس کے درمیان مکالمے کا اختتام ہوا، نپولین خستہ حالی کی تصویر بنا چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا بوریَنی کی جانب بڑھنے لگا۔ اپنے سیکریٹری کے قریب پہنچتے ہی وہ چلّایا۔

”بوریَنی تم مجھ سے وفادار نہیں ہو... اگر وفادار ہوتے تو مجھے حقیقت سے آگاہ کرتے۔ تمہیں ایک سچے دوست کا کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ جوناٹ کی مانند!“

بوریَنی کی آنکھوں میں تذبذب تھا۔ وہ خاموش رہا۔

نپولین نے آگے بڑھ کر اسے کاندھے سے پکڑ لیا۔

”جوزفین... میں اور وہ ابھی کوسوں دور ہیں... تم مجھے بتا سکتے تھے کہ وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے... بولا، کیا یہ تمہارا فرض نہیں تھا؟“

”میں نے سوچا کہ شاید آپ...“ بوریَنی نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن نپولین نے بات کاٹ دی۔

”شاید میں تمہاری بات کا یقین نہیں کروں... کیونکہ میں اُس کے سحر میں مبتلا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟“ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ ”لیکن تمہیں مجھے خبردار تو کرنا چاہیے تھا، ایک سچے دوست کی طرح! اور جہاں تک جوزفین کا تعلق ہے... طلاق... یہی واحد حل ہے... اعلانیہ طلاق...“

بوریَنی کا خیال تھا کہ جوناٹ نے ذاتی مفادات کے پیشِ نظر اِس معاملے کو بڑھا چڑھا کر نپولین کے سامنے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اتنا آگ بگولا ہوگیا ہے لیکن وہ غلط تھا۔

جنرل جوناٹ نے جو کچھ نپولین کو بتایا تھا وہ من و عن سچ تھا۔

جب دیگر ذرائع سے بھی جوناٹ کی بیان کردہ کہانی کی تصدیق ہوگئی، نپولین کے سوختہ دل نے ایک آہ سرد بھری۔ اُس کے عشق میں ٹھہرے ہوئے پانی کا سکوت آگیا۔ یہی وہ موقع تھا، جب محبت کا شدید جذبہ انتقام کی

www.paksociety.com

خواہش میں بدلنے لگا۔ وہ انسان سے ایک ''قصاب'' کے روپ میں ڈھلنے لگا۔

''جس طرح اس ظالم نے میرا دل چھیل ڈالا، میں بھی اس کی روح کو لہولہان کر دوں گا۔'' نپولین نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ ٹھیک اپنی عیاش محبوبہ کی جون میں ڈھلتا جا رہا تھا، اُس کے مانند عشق لڑانے کے منصوبہ ترتیب دے رہا تھا۔ اور اُس نے ایسا کیا بھی۔ مصر کے محاذ پر ایک بار اُس نے ایک مصری دوشیزہ کو اپنے دفتر میں چائے پر مدعو کرلیا اور گھنٹوں تنہائی میں اُس سے رومانوی گفتگو کرتا رہا۔

کسی نہ کسی طرح یہ اطلاع پیرس میں بیٹھی جوزفین کو مل گئی کہ اُس کا شوہر اب غیر عورتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ بہت سیخ پا ہوئی۔ شکایت سے بھرا ایک خط لکھا، جس پر آنسوؤں کی سیاہی گرائی۔ نپولین کو اُس کا وعدہ یاد دلایا.... اُس جینے مرنے کے عہد کا تذکرہ کیا جو شادی سے قبل نپولین نے باندھا تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

نپولین دنیا کے لیے ایک سخت دل آدمی تھا لیکن جوزفین کے لیے اُس کے دل میں فقط محبت تھی۔ خط پڑھنے کے بعد وہ تذبذب کا شکار ہوگیا اور سوچنے لگا کہ جو کچھ جوناٹ نے بتایا کہیں وہ جھوٹ تو نہیں؟

ازدواجی محاذ کے ساتھ جنگی محاذ پر بھی اُسے شاید مشکلات کا سامنا تھا۔ فرانسیسی فوج نے خشکی پر تو فتح حاصل کر لی تھی، لیکن لارڈ نیلسن کی قیادت میں دریائے نیل کے محاذ پر برطانوی بیڑے نے فرانسیسی بیڑے کو تباہ کر دیا تھا اور پیرس میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ مصر میں فرانسیسی فوج کو شکست ہوگئی ہے۔

1799ء میں جب فرانسیسی فوج مصر کے محاذ پر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی، نپولین نے اچانک پیرس لوٹنے کا فیصلہ کرلیا۔

اُس نے ایسا کیوں کیا، کوئی نہیں جانتا؟ لیکن عام خیال ہے کہ اسے چند مستند ذرائع سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ جوزفین اُس کی دولت دونوں ہاتھوں سے اپنے نوجوان عاشقوں پر لٹا رہی تھی۔

جب جوزفین کو یہ خبر ملی کہ نپولین پیرس کے لیے رختِ سفر باندھ چکا ہے، اسے پریشانیوں نے گھیر لیا۔

اب تک تو جوزفین یہی سمجھ رہی تھی کہ نپولین عشق کے معاملات میں کچا ہے، وہ ہمیشہ اس کی مٹھی میں رہے گا لیکن وہ بھول گئی تھی کہ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اب اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے نپولین کو سمجھنے میں غلطی کی۔

''کیا وہ پیرس پہنچتے ہی مجھے طلاق دے دے گا؟'' یہ خدشہ اُسے پاگل کیے جا رہا تھا۔ مستقبل اسے تاریک نظر آ رہا ہے لیکن وہ جلد ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔

جس دن نپولین کا بحری جہاز بندرگاہ پر لگنا تھا، جوزفین اپنی بیٹی ہارٹینس کے ساتھ بن ٹھن کر، ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے بندرگاہ پہنچ گئی، تاکہ کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اُسے قائل کر لے کہ وہ آج بھی اُسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔

شاطر جوزفین کی یہ کوشش ناکام گئی۔ نپولین کا جہاز کسی اور بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یوں اُسے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے شہر لوٹنا پڑا جہاں ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا۔ نپولین اس کی شہر واپسی سے قبل اپنے گھر پہنچ گیا تھا جہاں اُس نے خود کو خواب گاہ میں بند کرلیا تھا۔

چالاک جوزفین کے لیے وہ عجیب صورتِ حال تھی۔ خواب گاہ کے دروازے کے اُس طرف نپولین تھا جو اُس سے بات کرنے کو تیار نہیں تھا، اور دوسری جانب وہ کھڑی تھی، پریشان، اندیشوں میں گھری ہوئی۔

اس نے دروازہ پیٹا۔ نپولین کو منانے کی کوشش کی۔ پھر دھمکی دی، طعنے دیئے کہ وہ مصر میں گل چھرّے اُڑاتا رہا اور وہ یہاں اُس کے انتظار میں تڑپتی تھی... لیکن نپولین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر معاملہ فہم ہارٹینس کو دروازے پر دستک دینی پڑی جسے نپولین حقیقی باپ کی طرح چاہنے لگا تھا۔ اس نے گڑگڑاتے ہوئے دروازہ کھولنے کی درخواست کی۔

دروازہ کھل گیا۔ ہارٹینس اندر داخل ہوئی، لیکن جوزفین کو داخلے کی اجازت نہیں ملی۔ اُسے باہر ہی انتظار کرنا پڑا۔

کچھ دیر بعد جب ہارٹینس کمرے سے برآمد ہوئی، اُس کی آنکھوں میں اپنی ماں کے لیے ناپسندگی تیر رہی تھی۔

''تمھیں شکر ادا کرنا چاہیے۔ وہ تمھیں طلاق نہیں دے گا۔'' اس کے لہجے میں ترس و تاسف کی لہریں تھیں۔ ''لیکن اس نے ایک پیغام بھجوایا ہے۔ کہا ہے، تم نے اُس کے دل کو ذبح کر دیا اور اب وہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر پائے گا۔''

وہ جوزفین کی زندگی کا سب سے جذباتی لمحہ تھا۔ وہ آزردہ تھی۔ اور اُسی آزردگی سے پشیمانی نے جنم لیا۔

''کیا کوئی انسان اتنا عظیم ہوسکتا ہے؟'' اُس نے خود سے سوال کیا۔ فرطِ جذبات سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہارٹینس تو چلی گئی لیکن وہ وہیں دروازے کے پہلو میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور نہ جانے کب تک یونہی بیٹھی رہی۔

اُس روز پشیمانی کے بوجھ تلے وہ قلب ماہیت کے عمل سے گزری۔ بدل گئی، جس شخص کو کل تک وہ بیزار کن اور بیوقوف خیال کرتی تھی، اُس کے لیے جوزفین کے دل میں گداز محبت پنپنے لگی۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل وہ پوری طرح نپولین کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اُس سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور اب ایک نئی کہانی شروع ہونے والی تھی!!

☆☆☆

بے شک نپولین نے اُسے طلاق نہیں دی، گھر سے بے دخل نہیں کیا لیکن اب صورتِ حال یکسر بدل چکی تھی۔ وہ عزم کر چکا تھا کہ اپنی ظالم بیوی کو اُسی ہتھیار سے زخمی کرے گا جس نے اُس کے دل میں چھید کیے ہیں۔

آنے والے چند دن وہ عورتوں میں گھرا رہا۔ اس کی عیاشیوں کے قصّے شہر میں گردش کرنے لگے۔ ہر رات وہ اپنی محبوبہ بدلتا۔ دوسری جانب جوزفین دھیرے دھیرے سماجی سرگرمیوں سے دور ہو رہی تھی۔ اُس کے رابطے محدود ہوتے گئے۔

الغرض جوں جوں نپولین ایک بے وفا شوہر کے روپ میں ڈھلتا گیا، وہ ایک باوفا بیوی بنتی گئی۔

ہر رات نپولین نشے میں دھت گھر لوٹتا لیکن جوزفین خاموش رہتی۔ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی۔

گوکہ اب وہ پہلے کے مانند جوزفین سے محبت نہیں کرتا تھا لیکن اُس نے کسی موقع پر اُس سے بدسلوکی نہیں کی، تذلیل نہیں کی۔ خصوصاً وہ جوزفین کے بچوں پر تو بہت مہربان تھا۔ ہارٹینس کی شادی اُس نے اپنے چھوٹے بھائی لوئس سے کر دی تھی اور وہ اُن کا ہر ممکن خیال رکھتا تھا۔

اِس عرصے میں سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ نپولین کے مصر کے محاذ سے یوں اچانک لوٹ آنے کے فیصلے کو حکومت کی جانب سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لیکن اُس وقت حکومتِ فرانس اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُسے سزا نہیں دے سکی۔ وہ تاحال عوام میں مقبول تھا۔

جوں جوں حکومت اپنی طاقت کھو رہی تھی، فوجی

اطہر نفیس کو اس کے ہم جماعت کنور جی کہتے تھے۔ کیونکہ اطہر اپنے نام کے ساتھ کنور ضرور لکھتا تھا، کنور اطہر علی خاں!

بچپن ہی سے اطہر حسن پرست تو تھا ہی، نویں جماعت میں پہنچا تو ایک ہندو دوشیزہ اس کے دل کو بھا گئی۔ اس دوشیزہ کا گھر حکیم کی سرائے میں تھا۔ رسل گنج سے بارہ دری کی طرف جاتے ہوئے رستے میں حکیم کی سرائے پڑتی تھی۔ پہلے تو وہ اطہر کو طرح دیتی رہی کہ ابھی بچہ ہے، تاکتا ہے تو تاکا کرے مگر کچھ روز بعد جب اطہر کی خاموش نگاہوں نے اسے پیغامِ عشق دینا شروع کیا تو وہ چونک اُٹھی۔ وہ ان نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ بڑی بڑی شربتی آنکھوں والی گوری چٹی اور دراز قد وہ ہندو دوشیزہ اطہر سے تقریباً تین سال بڑی تھی۔ سولہ کے سن کی تھی اور جوانی اس پر ٹوٹ کے برسی تھی۔

اطہر اسے عجیب بے خودی کے عالم میں دیکھتا اور دیکھے ہی جاتا۔ وہ مندر جا رہی ہوتی تو اطہر اس کے پیچھے پیچھے چلتا، لوٹتی تو سائے کی طرح ساتھ ہوتا۔ دریچے میں کھڑی ہوتی تو اطہر اسے سامنے کھڑا نظر آتا، پاس پڑوس میں کسی کے گھر جا رہی ہوتی تو اطہر کی نگاہیں اس کے تعاقب میں ہوتیں۔ اس طرح سے وہ عشق پروان چڑھ رہا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان بھر میں ہندو مسلم فسادات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ کسی بھی وقت علی گڑھ میں بھی فساد کی آگ بھڑک سکتی تھی۔ معلوم نہیں اطہر کو یہ احساس ہوا یا پھر اس ہندو دوشیزہ کے توہین آمیز الفاظ نے اس کا دل توڑ دیا۔ بہر حال پھر اس نے ان شربتی آنکھوں کا تصور تو بارہا کیا مگر ان کے قریب نہ گیا۔ اس کے باوجود اطہر اسے بھول نہ سکا۔

اک شکل ہمیں پھر بھائی ہے، اک صورت دل میں سمائی ہے
ہم آج بہت سرشار سہی پر اگلا موڑ جدائی ہے

اور پھر جدائی کا یہ موڑ اگلے سال ہی آ گیا۔ اطہر نے مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول سے میٹرک کر لیا تھا اور ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ اسے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے گلی کوچے چھوڑ کر اور ایک بت کافر کو بھلا کر پاکستان کے لیے ہجرت کرنا پڑی۔ اس وقت اطہر کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ اتنی سی عمر میں اس نے ناکام عشق کا مزہ چکھ لیا تھا۔

اقتباس: شہید عشق، اطہر نفیس
مرسلہ: خالق بھٹی، اللہ آباد

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

افسران کی قوت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اسی عرصے میں معروف سیاست داں راجر ڈیکوس اور فرانسیسی چرچ کے بااثر ترین شخص ابی سیز نے اُس سے رابطہ کیا، جو آئینی حکومت کے خلاف ایک انقلاب کا منصوبہ ترتیب دے رہے تھے۔ نپولین فوراً اُس کا حصہ بن گیا۔ یہ منصوبہ ایک نئی حکومت کے قیام پر منتج ہوا، جو ''حکام ثلاثہ'' یعنی نپولین، ابی سیز اور ڈیکوس پر مشتمل تھی۔

گہما گہمی کے ان دنوں میں جوزفین کی بے لوث خدمت کے طفیل وہ زخم تو مندمل ہونے لگا جو اُس کی بے وفائی سے نپولین کے دل پر لگا تھا لیکن جلد ہی ایک اور مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ نپولین ایک وارث چاہتا تھا لیکن اس معاملے میں جوزفین اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ وہ ماں بننے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔

فرانس پر ایک تکون کی حکومت تھی۔ ابتدا میں خیال کیا جارہا تھا کہ ابی سیز اِس تکون کا سربراہ ہوگا لیکن نپولین نے جلد ہی اپنے سیاسی حریفوں پر برتری حاصل کرلی اور بڑی سبک رفتاری سے اقتدار پر قابض ہونے کا عمل انجام دیا۔ اگرچہ نئی حکومت نے تفصیلی آئین اپنایا لیکن یہ محض عسکری آمریت کو جمہوری روپ دینے کا ڈھونگ تھا۔

یوں تولون کے محاصرے کے محض چھ سال بعد جب اُس کی عمر تیس برس تھی، وہ فرانس کا غیر متنازعہ حکمران بن گیا۔

سیاسی پیچیدگیاں تو اس نے سلجھا لیں، لیکن گھریلو پریشانیوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ سبب جوزفین ہی تھی جس کے خلاف اب نپولین کے اہلِ خانہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس معاملے میں اس کی بہنیں پیش پیش تھیں، جو تعلیم، تہذیب اور اخلاقیات سمیت کسی بھی میدان میں جوزفین کا مقابلہ کرنے سے خود کو قاصر پاتی تھیں۔

چند برس پہلے تک جب جوزفین نپولین کے دل کی حکمران تھی، وہ دبی دبی رہتیں اور نجی محافل میں اُسے ''بوڑھی عورت'' کہہ کر مذاق اُڑاتیں، لیکن اب حالات اپنا رُخ بدل چکے تھے۔ جوزفین اپنے شوہر کے دل پر مزید قابض نہیں رہی تھی، سو اُنہوں نے اپنے بھائی کے کان بھرنے شروع کردیے۔ وہ استہزائیہ انداز میں نپولین سے کہتیں۔

''اس بوڑھی سے جان چھڑاؤ، جو تمہیں وارث دینے کے قابل نہیں!''

یہ جملے نپولین کو کاٹ ڈالتے۔ بے شک وہ اپنی محبوبہ سے ناراض تھا لیکن اُسے اندازہ تھا کہ وہ اب بدل چکی ہے، اُسے چاہنے لگی ہے اور وہ اس تبدیلی کا احترام کرتا تھا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جوزفین ایک بہترین مشیر ہے، سماجی تقریبات کے انعقاد کا وسیع تجربہ رکھتی ہے، گفتگو کے فن میں بھی طاق ہے اور ایسی عورت اُسے پھر نہیں ملے گی۔ لیکن اہلِ خانہ کا تقاضا بڑھتا جارہا تھا جو جوزفین سے شدید نفرت کرتے تھے۔

اسی عرصے میں نپولین کے چھوٹے بھائی لوئس (جس کی شادی اُس نے اپنی سوتیلی بیٹی سے کردی تھی) کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ کچھ دوستوں کے اصرار پر کچھ اپنی خوشی کے تحت اُس نے نومولود کو اپنا وارث قرار دے دیا۔

اِس اعلان کے بعد جوزفین کے مخالفین کے ہاتھ ایک جواز آگیا۔

''اب تو تمہیں وارث مل گیا... اب اِس بوڑھی سے جان چھڑاؤ!'' ایک بہن نے مشورہ دیا۔

''دیکھو دوست۔ لوئس تمہارا بھائی ہے۔ اُس کے بیٹے کو تم اپنا بیٹا قرار دیتے ہو، لیکن وہ تمہارا حقیقی بیٹا تو نہیں۔ ابھی تمہارے سامنے زندگی پڑی ہے۔ دوسری شادی کرلو!'' ایک دوست نے سمجھایا۔

جوزفین کو اپنے خلاف بُنی جانے والی سازشوں کا علم تھا اور وہ حتیٰ الامکان کوشش کررہی تھی کہ نپولین کسی انتہائی فیصلے سے باز رہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت نپولین کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اپنے سیاسی مخالفین کو شکست دینے، سرحد پر منڈلاتے خطرات کا قلع قمع کرنے پر مرکوز تھی۔ اور اِسی گہما گہمی میں دسمبر 1804ء آن پہنچا جب نپولین کی عسکری قوت اتنی بڑھ گئی کہ اُس نے خود کو فرانس کا شہنشاہ قرار دیتے ہوئے پوری طرح اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اور وہ بارسوخ افراد، جنھوں نے چند برس قبل یہ سوچ کر اسے انقلاب فرانس کا حصہ بنایا تھا کہ وہ اُن کے اشاروں پر ناچتا رہے گا، منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

اب نپولین سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اتنا پُرقوت تھا کہ کوئی اس کے خلاف سازش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اتنا ظالم تھا کہ دشمن اس سے پناہ مانگتے تھے۔

جب سیاسی پریشانیوں سے نجات حاصل کرلی تو وہ ازدواجی اُلجھنوں کی جانب متوجہ ہوا۔

جوزفین کو علم تھا کہ کسی بھی وقت اُسے رخصت کرنے کا اعلان ہوسکتا ہے لیکن وہ اِس ضمن میں خود کو بے بس پاتی تھی۔ لیکن پھر... قدرت نے عجیب ڈھنگ سے اُسے ایک موقع فراہم کیا۔

دراصل تاج پوشی کے رسم کے لیے نپولین نے رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ کی حیثیت سے پوپ کو فرانس مدعو کیا تھا۔ جس روز پوپ فرانس پہنچا جوزفین کو اپنے محبوب سے وابستہ رہنے کا طریقہ سوجھ گیا۔

وہ آنکھوں میں محبت لیے، وہ لباس زیب تن کیے جو چند برس قبل نپولین نے اُسے تحفے میں دیا تھا، اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''میرے پیارے شوہر، میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں!'' اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''کہو!'' نپولین نے گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لیا۔ سوچا، جوزفین آج بھی بہت حسین ہے۔

''ہماری شادی کو نو برس ہوگئے ہیں۔ اے جری سپہ سالار، تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے چرچ میں شادی نہیں کی تھی، سول کورٹ میں کی تھی؟''

''مجھے یاد ہے!'' نپولین نے کہا۔

''کلیسا ایسی شادیوں کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں تو ہم ان برسوں میں گناہ کرتے رہے۔ میں سوچ رہی تھی... اب جبکہ پوپ یہاں ہے، ہم اپنی شادی کو مذہبی حیثیت دے دیں... میرے دل کی دھڑکن، میری بات کا بُرا مت منانا، حتمی فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے!''

جوزفین نے سنگ دل نپولین کو پگھلانے کی ایک کوشش کی تھی اور اِس حد کامیاب رہی تھی کہ اُس نے اپنے شوہر کو تذبذب میں ڈال دیا تھا... اس کے دل میں شادی کو مذہبی حیثیت دینے کے خیال کا بیج بو دیا تھا۔

بے شک طلاق کی بابت سوچنا نپولین کے لیے ناممکن ہوگیا تھا، لیکن عشق لڑانے کی خواہش اُسے متحرک رکھے ہوئے تھی۔

اُن دنوں الزبتھ نامی ایک قاتل حسینہ اُس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی، جسے نپولین نے کچھ ہی عرصے قبل ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا تھا۔

پھر... ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ٹھیک تاج پوشی والے روز رسم کے ادائیگی سے قبل جوزفین نے الزبتھ اور نپولین کو ایک نیم تاریک کمرے میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑلیا۔

اُس لمحے احتیاط کا دامن جوزفین کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ آگ بگولا ہوگئی۔

یہ درست ہے کہ وہ خود بھی ایک عرصے تک نپولین کو دھوکا دیتی رہی تھی لیکن اب وہ ایک مخلص بیوی تھی، اپنے شوہر کا دل جیتنے کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی تھی، ایسے میں اُسے توقع تھی کہ نپولین کی جانب سے بھی مثبت جواب آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جذبات کی شدت سے لرزتی جوزفین نے اپنے شوہر اور اُس کی نوخیز محبوبہ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اس وقت تک چلّاتی رہی جب تک الزبتھ آنکھوں میں آنسو لیے کمرے سے چلی نہیں گئی۔

شہنشاۂ فرانس اِس طرح اپنی جاسوسی کرنے پر بہت سیخ پا ہوا۔ اُس نے جوزفین کو بے نقط سنائی۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اب وہ اُسے طلاق دے کر ہی رہے گا۔

نپولین کی سوتیلی بیٹی اس وقت محل ہی میں موجود تھی۔ اُسے پورے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ فوراً دوڑی دوڑی پہنچی اور نپولین سے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ اِس معاملے پر غور کرنے کی درخواست کی۔

''اس موقع پر یہ مناسب نہیں ہے شہنشاہ!'' اُس نے بڑے احترام سے نپولین کی پوشاک کے دامن کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تاج پوشی میں چند ہی لمحات باقی ہیں، اِس معاملے کو پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھیں!''

ہارٹینس یہ کہہ چلی گئی۔ اب کمرے میں نپولین اور جوزفین رہ گئے، جو بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کمرے میں جوزفین کی ہچکیاں گونجنے لگیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، جنھوں نے نپولین کو پگھلا دیا۔ اُس نے اپنا فیصلہ مؤخر کردیا۔ 2 دسمبر 1804ء کو نپولین کے سر پر تاج رکھ دیا گیا جس کے فوراً بعد اُس نے جوزفین کے سر پر تاج رکھتے ہوئے اُسے اپنی ملکہ قرار دے دیا۔

آنے والے دنوں میں چند ایسے اشارے ملے، جس سے اس خیال کو تقویت ملنے لگی کہ نپولین کے دل میں جوزفین کے لیے پھر محبت جاگ اُٹھی ہے۔

وہ اُسے دوبارہ اہمیت دینے لگا تھا، اُس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ جوزفین نے بھی اُس کی محبت کا بھرپور جواب دیا۔ ہر محاذ پر اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی رہی۔ اس کی حمایت

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کی۔ عوام کی سطح پر بادشاہ کی مثبت شبیہہ پیش کرنے کے لیے کئی مفید مشورے دیے۔ الغرض وہ پھر دھیرے دھیرے قریب آنے لگے تھے۔

☆☆☆

سیاسی طور پر حالات بگڑ رہے تھے!

نپولین نے اپنے بھائیوں کو یورپی ریاستوں میں تعینات کر دیا تھا۔ اِس فیصلے پر فرانس میں خاصی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ بدقسمتی سے 1805ء میں ٹرافلگر کی زبردست جنگ میں انگلستان کے بحری بیڑے کو فرانسیسی فوج پر نمایاں فتح حاصل ہوگئی جس کے بعد پانیوں پر انگلستان کی حکم رانی مسلم ہوگئی۔ چند برسوں بعد نپولین نے فرانس کو جزیرہ ہائے ابرین کے ساتھ طویل جنگ میں اُلجھا دیا۔

اُن ہی دنوں نپولین نے روس کے زار سے مل کر ٹلسٹ معاہدے کے تحت دوستی کا پیمان باندھا لیکن یہ اشتراک دھیرے دھیرے شکست وریخت کا شکار بنتا جا رہا تھا۔

مشکل کے اُس دور میں ایک وفاشعار بیوی کے مانند جوزفین نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کی غم گسار بنی رہی، اُسے خوشی فراہم کرنے میں جُتی رہی۔

اِسے حالات کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ نپولین کا طبیب ہی اُس کی اصل بیماری تھا۔ جوزفین نپولین کے دُکھ کا بنیادی سبب تھی کیونکہ وہ اب تک اُسے وارث نہیں دے سکی تھی۔ یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ نپولین دوسری شادی کر لیے۔ نپولین سخت دباؤ میں تھا لیکن جوزفین کی محبت اُسے انتہائی فیصلے سے باز رکھتی۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اُن کی جدائی پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔

1807ء میں جوزفین کا نواسا نپولین چارلس بونا پارٹ جسے فرانس کے تخت کا وارث قرار دیا گیا تھا، فقط چار برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

اِس سانحے نے نپولین کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔ اب اُسے شدت سے یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں وہ بے وارث نہ رہ جائے۔

اِس سانحے نے جوزفین کے مخالفین کو پھر متحرک کر دیا۔ اُنہوں نے مختلف ریاستوں کی اُن شہزادیوں کی فہرست مرتب کرنی شروع کر دی جو فرانس کی اگلی ملکہ بن سکتی تھیں۔

نپولین کے لیے یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ وہ جتنا سوچتا، اتنا اُلجھتا جاتا۔ اُس نے اِس معاملے کو ٹالنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔

بالآخر نومبر 1809ء کی ایک رات، عشائیے کے بعد جوزفین کا ہاتھ تھام کر رندھی... آواز میں دُکھی نپولین نے اُسے مطلع کر دیا۔

''جاناں، فرانس کے عظیم تر مفاد کے پیشِ نظر مجھے تمہیں طلاق دینی پڑے گی، مسیحی عقیدے کے مطابق پہلی بیوی کو طلاق دیے بغیر میں دوسری شادی نہیں کر سکتا!''

اِن حزنیہ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی الم میں ڈوبی ایک چیخ کمرۂ ضیافت میں گونجی۔

''میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاؤں گی!'' جوزفین کی آواز لرز رہی تھی۔

نپولین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے شک وہ بھی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن اب کوئی چارہ نہیں تھا۔

دوسرے روز جوزفین اپنے ملازمین کی معیت میں محل سے رخصت ہوگئی۔ جب اُس کی بگھی محل کے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی، بے روح نپولین کھڑکی میں کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ایک رقعہ تھا، جو جوزفین نے اُس کے نام لکھا تھا:

''میری جان، میرے محبوب، میری روح... میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ تم دوسری شادی کر لو، فقط اس امید پر کہ فرانس کو اس کا وارث مل سکے!''

نپولین کی آنکھوں میں نمی تھی۔ دوسری جانب بگھی میں جوزفین کی ہچکیاں لرز رہی تھیں۔

☆☆☆

گو کہ آنے والے چند دنوں میں جوزفین ملکۂ فرانس ہی کی حیثیت سے تقریبات میں شرکت کرتی رہی، لیکن یہ بات سب کے علم میں تھی کہ نپولین اُسے طلاق دینے کا حتمی فیصلہ کر چکا ہے۔

شاہ فرانس روس کے زار کی بہن سے شادی کرنے کا منصوبہ ترتیب دے رہا تھا۔

اِس فیصلے سے کئی سیاسی مفادات وابستہ تھے لیکن بدقسمتی سے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ جس کا بنیادی سبب نپولین کا وزیرِ خارجہ ٹالیرینڈ تھا جو فرانس اور روس کے الحاق کے سخت خلاف تھا۔ اُس نے بڑی چالاکی سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ زار کی جانب سے نپولین کا رشتہ مسترد کر دیا گیا۔ اِس بے عزتی نے نپولین کو حواس باختہ کر دیا اور چند برس بعد مسترد کیے جانے کے اِسی احساس سے ایک عظیم

جنگ پھوٹی۔

روس سے مایوس ہونے کے بعد وہ آسٹریا کی جانب متوجہ ہوا جس کی فوجیں ماضی میں نپولین کے ہاتھوں کئی بار شکست کا ذائقہ چکھ چکی تھیں۔ اس نے فرینسز اول سے اُس کی بیٹی شہزادی میری لوئی کا رشتہ مانگ کر پورے آسٹریا کو تذبذب میں ڈال دیا۔ اہلِ آسٹریا نپولین سے سخت نفرت کرتے تھے کیونکہ اُس قسائی نے ان کے ہزاروں نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ میری لوئی بھی اُسے جلاد تصور کرتی تھی، دعائیں مانگا کرتی تھی کہ وہ نپولین کی دلہن نہ بنے لیکن اُس کے مجبور باپ نے ہامی بھر لی تھی۔

بعد کے برسوں میں نپولین اُس شخص کو کوستا رہا جس نے میری لوئی کا نام تجویز کیا تھا کیونکہ وہ اُس کی قربت میں نپولین کو سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آیا۔

بہرحال، جب آسٹریا کے شاہی خاندان کی جانب سے یہ خبر موصول ہوئی کہ وہ رشتے کے لیے تیار ہیں، نپولین کو گہرے دُکھ نے آن گھیرا کہ اب اُسے جوزفین کو ہر صورت طلاق دینی تھی۔

بالآخر 10 جنوری 1810ء کی گرم دوپہر فرانسیسی تاریخ کی اُداس ترین تقریب منعقد ہوئی، جس میں طلاق کا اعلان کر دیا گیا۔

اس روز ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار نپولین اور جوزفین انتہائی افسردہ تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طلاق کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے دونوں ہی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

یاسیت سے پُر اس کارروائی کے اختتام پر نپولین نے جوزفین کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میں تمہیں بھول نہیں پاؤں گا!''

غم زدہ جوزفین مسکرائی۔ ''میں مرتے دم تک تم سے محبت کرتی رہوں گی!''

اور دونوں دُرست تھے کہ جدائی کے اُس لمحے وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے کے آرزومند تھے، اپنی کتاب زیست میں ایک نئی کہانی لکھنے کے خواہش مند تھے، لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا!

نپولین ایک ہفتے تک اپنے محل میں گم صم بیٹھا تھا۔ نہ تو کچھ کھاتا پیتا، نہ ہی کسی سے بات کرتا۔ بس خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ دوسری جانب جوزفین نے بھی خود کو ماتمی لباس تک محدود کر لیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اُن اُداس دنوں میں وہ ایک دوسرے کی طلب میں تڑپتے رہے۔

نپولین کی ہدایت کے مطابق آنے والے برسوں میں جوزفین کو ملکہ والی تمام مراعات حاصل رہیں... اور وہ اِس کی حقدار بھی تھی۔ نپولین کے دل کی ملکہ تو وہی تھی!

چند ماہ بعد نپولین نے میری لوئی سے شادی کر لی جس نے اس کی زندگی عذاب بنا دی۔

جہاں تک جوزفین کا تعلق ہے، بعد کے برسوں وہ پیرس ہی کے نزدیک ایک پُرشکوہ محل میں مقیم رہی۔

مارچ 1811ء میں میری لوئی نے اُس وارث کو جنم دیا، جس کے لیے نپولین نے اپنی محبت، اپنی روح کو خود سے جدا کر دیا تھا۔

شاہ فرانس نے اپنے بیٹے کو ''روم کا بادشاہ'' کا خطاب دیا۔ دو برس بعد نپولین نے جوزفین کی اپنے وارث سے ملاقات کروائی، جو رنج و الم میں ڈوبی ایک عجیب ملاقات تھی کہ جوزفین کے سامنے وہ بچہ تھا جو اُسے اُس کے محبوب سے دور لے گیا تھا... اور وہ اسے دعائیں دینے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

سیاسی سطح پر لڑکھڑاتا نپولین اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ زار پُرخار کھائے بیٹھا تھا۔ سو ٹلسٹ معاہدے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے وہ جون 1812ء میں اپنی فوج کے ساتھ روس میں داخل ہوگیا۔

روسی فوج نے منصوبہ بندی کے تحت لڑنے سے اجتناب برتا، اُسے پیش قدمی کا موقع دیا۔ ستمبر تک نپولین نے ماسکو پر قبضہ کر لیا، تاہم روسیوں نے شہر کو آگ لگا کر اُسے تباہ کر دیا۔ ماسکو میں وہ پانچ ہفتے انتظار کرتا رہا کہ روسی امن کے لیے التماس کریں گے۔ اِس بے ثمر، بیزار کن انتظار نے اُسے واپسی کے فیصلے پر مجبور کر دیا۔

روسی اسی کے منتظر تھے، کیونکہ موسم سرما اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ فرانسیسی فوج کے راہ میں کھڑا تھا۔ رہی سہی کسر روسی فوج کے تیز دھار ہتھیاروں نے پوری کر دی۔ الغرض واپسی کا عمل ایک عظیم شکست ثابت ہوا۔ فقط دس فیصد فوج ہی روسی زمین سے واپس آ سکی۔

یورپی ممالک کو یہ احساس ہوگیا کہ اُنہیں فرانسیسی غلامی کا پھندا گلے سے اُتار پھینکنے کا سنہری موقع مل گیا ہے۔ انہوں نے نپولین کے خلاف اتحاد قائم کر کے جنگ کا اعلان

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کر دیا۔ اکتوبر 1813ء میں اتحادی فوج نے ''لیپ زگ'' کے مقام پر فرانسیسی فوج کو درہم برہم کر دیا۔ نپولین کی تمام تر کوششوں کو ناکامی کو منہ دیکھنا پڑا۔ برطانوی فوج نے جنوب سے دباؤ ڈالنا شروع کیا، اتحادی فوج نے جرمنی کے محاذ کو خون میں نہلا دیا۔

بالآخر مارچ 1814ء میں اتحادی فوج نے پیرس پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ یہ خبر ملتے ہی سرحد پر موجود نپولین نے اپنی فوج کو دارالحکومت کی جانب پیش قدمی کا حکم دیا، تاہم فوج کے اعلیٰ افسران نے بغاوت کردی۔

حالات اتنے بگڑ گئے کہ مجبوراً اُس نے اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے کا اعلان کردیا، لیکن اتحادی فوج نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ نتیجتاً 11 اپریل کو وہ کلی طور پر فرانس کے تحت سے دستبرار ہوگیا۔ اُسے جلاوطن کر کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ اٹلی کے سرحدی علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے جزیرے البا تک محدود کردیا گیا۔

اِن پے در پے شکستوں نے نپولین کے خیرخواہوں پر یاسیت کی چادر تان دی لیکن میری لوئی بہت خوش تھی۔

1814ء میں وہ نپولین کے وارث کو ساتھ لے کر آسٹریا لوٹ گئی جس کے بعد نپولین کی پھر کبھی اُن دونوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔

وہ نپولین کی زندگی کا سب سے اذیت ناک لمحہ تھا۔ اُس نے فقط وارث کے لیے جوزفین کو طلاق دی تھی اور جس عورت نے اُس کی محبوبہ کی جگہ لی، اُس نے نپولین کو فقط دُکھ دیے۔

☆☆☆

29 مئی نپولین کی زندگی کا منحوس ترین دن تھا!

جلاوطنی کا دکھ بھگتے نپولین کو وہ اطلاع ملی جس نے اس کے سوختہ، محبت سے محروم دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اُس کی محبوبہ، اُس کے دل کی ملکہ جوزفین مختصر علالت کے بعد اِس فانی جہان سے کوچ کر گئی تھی۔

تاریخ گواہ ہے، اُس عورت نے مرتے وقت اپنے محبوب نپولین ہی کو پکارا تھا... وہ سرتاپا اُس کی محبت میں گرفتار تھی۔

جب نپولین کو جوزفین کی موت کی خبر ملی، اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا، جہاں وہ دو دن بھوکا پیاسا اُسے پکارتا رہا۔ غم کے دنوں میں اُس پر غشی طاری ہوجاتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا۔ ''میں اپنی جوزفین سے شدید محبت کرتا تھا، لیکن میں نے اُس کی قدر نہیں کی۔''

خاموشی کے ان ہی دنوں میں اُس نے ایک فیصلہ کیا۔ ''میں مرنے سے قبل جوزفین کے قبر پر ضرور جاؤں گا تا کہ اُس سے معافی مانگ سکوں!''

اِس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے اُسے آگ کا دریا عبور کرنا تھا... اور وہ اِس کے لیے تیار تھا۔

اُسے یہ خبریں بھی مل رہی تھیں کہ اُسے جلد البا سے بحر اوقیانوس کے ایک دور دراز جزیرے پر منتقل کر دیا جائے گا جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔

''جوزفین کی قبر مجھے پکارتی ہے... مجھے البا سے فرار ہونا ہوگا!'' اس نے خود سے کہا۔ گوکہ یہ مشکل تھا، لیکن وہ عام انسان تو نہیں تھا، نپولین بوناپارٹ تھا۔

26 جون 1815ء کو وہ کسی نہ کسی طرح اٹلی کے اُس دور افتادہ جزیرے سے بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ دو دن بعد وہ فرانس میں تھا۔

فرانسیسی فوج میں نپولین کے لیے ہمدردی پائی جاتی تھی، کئی افسران اُس کے حمایتی تھے، سو فرانس میں اُس کا شان دار استقبال کیا گیا۔ اُس نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور فوراً ہی یورپی ممالک کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ تاہم... جنگ کے آغاز سے قبل اُس نے وہ کام کیا، جس کے لیے وہ البا سے فرار ہوا تھا۔

وہ جوزفین کی قبر پر گیا، جہاں وہ گھنٹوں دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اُس نے قبر کے کتبے سے سر ٹکا کر کہا۔ ''جوزفین سب نے مجھے چھوڑ دیا... کم از کم تم تو میرے ساتھ رہتیں۔ میری پیاری... تمہاری جدائی نے مجھے بے روح کر دیا ہے!''

اپنے بحالی کے فقط سو دن بعد اُسے ''واٹرلو'' کے محاذ پر مکمل شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

برطانیہ نے اُسے بحر اوقیانوس کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے جزیرے سینٹ ہیلینا میں قید کر دیا اور وہیں 1821ء میں اپنی محبوبہ کی یاد میں تڑپتے ہوئے وہ انتقال کرگیا۔

اُس کی زبان سے ادا ہونے والا آخری لفظ تھا...

جوزفین!

مورخین کہتے ہیں... ''نپولین کو اپنی زندگی میں فقط دو محاذوں پر شکست ہوئی... ایک واٹرلو کے محاذ پر، دوسرے محبت کے محاذ پر!''

اور وہ درست ہی کہتے ہیں!

وہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے علاقے کا تھا مگر اس نے تعلیم کے ذریعے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ اس میں مردانہ وجاہت بھی غضب کی تھی جس نے برطانیہ کی ایک شہزادی کو اس کے حضور جھکادیا۔ دونوں کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ وہ شہزادی پاکستان آئی تو سیدھے اس کے گھر پہنچی مگر حالات نے ساتھ نہ دیا اور یہ عشق اپنے عہد شباب میں ناکام ہوگیا۔

عشقِ مسلسل

آصف ملک

عشق ناکام نمبر

اٹھارہ سال کی شہزادی ڈیانا کی تقریباً دو گنی عمر کے شہزادہ چارلس سے شادی ہورہی تھی۔ لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی رومان بھری کہانی اپنے عروج پر ہو۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ دیکھی جانے والی شادی تھی۔ جسے ایک اندازے کے مطابق ٹی وی پر دنیا بھر کے پچاس کروڑ سے زیادہ افراد نے دیکھا تھا۔ اس وقت کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ جلد یہ رومانی کہانی ایک المیہ داستان میں بدل جائے گی۔ شادی کے وقت شہزادہ چارلس کی اہمیت تھی اور شہزادی ڈیانا اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی اگرچہ میڈیا نے اسے بھی بھرپور کوریج دی تھی۔ نہایت دھوم دھام سے شاہی جوڑا ہنی مون منانے کے لیے روانہ ہوا۔ ان کے ہنی مون کو بھی میڈیا اور لوگوں کی

www.paksociety.com

طرف سے بھرپور توجہ ملی تھی۔

مگر جلد ہی چارلس اور ڈیانا کے درمیان اختلاف کی خبریں آنے لگیں ان اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ شادی کے فوراً بعد دونوں میں جھگڑا ہوا اور کچھ عرصے بعد ڈیانا نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئی۔ ڈیانا کا تعلق ایک معزز گھرانے سے تھا لیکن اسے شاہی خاندان کے برابر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لیے چارلس کے گھر والوں کا رویہ بھی ڈیانا سے سرد ہی تھا۔ خاص طور سے ملکہ الزبتھ سے اس کے پہلے دن سے اختلافات تھے۔ مگر یہ ساری خبریں رفتہ رفتہ محرم راز قسم کے لوگوں اور خود ڈیانا یا شاہی خاندان کے افراد کے توسط سے باہر آتی رہیں۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سارا رومان ٹھنڈا پڑ گیا اور اب لوگ منتظر تھے کہ کب شاہی جوڑے میں علیحدگی ہوتی ہے؟ اس قسم کے حالات میں طلاق میں زیادہ دیر نہیں لگتی ہے لیکن خلافِ توقع لوگوں کو خاصی دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔

بعد میں مزید کہانیاں سامنے آتی رہیں۔ بے وفائی شہزادے کی طرف سے ہوئی تھی وہ کمیلا پارکر نامی ایک شادی شدہ عورت کا دیوانہ تھا جو حسن اور طبقے کے لحاظ سے ڈیانا کا پاسنگ بھی نہیں تھی۔ شاہی خاندان کسی صورت چارلس کو کمیلا پارکر سے شادی کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھا جو پہلے سے شادی شدہ تھی۔ اس لیے قربانی ڈیانا کی دی گئی۔ شادی کے شروع کے دنوں میں یہ اسکینڈل ڈیانا کے علم میں آچکا تھا اور شہزادہ کھلم کھلا کمیلا سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ ان حالات میں ڈیانا کے پاس تین راستے تھے۔ ایک وہ سب کچھ بالائے طاق رکھ کر چارلس سے طلاق حاصل کرلے۔ دوسرے خاموشی سے اس کی بے راہ روی برداشت کرے اور خود نفسیاتی مریضہ بن جائے اور تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ بھی بے وفائی پر اُتر آئے اور وہ محبت جو اسے چارلس نے اس کا حق ہوتے ہوئے بھی نہیں دی تھی اسے کہیں اور تلاش کرے۔ ڈیانا نے تیسرا راستہ اختیار کیا۔

اپنی موت سے پہلے اچانک ہی کسی قدر پس منظر میں چلی جانے والی لیڈی ڈیانا کی چونکا دینے والی تصاویر منظر عام پر آئیں۔ یہ تصاویر اس کے تازہ ترین بوائے فرینڈ دودی الفائد کے ساتھ تھیں۔ عمادالدین محمد عبدل مونیم فائد ایک مصری فلم پروڈیوسر اور ارب پتی تاجر محمد الفائد کا بیٹا تھا۔ ایک مسلمان اور عرب سے ڈیانا کا افیئر ایسا نہیں تھا جسے مغربی دنیا نظر انداز کرتی۔ اس لیے کامن ہاؤس میں زلزلہ آ گیا۔ برطانوی عوام اور خواص نے اس محبت کو سرد مہری سے دیکھا اور اکثر کا ردِ عمل منفی تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دودی الفائد کا مسلمان ہونا تھا۔ دوسری طرف ڈیانا کو اس کی بالکل پروا نہیں تھی اور اس نے دودی سے منگنی کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ ڈیانا کے قریبی حلقے دعویٰ کرتے ہیں کہ ڈیانا کا دودی سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صرف ایک مصلحت کی وجہ سے ایسا ظاہر کر رہی تھی۔

کیا ڈیانا واقعی دودی سے محبت کرنے لگی تھی؟ اس سوال کے جواب میں ایک مصنفہ کیٹ اسنیل نے مفصل تحقیق کے بعد ایک ڈاکومینٹری بنائی اور اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دودی کے ساتھ ڈیانا کی خفیہ تصویروں کا سامنے آنا اتفاق نہیں تھا۔ یہ تصاویر ایک منصوبے کے تحت ساری دنیا کے میڈیا میں ایک ساتھ شائع کی گئیں اور ان تصاویر کا مقصد ایک ایسے شخص کو جیلس کرنا تھا جس سے ڈیانا سچ مچ محبت کرنے لگی تھی۔ یہ شخص پاکستانی نژاد ڈاکٹر حسنات خان تھا۔ کیٹ اسنیل لکھتی ہے۔ ''اپنی زندگی کے بالکل آخری حصے میں ڈیانا نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا۔ ''میں اب اکیلی نہیں رہوں گی میں جان گئی ہوں محبت کیا ہوتی ہے؟'' اسے یہ تحفہ ایک آدمی نے دیا تھا اور وہ آدمی ڈاکٹر حسنات تھا۔''

ڈاکٹر حسنات خان پاکستان کے ایک روایتی قدامت پرست گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور وہ کارڈیالوجسٹ کی حیثیت سے آج بھی لندن میں پریکٹس کر رہا ہے۔ میڈیا اور لوگوں کے سامنے نمایاں ہونے سے گریز کی وجہ سے اس کا ڈیانا سے تعلق آخر تک سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن کیا واقعی ڈیانا نے مرنے سے کچھ عرصے پہلے ڈاکٹر حسنات کی صورت میں سچی محبت کو پا لیا تھا؟ کیٹ اسنیل اس سوال کے جواب میں کہتی ہے۔ ''وہ خود کو بہت زیادہ غیر محفوظ سمجھتی تھی اور اس نے سچی محبت کی تلاش میں بہت ٹھوکریں کھائیں۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ اسی کام میں گزار دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک بوائے فرینڈ بدلتی رہی اور سب نے اسے دھوکا دیا۔ وہ اس سے نہیں اس کی خوب صورتی اور اس کے مرتبے سے محبت کرتے تھے۔''

ڈیانا کی یہ تلاش اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جس دن اس کی شادی شہزادہ چارلس سے ہوئی تھی اور اس نے اپنی محبوبہ کمیلا پارکر کو بھی اس شادی میں مدعو کیا تھا اور ڈیانا اس

بات سے واقف تھی۔ اس کے باوجود اس نے چارلس سے ساتھ نبھانے، ایک شہزادی کی حیثیت سے شاہی خاندان کے لیے اور پرنسز آف ویلز کے کردار کو نبھانے کے لیے اپنی سی بہترین کوشش کی۔ اس نے کہیں کوئی کمی یا کوتاہی نہیں چھوڑی۔ اس کے مقابلے میں شاہی خون رکھنے والی اس کی نند شہزادی مارگریٹ کا کردار سب کے سامنے ہے جسے اپنے اور شاہی خاندان کے کردار کی کوئی پروا نہیں رہی۔ ڈیانا بہت سادہ عورت تھی جو جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نے شاہی خاندان اور چارلس کے لیے یہ سب کیا شاید اسے امید تھی کہ چارلس اس کی طرف واپس آجائے گا وہ کمیلا کو چھوڑ دے گا۔ لیکن جواب میں اسے چارلس کی طرف سے کھلی بے وفائی اور شاہی خاندان کی طرف سے سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا۔

☆☆☆

1994ء میں اس طویل ترین تعلق کا خاتمہ ہوا جو ڈیانا نے کسی ایک مرد سے رکھا تھا۔ چارلس سے اس کی شادی اوّل دن سے اس کشتی کی طرح تھی جو بھنور میں پھنس گئی ہو۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ شادی فوری خاتمے کا شکار ہونے سے بچ گئی اور اس دوران میں ڈیانا اور چارلس دو بیٹوں کے ماں باپ بھی بن گئے تھے۔ صرف شادی ہی نہیں ڈیانا کے کئی افیئرز کا بھی خاتمہ ہوا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلی اور اداس تھی۔ چارلس سے طلاق سے اس کی شاہی خاندان میں حیثیت میں فرق آیا تھا لیکن جہاں تک اس کے پبلک امیج کا تعلق تھا اس میں بہتری آئی تھی اور طلاق کی کارروائی شروع ہونے کے بعد منظرِ عام پر آنے والی کہانیوں کی وجہ سے لوگ اسے ہمدردی کا مستحق سمجھنے لگے تھے۔ ڈیانا کے ساتھ چارلس اور شاہی خاندان کا رویہ ہمیشہ اسٹار پلس سسرال ٹائپ کا رہا لیکن طلاق تک اس میں سے بہت ساری چیزیں منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔

ڈیانا کے دوستوں اور قریبی رشتے داروں کا خیال تھا کہ چارلس اور شاہی خاندان کا مہیب سایا ہٹنے کے بعد ڈیانا ایک مضبوط شخصیت کے طور پر سامنے آئے گی اور اپنے مستقبل کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گی۔ مگر ان کی توقع کے برخلاف ڈیانا کا محبت کے معاملے میں سابقہ رویہ برقرار رہا تھا۔ ابھی اسے اکیلے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس کی ملاقات ڈاکٹر حسنات سے ہو گئی۔ ڈیانا کا ایک قریبی دوست ہارٹ اٹیک کا شکار ہوا اور وہ اس کے ساتھ اسپتال پہنچی جہاں وہ ڈاکٹر حسنات [illegible] دوست تو اس بیماری سے جانبر ہو گیا لیکن خود ڈیانا کو دل کا نیا روگ لگ گیا۔ وہ ڈاکٹر حسنات خان سے فوراً متاثر ہو گئی تھی اور اس نے یہ بات اپنے دوستوں کو بتانے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ کیٹ اسنیل کہتی ہے۔ ڈیانا نے ان الفاظ میں ڈاکٹر حسنات کا تعارف کرایا۔

''وہ جان لیوا حد تک پر کشش ہے۔'' اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ''شاید یہی وہ مرد ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور جو میرے خوابوں کو تعبیر دے سکتا ہے۔''

اس پہلے دورے کے بعد ڈیانا اتنی باقاعدگی سے برومپٹن ہاسپٹل لندن کا چکر لگانے لگی کہ وہاں کی ایک مستقل مہمان بن گئی۔ وہ اکثر وہاں مریضوں کی عیادت کرتی، ان میں تحائف تقسیم کرتی تھی اور کبھی کبھی براہِ راست کسی سرجری کے موقع پر بھی پائی جاتی اور لازمی بات ہے اس وقت آپریشن روم میں سرجن ڈاکٹر حسنات ہوتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت حسنات خان کے گرد منڈلانے میں صرف ہوتا تھا۔ ڈاکٹر حسنات ایک شرمیلا اور خاموش طبع شخص تھا جسے دنیا میں کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ اس کا پیشہ تھا۔ ساتھی اسٹاف اور مریضوں میں اس کی ساکھ بہت اچھی تھی اور سب اس کی عزت کرتے تھے۔ خان فیملی سے تعلق رکھنے والا حسنات خان دیکھنے میں خوبرو، باوقار اور شریف آدمی تھا۔ لندن جیسے شہر میں رہ کر اس نے اپنے کردار کو برقرار رکھا تھا اور اس کی گواہی اس کے ساتھی بھی دیتے تھے۔

''ڈیانا اس کے کردار، اس کی شرافت اور مریضوں اور ساتھیوں کے لیے اس کی توجہ اور خلوص سے متاثر ہوئی تھی۔'' کیٹ اسنیل نے کہا۔ ''ڈیانا اگر اس سے کوئی تعلق رکھتی تھی تو وہ اس تعلق کو یقیناً ممکن حد تک سب سے چھپانا چاہتی تھی خاص طور سے میڈیا سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی اس کے برومپٹن ہاسپٹل کے دورے ہمیشہ سماجی خدمت کے طور پر پیش کیے جاتے تھے۔''

ایسا لگتا تھا کہ ڈیانا ڈاکٹر حسنات خان سے پوری طرح متاثر ہو گئی تھی اور وہ اسے چاہنے لگی تھی۔ اب تک اس کے تمام بوائے فرینڈز معزز برطانوی سفید فام شہری تھے۔ لیکن حسنات خان برطانوی شہری ہوتے ہوئے بھی ایک ایشیائی اور مختلف مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص تھا۔ یہی نہیں ان کے کلچر میں بھی اتنا فرق تھا کہ وہ دونوں بالکل مختلف دنیاؤں کے باشندے تھے۔ ڈیانا کو پیش آنے

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

والے المناک سانحے کے بعد متعدد صحافی حضرات نے ڈاکٹر حسنات خان سے انٹرویو کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے صرف چند ایک کو کامیابی ملی تھی۔ ان میں ایک انڈین نژاد برطانوی صحافی شیکھر بھاٹیا بھی تھا اس نے ڈاکٹر حسنات کے بارے میں لکھا۔

''اسے ڈیانا کی دولت سے لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کی حیثیت سے متاثر تھا وہ صرف ڈیانا سے محبت کرتا تھا۔''

ڈاکٹر حسنات خان کے پاس ہونے کے بعد ڈیانا کو احساس ہوا کہ اس کا تعلق پاکستان کے ایک قدامت پرست لیکن تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا اور وہ اپنے رسم و رواج کو چھوڑنے کے قائل نہیں تھے۔ ڈاکٹر حسنات برطانوی شہری ہوتے ہوئے بھی اپنے خاندانی، معاشرتی اور مذہبی رسم و رواج کا پابند تھا۔ وہ کسی ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا جو ان رسم و رواج کی پابندی نہ کرتی ہو۔ لباس، ڈرنک اور مردوں سے میل جول کے معاملے میں بہت ساری پابندیاں تھیں جو ڈیانا کے لیے بالکل نئی چیز تھیں۔ مگر حسنات خان کے لیے اس نے ان پابندیوں کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود یہ تعلق قائم ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔

اس سے پہلے ڈیانا نے کبھی اسلام یا پاکستان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں میں شاید ہی کوئی پاکستانی تھا اور اگر وہ کسی پاکستانی کو جانتی تھی تو وہ عمران خان تھا۔ حسن اتفاق دیکھیں حسنات خان اسی عمران خان کا دور کا کزن تھا۔ اب ڈیانا پاکستان اور اسلام کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ اس نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے عمران خان سے بہتر کون شخص ہو سکتا تھا؟ جو اُن دنوں کینسر ہاسپٹل قائم کر رہا تھا۔ 1996ء میں ڈیانا پاکستان کے دورے پر آئی۔ بہ ظاہر اس کا مقصد کینسر ہاسپٹل کی فنڈ ریزنگ میں حصہ لینا تھا لیکن اس کا اصل مقصد ڈاکٹر حسنات خان کی فیملی سے ملنا اور ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنانا تھا۔ اسے معلوم تھا ایسا کیے بغیر وہ اسے حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

پاکستان سے واپسی کے بعد ڈیانا کی طلاق سرکاری طور پر موثر ہو گئی تھی اور اب اس کا شہزادہ چارلس سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے دو بچوں کی ماں تھی اور ان میں سے ایک آنے والے دنوں میں شاہ برطانیہ کا تاج سنبھالنے والا تھا۔ اس دوران میں اس کی ڈاکٹر حسنات سے ملاقاتیں جاری رہی تھیں اور ڈیانا کے دوست کہتے ہیں کہ وہ اسے اپنی کار کی ڈکی میں چھپا کر بکنگھم پیلس بھی لے جاتی رہی تھی۔ مگر حسنات خان کی شخصیت اور پھر ڈیانا کی سابق آزاد روی کو دیکھتے ہوئے یہ صرف کہانی لگتی ہے۔ جب ڈیانا کے دوسرے بوائے فرینڈز کھلے عام اس کے ساتھ محل میں آتے تھے اور رات رات بھر وہیں بسر کرتے تھے تو حسنات خان کو اس طرح چھپ کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر ملاقات کے لیے جگہوں کی کمی تھی جو وہ کار کی ڈکی میں چھپ کر جانے کا خطرہ مول لیتا۔ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اسے چھپ کر محل میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا تھا اور اسے سزا بھی ہو سکتی تھی۔

یہ خطرہ اگرچہ ڈیانا کے دوسرے بوائے فرینڈز کو بھی تھا لیکن ان میں اور ڈاکٹر حسنات خان میں ایک بنیادی فرق تھا وہ برطانوی شہری ضرور تھا لیکن نسلاً سفید فام نہیں تھا۔ دوسرے مسلمان تھا اس لیے اگر اس کا ڈیانا سے افیئر سامنے آجاتا تو ملک میں یقیناً ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا۔ برطانوی عوام کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مستقبل کی مادر ملکہ کا تعلق کسی طرح بھی ایک مسلمان سے ہو اور یہ تو قطعی ناقابلِ برداشت تھا کہ خود ڈیانا بھی مسلمان ہو جائے۔ خود ڈیانا بھی جانتی تھی کہ اس کا حسنات خان سے تعلق اتنی ہنسی خوشی برداشت نہیں کیا جائے گا جس طرح دوسرے بوائے فرینڈز سے کیا جا رہا تھا۔

اس متوقع مخالفت کے خطرے کے باوجود ڈیانا حسنات خان کے عشق میں اس طرح ڈوب گئی تھی کہ اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ اس نے ایسا لباس پہننا شروع کر دیا جو اسے زیادہ چھپاتا تھا۔ وہ سر پر اسکارف لینے لگی تھی اور پاکستان کے دورے میں اس نے مکمل طور پر مقامی لباس پہنا اور سوائے چہرے اور ہاتھوں کے پورا جسم پوشیدہ رکھا تھا۔ وہ اسلام سے دلچسپی ظاہر کر رہی تھی اور اس نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ باتیں میڈیا اور عوام سے چھپی نہیں رہ سکتی تھیں۔ سب ہی بے چین ہو رہے تھے کہ ڈیانا میں اس تبدیلی کا ذمے دار کون ہے؟ نائن الیون کے بعد ایک طرف تو مغربی حکومتوں اور میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم چلائی تھی تو دوسری طرف مغرب میں اسلام قبول کرنے کے واقعات میں بے پناہ تیزی آ گئی تھی۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والی کئی اعلیٰ شخصیات نے

اسلام قبول کر لیا تھا جن میں سب سے مقبول شخصیت خاتون صحافی مریم ریڈلے کی تھی۔ وہ طالبان کی قید میں رہ کر آئی تھی اور بعد میں اس نے قرآن کریم کا مطالعہ کر کے اپنے لیے اسلام کو بہ طور مذہب منتخب کر لیا تھا۔ مقبول شخصیت ہونے کے باوجود مریم ایک عام عورت تھی جبکہ ڈیانا شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور مستقبل کی مادر ملکہ تھی۔ اس کا قبول اسلام کسی صورت قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کا امکان ہے کہ ڈیانا پر اس حوالے سے دباؤ آیا ہو۔

اس لیے ڈیانا اس تعلق کو خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ وہ جہاں بھی ملتے بہت احتیاط سے ملتے تھے اور جب وہ کہیں باہر ملتے تو ڈیانا شرعی لباس پہنتی تھی۔ وہ جس ہوٹل، ریستوران یا کلب میں جاتے تھے وہاں ان کے قریب بیٹھے لوگوں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ ڈیانا ہے۔ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو وہ اسے اپنا وہم ہی سمجھا ہوگا کہ ڈیانا ایک نیٹو باشندے کے ساتھ نظر آئے یہ ناممکن تھا۔ وہ نارمل جوڑا نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ نارمل جوڑا نہیں تھے اور نہ ہی کبھی بن سکتے تھے۔ وہ دو الگ دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دنیائیں آپس میں متضاد بھی تھیں۔ اسلام اور عیسائیت میں دشمنی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ صلیبی جنگیں آج بھی اہلِ یورپ کے ذہن و قلب میں اسی طرح تازہ ہیں جیسے آج سے ہزار سال پہلے تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے اپنے تعصب کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔

ڈیانا عیسائی تھی اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ نہایت مقبول اور ہر دل عزیز تھی۔ چارلس سے طلاق کے باوجود عوام میں اس کی ساکھ تھی۔ اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے اس نے عوام کے دل جیت لیے تھے۔ برطانوی عوام میں وہ برسوں سے مقبولیت کے لحاظ سے نمبر ون شخصیت چلی آ رہی تھی اور اس فہرست میں اس کا مقابلہ ملکہ اور چارلس سے بھی ہوتا تھا جو ہمیشہ اس سے پیچھے رہ جاتے تھے۔ اکیلے ڈیانا کی مقبولیت سارے شاہی خاندان سے زیادہ تھی۔ اس کے باوجود اگر لوگوں کے علم میں آجاتا کہ وہ ایک پاکستانی مسلمان ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے تو یقیناً اسے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

کیٹ اسنیل ان دونوں کے تعلق کے بارے میں کہتی ہے۔ ''میرا خیال ہے ڈاکٹر حسنات خان ڈیانا سے ایک مرد کی

نوبل انعام کے بانی الفریڈ نوبل کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی ناکام محبت کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ انہیں نوبل انعام قائم کرنے کا خیال معروف مصنفہ برتھا وان بٹ نر کے ناول ''ہتھیار رکھ دو'' پڑھ کر آیا تھا۔ اس ناول کے مطالعہ نے انہیں مصنفہ کی جانب مائل کر دیا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ بہت قریب آگئے تھے۔ یہ رومان پختگی اختیار کرتا کہ برتھا وان سٹ نر، نوبل سے ناراض ہو گئی۔ یہ ناراضی دھیرے دھیرے بڑھتی چلی گئی۔ نوبل نے شادی کا پیغام بھیجا تو برتھا نے حقارت سے اسے ٹھکرا دیا۔ یہ غم وہ دم آخر بھی بھلا نہ سکا۔

نوبل انعامات کا آغاز نوبل کی وفات (1896ء) کے پانچ برس بعد 1901ء سے ہوا۔ مزے دار بات یہ ہے کہ 1905ء کا نوبل انعام برائے امن برتھا وان سٹ نر کو ملا۔ وہ نوبل انعام حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہے۔

اقتباس: عجائبات دنیا از خورشید اقبال

مرسلہ: ندیم فرحت، کراچی

طرح محبت کرتا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ لیڈی ڈیانا ہے یا مستقبل کے شاہ برطانیہ کی ماں ہے۔ حسنات کے تمام احساسات اور جذبات صرف ڈیانا کے لیے تھے کیونکہ ڈیانا اس کے لیے خود کو بدلنے کے لیے تیار تھی۔''

حسنات کے والدین قدامت پرست تھے۔ ان کے خاندان میں صرف ماں باپ کی مرضی سے شادی طے کی جاتی تھی۔ ایک طلاق شدہ، نان مسلم اور آزاد خیال عورت سے حسنات کو شادی کی اجازت دینا ممکن نہیں تھا۔ یہ بات حسنات خان بھی جانتا تھا اور اس نے ڈیانا کو واضح لفظوں میں سمجھا بھی دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیانا نے پاکستان کا دورہ کرنے اور حسنات خان کے گھر جانے کی ضرورت محسوس کی۔ ''حسنات خان کے ماں باپ اس بارے میں مکمل یقین رکھتے تھے کہ وہ ان کی مرضی سے شادی کرے گا۔'' شیکھر بھاٹیا نے کہا۔ ''یہ اس کے باپ کے الفاظ ہیں، میرا بیٹا کسی سے کہیں بھی اور کبھی بھی شادی نہیں کر سکتا جب تک اس میں میری اجازت شامل نہ ہو۔''

دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر حسنات کے والد نے کہہ دیا تھا کہ اسے ڈیانا سے شادی کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ یہ بات قطعی الفاظ میں حسنات خان تک پہنچ گئی تھی۔ 1997ء کے آغاز میں ان دونوں کے تعلقات ایک مقام پر رکنے لگے تھے۔ ڈیانا حسنات خان سے شادی کرنا

www.paksociety.com

چاہتی تھی اور وہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر اسے پروپوز بھی نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس نے ڈیانا کی شدید خواہش کے باوجود اسے پروپوز نہیں کیا تھا اور یہیں سے ان کے تعلقات میں دراڑیں آنے لگی تھیں۔ ڈیانا اس معاملے میں اتنی آگے جا چکی تھی کہ جب اسے حسنات خان کی طرف سے ردِعمل نہیں ملا تو اس نے عمران خان سے رابطہ کیا۔ عمران خان نہ صرف حسنات خان کا کزن تھا بلکہ وہ خود بھی برطانوی قدامت پرست دولت مند گھرانے میں شادی کر چکا تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تجربہ ناکام رہا اور جمائما خان نہ صرف پاکستانی معاشرے میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کرسکی تھی بلکہ وہ اسلام پر بھی قائم نہ رہی اور دوبارہ سے لندن لوٹ گئی۔

ڈیانا چاہتی تھی کہ عمران خان اس کے لیے حسنات سے بات کرے اور اسے راضی کرے کہ وہ اس سے شادی کرلے۔ عمران خان نے اسے جواب دیا۔ ''ممکن ہے میں اس سے اس بارے میں بات کروں۔ ملک اور مذہب کے فرق کے ساتھ شادی کرنا ہمارا رواج نہیں ہے لیکن ایسی شادیاں ہوتی ہیں ممکن ہے وہ اس بارے میں اپنا نقطہ نظر رکھتا ہو۔ اگر اس نے مجھ سے اس بارے میں کوئی مشورہ مانگا تو ممکن ہے میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔''

پاکستان کے اس دورے میں ڈیانا نے کچھ وقت ڈاکٹر حسنات خان کے گھر میں گزارا تھا اور اس نے کوشش کی کہ وہ اس کے والدین کو راضی کرلے کہ وہ اپنے بیٹے کو اس سے شادی کی اجازت دے دیں کیونکہ وہ ان کے بیٹے کے لیے بہترین عورت ہے۔ اس سے پہلے وہ ان کو قائل کرنے کے لیے خطوط بھی لکھتی رہی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر پا رہی ہے۔ اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی اور وہ پاکستان سے خالی ہاتھ لوٹ آئی۔ کیٹ اسنیل نے اس بارے میں لکھا۔ ''میرا نہیں خیال کہ ڈیانا مستقبل کے بارے میں پر امید تھی۔ تقریباً یہی خیال ڈاکٹر حسنات کا بھی ہو گا۔ ممکن ہے اس نے ڈیانا سے اب تعلق ختم کرنے کو کہا ہو لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ ڈیانا معاملے کو ختم سمجھ رہی ہوگی۔''

کیٹ اسنیل کا کہنا ہے۔ حسنات خان اور ڈیانا کے تعلقات اس واقعے سے چند دن پہلے ختم ہوئے تھے۔ جب ساری دنیا میں اخبارات اور چینلز نے ڈیانا کی وہ تصاویر شائع کی تھیں جن میں وہ دودی الفائد کو بوسہ دے رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ میڈیا کا اسکینڈل لگ رہا تھا لیکن ڈیانا کے قریبی لوگ جانتے تھے کہ اس نے خود یہ تصاویر میڈیا کو مہیا کی تھیں وہ ان تصاویر کی مدد سے حسنات خان کو جیلس کرنا چاہتی تھی۔ یا پھر اسے یہ جتانا چاہتی کہ اسے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

''وہ دودی سے محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ حسنات خان سے محبت کرتی تھی۔'' کیٹ اسنیل نے کہا۔ ''وہ کنگسٹن پیلس واپس جانا چاہتی تھی اور وہ دودی کے ساتھ فرانس میں صرف تفریح کرتی رہی تھی۔ جب وہ واپس گھر جاتی تو دودی اس کی کتاب زندگی کا ماضی کا ایک باب بن چکا ہوتا۔''

لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تصویروں والا پیغام اصل میں حسنات خان کے لیے نہیں بلکہ کچھ اور لوگوں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی ہوسکتی ہے کہ ڈیانا اور حسنات خان کا افیئر برٹش حکومت کے علم میں آگیا ہو اور ان کی طرف سے فیصلہ بھی کرلیا گیا ہوگا کہ یہ شادی برطانیہ کے مفاد میں نہیں ہے اور جب کوئی چیز حکومت کے مفاد میں نہیں ہوتی ہے تو اسے روکنے کے بہت سارے طریقے حکومت کے پاس ہوتے ہیں۔ پہلے ڈیانا اور ڈاکٹر حسنات خان پر دباؤ ڈالا گیا ہو اور جب یہ دباؤ کارآمد ثابت نہیں ہوا تو برٹش حکومت نے اپنی حیثیت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پاکستان پر دباؤ ڈالا ہو اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی ہو یعنی حسنات خان کے گھر والوں کی طرف سے انکار ہوگیا ہو اور یوں یہ شادی ممکن نہیں رہی۔ ڈیانا جانتی ہوگی کہ اسے حسنات خان سے کس طرح دور کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے کیا وجوہات ہوں گی اس لیے اس نے فوراً ہی دودی سے تعلقات بڑھا لیے اور ان تصویروں کے ذریعے برٹش حکومت کو پیغام دیا کہ وہ اسے ایک مسلمان سے شادی کرنے سے روک سکتی ہے دوسرے اس کے بعد کسی تیسرے سے شادی کرنے سے نہیں روک سکتی۔ ڈیانا کا پیغام واضح تھا اور شاید اسی پیغام نے اس کی زندگی کے لمحات مختصر کردیے۔

جو کچھ بھی ہوا تھا لیکن یہ ڈیانا کی زندگی کا آخری باب بھی ثابت ہوئے۔ حسنات خان نے کبھی نہیں بتایا کہ ان کے دونوں کے درمیان کیا ہوا تھا اور وہ کیوں الگ ہونے پر مجبور ہوئے؟ لیکن جس روز ڈیانا کی تدفین کی تقریب تھی اس تقریب میں حسنات خان آخر تک شامل رہا تھا اور ایک بڑا سا سن گلاس اس کے چہرے کے تاثرات کو چھپائے ہوئے تھا۔ شاید وہ اپنے ناکام عشق کو بھی چھپانا چاہتا ہو۔

دو عہد دو عشق

قارئین

عشق وہ جذبۂ اوّلین ہے جس نے حضرتِ انساں کو سب سے پہلے متاثر کیا اور اسی جذبے نے انسان کو کامل بنایا۔ ابنِ آدم اپنی خلقت کے ساتھ ہی اس جذبے کا اسیر بن گیا تھا۔ ہر دور میں ایسی داستانیں دُہرائی جاتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ گر عشق نہ ہو تو سب کچھ بیکار ہے۔

جذبۂ عشق پر دو عہد کی دو داستانیں

عشق ناکام نمبر

پیار کرنے والے ہر دور میں ہوتے ہیں۔ چاہے وہ زمانہ قبل از مسیح کا ہو یا آج کا۔ مرد نے عورت سے اور عورت نے مرد سے محبت کی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کے ساتھ زندگی موت، مفلسی امیری، رنگ و نسل، زبان اور مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ شاید یہی وہ واحد فطری جذبہ ہے جو اپنی پوری شدت کے ساتھ آج بھی زندہ ہے اور جب تک انسان زندہ ہے، محبت زندہ رہے گی۔ جن کا خیال ہے کہ عشق ناکام،

www.paksociety.com

قاتل محبت ہے یعنی جذبہ محبت کی ناکامی وہ ذرا میرے ساتھ ماضی کے سفر پر چلیں۔

یہ تہذیب تھی بے بیلون (بابل) کی۔اب سے ہزاروں سال پہلے کی تہذیب۔اس دوران رونما ہونے والی محبت کی ایک داستان آج بھی زندہ ہے اور جب جب یہ داستان دُہرائی جاتی ہے تو سننے والوں کی آنکھوں میں ان بدنصیب محبت کرنے والوں کے لیے نمی آ جاتی ہے۔

یہ کہانی ہے بے بیلون کے ایک شہر کی۔

پختہ اور نیم پختہ مکانات سے بھرا ہوا تھا وہ شہر۔مٹی، گارے اور لال اینٹوں سے بنائی گئی عمارتیں یہ بتا رہی تھیں کہ یہ لوگ معاشرت کا ہنر جانتے تھے۔

یہ اس دور کے لحاظ سے مہذب اور ترقی یافتہ لوگ تھے۔

محبت کی طرح ایک جذبہ اور بھی زندہ تھا اور اپنی اہمیت ثابت کر رہا تھا، وہ تھا نفرتوں کا جذبہ یا طبقاتی نفرت کا جذبہ۔

امیر غریب، حاکم مظلوم، کمزور اور طاقت ور اس دور میں بھی ہوا کرتے تھے۔

پیرامس (Pyramos) ایک غریب نوجوان تھا جس کا باپ دربار سے وابستہ تھا۔اس کی حیثیت بہت معمولی سی تھی اسی لیے اس کے بیٹے پیرامس کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔صرف ایک بات اسے دوسرے غریب نوجوانوں سے الگ کرتی تھی اور وہ تھا اس کا بہت خوبصورت اور طاقت ور ہونا۔

وہ ایک شاندار نوجوان تھا۔محلّے اور شہر کی لڑکیاں اسے دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھیں لیکن وہ اپنی دھن میں مگن رہنے والا نوجوان تھا۔

اس کی دلچسپی اپنے ساز سے تھی جو اس زمانے میں رائج تھا۔وہ اس ساز کو بجانے میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔

اس کے باوجود اس کی مالی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔اس کا باپ اسے سمجھایا کرتا لیکن پیرامس اپنے روش پر قائم رہا کرتا۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں زندہ رہنے والے لوگ اپنی تقدیر میں یہی لکھوا کر لاتے ہیں۔انہیں چونکہ ایک مثال قائم کرنی ہوتی ہے۔اس لیے وہ کسی اور طرف دھیان نہیں دیتے۔

پیرامس کو اپنے عشق کی لازوال مثال قائم کرنی تھی۔اسی لیے وہ اپنی ڈگر پر چلتا رہا۔محلّے کی لڑکیاں اسے اشارے کیا کرتیں۔اپنی جانب راغب کرنے کی کوششیں کرتیں لیکن پیرامس کو کسی کی پروا نہیں تھی۔اس کے دل میں کسی کے لیے محبت کی آگ نہیں بھڑک سکی تھی۔

لیکن ایک دن یہ آگ اس کے دل میں بھڑک اُٹھی۔

اس لڑکی کا نام تھائی سب تھا۔وہ فوج کے ایک امیر اور طاقت ور عہدے دار کی بیٹی تھی جو پیرامس ہی کی طرح خوبصورت اور دلکش تھی۔

ان دونوں کا ٹکراؤ ایک ایسی تقریب میں ہوا تھا جس میں پیرامس نے ساز بجانے کا مظاہرہ کیا تھا۔بس اسی وقت تھائی سب پیرامس کو دل دے بیٹھی۔

پیرامس بھی اس کے عشق میں گھائل ہو کر رہ چکا تھا۔دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔اب پیرامس کا سوائے آہیں بھرنے کے اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔

دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور دونوں عشق کی انتہا کو پہنچ گئے۔ایک دوسرے کے بغیر سکون نہیں تھا۔پورے شہر میں ان دونوں کی محبت کی داستانیں زبان زدعام ہو گئی تھیں۔

یہ خبر تھائی سب کے باپ کو بھی پہنچ گئی۔اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کا نام کسی عام آدمی کے ساتھ لیا جائے۔

اس نے تو اپنی بیٹی کے لیے بہت اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔اس نے تھائی سب پر پابندی لگا دی کہ وہ گھر سے باہر نہیں جایا کرے گی۔

تھائی سب نے ایک بار پیرامس کو اپنی کسی کنیز کے ذریعے پیغام بھجوایا ”میرے محبوب! میری زندگی اور موت صرف تمہارے لیے ہے۔یہ بات یاد رکھنا۔اگر میں زندہ رہوں تو تمہارے لیے۔اگر موت آئی تو تمہارے لیے آئے گی۔“

پیرامس اس کے عشق میں پاگل ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نے تھائی سب سے ملنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔تھائی سب کے باپ نے پہرے لگا رکھے تھے۔بالآخر وہی کنیز دونوں کے کام آئی۔

تھائی سب نے اسی کی معرفت پیرامس کو یہ پیغام بھجوایا۔

”میرے محبوب! اب تمہاری جدائی برداشت نہیں ہوتی۔میں اپنی زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں اس لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

میں نے اپنا گھر اور اپنا خاندان سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تم کل دوپہر وادی میں پہنچ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ پھر ہم دونوں کسی اور طرف نکل جائیں گے، کسی اور طرف جہاں یہ اونچ نیچ کا کوئی تصور نہ ہو۔ جہاں ہمیں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ جہاں ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں۔''

پیرامس نے اس کنیز سے کہا ''میری محبوبہ سے کہہ دو کہ وہ کل دوپہر ٹیلے والے میدان میں آجائے۔ میں وہاں اس کا انتظار کروں گا۔ پھر ہم کسی مہربان سرزمین کی طرف نکل جائیں گے۔''

وفادار کنیز نے پیرامس کا یہ پیغام تھائی سب کو پہنچاتے ہوئے اپنی خواہش کا بھی اظہار کردیا ''شہزادی، میں تم کو اکیلا تو نہیں جانے دوں گی بلکہ تمہارے ساتھ چلوں گی جس طرح آج تک سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہی ہوں، اسی طرح آیندہ بھی رہنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن میرے راستے تو بہت دشوار ہیں۔ ہماری کوئی منزل نہیں ہے۔ ہمارے چاروں طرف دشمن ہیں۔ ہمارے پاس زندگی گزارنے کے وسائل نہیں ہوں گے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا شہزادی! جو حال تمہارا ہوگا، وہی میرا بھی ہوگا۔ دیوتا ہماری حفاظت کریں گے کیونکہ ہم محبت کے لیے گھر سے جارہے ہیں۔ اپنا شہر چھوڑرہے ہیں۔''

تھائی سب خاموش ہوگئی۔ کنیز کی وفاداری اسے اچھی لگی تھی۔

دوسری دوپہر وہ دونوں گھر سے نکل گئیں۔ گھر والوں نے کسی شک کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ تھائی سب اپنی اسی کنیز کے ساتھ باہر جایا کرتی تھی۔

تھائی سب نے بُرے وقتوں کے لیے اپنے ساتھ سونے کے کچھ سکے بھی رکھ لیے تھے۔

ٹیلے والا میدان بہت فاصلے پر تھا۔ شہری حدود سے آگے نکل کر اس میدان کے اردگرد پہاڑیاں تھیں اور پہاڑیوں کے عقب میں دور تک پھیلا ہوا جنگل۔

اسی جنگل کے درمیان ایک کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ جو لہراتا ہوا دور، بہت دور نکل جاتا تھا۔ شاید پیرامس نے اسی راستے پر سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی لیے اس نے تھائی سب کو ٹیلے والے میدان میں بلایا تھا۔

دونوں وقت مقررہ پر میدان میں مہیب ٹیلے کے پاس پہنچ گئیں۔ پیرامس ابھی نہیں آیا تھا۔ دونوں خاموش تھیں۔ شاید آنے والے دنوں کے اندیشوں نے ان کی زبانیں بند کردی تھیں۔

پھر اچانک ایک آواز سنائی دی۔

یہ آواز پیرامس یا کسی انسان کی نہیں تھی، بلکہ ایک شیر کی تھی جو ٹیلے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ اس کی دہاڑ نے پورے میدان کو لرزا دیا تھا۔ پرندے پرواز کرنے لگے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر کھڑی ہوگئیں۔

شیر کسی پہاڑی سے کود کر ان کے سامنے آگیا۔ اس کے نوکیلے، خونخوار دانت دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ انہی کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس انداز سے جیسے ان کی بے بسی اور خوف کا لطف اُٹھا رہا ہو۔

کنیز کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ چیخ کر ایک طرف بھاگ نکلی۔ شیر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ تھائی سب کی طرف بڑھتا رہا۔

تھائی سب بھی اب اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکی، اس نے بھی بے تحاشا دوڑ لگادی۔ وہ اونچے نیچے پتھروں کے درمیان بھاگ رہی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں اس کی شال اس کے شانوں سے پھسل کر نیچے جاگری۔ شیر اس شال کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے وہ شال اپنے دانتوں میں اُٹھالی تھی، اس کو نوچنے لگا۔

اس دوران کنیز اور تھائی سب دونوں کو اتنا موقع مل گیا تھا کہ دونوں الگ الگ مقام پر جاکر چھپ گئیں۔ شیر ابھی شال ہی سے اُلجھا ہوا تھا کہ پیرامس بھی وہاں آگیا۔

اس نے شیر کو شال سے اُلجھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ تھائی سب بھی آس پاس دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ ظالم شیر نے اس کی محبوبہ کو مار ڈالا ہے۔

پیرامس کے لیے اب زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کی زندگی اپنی محبوبہ کے بغیر بے کار تھی۔ اس نے اپنی تلوار نکالی اور پوری قوت سے اپنے پیٹ میں اُتارلی۔

خوف زدہ کنیز کچھ فاصلے سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ شیر نہ جانے کیوں واپس چلا گیا تھا۔ اس نے دم توڑتے ہوئے پیرامس پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔

شیر کے جانے کے کچھ دیر بعد تھائی سب اس جگہ سے

باہر نکلی جہاں اس نے خود کو چھپایا ہوا تھا۔ اپنے محبوب کی لاش دیکھ کر اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔

اس نے پیرامس کی گری ہوئی تلوار اُٹھائی اور اپنے سینے میں اُتارلی۔ دونوں محبت کرنے والوں کی لاشیں ایک دوسرے کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔

بے بیلون والوں کو یہ چشم دید کہانی اسی کنیز نے سنائی تھی۔ اس کے بعد صدیوں تک یہ الم ناک کہانی محبت کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے کو سنائی جاتی رہی۔

○ اب اس کے بعد کے دور کی ایک داستان سنیں۔ یہ داستان پیرامس کی موت کے ہزار سال بعد کی داستان ہے مگر مکمل طور پر ناکام عشق نہیں ہے۔ ہاں، جزوی ناکام کہہ سکتے ہیں۔

(مرسلہ: عدنان فاروقی، لیہ)

انطونی اور قلوپطرہ

محبت کی وہ داستان جو نہ جانے کتنے افسانوں، ڈراموں اور فلموں کا موضوع بن چکی ہے، ان کی کہانی عالمی تاریخ کا ایک بہت اہم حصہ بن گئی ہے۔

انطونی اور قلوپطرہ کے ساتھ اس داستان کا ایک اور اہم کردار جولیس سیزر بھی ہے۔ اس بہادر شخص کو 44 بی سی میں دھوکے سے قتل کردیا گیا تھا۔

جولیس کی موت کے بعد مارک انطونی نے روم پر حکومت کی۔ انطونی ایک رومن جنرل تھا۔ جولیس کی موت کے بعد انطونی روم کا بادشاہ بن گیا لیکن اس کے ساتھ دو بادشاہ اور بھی شراکت میں تھے۔ اوکٹاویوس سیزر اور لیپائی ڈس۔

ان تینوں کے حصے میں روم کے تین مختلف علاقے تھے جن پر یہ حکومت کیا کرتے، روم کی شان وشوکت دیکھنے کے قابل تھی۔

اس کے سپاہیوں اور جنرلوں کی بہادریوں کی داستانیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے محلات، ان کے فوجی ساز وسامان، ان کی دولت، سلطنت روما ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔

محبت کی اس داستان کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ انطونی ملک کے مشرقی علاقے کا حاکم تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ شان وشوکت، دولت اور طاقت لیکن ابھی تک اس کی زندگی میں وہ لمحہ نہیں آیا تھا جو محبت کا لمحہ ہوتا

عشق کی ماری نو شہزادیاں

یونانی دیومالا میں نوشہزادیوں کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے جو عشق میں ناکام رہی تھیں۔ انہیں میوس The muses کے اجتماعی خطاب سے یاد آجاتا ہے۔ یہ نوشہزادیاں ریوس اور نیوسین کی بیٹیاں تھیں۔ جو ایک ہی دیوتا کاؤس (Chaos) سے محبت کرتی تھیں۔ جبکہ ان کے دوستوں میں ہورا، ڈایونامس، اپالو، ایفروڈائٹ، ہارمونیا اور ہیمی روس شامل تھے۔

ایک کہانی کے مطابق مقدونیہ کی ریاست ایماتھیا کے بادشاہ اور اس کی بیوی یوپی کی نو بیٹیاں تھیں جن کے نام میوسز کے نام پر رکھے گئے تھے۔ ان لڑکیوں نے شہزادیوں کے پسندیدہ مردوں سے عشق کیا چنانچہ میوسز نے انہیں مختلف پرندوں میں تبدیل کرکے ان کے نام کولمبس، بےفکس، سنچریں، کیسا، کلورس، اکلاتھس، نیسا، پیپو اور ڈرے کونٹس رکھ دیے۔

دی میوسز میں شامل نوشہزادیوں میں سے کیلی اوپ رزمیہ شاعری، کیلیو، تاریخ نگاری۔ ارٹیو، عشقیہ شاعری۔ تھالیا، مزاح اور طرب، میلپومین، المیہ، ٹریسپکور (Trepscicor) فنِ رقص۔ ایٹرپ، غنائیہ شاعری۔ پولی مینیا، گیتوں اور یورانیا علم فلکیات کی دیوی ہے۔ ان تمام اصناف کا تعلق جذبات سے ہے اسی لیے ان ٹوٹے ہوئے دلوں کی شہزادیوں کو زیوس نے فن کی دیویوں کا درجہ دیا ہے۔

اقتباس: یونان، حیرت بھرے قصوں کی سرزمیں
مرسلہ: ایاز راہی مانسہرہ

www.paksociety.com

ہے۔اس کی زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب اس نے قلوپطرہ کو دیکھا، مصر کی وہ ملکہ جس کے حسن کی مثالیں آج بھی دی جاتی ہیں۔ وہ انتہائی شان وشوکت والی عورت تھی۔ انتہائی رومانٹک، اس کی ذات سے نہ جانے کتنی داستانیں وابستہ ہیں۔

ایک داستان یہ بھی ہے کہ وہ ہر رات ایک غلام کو اپنی خواب گاہ میں مدعو کرتی اور دوسری صبح اس غلام کو مار دیا جاتا تھا۔

• کہا نہیں جاسکتا کہ اس داستان میں کتنی حقیقت ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ایک رومان پسند عورت تھی۔ انتھونی اس کی زلفوں کا اتنا اسیر ہوا کہ اس نے اسکندریہ میں رہائش اختیار کرلی اور قلوپطرہ کی زلفوں کی چھاؤں میں اس کے شب وروز گزرنے لگے۔

اُدھر روم کی صورتِ حال یہ ہوئی کہ سیکس ٹس پامپی نے سلطنت روما سے جنگ کا اعلان کردیا۔ سیکس ٹس پامپی، پامپی سینئر کا بیٹا تھا جس کو جولیس سیزر نے شکست دی تھی۔ اب وہ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے روم والوں سے اُلجھنا چاہ رہا تھا۔

انتھونی کی ضرورت اس کے وطن کو تھی، لہٰذا انتھونی اسی جنگ کے لیے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ یہاں بھی بہت افراتفری تھی۔ روم کے ایک حصے کے حاکم Octavious کی طرف سے انتھونی کو اندیشے لاحق ہوگئے تھے کہ وہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گا۔

اسے کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرنی تھی کہ اس کی اور اوکٹاویوس سیزر کی طاقت ایک ہوجائے اور دونوں مل کر دشمن کا مقابلہ کرسکیں۔

اسی دوران انتھونی کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور حکمت عملی کے طور پر اوکٹاویوس سیزر کی بہن سے شادی کرلی۔

یہ خبر جب قلوپطرہ کو ملی کہ اس کے محبوب انتھونی نے اوکٹاویوس سیزر کی بہن سے شادی کرلی ہے تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ انتھونی صرف قلوپطرہ ہی سے محبت کرتا ہے اور اوکٹاویوس کی بہن سے اس نے حکمت عملی کے تحت شادی کی ہے۔

انتھونی یونان چلا گیا۔اسی دوران اوکٹاویوس اور پامپی کے درمیان جنگ کی ابتدا ہوگئی۔ انتھونی نے بجائے ساتھ دینے کے سیزر کی بہن کو روم واپس بھیج دیا اور خود قلوپطرہ کے پاس چلا گیا۔

سیزر کو یہ بات بہت گراں گزری۔

اس نے بہ یک وقت انتھونی اور قلوپطرہ کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔

بحری جنگوں کی تاریخ میں اس جنگ کی بہت اہمیت رہی ہے۔انتھونی نے یہ جنگ سمندر میں لڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن سیزر کی بحری طاقت بہت زیادہ تھی۔ اس نے انتھونی اور قلوپطرہ کی بحری فوج کو شکست دے دی۔

قلوپطرہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لیے ایک مقبرہ بنوا رکھا تھا۔ وہ اپنی شکست سے دلبرداشتہ ہوکر اپنے مقبرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے انتھونی کو اپنی موت کی خبر پہنچادی۔

انتھونی کو جب اس کی موت کی اطلاع ملی تو اس نے خودکشی کے ارادے سے اپنے آپ کو بُری طرح زخمی کرلیا۔

لیکن ابھی اس کی تھوڑی سی زندگی باقی تھی۔ اس کے ساتھی اسے اُٹھا کر قلوپطرہ کے مقبرے پر لے گئے جہاں وہ قلوپطرہ کو زندہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

لیکن اب اس کے لیے زندگی کی مہلت ختم ہوچکی تھی۔ تاریخ کے ایک بہت بڑے جرنیل نے قلوپطرہ کے بازوؤں میں دم توڑ دیا۔

قلوپطرہ بہت بُری طرح بکھر کر رہ گئی۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔اس کا محبوب انتھونی مر چکا تھا اور وہ خود سیزر کے رحم وکرم پر تھی۔

اس نے بھی بالآخر اپنی موت کا فیصلہ کرلیا۔اپنی موت کے لیے اس نے زہریلے سانپوں کا انتخاب کیا تھا۔ یہ زہریلے سانپ اسے ڈستے رہے اور وہ لمحہ بہ لمحہ موت کی آغوش میں گم ہوتی چلی گئی۔

سیزر اس کی موت کے فوراً بعد اس کے پاس پہنچا تھا لیکن اب دنیا کی ایک خوبصورت ترین عورت لاش کی صورت میں اس کے سامنے پڑی تھی۔

اس نے حکم دیا کہ قلوپطرہ کو بھی اس کے محبوب انتھونی کے پہلو میں دفن کردیا جائے اور اس طرح قلوپطرہ اور انتھونی کی کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

(مرسلہ: دردانہ احمر علی، لاڑکانہ)

عشق ہی انسان کی معراج ہے۔ اس نے بھی ایک لڑکی سے عشق کیا تھا اور یہ عشق اسے رسوا کررہا تھا۔ اس کی دلی کیفیت کوصرف ایک شخص محسوس کررہا تھا۔ وہ تھے پیرکامل حضرت حاجی وارث علی، دیوہ شریف۔ آپ ہی کی نظرکرم تھی کہ وہ کیا سے کیا بن گیا۔

عشقِ حقیقی

زین مہدی

عشق مجازی ناکام ٹھہرا مگر عشق حقیقی نصیب ہوا اور وہ فیض عام کا منبع بن گیا

عشق ناکام نمبر

کارخانۂ قدرت میں کشش اور گریز کا ایک عجیب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔ کسی بھی حرکت کی گہرائی میں جائیے تو کشش کی قوت یا گریز کا عمل کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے گریز کہتے ہیں وہ بھی کشش کے ساتھ پیوستہ ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات کے اندر کام کرنے والے تمام معاملات کشش کی اَن دیکھی قوت پر قائم ہیں۔ ہر نوع کا نر مادہ کی جانب ایک نامعلوم طاقت کے زیرِاثر کھنچتا چلا جاتا ہے۔انتہا یہ ہے کہ مادے کے سب سے چھوٹے جزو ایٹم میں بھی ذرات کشش کے ایک نظام کے تحت آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔

کشش کی یہ عجیب وغریب قوت دراصل خالقِ کائنات کی ایک صفت ہے جو تمام مخلوقات کے اندر کارفرما ہے۔یہ قوت بندے اور خالق کے درمیان ایک ربط ہے۔اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر جب یہ قوت رونما ہوتی ہے تو ان کا شعور عالمِ اقدس کی طرف صعود کرکے اللہ تعالیٰ کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

www.paksociety.com

خاصانِ خدا کی نظر میں کشش کے تمام کرشمے مجاز ہیں۔ مجاز میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ مجاز فنا ہے لیکن مجاز جس حقیقت پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو لافانی ہے اور اسی صفت سے تمام مجازی کرشمے متحرک رہتے ہیں، عشق حقیقی اس خدائی صفت کا دیوانہ ہوتا ہے اور اس کی نظر مجاز سے ہٹ کر حقیقت پر ہوتی ہے۔

انسانی زندگی خیالات پر رواں دواں ہے۔ زندگی کی تمام حرکات خیالات سے شروع ہوتی ہیں جس نقطے پر خیال مرکوز ہو جاتا ہے وہ مظہر بن جاتا ہے اولیاء اللہ علم خیال کے ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں خیالات کو پڑھنے، خیالات کو منتقل کرنے اور خیالات کو تبدیل کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اہلِ اللہ جب اپنے شاگردوں کی روحانی تربیت فرماتے ہیں تو انسانی طبیعت اور بشری خصائل ان کے سامنے ہوتے ہیں۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد کو جو کششِ مجازی میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے اس طرح کششِ حقیقی کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ عشق مجازی عشقِ حقیقی میں بدل جاتا ہے۔

اس ضمن میں ہم جس واقعے کو بیان کرنے جا رہے ہیں اس کی کئی باتیں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ واقعہ بھارتی صوبہ یوپی کے شہر بارہ بنکی کا ہے جو لکھنو کے قریب ہے۔ وہاں ایک بہت بڑے اللہ والے رہتے تھے جن کا نام حاجی وارث علی شاہ ہے۔ انؒ کے ایک شاگرد سے اس واقعہ کا تعلق ہے۔ جس کے عشق ناکام نے اسے معراج دے دی۔ حاجی وارث علیؒ اولیاء اللہ میں بڑے صاحبِ حال و مقام بزرگ گزرے ہیں۔ شروع ہی سے ان کی طبیعت میں استغنا و توکل غالب تھا۔ دس برس کی عمر میں سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی اور اپنے پیر و مرشد کے حکم پر مختلف ممالک کی سیر کی۔ بہت سے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے اوپر نسبت عشق کا غلبہ رہتا تھا۔ حج پر تشریف لے گئے تو احرام پہننے کے بعد کوئی اور کپڑا انہیں پہنا۔ ہمیشہ احرام زیب تن رکھتے تھے۔ لوگ بطور خدمت آپ کو احرام پیش کرتے تھے اور آپ کے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ کا قیام زیادہ تر یوپی کے شہر دیوہ ضلع بارہ بنکی میں رہتا تھا۔ 1904ء میں وصال فرمایا۔ آپ سے تعلق رکھنے والے لوگ وارثی کہلاتے ہیں۔

یہ انہی کے ہاں کا اٹھارہ سو اٹھانوے کا قصہ ہے۔ حاجی وارث علی مریدوں کے جمگھٹے میں بیٹھے تھے۔ پند و نصائح کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خوش پوش شخص نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اس کی آواز نہایت بھاری تھی۔ گو کہ اس نے اپنی آواز کو ہلکا بنانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ اس کی کرخت آواز نے ہر ایک کو مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دروازے کے درمیان کھڑا اذن کا منتظر تھا کیونکہ حاجی صاحب اُدھر ہی دیکھ رہے تھے لیکن ان کی نظریں اس پر مرکوز نہ تھیں۔ اس کے پیچھے کھڑے نوجوان پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس نوجوان کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار کسی کو دیکھا ہو۔ ان کی تیز نظروں کا کمال تھا کہ وہ نوجوان خود میں سمٹنے لگا تھا۔ اسے شرماتے دیکھ کر حاجی وارث علی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے پھر ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا اور دونوں بانہیں کھول کر بولے ”عاشق آیا ہے، عاشق...... آ میرے گلے لگ جا۔“

مریدوں نے پہلی بار ایسا انداز، لہجے میں ایسی مٹھاس دیکھی تھی۔ وہ سب حیرت بھری نظروں سے نوجوان کو دیکھ رہے تھے۔

اس نوجوان کا نام عبدالکریم تھا اور وہ لکھنو کے کسی مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ عمر ہوگی یہی کوئی 14-15 سال۔ لوگ اسے حافظ عبدالکریم کہتے تھے۔

حافظ عبدالکریم نے بیعت کی درخواست کی جسے حاجی صاحبؒ نے فوراً قبول کر لیا۔

دیوہ میں حافظ کے رشتے کے چچا رہتے تھے۔ وہ انہی کے یہاں رہنے لگا۔ اس گھر میں اس کا دل لگ گیا تھا۔ وہ دن بھر ہنسی ٹھٹھول کرتا رہتا۔ اس کی اس عادت نے سب کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ حافظ عبدالکریم کی چچی نے ایک روز اس سے کہا، بچیاں بڑی ہو گئی ہیں اور باہر کے کسی شخص سے قرآن شریف پڑھوانا مناسب نہیں ہے۔ تم گھر کے لڑکے ہو، انہیں قرآن شریف پڑھا دیا کرو۔ چچا کی لڑکیوں میں ایک لڑکی تیسرا سپارہ پڑھتی تھی اور اسے سب پیاری کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حافظ کی بے شعوری کا زمانہ تھا۔ لیکن اسے اس کام میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ پیاری قرآن شریف پڑھتی رہے اور وہ سنتا رہے۔

حافظ عبدالکریم نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور پھر اپنے موضع بڑا گاؤں چلا گیا۔ کیونکہ بہن کی شادی طے ہو گئی تھی اور سب اعزا و اقارب جمع ہو رہے تھے۔ چچا صاحب بھی مع اہلِ خانہ تشریف لائے۔ تقریب کے خاتمے پر سب اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ چچی صاحبہ بھی تیاری کرنے لگیں۔ حافظ کے والدین نے انہیں روک لیا کہ چند دن بعد چلی جانا۔ چچی صاحبہ نے کہا کہ میرا رکنا تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن لڑکیوں کو اس شرط پر چھوڑ سکتی ہوں کہ حافظ عبدالکریم قرآن شریف

پڑھایا کریں۔ حافظ کی والدہ نے فوراً کہا، وہ تمہارا ہی لڑکا ہے بسر و چشم کلام پاک پڑھائے گا۔

حافظ نے نہایت جانفشانی سے کلام مجید پڑھانا شروع کیا اور بہت جلد ختم بھی کرا دیا۔ لیکن حافظ عبدالکریم کی وارفتگی میں کمی نہ آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت پیاری کی صورت اس کے سامنے رہے اور وہ قرآن شریف پڑھاتا رہے۔

حافظ اور پیاری کے درمیان پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ قرآن مجید ختم ہونے کا تذکرہ اپنی والدہ سے نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ ابھی کچھ پارے باقی ہیں۔ پیاری نے یہ بات اپنی والدہ کو بتائی تو انہوں نے حافظ سے بات کی۔ حافظ نے کہا۔ ”آپ فکر ہی نہ کریں، میں روز آ کر پڑھا دیا کروں گا۔“ چچی نے حیرانی سے کہا، اپنے گاؤں سے یہاں اتنی دور آ کر تم کیسے پڑھاؤ گے۔ لوگ کیا کہیں گے؟

حافظ نے جواب دیا، مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اور لوگوں سے کیا مطلب۔ خدا تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کا دیکھنے والا ہے۔

حافظ عبدالکریم روزانہ بعد نماز مغرب اپنے گھر سے چلتا اور نو بجے تک دیوہ شریف پہنچ جاتا۔ پھر قرآن مجید پڑھاتا۔ جب رات کچھ باقی رہتی تو وہاں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑتا اور نماز فجر گھر پر ادا کرتا۔ دو ڈھائی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا ایسی باتیں کب چھپتی ہیں، دیوہ شریف کے لوگوں میں... چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پیاری کے والد عبدالرؤف ریاست جہانگیر آباد میں ملازم تھے۔ یہ بات ان تک پہنچی تو وہ وہاں سے گھر آئے اور سخت تاکید کی کہ حافظ عبدالکریم ہمارے گھر میں نہ آئے۔ اس رات جب حافظ قرآن پڑھانے پہنچا تو اسے منع کر دیا گیا۔ یہ بات پیاری کو بھی ناگوار لگی، وہ کتاب دینے کے بہانے دروازے پر آئی اور چپکے سے کہا، سب کا خیال ہے کہ اس مکان کے بالا خانے پر جن رہتے ہیں۔ اگر تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو رات کو جن کا بھیس بدل کر آ جایا کرو۔ لیکن کسی کو خبر ہو گئی تو جان پر آ بنے گی۔ حافظ نے کہا، لوگوں کی پروا نہیں۔ میں دو تین دنوں میں انتظام کر کے آتا ہوں۔

حافظ عبدالکریم نہایت پریشانی کے ساتھ دل پر بوجھ لیے واپس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں پیاری کی ذہانت کی داد دیتا رہا تھا جس نے یہ ترکیب سوچ کر ملاقات کی راہ بجھائی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ ضرور جن بن کر جائے گا خواہ اصل جنات اسے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔

حافظ عبدالکریم چپکے سے لکھنؤ پہنچا اور مختلف قسم کے عطر، اگربتی، شیرینی، کوئلے اور دیا سلائیاں خریدیں۔ دو ہاتھ لمبی موٹی موٹی سات آٹھ سلاخیں لوہے کی بنوائیں جس کے ذریعے بالا خانے پر چڑھ سکے۔ رات کے وقت وہ تمام سامان لے کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بالا خانے پر چڑھا۔ بالا خانے پر کسی جگہ اگربتی سلگائی، کسی جگہ لوبان جلایا اور کہیں عطر و گلاب چھڑکا۔ پورا بالا خانہ خوشبویات سے مہک اٹھا۔ اچانک حافظ کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ زینے کے راستے نیچے اترے گا تو جن بننے کے ڈرامے میں اصلیت کا رنگ نہیں آئے گا۔ چنانچہ وہ کوٹھے پر سے صحن میں کود گیا۔ آواز سنتے ہی گھر والوں کی آنکھ کھل گئی۔ خواتین حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ پیاری کی والدہ نے خوف سے چراغ گل کر دیا۔ حافظ نے دالان میں پہنچ کر کہا۔ تم روز کہتی تھی کہ جن کی صورت نہیں دیکھی۔ چراغ جلاؤ اور ہماری شکل دیکھو۔“

پیاری کی والدہ نے کانپتے ہوئے کہا۔ ”خدارا! رحم کیجئے ہم آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔“

حافظ نے آواز بدل کر تیز لہجے میں کہا۔ ”ہمارے آنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہاری لڑکی قرآن پاک پڑھتی تھی تو ہم بھی سنا کرتے تھے۔ تین دن سے وہ لڑکا حافظ نہیں آ رہا اور ہمیں تلاوت قرآن سننے کو نہیں مل رہی۔“

پیاری کی والدہ نے ہمت کر کے جواب دیا حافظ کو ہم نے اپنی بدنامی کی وجہ سے منع کر دیا ہے اگر آپ قرآن شریف سننا چاہتے ہیں تو جس وقت آپ حکم کریں لڑکی اسی وقت تلاوت کر دیا کرے گی۔

حافظ نے جن کی آواز میں کہا، ہمیں قرآن شریف سننے سے مطلب ہے حافظ کے آنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم روزانہ رات کو آئیں گے اور تلاوت سنیں گے۔

حافظ روزانہ رات کو بالا خانے پر چڑھ کر خوشبو جلاتا اور پھر نیچے کود پڑتا تھا۔ قرآن شریف سننے کے بعد زینے کے راستے بالا خانے پر چڑھ کر واپس چلا جاتا تھا۔

پیاری کے گھر جن آتا ہے اس کی شہرت تمام بستی میں پھیل گئی۔ کسی نے حاجی ورث علیؒ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”ہاں ہاں پڑھا لکھا جن ہے، پڑھا لکھا جن ہے۔“

ان الفاظ سے سب نے یہی مطلب اخذ کیا کہ کوئی عالم فاضل جن ہے۔ اصل بات کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

ایک روز حافظ عبدالکریم نے تلاوت قرآن شریف کے بعد پیاری سے کہا۔ ”میں چند روز کے لئے لکھنو جا رہا ہوں

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

تا کہ جن بننے کا سامان لاؤں اگر تمہیں کچھ منگانا ہو تو بتاؤ۔"

پیاری نے عقیق البحر کی تسبیح کی فرمائش کی۔ حافظ کا خیال تھا کہ سب گھر والے سو رہے ہیں لیکن پیاری کی والدہ جاگ رہی تھیں اور انہوں نے یہ گفتگو سن لی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ بالا خانے کے جنات کو حافظ عبدالکریم نے عملیات کے ذریعے قابو کیا ہوا ہے اور ان کی مدد سے روزانہ یہاں پیاری سے ملنے آجاتا ہے۔ انہوں نے یہ بات اپنے تک محدود رکھی اور حافظ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ حافظ اب تک جن کی شکل میں پیاری کے گھر جاتا رہا۔ پھر تین ماہ بعد وہ مہمان بن کر چچا کے گھر پہنچا تو خلافِ معمول پیاری کی والدہ نے اسے حافظ کے سامنے آنے سے منع کر دیا۔

حافظ کچھ دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن پیاری سامنے نہیں آئی۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اچانک وہ کمرے سے نکل کر حافظ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

اس کی بڑی بہن نے کہا۔ "تم کیوں باہر آئیں۔ اماں جان نے باہر آنے سے منع کیا تھا۔"

پیاری نے کہا۔ "اماں جان کی بات خلافِ عقل ہے۔ حافظ عبدالکریم رشتے دار ہیں اور مجھے قرآن شریف پڑھایا ہے۔ اگر اب ان سے پردہ کروں گی تو اس میں میری بدنامی ہے۔ لوگ پوچھیں گے کہ اچانک پردہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟"

پیاری کی یہ منطق سن کر تمام خواتین دم بخود رہ گئیں۔

یہ صورتحال دیکھ کر حافظ کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اُٹھ کر جانے لگا۔

پیاری کی والدہ نے بہت روکا لیکن حافظ نہیں رُکا۔ تمام راستے اس واقعے کا خیال اسے پریشان کرتا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب جن کی شکل میں آکر ان لوگوں کی اچھی طرح خبر لے گا۔ راستے میں بے اختیار ہوکر واپس پیاری کے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ حافظ کے جانے کے بعد پیاری کی والدہ نے اس کی خوب پٹائی کی ہے۔ یہ سن کر وہ مزید بدحواس ہوگیا۔

منصوبے کے مطابق حافظ اسی رات بالا خانے پر چڑھ کر صحن میں کودا۔ اس نے گزشتہ دن اہلِ خانہ سے جن کی آواز میں کہہ دیا تھا کہ چند روز کے لئے ہم اجمیر شریف جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مہمان بن کر اگلے روز چچا کے گھر جانا چاہتا تھا۔ اہلِ خانہ اس خلاف اطلاع جن کی آمد پر حیران ہوئے۔ حافظ نے جن کی آواز میں غصے کا تاثر پیدا کیا اور کہا "تم نے لڑکی کا پردہ حافظ سے کیوں کرایا اور حافظ کے جانے کے بعد اس کو کیوں مارا؟ ہمیں اس واقعے کی خبر ہوگئی ہے اس لئے ہم اجمیر شریف سے فوراً واپس آئے ہیں۔ یہ بات جان لو کہ ہم حافظ کے قبضے میں ہیں اور جو کچھ وہ حکم دے گا ہم اس کو بجا لائیں گے ہمیں تمہاری اس حرکت سے بہت رنج ہوا ہے۔ اب حافظ تمہارے گھر نہیں آئے گا۔"

سارے گھر والوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ طرح طرح سے خوشامد کرنے لگے تا کہ خطا بخش دی جائے لیکن حافظ (بشکلِ جن) نہ مانا۔ اگلے دن حافظ عبدالکریم مہمان بن کر پیاری کے مکان کے برابر میں ایک اور عزیز کے ہاں ٹھہرا۔ پیاری کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ حافظ آیا ہے اور کسی دوسرے عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے تو جنات کے ڈر سے انہیں بہت پریشانی ہوئی۔ کئی بار خادماؤں کو بھیجا کہ حافظ کو بلائیں لیکن حافظ نے آنے سے انکار کر دیا۔ رمضان کا مہینا تھا چنانچہ جب افطار کا وقت ہوا تو انہوں نے افطار بھی بھیجا۔ حافظ نے اسی افطاری سے روزہ کھولا صرف اس خیال سے کہ افطاری کی تیاری میں پیاری کے ہاتھ لگے ہوں گے پھر اس افطاری میں کہیں اور سے آئی ہوئی افطاری ملا کر چچی صاحبہ کے گھر واپس کر دی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ حافظ نے ان کے گھر کی افطاری نہیں کھائی تو ناراضی دور کرنے کے لیے رات کو خود گئیں اور زبردستی اسے ساتھ لے کر آئیں۔ کھانے کے لیے بٹھایا اور پیاری سے کہا کہ وہ حافظ کے لیے کھانا لائے۔

حافظ عبدالکریم نے پیاری کے خیال میں کھانا شروع کیا تھا کہ اچانک چچی صاحبہ کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ وہ سب گھر والوں کو مارنے لگیں لیکن حافظ اور پیاری کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ مارتے مارتے وہ کنوئیں کی طرف دوڑیں لوگوں نے فوراً پکڑ لیا۔ نصف شب تک چچی صاحبہ کا دماغی توازن اسی طرح خراب رہا۔

پیاری نے گھبرا کر حافظ سے پوچھا، کہیں آپ نے تو کچھ نہیں کروایا۔

حافظ عبدالکریم نے جواب دیا، یقین جانو میں نے کچھ نہیں کیا شاید حرارتِ قلب زیادہ ہونے سے حواس پر اثر پڑا ہے۔

پیاری کی بڑی بہن نے حافظ سے کہا۔ آپ ایک خط والد صاحب کے نام لکھ دیں تا کہ ملازم کے ہاتھوں بھیج کر جہانگیر آباد سے انہیں بلالیا جائے۔ کیوں کہ والدہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حافظ نے خط لکھ دیا لیکن اس بات کا اندیشہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا کہ پیاری کے والد جہانگیر آباد سے آگئے تو نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔ اس نے عظمت نامی ملازم کو الگ لے جا کر پوچھا، عظمت تم جانتے ہو یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

عظمت نے کہا، مجھے سب معلوم ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ ان لوگوں نے آپ کو ناراض کر دیا ہے اور آپ کے قبضے میں جو جنات ہیں وہ انہیں پریشان کر رہے ہیں جب تک یہ لوگ آپ کو راضی نہیں کریں گے اسی حالت میں رہیں گے۔

حافظ دل میں خوش ہوا کہ عظمت بھی جنات کی کارروائی کا قائل ہے۔ اس نے کہا، میں جنات کو بہت سمجھا رہا ہوں لیکن وہ مانتے نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم خط لے کر جاؤ اور وہ تمہارے خلاف بھی کارروائی کریں۔

عظمت خوف کے مارے کانپنے لگا۔ حافظ نے کہا، ایسا کرو کہ جب تمہیں خط ملے تو تم باہر جاتے ہی زمین پر گر کر لوٹنے لگنا گویا کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہوگئے ہیں۔ اس طرح تم خط لے جانے سے بچ جاؤ گے اور لوگ سمجھیں گے کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہوگئے ہیں۔

عظمت نے ایسا ہی کیا۔ خط لے کر کچھ دور چلا اور زمین پر گر کر لوٹنے اور چیخنے پکارنے لگا۔ جو قریب گیا اس کو زوردار طمانچہ رسید کیا۔

پیاری کے ایک عزیز آئے ہوئے تھے اور پیاری کی والدہ کی طبیعت بحال کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، شور سن کر باہر آئے اور یہ منظر دیکھ کر کہا، مستورات کی حالت پہلے خراب ہے ایک مرد تھا اس کا بھی یہ حال ہوگیا ہے۔ حافظ نے تو حد کر دی ہے تمام گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ حافظ کے پاس آئے اور کہا، بھائی! ان کی غلطی کو معاف کرو۔ کیا کسی کا خون کر کے خوش ہو گے۔ مستورات بے پردہ ہو جائیں گی تب تمہیں چین آئے گا۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ عظمت اٹھ کر گھر میں آیا اور کہا، اگر کسی نے حافظ عبدالکریم کے خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔

پیاری کی والدہ نے جن کی طبیعت اس وقت کسی قدر بہتر ہوگئی تھی کہا، میں ان کے خلاف کچھ نہیں کروں گی بلکہ جو وہ کہیں گے کیا جائے گا۔

حافظ عبدالکریم صبح کے وقت اپنے گھر روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ پیاری کے ایک قریبی عزیز بھی تھے۔ ان سے حافظ کی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کہا، میں جہانگیر آباد پیاری کے والد کے پاس جا رہا ہوں تم بھی چلو۔ میں رات کے واقعے کا ذکر کروں گا اور ان پر زور دوں گا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی تم سے کر دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو رسوائی کے علاوہ کسی نہ کسی کا خون ہو جائے گا۔

حافظ عبدالکریم ان کے ساتھ جہانگیر آباد چلا گیا۔ پیاری کے عزیز نے تمام واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور کہا کہ حافظ کے قبضے میں دو جن بھی ہیں۔

پیاری کے والد تمام واقعہ اور جنات کا تذکرہ سن کر طیش میں آگئے، کہا "چاہے کچھ ہو جائے۔ ہرگز شادی نہیں ہوگی۔"

پھر حافظ سے نہایت برہمی میں انہوں نے کہا "جنات کیا تم نے قابو میں کر لیے ہیں سمجھتے ہو کہ خدائی قبضے میں کر لی ہے۔ سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہم اسی وقت گھر جا رہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ جنات ہمارا کیا کر لیتے ہیں؟"

حافظ عبدالکریم نے نہایت اطمینان اور بے پروائی سے جواب دیا۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جنات تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ چاہیں تو ابھی اور یہیں تماشا دیکھ لیجیے۔"

غیر متوقع جواب سن کر پیاری کے والد کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھبرا کر کہنے لگے، کیا یہاں بھی تم اپنے گھرانے کو بے آبرو کرو گے۔

حافظ نے کہا، آپ لوگ خود ہی جنات سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو انہیں روک رکھا ہے۔ اس وقت تو جنات میرے ساتھ موجود ہیں اور اجازت طلب کر رہے ہیں۔

پیاری کے والد نے کہا، خدا کے لئے معاف کرو۔ تین دن بعد مجھ سے ملنا میں سوچ کر تمہیں جواب دوں گا۔

حافظ عبدالکریم تیسرے روز پھر جہانگیر آباد پہنچا۔ پیاری کے والد کے پاس بہت سے لوگ مہمان تھے جو ان کے رشتے دار بھی تھے۔ کسی نے حافظ سے بات نہیں کی۔ حافظ واپس اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا تو پیاری کے ایک رشتہ دار ساتھ ہو لیے۔ دورانِ سفر انہوں نے کہا، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری وجہ سے ایک خون ہونے والا ہے۔ حافظ کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا "لڑکی کے والد اور چچا کو تم دونوں کے جذبات کا علم ہوگیا ہے۔ شرفاء میں اس قسم کے واقعات سے بڑھ کر کوئی بات باعثِ شرم نہیں ہوتی اس لیے تمام رشتہ داروں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ لڑکی کو مار دیا جائے تا کہ مزید بدنامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کام کے لئے ابھی ابھی دونوں بھائی دیوہ شریف گئے ہیں۔"

حافظ عبدالکریم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس

www.paksociety.com

کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پیاری کے عزیز نے حافظ کو مشورہ دیا۔

''میاں! اب تو تمہارا زندہ رہنا لا حاصل ہے تمہیں بھی اپنی جان کا نذرانہ دے دینا چاہیے۔''

حافظ عبدالکریم نے اپنے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اسی وقت دیوہ شریف کو چلا جہاں پیاری کا گھر تھا۔ راستے بھر طرح طرح کے خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ بار بار اس کے دل سے یہی آواز آتی کہ پیاری کے بعد زندہ رہنا بیکار ہے۔ تم کو بھی جان دے دینی چاہیے۔ اس کے گھر میں جو کنواں ہے اس میں کود کر چراغِ زندگی گل کر دینا چاہئے۔

حافظ عبدالکریم سہ پہر کو دیوہ شریف میں پیاری کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دروازہ بند تھا۔ یہ خاموشی اسے موت کا سناٹا محسوس ہوئی اور یہ خیال بن گیا کہ پیاری اس دنیا میں نہیں رہی۔ حافظ نے کئی چکر مکان کے لگائے لیکن کھڑکی کھلی دکھائی دی اور نہ کوئی دروازہ، رمضان شریف کے دن تھے۔ بوقتِ افطار حافظ نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

حافظ عبدالکریم نے الا اللہ کا نعرہ لگایا اور مکان کے اندر داخل ہو کر سیدھا کنوئیں تک جا پہنچا اور سر کے بَل کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگاتے ہی ایک عجیب معاملہ ہوا۔ حافظ کو یوں لگا، جیسے کسی نے اس کے جسم کو سنبھال لیا ہے اور جب وہ نیچے پہنچا تو اس کا سر اوپر اور پیر نیچے تھے۔ پھر بھی اس کے دونوں ہاتھوں میں سخت چوٹ آئی، ایک ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ کر باہر نکل آئی۔ اتفاقاً پیاری کی والدہ نے حافظ کو کنوئیں میں چھلانگ لگاتے دیکھ لیا۔ انہوں نے شور مچا کر رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جمع کر لیا۔ رشتہ داروں نے پیاری کو ایک کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنوئیں میں اینٹیں اور پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ شور و غل اتنا زیادہ ہوا کہ ہر طرف اطلاع پھیل گئی۔ سید معروف شاہ وارثی دیگر معززین شہر کو لے کر حافظ کی اعانت کے لئے پہنچے۔ پیاری کی والدہ پر اظہار ناراضی کیا اور کنوئیں کے قریب پہنچ کر آوازیں دیں۔ کنوئیں کے اندر حافظ گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہوا تھا اُدھر پیاری کمرے میں چیخ رہی تھی کہ آج تم لوگوں نے حافظ کی جان لے لی۔ اب تو خدارا دروازہ کھول دو۔ یہ آواز حافظ کے کانوں میں پہنچی تو اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پوری قوت سے آواز لگائی، میں زندہ ہوں۔''

حافظ کو باہر نکالا گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا۔ ''مزہ ہے پیاری کا۔''

سید معروف شاہ حافظ کو اپنے مکان پر لائے، دودھ پھٹکری پلائی اور کہا، میں کہاروں کو بلاتا ہوں وہ تمہیں پالکی میں بٹھا کر گھر چھوڑ دیں گے۔ لڑکی کے والد جہانگیر آباد سے آنے والے ہیں۔ نہ جانے تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے لڑکی کا معاملہ ہے اس لئے تمام بستی والے بھی اُن کا ساتھ دیں گے۔

حافظ نے کہا مجھے جان کی پروا نہیں ہے میں نے تو جان دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جان جانے سے رہ گئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

حافظ کے ایک رشتہ دار اسے اپنے گھر لے گئے۔ اسی رات پیاری کے والد بھی جہانگیر آباد سے آ گئے۔ حافظ کی حالت عجیب تھی۔ اسے نہ چوٹ کا احساس تھا۔ اور نہ تکلیف کا خیال۔ وہ پوری رات جاگتا رہا۔

صبح کو یہ اطلاع زبان زدِ عام ہوئی کہ حاجی وارث علی شاہؒ دیوہ تشریف لا رہے ہیں۔ اس زمانے میں عبدالکریم کا حاجی صاحب کے بارے میں صرف یہ خیال تھا کہ حاجی صاحب ایک پیر ہیں جن کا سب لوگ حکم مانتے ہیں۔ حافظ، حاجی صاحب سے بیعت ہو گیا تھا لیکن مرتبہ ولایت کا ادراک و احساس اسے نہ تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ لوگ جب اس معاملے کی اطلاع انہیں دیں گے تو ایسا نہ ہو کہ وہ اسے دیوہ شریف سے باہر نکلوا دیں۔ حافظ نے ان تمام لوگوں سے جو حاجی صاحب سے قربت رکھتے تھے، طرح طرح کی خوشامد کی اور بڑی منت سماجت سے کہا۔ خدارا سفارش کر کے مجھے دیوہ شریف سے نہ نکلنے دینا۔ لیکن جو بھی یہ بات سنتا کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔

صبح آٹھ بجے سید معروف شاہ وارثی اور دیگر معززین شہر حاجی صاحب کے استقبال کے لئے پہنچے۔ حاجی صاحب ان لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا:۔

''کیوں، کیوں! حافظ کنوئیں میں کود پڑا۔ کیوں ایسا کہا جو وہ کود پڑا۔'' پھر سید معروف شاہ سے مخاطب ہوئے۔ ''سنا، سنا محبت ایسی تو ہو جیسی حافظ کو ہے۔''

سید معروف شاہ نے تمام رودادِ عشق بیان کی حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔ ''پاک محبت ہے پاک محبت ہے مگر دنیا کے لوگ نہیں مانیں گے اور ان کی بدنامی ہو گی۔ حافظ عاشق ہے حافظ عاشق ہے۔''

جب لوگوں نے حاجی صاحب کی یہ باتیں سنیں تو حافظ کی طرفداری میں بولنا شروع کر دیا۔ حافظ کو جب اس بات کا علم ہوا تو ہمت کر کے حاجی صاحب کے پاس پہنچا اقامت گاہ کا دروازہ بند تھا۔ خادم نور محمد شاہ نے حافظ کے آنے کی اطلاع دی۔ حاجی صاحب نے فرمایا ''حافظ مستان حافظ مستان''

حافظ اندر داخل ہوا تو حال یہ تھا کہ وہی خون آلود کپڑے جسم پر تھے جو کنوئیں میں گرتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا۔

''حافظ، حافظ ضبط نہیں ہوا، کنوئیں میں کود پڑے۔ کون سا ہاتھ ٹوٹا، کون سا ہاتھ ٹوٹا؟''

یہ کہتے کہتے حاجی صاحب نے حافظ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو ہڈی اپنی جگہ بیٹھ کر بالکل جڑ گئی چوٹ کا اثر ختم ہو گیا۔ حاجی صاحب نے کہا ''حافظ، حافظ! وہ لوگ تمہارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اب ان کے گھر نہیں جانا۔''

حافظ نے یہ حکم سن تو لیا لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ محبوب کے در کو چھوڑ دے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دوہرایا، میں ضرور جاؤں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ حاجی صاحبؒ نے کئی مرتبہ زور دے کر کہا۔

''تم نے نہیں جانا، وہ لوگ مار ڈالیں گے۔''

حاجی صاحبؒ سے رخصت ہو کر حافظ باہر نکلا تو دیوانگیٔ شوق نے اس قدر شدت اختیار کی کہ بے تابانہ پیاری کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود لوگوں نے اُس کی خوب پٹائی کی اور دھکے دے کر نکال دیا۔ بعد ازاں پیاری کے گھر والوں نے کئی چوکیدار مقرر کر دیئے تاکہ حافظ مکان کی طرف نہ آئے۔ نیز کئی عورتیں بھی ہمہ وقت پیاری کے ساتھ رہتی تھیں۔

ایک روز حافظ بے تابی کے عالم میں صدا لگاتا ہوا پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ پیاری بھی دوڑتی ہوئی چھت پر چڑھ گئی۔ عورتوں نے اسے پکڑا اور کھینچتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ مکان کے زینے کو توڑ کر گرا دیا گیا۔

حافظ عبدالکریم کی حالت دیوانگی یہ ہو گئی کہ اُس کا نام حافظ پیاری رکھ دیا گیا۔ لوگ اُس سے مذاقاً کہتے۔ ''حافظ! پیاری نے کہا ہے کہ میرے نام سے سو جوتے مارو۔'' پیاری کا نام سن کر حافظ بسر و چشم سر جھکا کر بیٹھ جاتا اور لوگ اُسے جوتے مارتے۔

حاجی صاحبؒ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو حافظ کو بلا کر کہا۔ ''حافظ تم کسی کے کہنے سننے میں نہ آیا کرو اور نہ کسی کا اعتبار کرو۔ جب وہ خود آ کر کہے تو یقین کیا کرو۔''

حافظ عبدالکریم پیاری کے مکان کے گرد طواف کرتا اور مختلف صدائیں لگاتا رہتا۔ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ارشاد فرماتے۔ ''جاؤ! شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر صدا لگاؤ۔'' چنانچہ حافظ اکثر شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہو کر صدائیں لگاتا اور دیوانِ حافظ کے اشعار پڑھتا۔

ایک روز اُس نے پیاری کے مکان کا طواف کیا اور صدا لگائی تو پیاری کی والدہ دیگر عورتوں کو ساتھ لے کر حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچیں اور کہا۔ ''حضرت! حافظ ہمیں بدنام کرتا ہے اور ہماری لڑکی کا نام سب کے سامنے لیتا ہے۔''

حاجی صاحبؒ نے کہا۔ ''اگر وہ ایسا ہے تو ہم اُسے ابھی دیوہ سے نکلوا دیتے ہیں۔'' خادم نور محمد شاہ کو حکم دیا۔ ''حافظ کو ابھی پکڑ کر لاؤ۔''

نور محمد شاہ نے یہ واقعہ حافظ کو بتایا تو حافظ ایک چاقو اپنے ساتھ لے کر گیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر حاجی صاحبؒ نے اُسے دیوہ شریف سے نکلنے کا حکم دیا تو وہ اسی چاقو سے خود کو ہلاک کر لے گا۔

حافظ حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا لیکن اُنہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے حافظ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ اسی زمانے میں حافظ اکثر پتنگ اُڑاتا اور جان بوجھ کر پتنگ پیاری کے گھر میں گرا دیتا۔ پھر یہ کہتے ہوئے مکان پر جا پہنچتا کہ ہماری پتنگ آ گری ہے۔ کئی بار وہاں سے زد و کوب کر کے باہر نکالا گیا۔ حاجی صاحب نے حافظ کو بلا کر کہا۔ ''حافظ! تم ہمارے کوٹھے پر پتنگ اُڑایا کرو۔''

راہِ عشق میں آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ طرح طرح کے واقعات و معاملات پیش آتے رہے۔ ایک روز حاجی وارث علیؒ نے حافظ عبدالکریم سے کہا۔ ''حافظ حافظ! تم ہماری صورت دیکھا کرو۔'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ترجمہ:۔ ''ہم تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہیں۔''

حافظ نے کہا۔ ''حضور! دنیا میں پیاری سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ کس کو دیکھوں؟ اگر آپ اُس سے زیادہ حسین ہوتے تو آپ کو دیکھتا۔''

یہ جواب سن کر حاجی صاحب مسکرائے اور حافظ کو گلے لگا کر فرمایا۔ ''عاشق کے سوا کسی کی جرأت نہیں کہ ایسی بات کہہ سکے۔''

ایک عرصے بعد حاجی وارث علیؒ نے حافظ سے کہا۔ ''حافظ حافظ! خدا اور رسول تم کو ملیں گے۔ وہ لڑکی ملے یا نہ:

www.paksociety.com

ملے۔“

حافظ نے گھبرا کر کہا۔ ”نہیں حضور مجھے کچھ نہ ملے، وہ لڑکی مل جائے۔ اگر خدا اور رسول کو بھی اسی صورت میں دیکھوں گا تو مانوں گا، ورنہ میں سب سے باز آیا۔“

یہ سن کر حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”عاشق کے سوا کوئی ایسا کفر بک نہیں سکتا۔“

حافظ عبدالکریم پر عشق کی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلتا۔ ”مزہ ہے پیاری کا۔“ دیوانِ حافظ کے اشعار اکثر اُس کی زبان پر ہوتے تھے۔ ایک روز حافظ کو معلوم ہوا کہ پیاری اور اُس کی والدہ حاجی صاحبؒ کے پاس آئی ہیں۔ حافظ مکان کے زنانہ حصے کے پاس پہنچ گیا اور صدا لگائی۔ حاجی صاحبؒ نے آواز سنتے ہی ماں بیٹی کو واپس جانے کا کہا۔ وہ دونوں دروازے پر آئیں لیکن حافظ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر پیاری کی والدہ نے مرزا منعم بیگ وارثی کو بلا کر کہا کہ حافظ کو دروازے سے ہٹایا جائے۔

مرزا صاحب نے حافظ سے کہا۔ ”یہ زنانہ دروازہ ہے۔ اگر صدا لگانی ہے تو مردانہ حصے کی طرف جاؤ۔“ انہوں نے حافظ کو خوب بُرا بھلا بھی کہا۔ ”میں حاجی صاحب سے تمہاری شکایت کر کے تمہیں نکلواتا ہوں۔“

حافظ نے کہا۔ ”جاؤ! تم خدا سے بھی کہہ دو، میں نہیں جاؤں گا۔“

ایسا کفر سن کر مرزا صاحب کی عجیب حالت ہوگئی۔ کبھی اندر کی طرف جاتے اور کبھی باہر آجاتے۔ اُسی وقت پیاری حافظ کے پاس آئی اور کہا۔ ”حافظ بھائی! کسی سے کچھ کہتے تھوڑا ہی ہیں، سب سہتے ہیں۔“

پیاری کو سامنے دیکھ کر حافظ کی حالت ناقابلِ بیان ہوگئی اور اُس نے سرِ تسلیم جھکا دیا۔

پیاری اور اُس کی والدہ رخصت ہوگئیں۔ مرزا منعم بیگ صاحب نے حاجی وارث علیؒ سے حافظ کی شکایت کی۔ حاجی صاحبؒ نے حافظ کی طرف ایک نگاہ کی اور مسکرا کر کہا۔ ”عبدالرؤف (پیاری کے والد) کے گھر میں کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو لے کر ہمارے ہاں نہ آیا کریں۔ حافظ عاشق ہیں، کسی روز پکڑ لیا تو قیامت تک چھوٹنا مشکل ہے۔“

حافظ عبدالکریم عشق کی سرمستی میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ہوش و خرد رخصت ہوگئے۔ لوگ اُن کی اِس حالت کا نہ صرف مذاق اُڑاتے بلکہ طرح طرح سے فائدہ اُٹھاتے...... نائن پیاری کے ناخن اور بال لے کر آتی اور حافظ رقم دے کر خرید لیتا تھا۔ دھوبن اس کے کپڑے لاتی۔ حافظ اُسے پیسے دیتا اور پیاری کے کپڑوں کو دیکھتا اور اُس کی خوشبو سونگھتا۔ اس طرح اُس نے ایک بڑی رقم صرف کر دی۔

حافظ اکثر حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں طرح طرح کی مٹھائیاں اور تحائف پیش کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ حاجی صاحبؒ اِن چیزوں کو تقسیم کریں گے تو کچھ نہ کچھ پیاری کے گھر بھی جائے گا۔ یہ خیال اُس کی قلبی تسکین کا باعث بنتا۔ حافظ جو تحفہ پیش کرتا حاجی صاحبؒ اُسے تقسیم کرنے کے بجائے پورے کا پورا پیاری کے گھر بھجوا دیتے تھے۔

ایک روز کسی شخص نے حافظ سے کہا۔ ”حافظ! اگر تم پانچ روپے مجھے دو تو تمہیں پیاری سے ملوا دوں گا۔“

رقم بڑی تھی اور حافظ کے پاس نہیں تھی اس لئے خاموش ہوگیا۔ اُن صاحب نے متبادل راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ کہ فلاں رئیس حاجی صاحب کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اُن کی جیب میں سونے کی انتہائی قیمتی گھڑی ہے۔ کسی طرح وہ گھڑی تم ہمیں لا دو تو ہم تمہارا کام کر دیں گے۔

حافظ دن کے دس گیارہ بجے کوٹھے پر چڑھا، سیدھا کمرے میں داخل ہو کر جیب سے گھڑی نکالی اور تیر کی تیزی سے واپس ہو کر کوٹھے پر سے کود پڑا۔ وہ رئیس چلّائے کہ حافظ! گھڑی لے کر کہاں جا رہے ہو؟ شور سن کر لوگوں نے حافظ کو پکڑ لیا اور گھڑی سمیت حاجی صاحبؒ کے سامنے پیش کیا۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا۔ ”حافظ کو نکال دو۔ یہاں نہ آنے پائے اور جہاں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں اُن سے بھی کہو کہ اپنے مکان پر ٹھہرنے نہ دیں۔ یہ ہمیں بدنام کرتے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ ہم لوگوں سے چوری کراتے ہیں اور ہماری بھی شراکت ہوگی۔“

چنانچہ حافظ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد حافظ کو معلوم ہوا کہ حاجی وارث علیؒ رودولی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ پیاری کے گھر والوں نے یہ منت مانی ہے کہ اگر حافظ کو نکال دیا جائے تو وہ حاجی صاحبؒ کی دعوت کریں گے اور اُن کو نیا احرام پیش کریں گے اور جلد ہی وہ اس تقریب کا اہتمام کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سن کر حافظ کے دل کی حالت بُری ہوگئی۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھی حاجی صاحب کی دعوت کرے گا اور خاص دیوہ میں، جہاں سے وہ نکالا جا چکا ہے۔ حافظ رودولی پہنچ کر حاجی صاحبؒ کے خادموں سے ملا اور اُنہیں تحائف وغیرہ دیئے تاکہ وہ حاجی صاحب کو مناسب وقت اطلاع کریں۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”وہ ہماری دعوت دیوہ میں کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ چوری سے بدنام ہوگئے ہیں اور ہمیں بھی بدنام کیا ہے۔ رات کو پھر لوگوں نے حافظ کا مدعا پیش کیا تو فرمایا۔ ”اچھا بلاؤ!“ حافظ ڈرتے ڈرتے اندر گیا۔ حاجی صاحب نے تمام حال پوچھا اور کہا۔ ”اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ ہماری گردن مار دو تو ہم اُس لڑکی (پیاری) سے ملا دیں گے۔ تو تم کیا کرو گے؟“

حافظ نے نہایت بے باکی سے کہا۔ ”حضور! میرے بس میں ہوتا تو ضرور ایسا کر گزرتا۔“

حاجی وارث علیؒ مسکراتے ہوئے اُٹھے اور حافظ کو گلے لگا کر کہا۔ ”جاؤ دیوہ میں تمہاری دعوت ہمیں منظور ہے۔“

حاجی وارث علیؒ دیوہ تشریف لے گئے تو پیاری کے گھر والوں نے دعوت کی اور احرام پیش کیا۔ حاجی صاحب کے سامنے شیرینی پیش ہوئی تو حافظ یہ سوچ رہا تھا کہ اس شیرینی میں پیاری کے ہاتھ بھی لگے ہوں گے۔ خدا کرے مجھے بھی نصیب ہو۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ سب کو شیرینی تقسیم ہوئی لیکن حافظ کو نہیں ملی۔ اچانک حاجی صاحبؒ نے کہا۔ ”حافظ حافظ! تم کو حصہ نہیں ملا۔“ پھر اپنے ہاتھ سے مٹھائی دی۔ پیاری کے گھر سے کھانا آیا تو کھانے میں سے بھی عطا کیا اور فیرینی کی مٹی سے بنی رکابیاں بھی حافظ کو دیں۔ حافظ فیرینی کھانے کے بعد رکابیاں بھی توڑ توڑ کر کھا گیا۔ بعد ازاں حافظ نے حاجی وارث علیؒ کی دعوت کی اور احرام تبدیل کرایا۔

کچھ عرصہ بعد پھر حافظ کی شکایتیں حاجی وارث علیؒ تک پہنچیں کہ وہ پیاری کے گھر پر جا کر صدا لگاتا ہے تو آپ نے حافظ کو دیوہ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ حافظ دیوہ سے باہر خستہ حال و پریشان پھرتا رہا۔ ایک روز حلوہ لے کر حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا۔ خادموں نے اندر اطلاع کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ ایک نووارد شخص نے اندر جا کر حاجی صاحب سے کہا۔ ”ایک عاشق آیا ہے۔“

فرمایا۔ ”عاشق کو کون روک سکتا ہے؟ اندر آنے دو۔“

حافظ حاجی صاحب کے پاس پہنچا تو وہ مسکرائے۔ حلوہ پیش کیا تو اُسی وقت سارا حلوہ پیاری کے گھر بھجوا دیا۔ اُن دنوں پیاری کے چچا اپنے بھائی کے گھر آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے حافظ کو بلوایا۔ حافظ خوشی خوشی پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ چچا صاحب نے پہلے تو حافظ کو سمجھایا کہ وہ پیاری کا نام لینا ترک کر دے اور دیوہ سے چلا جائے لیکن حافظ نہ مانا۔ اُنہوں نے دست پناہ گرم کر کے حافظ کو داغنا شروع کر دیا۔ کسی شخص نے حاجی صاحبؒ تک اطلاع پہنچائی کہ حضور! آج فیصلہ ہوگیا۔ حافظ اُن کے گھر میں بند ہے۔ ضرور مار ڈالیں گے۔ حاجی صاحبؒ اُٹھ کر دروازے تک آئے اور فرمایا۔ ”عاشق کو مار ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔“

خُدام نے گھبرا کر کہا۔ ”حضور! عاشق ہیں، گھر میں گھس گئے ہوں گے۔“ پھر خُدام پیاری کے گھر پہنچے اور حافظ کو نکال کر حاجی صاحبؒ کے پاس لائے۔

حافظ نے اُس وقت پیاری کے ہاتھ کا سِلا ہوا کرتہ پہنا ہوا تھا۔ کرتا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور جسم زخموں سے داغدار تھا لیکن حافظ کو صرف اس بات کا ملال تھا کہ پیاری کے ہاتھ کا سِلا ہوا کرتہ پھٹ گیا۔ اُسے زخموں کی قطعی پروا نہیں تھی۔ حاجی صاحبؒ نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ ”ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ حافظ کو مارنے سے کیا حاصل؟“

حافظ اسی مجذوبانہ حالت میں زندگی گزارتا رہا۔ اک روز حاجی وارث علیؒ نے حافظ کو بلایا اور کہا۔ ”تم بہرائچ جاؤ اور کل آ کر ہم سے پیتے پور میں ملو۔“

حافظ اُسی وقت پیدل بہرائچ پہنچا اور حضرت سیّد سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کی لہر آئی اور اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے گاؤں میں مکان پر بیٹھا ہے۔ اتنے میں حاجی وارث علیؒ تشریف لائے اور فرمایا۔ ”حافظ! تم ہماری دعوت کرو تو پیاری تمہیں مل جائے گی۔ گیارہ تاریخ اور دن دو شنبے کا ہونا چاہئے۔ اب ہم دیوہ جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

غنودگی کی اسی کیفیت میں حافظ دیوہ پہنچا اور شاہ منعم صاحبؒ کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ مزار کا تعویذ غائب ہے اور شاہ منعم صاحبؒ بیٹھے ہوئے قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حافظ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”یہ تو فرمایئے پیاری مجھے کب ملے گی؟“

شاہ منعم صاحبؒ نے جواب دیا۔ ”چادر چڑھاؤ گے تو ملے گی۔“ یہ کہہ کر اُنہوں نے حافظ کو واپسی کا اشارہ کیا۔ حافظ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ حضرت سیّد سالار کے مزار پر بیٹھا ہوا ہے۔

حافظ مزار سے باہر نکلا تو ایک اجنبی شخص آیا اور تین سو روپے حافظ کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ حافظ دوسرے دن پیتے پور پہنچا۔ حساب لگایا تو پیر کے دن گیارہویں تاریخ آنے والی تھی۔ چنانچہ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچ کر کہا۔ گیارہ تاریخ کو پیر کے دن آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔“

حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”پیر کے بجائے جمعہ کو

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کر دینا۔“

حافظ نے کہا۔ ”حضور ہی نے پہلے پیر کا دن مقرر فرمایا تھا۔“

مسکرا کر جواب دیا۔ ”اچھا یہی سہی۔“

حافظ عبدالکریم دیوہ پہنچا اور شاہ منعم صاحبؒ کے سجادہ نشین سے ملا۔ اُن سے عالم رویا، کا تمام واقعہ بتایا۔ حافظ نے جو شکل و شباہت شاہ منعم صاحب کی دیکھی تھی۔ سجادہ نشین نے اُس کی پوری تصدیق کر دی۔

گیارہ تاریخ کو صبح دس بجے حافظ نے حاجی وارث علیؒ کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حاجی صاحبؒ نے پوچھا۔ شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر چادر کب چڑھاؤ گے؟“

حافظ نے کہا۔ ”حضور کی دعوت کے بعد وہاں جاؤں گا۔“

دعوت کے بعد حافظ شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور چادر چڑھائی۔ حاجی صاحبؒ کی دعوت کرنے اور شاہ منعم صاحبؒ کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد حافظ کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی شخص پیاری کو اُس سے نہیں چھین سکتا۔ اُس کے دل کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ اُس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اب وقت کا انتظار کرنا فضول ہے۔ گھر میں جا کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آنا چاہیے۔ یہ خیال اُس کے دل میں راسخ ہو گیا۔ وہ کشاں کشاں پیاری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ راستے میں حاجی وارث علیؒ کا آستانہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ خیال آیا کہ چلو پہلے قدم بوسی کر لیتے ہیں پھر پیاری کے گھر چلتے ہیں۔ دیکھا کہ آستانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ حافظ اندر داخل ہو کر حاجی صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔

حاجی وارث علی تو نہ دکھائی دیئے البتہ ایک ایسا منظر جو اُس کا منتظر تھا جو بجلی بن کر اُس کے ہوش و حواس پر گرا۔ حافظ پتھر کا بت بن کر رہ گیا اور پلکیں جھکانے کی طاقت تک باقی نہ رہی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی معصوم روپ ہے، وہی دلکش انداز ہے، وہی رنگ و رعنائی ہے۔ وہی پیاری ہے جس نے اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ پیاری کانوں میں بجلیاں اور گلے میں چندن ہار پہنے گلابی دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ پیاری نے نظریں اُٹھا کر حافظ کی طرف دیکھا۔ ایک برق سی حافظ کی نگاہوں کے سامنے کوند گئی۔ حافظ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور بے اختیار سربسجود ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد ہوش و حواس بحال ہوئے تو دل چاہا کہ دوبارہ اس مجسمۂ حسن کو دیکھے۔ سر جو اُٹھایا تو عالمِ حیرت و تحیر میں ڈوب گیا۔ وہاں نہ پیاری موجود تھی اور نہ اُس کے حسن و جمال کی روشنی۔ بلکہ حاجی وارث علی شاہؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے اختیار اُسکی زبان سے نکلا۔ ”حضور! یہ کیا؟“

فرمایا۔ ”یہی صورت ہے، اسی کے ساتھ تمہارا حشر ہے اور جہاں کہیں دیکھو گے اسی صورت کو دیکھو گے۔“

اِس مشاہدے اور اِن الفاظ میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ حافظ عبدالکریم کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ ماضی کے تمام جذبات و خیالات اِس طرح ختم ہو گئے جیسے پانی ریت پر بنے نقوش کو مٹا دیتا ہے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھتا رہا ہے اور اب تک کچھ ہوا ہی نہیں۔ اُس کی نگاہوں نے حاجی وارث علیؒ کے اندر ایک ایسا نظارہ دیکھا تھا جس کی حقیقت و معنویت اُس کے قلب پر ظاہر ہو گئی تھی۔ پیاری کے عشقِ ناکام نے اس کے لیے عشقِ حقیقی کا در کھول دیا تھا۔

اس منظر کو دیکھنے کے بعد حافظ عبدالکریم عرف حافظ پیاری صاحب نے کبھی پیاری کے گھر کا رُخ نہیں کیا اور نہ کبھی اُن کی زبان سے پیاری کا نام سنا گیا۔ البتہ کبھی کبھی وہ کہتے۔ ”مزا ہے پیاری کا اور سب جھول ہے۔“ (یعنی بے معانی ہے)

جن لوگوں نے راہِ عشق میں حافظ پیاری صاحب کی وارفتگی و شیفتگی اور جذب و جنون کو دیکھا تھا۔ یہ امر اُن کے لئے ہمیشہ باعث صد حیرت و استعجاب بنا رہا کہ آخر وہ کیا قوت تھی؟ وہ کیا راز تھا جس نے ہفتوں، مہینوں، سالوں نہیں بلکہ چشم زدن میں اُن کو یکسر بدل دیا تھا۔

حافظ عبدالکریم ہمیشہ حاجی وارث علی شاہؒ کے والہ و شیدا رہے اور جب حاجی صاحبؒ نے اِس دنیا سے انتقال فرمایا تو سال میں دو مرتبہ خصوصی طور پر حاجی صاحبؒ کے مزار پر چادر چڑھانے جاتے تھے۔ جب چادر لے کر چلتے تو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ دو آدمی اُن کو سنبھالے ہوئے چلتے تھے۔ بے خودی کے عالم میں ایک بار ایسی حالت طاری ہوئی کہ منہ سے خون جاری ہو گیا اور تمام راستے بہتا رہا لیکن اُن کو احساس تک نہیں ہوا۔ چادر چڑھانے کے بعد اُن کی حالت مردے کی سی ہو جاتی۔ گھنٹوں ہوا دی جاتی، گلاب سنگھایا جاتا تب کہیں جا کر ہوش و حواس میں آتے تھے۔ واقف اسرارِ عشق حاجی وارث علی شاہؒ نے حافظ پیاری صاحب کو حسن ازلی و جمالِ لافانی کا جو جلوہ مثلِ تجلّیٰ طور دکھایا تھا اُس نے حافظ پیاری صاحب کو کششِ مجازی سے آزاد اور فانی رنگ و روپ سے بیگانہ کر دیا تھا۔

دشمنِ عشق

برصغیر میں ناکام عشق کی بہت ساری داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، عمرماروی، مرزا صاحباں کے علاوہ بھی بہت سارے قصّے زبانِ زدعام ہیں۔ یہ قصّہ بھی ہماری روایت کا حصہ ہے، بھلے ہی دو دل مل نہ پائے مگر اپنی کہانی امر کرگئے۔

ذوالفقار ارشد گیلانی

ناکامی نے ان کے عشق کو معراج بخش دی

عشقِ ناکام نمبر

پنجاب یعنی پنج آب کے سب سے بڑے دریا، دریائے چناب کو دو ایسے اعزازات حاصل ہیں جو دنیا کے کسی اور دریا کو حاصل نہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ دنیائے محبت کی آبرو کہلانے والی تین لافانی اور عالمی شہرت یافتہ رومانوی داستانیں اسی دریا سے وابستہ ہیں۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں کی لازوال محبتوں نے نہ صرف اس کے پانیوں سے جنم لیا بلکہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہیر کا جھنگ، سوہنی کا گجرات اور صاحباں کا کھیوا، دریائے چناب کے عین کنارے واقع ہیں اور عشق و محبت کی یہ دلکش تصویریں کبھی ان شہروں کی پہچان اور شناخت ہوا کرتی تھیں۔

شاید اسی لیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دریائے چناب میں پانی نہیں، پیار بہتا ہے جبکہ کچھ کہتے ہیں کہ دریائے چناب کے پانی کی تاثیر ایسی ہے کہ جس نے اسے چھوا یا پیا، وہ امر ہو گیا، لیکن دریائے چناب کا پانی صرف محبتوں کی آبیاری ہی نہیں کرتا بلکہ پنجاب میں یہ دریا، دنیا کے دو زرخیز ترین میدانی علاقوں کی قدرتی سرحد کا کام بھی دیتا ہے۔ یہ اس کا دوسرا اعزاز ہے۔

اس کے دائیں کنارے کا علاقہ چج دوآب کہلاتا ہے۔ چج کا لفظ دریائے چناب کی ”چ“ اور دریائے جہلم کی ”ج“ کے ادغام سے تشکیل میں آیا ہے کیونکہ دریائے چناب کی دائیں سمت دریائے جہلم بہتا ہے۔ اسی طرح دریائے چناب کی بائیں کنارے پر دریائے راوی تک کا علاقہ رچنا دوآب کہلاتا ہے جو دریائے راوی کی ”ر“ اور دریائے چناب کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

''چنا'' کا اشتراک ہے۔ یہ دونوں علاقے اتنے زرخیز اور سرسبز وشاداب ہیں کہ غلے کی شاید ہی کوئی ایسی جنس ہو جو یہاں پیدا نہ ہوتی ہو۔ سنگترے، مالٹے اور کیلوں کے باغات سے لے کر گندم، چاول اور گنے کے گھنے کھیت ان علاقوں کی آن، بان اور شان ہیں تو یہاں کی گائے، بھینسیں اور بیل، مویشیوں کے سرتاج تسلیم کیے جاتے ہیں۔

رچنا دوآب کے ایک حصے کو ساندل بار کہا جاتا ہے جو شرقاً غرباً اسی (80) کلومیٹر چوڑا اور شمالاً جنوباً چالیس کلومیٹر لمبا ہے۔ بار کا مطلب مقامی زبان میں ایسے علاقے کے ہیں جہاں جنگل تو ہو لیکن کاشتکاری کے لیے پانی جیسی کوئی سہولت دستیاب نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ساندل، پنجاب کے روایتی ہیرو دلا بھٹی کے دادا کا نام تھا جو اسی علاقے کا رہنے والا تھا چنانچہ اسی کی مناسبت سے اسے ساندل بار کا نام دے دیا گیا۔ شروع میں ساندل بار کا تمام علاقہ ضلع جھنگ میں شامل تھا لیکن اب یہ فیصل آباد، جھنگ، کمالیہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے اضلاع میں تقسیم ہو چکا ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ساندل بار میں مذکورہ بالا علاقوں کے علاوہ ننکانہ صاحب، چنیوٹ اور حافظ آباد کے اضلاع کے علاوہ ضلع شیخوپورہ کے بعض حصے بھی شامل ہیں۔ ان کے مطابق اس وسیع وعریض خطے میں درجنوں پنجابی قبیلے آباد ہیں جن کی نہ صرف زبان اور ثقافت یکساں ہے بلکہ وہ آپس میں خونی رشتے دار بھی ہیں۔ کھرل، اسی ساندل بار کا ایک راجپوت قبیلہ ہے جو اگنی ونشی پنہور کی اولاد ہے۔ مرزا صاحباں کی ناقابلِ فراموش داستان محبت کا مرکزی کردار مرزا، کھرل قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہی پنجاب کا مرزا جٹ ہے جو اپنی بہادری، تیراندازی، گھڑسواری اور صاحباں سے محبت کے حوالے سے امر ہو چکا ہے۔

کھرل قبیلے کا ایک اور نامور سپوت رائے مکھن خان کھرل بھی تھا جسے برصغیر پاک وہند میں بادشاہ گر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ضلع ننکانہ صاحب کے گاؤں چوکرے کھرلاں کا رہائشی رائے مکھن خان اپنے وقت کا بہت بڑا زمیندار اور پنجاب کی مشہور شخصیت تھا۔

کھرلوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا جدِامجد مہابھارت کا مشہور کردار راجا کرن ہے۔ راجا کرن جسے ہندو رادھیا بھی کہتے ہیں۔ قدیم ہندوستان کی معروف رزمیہ داستان مہابھارت کے مرکزی کرداروں میں سے ایک تھا۔ وہ انگا (موجودہ بھاگل پور) کا بادشاہ تھا۔ مہارشی ویدویاس کے تحریر کردہ مہابھارت کے اصل نسخے کے مطابق کرشن اور بھشم سمیت مہابھارت کے مقتدر حکمرانوں نے کرن کو عظیم ترین جنگجوؤں میں سے ایک قرار دیا تھا۔ وہ سوریا (سورج دیوتا) اور کنتی کا بیٹا تھا جسے کنتی نے پانڈو کے ساتھ شادی سے پہلے جنم دیا تھا۔

کرن کو دریودھنا کے قریبی دوست ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور اس نے دریودھن کی طرف سے ہی کرک شترا کی جنگ میں اپنے بھائیوں یعنی پانڈوؤں کے خلاف اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ کرن اپنی پوری زندگی، قسمت کے خلاف لڑتا رہا لیکن کسی بھی قسم کے حالات میں اس نے اپنے وعدے اور عہد پر آنچ نہ آنے دی۔ اس کی بہادری اور شجاعت کے کئی لوگ مداح تھے۔ خیال ہے کہ اس نے ہندوستان کا مشہور شہر کرنال آباد کیا تھا۔

اسی راجا کرن کا ایک جانشین بھوپا، تیرہویں صدی عیسوی میں اپنے بیٹے کھرل کے ہمراہ اچ شریف آیا جہاں انہوں نے مخدوم جہانیاں شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اچ سے کھرل دریائے راوی کے کنارے واقع علاقے میں پھیل گئے اور اب وہ ضلع وہاڑی، فیصل آباد، ساہی وال، حافظ آباد، اوکاڑہ، ننکانہ صاحب، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، بہاولنگر اور چشتیاں میں آباد ہیں۔

کھرلوں کی مشہور ذیلی شاخوں میں نووکے، روبیرا، گوگیرا، چیرا، ساہی، پیروکا، سابوکا، جالوکا، بشیرا، پوربیرا، کالیرا، بھنڈارا، لکھویرا، رانسینہ، دھیرو کے، شمیر کے اور جلا بکے وغیرہ شامل ہیں۔ سیالوں کی طرح یہ بھی شروع میں خانہ بدوش ہی تھے لیکن چودھویں صدی عیسوی میں کمال خان نے ایک قدیم قصبے کو ازسرِنو آباد کیا۔ اس قصبے کو آثارِقدیمہ کے ماہر جنرل جیمز مننگھم نے ان مالی قبائل کے ایک مضبوط گڑھ کے طور پر شناخت کیا جنہیں الیگزینڈر دی گریٹ نے موجودہ ملتان کے قریب شکست فاش دی تھی چنانچہ کمال خان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اس قصبے کو کوٹ کمالیہ کا نام دیا گیا۔

کھرلوں کی ذیلی شاخ لکھویرا عددی اعتبار سے کبھی مضبوط نہیں رہی لیکن اسے مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں اس وقت بے حد اہمیت حاصل ہوئی جب کمالیہ کے سربراہ سعادت یار خان کو شہنشاہ کی طرف سے جاگیر عطا کی گئی۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ولی داد سیال، کمالیہ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے کھرلوں کو ان کے آبائی قصبے سے مار بھگایا اور راوی کے کنارے مردانہ اور ترہانہ سیالوں کو آباد کر دیا۔ ان میں سے بعض کھرل تو وہاڑی، ملتان، فیصل آباد اور حافظ آباد

میں آباد ہو گئے جبکہ کچھ نے سندھ کی جانب ہجرت کو ترجیح دی۔ کھرل قبیلے کے بعض افراد نیپال میں بھی آباد ہیں لیکن وہ بدھ یا ہندو مت کے پیروکار ہیں۔

کمالیہ اور اس کے گردونواح میں آباد کھرلوں کے پڑوسی سیال تھے۔ دریائے چناب کے کنارے پر قابض اس پنجابی قبیلے کا آبائی وطن جھنگ سیال ہے لیکن مورخین کھرلوں اور سیالوں، دونوں کو ہی مستقل غلہ بان قبیلہ قرار دیتے ہیں جنہوں نے مخصوص علاقوں میں آباد ہو کر ان میں اپنی اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ یوں بھی 1500ء کے لگ بھگ کھرلوں اور سیالوں کے علاقوں یعنی فیصل آباد، جھنگ اور سرگودھا وغیرہ میں بڑے بڑے جنگل تھے جنہیں وہاں بسنے والے چراگاہوں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ دونوں قبائل کا زمین سے رشتہ بے حد مضبوط تھا چنانچہ وہ انہی جنگلوں میں مویشی پالتے اور کاشت کاری کرتے تھے۔

محققین، سیال قبیلے کا شمار نو مسلم قبائل میں کرتے ہیں کیونکہ ان کے بہ قول سیالوں نے مسلمانوں کے پنجاب آنے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ ہندو سیالوں میں زیادہ تعداد کھتریوں کی ہے تاہم راجپوتوں اور جاٹوں میں بھی موجود ہیں کیونکہ سیال قبیلہ، جاٹ برادری کی ہی ایک ذیلی شاخ ہے۔ اسی طرح سیال، مسلمانوں کے علاوہ سکھوں اور عیسائیوں میں بھی سیال پائے جاتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہندو اور سکھ سیال ہجرت کر گئے۔ سکھ سیال زیادہ تر راجپوت ہیں جبکہ بلوچستان کے اضلاع جعفرآباد، نصیرآباد اور بولان میں بھی سیال آباد ہیں۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سیال، پنجابی، سندھی اور سرائیکی بولتے ہیں جبکہ بلوچستان کا رند قبیلہ بلوچی بولتا ہے اور خود کو بلوچ ہی قرار دیتا ہے۔

سیالوں کی ابتدا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سیو، ٹیو اور گھیو تین بھائی تھے جن کا تعلق اگنی کولا نامی قبیلے سے تھا۔ روایت ہے کہ ٹوانے، ٹیو کی اولاد ہیں۔ راولپنڈی کے گھیب، گھیو کے جانشین ہیں جبکہ جھنگ کے سیال، سیو کی نسل سے ہیں۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ سیال درحقیقت راجپوتانہ کے رہنے والے تھے جہاں سے ہجرت کر کے پاک پتن کے علاقے میں آباد ہوئے۔ ان دنوں اجودھن یعنی پاک پتن کے مالک ومختار حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا طوطی بولتا تھا اور فیضِ عام جاری تھا چنانچہ سیالوں نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ پاک پتن سے جھنگ آ گئے جہاں

شاعرِ ناکامِ محبت

قیس بن اعظیم کا شمار قبل از اسلام خطۂ عرب کے جید شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ حضرت حسانؓ بن ثابت کا ہم عصر تھا اور خود کو عرب کا سب سے بڑا شاعر کہا کرتا تھا۔ ہوارہ بنت جشں سے محبت کرتا تھا لیکن قبائلی دشمنی کے سبب دونوں ایک نہ ہو سکے۔ ہوارہ کی شادی کے بعد وہ اس کی خوبصورتی کو نظم کرنے لگا تھا اور یہی وجہ شہرت بنی۔ قیس کا تعلق بنوظفر سے تھا جو قبیلہ اوس کے خاندان بنیت سے متعلق تھا۔ قیس اپنے زمانے کے تمام خذرجی شاعروں خصوصاً حسان بن ثابت اور عبداللہ بن رواحہ سے بحث ومناظرہ میں اُلجھا رہتا۔ قیس نے آخر وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ نبوت میں یثرب (مدینہ) میں موجود تھا۔ اس کی بہن لیلیٰ بنت اعظیم اور اس کے بیٹے ثابت نے مشرف بہ اسلام ہو کر شرف صحبت نبوی ﷺ پایا۔ قیس کا دیوان قسطنطنیہ کے ایک کتب خانے میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔ اسلام سے پہلے کے زمانۂ یثرب کی تاریخ اور معاشرت سمجھنے میں قیس کا کلام کسی حد تک ممد ومعاون ہے۔

قیس بن اعظیم کے دیوان کا ترجمہ اور شرح 1914ء میں لائپزگ سے شائع ہوا پھر 1962ء میں بغداد وقاہرہ سے بھی شائع ہوا۔

تمدن عرب: از ایس جی حسن

مرسلہ: ایاز راہی مانسہرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

ان دنوں سرکار دہلی کے نمائندے نول رہائش پذیر تھے۔

تواریخ کے مطابق رائے سیال نے بھائی خان میکن کی بیٹی سے شادی کی جو ان دنوں ضلع سرگودھا کی تحصیل شاہ پور کے علاقے ساہی وال کا بااثر زمین دار تھا۔ شاہ پور میں جھانوریال کے مقام پر کوٹ بھائی خان (بھائی خان کا قلعہ) آج بھی موجود ہے۔

سیالوں نے اپنے مخالفین یعنی نول قبائل سے جنگ کی اور ساندل بار کے علاوہ دریائے جہلم اور دریائے چناب کے درمیانی حصے بیچ دوآب کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔

اس وقت سیال ایک سو سے زائد ذیلی قبائل، شاخوں اور برادریوں میں تقسیم ہیں لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے آخر میں ''انا'' یا ''انہ'' کا لفظ آتا ہے۔ میر جانا، چوچکانہ، مگھیانہ یا میکھیانہ، ترہانہ، مندانہ، حسنانا، جانجیانہ اور بھروانہ وغیرہ اس کی چند مثالیں ہیں۔

داستان مرزا صاحباں کی روح رواں صاحباں، ہیر کی طرح انہی سیالوں کی بیٹی تھی۔

ہمسایہ ہونے کے ناتے کھرلوں اور سیالوں میں رشتہ داریاں بھی رہیں اور دشمنیاں بھی، جو اس عہد میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں۔ چنانچہ جس طرح ان دونوں قبائل کا وجود حقیقت ہے اسی طرح مرزا صاحباں کا رومان بھی کوئی افسانہ نہیں بلکہ پنجابی شاعری میں ہیر رانجھا کے بعد، دو جیتے جاگتے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے انسانوں کی سب سے زیادہ تحریر کی جانے والی ایک سچی اور لافانی کہانی ہے، جس سے وابستہ حقائق آج بھی پورے کروفر اور ثبوتوں کے ساتھ موجود ہیں۔

موجودہ جھنگ، چنیوٹ روڈ پر، جھنگ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر کھیوا نام کا ایک گاؤں آباد ہے۔ یہی صاحباں کا گاؤں تھا، جو اس زمانے میں خاصا بڑا قصبہ تھا اور اس کا حاکم یا قبیلے کا سردار، خان کھیوا کہلاتا تھا جو ذات کے اعتبار سے ماہنی سیال تھا۔ صاحباں کا بچپن اسی کھیوا کی گلیوں میں کھیل کود کو لڑکپن اور جوانی کی حدود تک پہنچا۔ کھیوا کی ایک قدیم مسجد آج بھی صاحباں کے وجود کی گواہی دیتی ہے کیونکہ وہ اسی مسجد کے مدرسے میں پڑھا کرتی تھی۔ یہیں اسے مرزا سے محبت ہوئی اور جب مرزا کے قتل کے بعد اس کے ورثا یعنی کھرل بدلہ لینے کھیوا آئے تو انہوں نے اس مسجد کے علاوہ گاؤں کی ہر چیز تباہ کردی تھی۔ کہتے ہیں کھرلوں نے کھیوا میں اس قدر قتل وغارت کیا کہ آج اس قصبے میں جو آبادی موجود ہے وہ ساری کی ساری اس قتلِ عام کے بعد کی ہے۔

مرزا، ذات کا کھرل تھا جس کے قبیلے کی حکمرانی راوی کے دائیں کنارے پر شروع سے تسلیم کی جاتی تھی۔ حالیہ تحصیل جڑانوالہ میں دانا آباد کا گاؤں مرزا کے کھرل قبیلے کا تھا۔ اس کے باپ کا نام رائے وجھل تھا (بعض تذکرہ نگاروں نے اس کا نام بنجل بھی بیان کیا ہے) رائے وجھل کا تعلق کھرلوں کی ایک شاخ ساہی سے بتایا جاتا ہے جو خود کو جاٹ بھی کہتے ہیں۔ مغربی پنجاب (پاکستان) میں تو جاٹ اور راجپوت خود کو مختلف قبیلے بتاتے ہیں مگر مشرقی پنجاب میں جاٹ اور راجپوت کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔

مرزا صاحباں کا قصہ پنجابی زبان کے 35، اور فارسی کے 12 سے زیادہ شاعروں نے منظوم کیا ہے لیکن کسی نے اس واقعے کی حقیقت ہونے کے باوجود اس کے وقوع پذیر ہونے کے اصل زمانے کی بابت کچھ تحریر نہیں کیا۔ آج بھی یہ بحث تمام نہیں ہوئی کہ یہ قصہ کب کا ہے اور سب سے پہلے کس نے اسے تحریر کیا۔ بعض روایات کے مطابق پیلو نامی شاعر اس قصے کا پہلا راوی ہے۔ پیلو نے مرزا صاحباں اس طرح لکھی کہ گویا مرزا، پیلو سے صلاح مشورہ کرکے عشق کی بازی کھیلتا رہا۔ حتیٰ کہ مرزا جب صاحباں کو لینے دانا آباد سے کھیوا روانہ ہوتا ہے تو اس سے پیشتر، پیلو سے پوچھتا ہے کہ میرے سفر کی کامیابی کا حساب لگا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیلو، مرزا کا ہم عصر ہے نہ کہانی کا پہلا راوی بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا اور صاحباں کے آبائی علاقوں سے اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ میں پیلو کے بارے میں تفصیلات سرے سے دستیاب ہی نہیں، ہاں اس کا تحریر کردہ منظوم قصہ اس کے وجود کی گواہی ضرور دیتا ہے۔ اس بنیاد پر کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ پنجابی میں مرزا صاحباں کی داستان لکھنے والوں میں وہ سب سے پہلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیلو...... چکوال کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا اور تیسرے مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں زندہ تھا۔ شہنشاہ اکبر نے 1556ء سے 1605ء تک ہندوستان پر حکومت کی اور پیلو بھی ظاہر ہے، اسی دور میں حیات رہا ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرزا صاحباں بھی اسی دور میں تھے بلکہ اندازہ یہ ہے کہ مرزا صاحباں، پیلو نامی شاعر سے کم از کم پچاس برس پہلے گزرے ہوں گے یا جب پیلو نے یہ داستان لکھی تو مرزا صاحباں کی طوفانی محبت کے عینی شاہد اور ممکن ہے کہ ان کی اگلی پشت بھی اس دارفانی سے کوچ کرچکی ہو۔ اس مفروضے کو یوں بھی تقویت ملتی ہے کہ خیر اللہ نامی ایک شاعر نے فارسی میں یہ قصہ 1551ء میں لکھا جو شہنشاہ اکبر سے پہلے کا زمانہ تھا۔

یوں بھی اس زمانے میں کسی قصے کے مشہور اور ملک گیر ہونے میں خاصا وقت لگتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بااثر قبائل جن میں سیال اور کھرل شامل ہیں، کسی صورت یہ برداشت نہیں کرتے ہوں گے (اور آج تک برداشت نہیں کرتے) کہ ہیر سیال یا صاحباں سیال کے عشق کی داستان چھیڑی جائے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی جھنگ میں ہیر کو مائی ہیر یا مائی عزت بی بی کہا جاتا ہے اور اس کی قبر کا کسی ولی کے مزار جیسا احترام کیا جاتا ہے جبکہ تحصیل جڑانوالہ کے چک نمبر 484۔ جی بی، جھنڈ والی میں واقع مرزا صاحباں کی قبر پر مقامی خواتین کو جانے کی اجازت نہیں کیونکہ ان کے مردوں کے خیال میں قبر پر جانے سے عورتوں کے دل ودماغ میں مرزا صاحباں کی تقلید کا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے جو ان کی نظر میں قابل اعتراض ہی نہیں، ناقابلِ برداشت بھی ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ 1857ء میں انگریزوں کے خلاف ضلع ساہی وال میں بغاوت کرنے، جیلیں توڑنے اور انگریزوں کو قتل کرنے کے ''مجرم'' احمد خان کھرل کے علاوہ نظام لوہار، دلا بھٹی اور جبرو وغیرہ کے بے شمار ڈھولے لکھے گئے لیکن انگریزی عہد میں کسی بھی شاعر نے ان پر اپنا نام دینے کی جرأت نہیں کی کیونکہ یہ سارے انگریز سرکار کے مجرم تھے اور مجرموں کی تعریف کرنے یا انہیں ہیرو بنا کر پیش کرنے کی پاداش میں انگریزی قانون کا پھندا ان کی گردن تک پہنچ سکتا تھا۔

چنانچہ اگر حاکموں کے خوف سے شاعر احمد خان کھرل، نظام لوہار یا دلا بھٹی کے ڈھولے لکھ کر بھی سو سال تک ان پر اپنا نام دینے کو تیار نہیں ہوئے تو ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں کی داستانوں کا آغاز بھی ایسے ہی ہوا ہوگا۔ اس لیے اندازہ ہے کہ مرزا صاحباں کا وجود لودھیوں کے آخری عہد یا مغلوں کے ابتدائی زمانے کا ہے جو 1520ء سے 1540ء کا درمیانی عرصہ بنتا ہے لیکن یہ بھی طے ہے کہ صاحباں، ہیر کے نہ صرف بعد میں پیدا ہوئی بلکہ محتاط ترین اندازوں کے مطابق ہیر کی موت اور صاحباں کی پیدائش میں چالیس سے پچاس برس کا فرق ضرور ہوگا جو 1451ء سے 1489ء کے درمیان کسی عرصے میں حیات تھی۔

بعض حلقے واضح طور پر پیلو کو سترہویں صدی عیسوی یعنی 1601ء سے 1700ء کا شاعر قرار دیتے ہیں جس نے یہ قصہ اپنے بزرگوں سے سن کر تحریر کیا لیکن اس سے انکار نہیں کہ پنجاب سمیت دنیا بھر کو مرزا صاحباں کی لافانی محبت سے روشناس کرانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کے بعد تخت ہزارہ کے رہائشی اور چٹی شیخاں (سیالکوٹ سے تین کلومیٹر شمال مشرق میں واقع گاؤں) میں مدفون حافظ برخوردار (1658ء تا 1707ء) نے بھی اس قصے کو پنجابی میں منظوم کیا لیکن جو شہرت پیلو کو نصیب ہوئی، وہ حافظ برخوردار سمیت اسے لکھنے والے درجنوں شعرا کے حصے میں بھی نہیں آئی اور پنجاب کے دیہی علاقوں میں آج بھی پیلو کی مرزا صاحباں ہی زبان زد عام ہے۔

اس داستان کو بعد میں اردو نظم اور نثر کی صورت میں بھی لکھا گیا جبکہ 1884ء میں کیپٹن آر سی ٹیمپل نے اپنی انگریزی کتاب ''دی لیجنڈز آف پنجاب'' میں بھی اسے نقل کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ 1931ء میں محکمۂ پنجاب، لاہور نے اردو میں یہ کہانی شائع کی جس کے سرورق پر تحریر تھا...... مرزا صاحباں (صرف بالغوں کے لیے) اسی طرح بعض تحقیق نگاروں نے اسے صریحاً شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد یعنی 1556ء سے 1605ء کے درمیانی عرصے کی سچی کہانی قرار دیا ہے اور تصدیق کی ہے کہ یہ واقعہ چناب اور راوی کے درمیانی علاقے میں کسی جگہ رونما ہوا۔

بہرحال صاحباں اور مرزا 1520ء سے 1540ء کے درمیان حیات رہے ہوں یا ان کا زمانہ 1556ء سے 1605ء کا درمیانی عرصہ ہو، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ صاحبان، کھیوا کے سیالوں کے سردار خان کھیوا کی بیٹی تھی۔

گھر کھیوے دے صاحباں، جمی منگل وار!

ڈوم سوہیلے گاوندے، خان کھیوے دے بار

دو بھائی اس سے بڑے تھے جن میں سے ایک کا نام شمیر خان اور دوسرے کا میر خان تھا۔ یہ دونوں اپنے علاقے میں دلیری اور بہادری کی علامت سمجھے جاتے تھے جبکہ ان کی چھوٹی بہن یعنی صاحباں، حسن وخوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی اور اس کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پیلو کے بہ قول وہ منگل کے روز پیدا ہوئی اور روایات کے برعکس ایک لڑکی کی پیدائش پر ایسا جشن برپا کیا گیا جو عرصے تک لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوسکا۔

صاحباں کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے پیلو لکھتا ہے کہ جب صاحباں اپنی نازک اور پتلی کمر پر لنگی باندھ کر گھر سے نکلی تو فرشتے اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئے جبکہ خدا بھی سانس لینا بھول گیا۔ (نعوذ باللہ)

صاحباں کی طرح مرزا بھی اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا البتہ بعض تذکرہ نگاروں کے بہ قول وہ

www.paksociety.com

بھائیوں میں چھوٹا تھا لیکن چھتی نامی بہن سے بڑا تھا۔ مرزا خان یا مرزا جٹ کو بھی بلا کا وجیہہ، دلیر اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کا تیرانداز بتایا گیا ہے۔ مرزا کے باپ کے نام پر تو کسی کو اختلاف نہیں کہ وہ رائے ونجھل کا بیٹا ہی تھا البتہ اس کی ماں کے نام اور صاحباں کے باپ کے ساتھ رشتے پر علیحدہ علیحدہ رائے دی جاتی ہے۔ کچھ لوگ مرزا کی ماں کو خان کھیوا کی سگی بہن لکھتے ہیں جبکہ بعض دونوں کو رضاعی بہن بھائی قرار دیتے ہیں۔

ایک طبقے کا کہنا ہے کہ کھیوا میں ایک عورت نوراں نے بیٹے کو جنم دیا لیکن بیٹا چند دن کا ہی تھا کہ نوراں کا انتقال ہوگیا چنانچہ اسے دودھ پلانے کے لیے ایک ایسی عورت کے حوالے کردیا گیا جو پہلے سے اپنی بیٹی کو دودھ پلا رہی تھی چنانچہ لڑکی اور لڑکا، دودھ شریک بہن بھائی بن گئے۔ لڑکا بڑا ہوکر اس علاقے میں رہنے والے سیال قبیلے کا سردار بن گیا اور کھیوا خان یا خان کھیوا کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی دودھ شریک بہن جس کا نام فتح بی بی تھا، کی شادی کھرل قبیلے کے رائے ونجھل سے کردی گئی جو موجودہ ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے گاؤں دانا آباد میں رہتا تھا۔

جو لوگ مرزا کی ماں کو خان کھیوا کی سگی بہن بتاتے ہیں، ان کے مطابق اس کا نام لانگی مہری تھا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں مرزا کی ماں صاحباں کی پھوپی اور صاحباں کا باپ، مرزا کا ماموں تھا۔ اس طرح مرزا صاحباں، عاشق و معشوق ہونے کے علاوہ قریبی رشتے دار (فرسٹ کزن) بھی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا پیدائش سے پہلے اپنی ماں کے لیے سخت تکلیف کا باعث بن رہا تھا چنانچہ لانگی مہری نے اس تکلیف سے نجات پانے کے لیے کئی درباروں اور پیروں، فقیروں کے پاس حاضری دی۔ انہی میں ایک صاحبِ کمال، نوشہ گنج بخش بھی تھے۔ مہری نے انہیں مرشد بنایا اور اپنی تکلیف بتائی۔ نوشہ نے مہری کو دودھ کا ایک کٹورا پلایا جس سے اس کی تکلیف جاتی رہی۔ ساتھ ہی نوشہ نے مہری کے لیے دعا کی اور اسے خوش خبری سنائی کہ اس کے گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوگا جو عشق میں بڑا نام کمائے گا۔

لانگی مہری ایک خالصتاً دیہاتی عورت تھی۔ اس لیے اس نے اپنے مرشد کی بات پلے سے تو باندھ لی لیکن عشق کے بارے میں اس کی اپنی معلومات کچھ زیادہ نہ تھیں لہٰذا اس نے اس طرف کوئی توجہ بھی نہ دی۔ ان دنوں یہ رواج عام تھا کہ بچوں کو تعلیم کے لیے اس کے ماں یا باپ کے رشتہ داروں کے پاس بھجوایا جاتا تھا چنانچہ مرزا کا بچپن لڑکپن کی حدود کو چھونے لگا جبکہ بعض روایات کے مطابق جب وہ آٹھ یا نو سال کا ہوا تو اسے پڑھنے کے لیے ننھیال یعنی کھیوا بھیج دیا گیا جہاں اس کے ماموں خان کھیوا (صاحباں کے باپ) کے علاوہ اس کی خالہ بیبو بھی رہتی تھی۔ مرزا کو اس کے ماموں نے اپنے گھر رکھا اور اپنی بیٹی کے ہمراہ مقامی مسجد میں داخل کردیا جو نماز کے علاوہ مدرسے کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔

مسجد میں ایک ساتھ تعلیم مرزا اور صاحباں کے لیے ایسے اٹوٹ بندھن کا باعث بن گئی جس میں ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنا محال ہوجاتا ہے۔ چنانچہ تعلیم تو پیچھے رہ گئی لیکن عشق کے سبق میں دونوں بہت آگے نکل گئے۔ روایت ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اس لیے مرزا اور صاحباں کا دلی تعلق بھی کچھ زیادہ عرصہ پوشیدہ نہ رہ سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر زبان پر دونوں کے چرچے ہونے لگے۔

صاحباں پڑھدی پٹیاں، مرزا پڑھے قرآن
وچ مسیت دے لگیاں، جانے کل جہان

مرزا اور صاحباں کی محبت ظاہر ہے کہ ان کے استاد یعنی مولوی صاحب سے چھپی نہ رہ سکی۔ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کے استاد بے حد سخت ہوا کرتے تھے اس لیے مولوی صاحب جنہیں صاحباں، قاضی کہہ کر مخاطب کرتی تھی، بھی اسی نوع کے ہوں گے۔ ان کا اصول یقیناً یہ رہا ہوگا کہ بچہ بے شک جان سے چلا جائے لیکن ڈنڈے کی حکمرانی ہمیشہ قائم رہنی چاہیے۔ صاحباں نے بہ زبان پیلو اس ڈنڈے کو چھمک کا نام دیا ہے۔ پنجابی زبان میں چھمک اس چابک کو کہا جاتا ہے جس کی مدد سے کوچوان، تانگہ چلاتے ہوئے گھوڑے کی خبر لیتا ہے لیکن مدرسوں یا اسکولوں میں جو چھمک استعمال کی جاتی ہے وہ درحقیقت درخت کی ایک لمبی، مضبوط، موٹی اور ہری بھری شاخ ہوتی ہے جس پر سے پتے اُتار لیے جاتے ہیں لیکن جہاں سے پتے اُتارے جاتے ہیں وہاں نوکیلے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ چھڑی یا چھمک جب انسانی بدن پر پڑتی ہے تو کھال اُتار لے جاتی ہے یا ایسی سرخ لکیر چھوڑ جاتی ہے جس میں سے نہ صرف خون نکل آتا ہے بلکہ کئی روز تک اس جگہ سے جلن ختم نہیں ہوتی۔

بچپن اور لڑکپن میں تو مولوی صاحب نے شاید مرزا اور صاحباں کے ایک دوسرے کو دیکھنے پر اعتراض نہیں کیا لیکن جب بالغ ہونے کے باوجود ان کی باہم سرگوشیاں، دلچسپی اور محویت ختم نہ ہوئی تو مولوی صاحب معترض ہونا شروع ہوگئے۔ تب تک مرزا اور صاحباں اس بُری طرح ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوچکے تھے کہ دین کا ہوش رہ گیا تھا نہ دنیا کا۔ اکثر و بیشتر وہ مدرسے میں بھی مولوی صاحب کے سبق کے بجائے ایک دوسرے پر زیادہ توجہ دیتے چنانچہ مولوی صاحب کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے چھمک کا استعمال کرنا پڑتا۔

کہانی کے مطابق ایک بار سبق یاد نہ کرنے پر جب صاحباں کی چھمک سے تواضع ہوئی تو وہ بول اُٹھی......

نہ مار قاضی چھمکاں، نہ دے تتی نوں تا
پڑھنا ساڈا رہ گیا، لے آئے عشق لکھا

او قاضی (مولوی) مجھے چھمک یعنی ڈنڈے سے مت مارو اور نہ ہی مجھے جلاؤ کیونکہ میں تو پہلے سے ہی کسی آگ میں جل رہی ہوں (محبت میں مبتلا ہوں) پڑھنا پڑھانا اور کتابیں اب ہمارے لیے کچھ نہیں رہ گئیں کیونکہ ہم اپنی تقدیر میں محبت اور عشق لکھوالائے ہیں۔ اب یہی ہمارا نصیب ہے اور یہی مقدر!

مولوی کی چھمکوں اور مرزا کی محبت بھری نظروں کے سائے تلے صاحباں جوان ہوئی تو حسن گویا ٹوٹ کر اس پر برسا۔ پیلو نے اسے دلکش اور خوب رو ثابت کرنے کے لیے شاعرانہ مبالغہ آرائی کی انتہا کردی۔ پیلو کہتا ہے کہ صاحباں ایک دن پنساری کی دکان پر تیل لینے گئی تو وہ اس کی خوبصورتی دیکھ کر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا اور نہ صرف ترازو پکڑنا بھول گیا بلکہ باٹوں کا شمار بھی یاد نہ رہا۔ بنیا اس حسن جہاں سوز سے اس قدر مسحور ہوا کہ اس نے صاحباں کے برتن میں تیل کے بجائے شہد ڈال دیا۔

صاحباں گئی تیل نوں، گئی پساری دے ہٹ
پھڑ نہ جائے تکڑی، ہاڑ نہ جائے وٹ
تیل بھلاوے بھلا بانیاں، دتا شہت الٹ

ایک اور جگہ شاعر کہتا ہے کہ جب کبھی صاحباں کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تو کاشت کار ہل جوتنا بھول جاتے اور پتھر کے مجسمے بن کر یک ٹک اسے دیکھتے اور اس کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کرتے۔

ونج گوائے بانیاں، ہلد گوائے جٹ
تن سے نانگا پڑ رہیا، ہوگئے چور چپٹ
مرزے صاحباں دی دوستی، رہ سی وچ جگت

حافظ برخوردار، صاحباں کی تعریف میں پیلو سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ انہوں نے صاحباں کی خوبصورتی اور حسن کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ صاحباں آسمان سے اُتری اپسرا یا کوہ قاف سے آئی پری محسوس ہوتی ہے۔

عشق وہے وچ چندلے، عاشق گھٹ پھرن
بیڑے عشق مجاز دے، اسی وچ لکھ ترن!
جھنگ مثال بہشت دے، جتھے موراں وار کھڈن
پنچھی جویں جو جھاڑیاں، کھدے عشق پون
دھی کھیوے دی صاحباں، جس تے حوراں گھنڈ کڈھن
تے پریاں پربت تسنے، جئی دا دیکھ حسن
صاحباں دا قد سرو کل کونج جیوں دوہے واہ پون
لباں سے جام شراب دا پی عاشق مست تھون
صاحباں دے خونیں نین، پکھاولے بازاں وانگ تکن
اوہ پاڑن ول ول دلاں نوں بکیں رات پیون
پپیاں تھیں ناوکاں ترکش جد لٹن!
رکھ نشانے دلاں تے کہیاں وانگ ہٹن
اوہ باجھوں کجلیوں، سرمئیوں انویں گھاہ کرن
جاں نوکاں کڈھن کجلیوں، سولی لوک چڑھن
صاحباں دے نین سندورے، عشق دے ہاتھی مست پھرن
جئیوں شیشہ ویہنیں ساہمنے، لاناں حسن مچن
اوہدا متھا بنیاں امردا، جاں پوہ پھٹی چمن
اوہدے سر تے بھوچھن کاہڈواں، وچ تلیئر چوگ چگن
اوہدے ہوٹھ پاناں تھیں پتلے، دند انارن ون
اوہدی ٹھوڈی حلقہ میم دا، پرزے ہو پٹن
اوہدے گل چولی چوتاردی جویں جھالر بند کرن
اوہدی چھاتی تختہ سیم دا، جتھے دونویں لعل بھخن
اوہدی دھنی ٹنگ شراب دی جتھے عاشق گھٹ بھرن
اوہدے پٹ دو چنن گیلیاں، کھیہ کھیہ مشک چھڈن
زہر چڑھایئے زہر تے، فیر عاشق کیوں جون
ایس کستوری دی بھار نوں، حافظ مرزے لائی سن

یوں ایک طرف صاحباں کے حسن کی دھوم تھی تو دوسری جانب مرزا کی جوانی کی دھوم تھی۔ کہتے ہیں کہ مرزا کی پیدائش پر اس کی ماں لانگی مہری نے کہا تھا۔

مرزا پھل گلاب دا، میری جھولی ٹٹ پیا

چنانچہ گلاب کا یہ پھول نہ صرف اپنے جوبن پر تھا بلکہ کھل کر اپنی بہار بھی دکھا رہا تھا۔ وہ ایک شہ زور، شجیع، بہادر، نڈر، دلیر اور جنگ جو نوجوان بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کے گیسو شانوں جتنے لمبے تھے۔ وہ بہترین گھڑسوار اور کمال کا تیرانداز تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنی تیزی سے تیر برساتا تھا کہ ہواؤں کو بھی چھلنی کردیتا تھا۔ اس کی بہادری کی شہرت نہ صرف جنگل کی آگ کی طرح چاروں جانب پھیلی بلکہ ایک روایت کا درجہ بھی حاصل کرگئی۔

لیکن صاحباں کا حسن اور مرزا کی جواں مردی مل کر بھی

www.paksociety.com

زمانے کی زبانیں نہ روک سکے اور جب دونوں کی محبت پر اُٹھنے والی انگلیوں کو زباں ملی تو صاحباں کے گھر والے بھی چونکے۔ صاحباں کے باپ کو پتا چلا تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور بھانجے کو واپس دانا آباد روانہ کردیا۔ صاحباں نے اپنے محبوب کی یوں اچانک روانگی کا سنا تو وہ بیمار ہوگئی۔ اس کی بیماری نے اس حد تک شدت اختیار کی کہ اس کے ماں باپ اس کی زندگی سے مایوس ہوگئے۔ طبیبوں کے علاج سے صاحباں ٹھیک تو ہوگئی لیکن مرزا کی جدائی کے باعث اس کا شباب ماند پڑ گیا، جس کا حل کسی طبیب یا وید کے پاس نہیں تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ مرزا اور صاحباں کی بچپن میں منگنی طے کردی گئی تھی لیکن صاحباں کی سوتیلی ماں کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ مرزا کو دانا آباد واپس بھیج کر اس نے خان کھیوا کو اس امر پر قائل کرلیا کہ صاحباں کی جلد از جلد کہیں اور شادی کردی جائے چنانچہ ساندل بار کے ایک اور مشہور قبیلے چدھڑ کے طاہر خان سے صاحباں کی سگائی کردی تھی اور چدھڑوں سے کہا گیا کہ جلد از جلد برات لے کر آجائیں اور اپنی امانت' صاحباں کو بیاہ لے جائیں۔

صاحباں کو یہ رشتہ منظور نہ تھا کیونکہ وہ تو اپنا سب کچھ مرزا کو دے بیٹھی تھی۔ صاحباں نے اس سلسلے میں اپنی ماں کو قائل کرنے کی کوشش بھی کی اور ہیر سیال کی مثال دی۔ منظوم قصوں کے مطابق صاحباں نے ہیر کو پھوپی ہیر کہہ کر مخاطب کیا اور ماں سے کہا کہ پھوپی ہیر کی شادی رانجھے سے اس لیے نہ ہوسکی کہ ان کی ذات میں فرق تھا۔ ہیر سیالوں کی بیٹی تھی جو اعلیٰ ذات والے تھے جبکہ رانجھا سیالوں کا ملازم تھا۔ ہیر نے اعلیٰ قبیلے سے تعلق کے باوجود ایک کمتر قبیلے کا فرد رانجھا سے عشق کیا (حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ رانجھا بھی ہیر کی طرح ذات کا جاٹ اور اس کے ہم سر قبیلے کا فرد تھا) لیکن مرزا سے اس کا عشق اس لیے قبول کرلیا جائے کہ وہ کوئی چاک یعنی ملازم نہیں بلکہ نہ صرف سیالوں کے ہم پلہ اور رشتہ دار قبیلہ کھرل کے ایک سردار کا بیٹا ہے اور اس کا پھوپی زاد بھی ہے۔

دوسری جانب ان باتوں سے بے خبر مرزا اپنے علاقے دانا آباد میں بہادری کی دھاک بٹھانے میں مصروف تھا۔ صاحباں اسے بھولی تو نہیں تھی لیکن فی الوقت وہ اپنی گھوڑی بکی (اس کا نام بعض شاعروں اور محققوں نے نیلی لکھا ہے) پر سوار ہوکر دور دور تک پھیلی اپنی زمینوں کی حفاظت کرتا، کہا جاتا ہے کہ مرزا کی گھوڑی بکی، دسویں سکھ گرو، شدی گرو گوبند سنگھ کے گھوڑے کی اولاد تھی۔ مرزا اسی گھوڑی پر گھڑسواری کے مقابلوں میں حصہ لیتا اور نیزہ باز وتیراندازی میں وقت گزارتا۔ زمانے بھر کی دلچسپیاں ا کے پاس تھیں لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ کھیوا میں اس کی محبت پر بیت رہی ہے۔

صاحباں ماں کو دلائل دیتے دیتے ہار گئی حتیٰ کہ وہ د آ گیا جب اگلے روز ساندل بار والے چدھڑ اس کی برات لے کر آنے والے تھے۔ صاحباں نے خاموشی سے قصبے کمّوں برہمن (بعض قصہ نگاروں نے اس کا نام کرموں بھ لکھا ہے) کو بلا بھیجا اور اسے لالچ دیا کہ تمہیں ایک گھوڑی م کاٹھی، سونا، دودھ دیتی بھینس اور ایک ہل انعام میں دوں گ لیکن کسی طرح مرزا خان تک یہ خبر پہنچا دو کہ کل مجھے چدھڑ بیاہنے آرہے ہیں۔ وہ مجھے لے جائیں گے۔ تم اگر بعد میں آئے تو تمہارا آنا کس کام کا۔

صاحباں نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ "تمہیں آ کر صاحباں کے ہاتھ مہندی سے رنگنے چاہئیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اپنی عزتِ نفس بچانے، وعدوں کی پاسداری اور سچ کی جیت کے لیے جان کی بازی لگا دو۔"

کمّوں یہ تو جانتا تھا کہ صاحباں، سردار کی بیٹی ہے، لیکن اس نے شاید کچھ اور سمجھا اور صاحباں کو پیش کش کی کہ اس جاٹ (یعنی مرزا) کی دوستی بھول کر اس سے دوستی کرلے۔ صاحباں مارے غصے کی لال پیلی ہوگئی۔ اس نے کمّوں کو دھمکی دی کہ ابھی جا کر بتاتی ہوں اپنے باپ کو۔ اس کی کچہری میں تمہیں زنجیروں سے بندھوا کر پیش کراؤں گی تو مجھ سے عشق کا پتا چل جائے گا۔ کمّوں ذات کا برہمن اور پرلے درجے کا بزدل تھا۔ اس نے فوراً صاحباں کے قدموں پر گر کر معافی مانگ لی۔ اس نے گھوڑی لی اور چالیس کوس کا فاصلہ رات بھر میں طے کرکے اگلے روز دانا آباد پہنچ گیا۔

کمّوں جس وقت مرزا کے پاس پہنچا، وہ اپنی بہن چھتی کی شادی کے کاموں میں مصروف تھا جس کی اتفاق سے اسی روز برات آنے والی تھی۔ مرزا نے صاحباں کا پیغام سنا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کھیوا جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کے باپ، ماں اور بہن بھائیوں نے اس کی بہتری منتیں اور التجائیں کیں کہ وہ کھیوا نہ جائے۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ سیالوں کی راہ پر مت جا۔ اس راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ یاد رکھ سیالوں کی عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔ وہ تمہارا کلیجا نکال کر کھا جائیں گی۔ عورتوں کی دوستی بُری چیز ہے۔ یہ پہلے تو ہنس کر دوستی کرلیتی ہیں اور پھر مرد کو ساری بات بتا دیتی ہیں۔ یاد رکھ جس گھر میں دوستی ہو، اس گھر میں کبھی قدم نہیں

رکھنا چاہیے۔ راجے چھینی ہوئی سلطنتوں، چور اپنی گرفتاری، عورت اپنے لیے ہوئے روپ اور مور اپنے پیروں کی بدصورتی پر ہمیشہ آنسو بہاتے ہیں۔

بہن چھتی بھائی سے کہتی ہے......

چڑھدے مرزے خان نوں، چھتی کرے سوال
ہٹ کے بیٹھیں مرزیا، گھر وچ کریں صلاح
اتے پلنگ دے بہ کہ، میرے ہتھیں کاج سنوار
بھلکے آون گے بھٹی سندل بار دے، صاحب سندی یار

روانگی کے لیے تیار مرزے خان کو چھتی نصیحت کررہی ہے کہ واپس آؤ اور گھر پر رکو۔ چارپائی پر بیٹھ کر صلاح مشورہ کرو اور اپنے ہاتھوں سے میری شادی کے کام انجام دو کیونکہ کل ساندل بار کے بھٹی مجھے بیاہنے آرہے ہیں۔

اس کی ماں کہتی ہے کہ سیالوں کی عورتیں قابل اعتبار نہیں اس لیے وہ کھیوے جاکر بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔

چڈھدے مرزے خان نوں، متاں دیوے ماں
برے سیالاں دے معاملے، بری سیالاں دی راہ
بریاں سیالاں دیاں عورتاں، لیندیاں جادو پا!
کڈھ کلیجہ کھاندیاں، میرے جھاٹے تیل نہ پا
رن دی خاطر چلیا، آنویں جان گوا
آکھے میرے لگ جا، اگے پیر نہ پا

ماں مرزے کو بتا رہی ہے کہ سیال (صاحباں کے قبیلے والے) بُرے اور شیطان لوگ ہیں۔ ان کے پاس کوئی بھلائی نہیں۔ ان کی عورتیں بھی ان جیسی ہیں۔ وہ جادوگرنیاں ہیں اور آنے والوں پر جادو کرنے میں ذرا دیر نہیں کرتیں۔ ان کے ہاتھوں میں نہ کھیل۔ وہ کسی کی جان لینے میں ذرا رعایت نہیں کرتیں اس لیے بڑھاپے میں مجھے دکھ نہ دے۔ ایک عورت کے لیے جارہے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی نہ ملے اور اپنی جان سے بھی جاؤ۔ اس لیے میری بات مان لے اور کھیوے نہ جا۔

حافظ برخوردار کے الفاظ میں ماں، مرزا کو کہتی ہے۔

چڑھ دے مرزے خان نوں متیں دے کھلی
جتول لائیے دوستی، نہ جائیے اوس گلی
اگے کڑاہ تپ گئے تیل دے، توں اودے نہ لت دھری
اگے ہاتھی سند دریا عشق دا کردا علی علی
دونہاں پڑاں وچ آئیکے حافظا کیوں ہندائیں ذری ذری

بہن اور ماں کی طرح باپ نے بھی مرزا خان کو اسی طرح کی نصیحتیں کیں اور کھیوا جانے سے روکنے کی کوشش کی۔

چڑھ دے مرزے خاں نوں، وجھل دیندا مت
بھٹھر ناں دی دوستی، کھری جہاں دی مت
ہس کے لاندیاں یاریاں، رو کے دیندیاں دس

عورتوں سے دوستی شیطانی فعل ہے کیونکہ وہ بے وقوف ہوتی ہیں۔ یہ ہنستے ہوئے پیار کرتی ہیں لیکن جب کوئی آفت آتی ہے تو روتے ہوئے نہ صرف راز فاش کردیتی ہیں بلکہ آنسوؤں سے خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ مرزا نے جب بہن اور ماں کی طرح باپ کی بھی بات نہ مانی تو رائے وجھل نے اسے کہا۔

جس گھر لائیے دوستی، مول نہ گھتیے لت!
سٹھیں ہتھ نہ آوندی، دانش منداں دی پت!
صاحباں آئیں نہ چھڈ کے، سر نہ دھوے ساڈی پت

جس گھر میں محبت کی جائے وہاں پلٹ کر نہیں جاتے۔ یاد رکھنا! وقت گزر جاتا ہے لیکن عقل مندوں کی کہی ہوئی بات ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اور اگر یہ ساری باتیں تیری سمجھ میں نہیں آرہیں تو پھر جا لیکن خالی ہاتھ مت آنا۔ ایسا نہ ہو کہ تو صاحباں کو چھوڑ کر بھاگ آئے اور تیرے اس فعل سے ہماری بے عزتی ہو۔

دراصل مرزا کے گھر والوں کو خدشا تھا کہ کھیوا والے رشتہ داری کی پروا کیے بغیر اسے مار ڈالیں گے لیکن مرزا نے کسی کی نہ سنی اور یہ کہتا ہوا کھیوا روانہ ہوگیا کہ

دس مہیناں دا گھیووتا، بکی دے ڈھڈ پا
بکی توں ڈرے فرشتے، میتھوں ڈرے خدا
چوبھے وچ تپال، اڈ کے چڑھے آتاس
چڑھنا اپنے شوق کوں، بکی کوں لاج نہ لا

میں نے اپنی گھوڑی بکی کو دس مہینوں تک اصلی گھی کھلا کر پالا پوسا ہے۔ میری بکی سے فرشتے اور مجھ سے خدا ڈرتا ہے۔ یہ صرف دوزخ کو ہی نہیں روند سکتی بلکہ مجھے جنت میں بھی لے جاسکتی ہے۔

ایک شاعر نے مرزا کی کھیوا آمد پر اس کی خواہش کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

کتی مرے فقیر دی، جیہڑی چاؤں چاؤں نت کرے
ہٹی سڑے تراڑ دی، جتھے دیوا نت بلے!
پنج ست مرن گوانڈناں، تے رہندیاں نوں تاپ چڑھے
سنجیاں ہوجان گلیاں، وچ مرزا یار پھرے

فقیر کی کتیا ہر وقت بھونکتی اور شور مچاتی رہتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ یہ مرجائے۔ لوہار کی دکان کو آگ لگ جائے کیونکہ یہاں ہمیشہ روشنی رہتی ہے۔ پانچ سات پڑوسنیں مرجائیں اور جو باقی رہ جائیں انہیں ایسا بخار آئے کہ اُٹھنے

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

کے قابل نہ رہ جائیں۔ بس محبوب کے گاؤں کی گلیاں سنسان ہو جائیں جس میں، میں یعنی مرزا اکیلا پھرے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

لیکن مرزا کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ ایک شیر جوان کی طرح عین اس وقت کھیوا پہنچا جب صاحباں کے گھر شادی کی رسمیں ادا ہو رہی تھیں۔ مرزا نے ساری صورتِ حال اپنی خالہ بیبو کو بتائی۔ بیبو فوراً صاحباں کے پاس پہنچی جو اس وقت اپنی سہیلیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ مرزا کی آمد کا پیغام سنتے ہی صاحباں کھل اُٹھی اور بھیس بدل کر اس سے ملنے آ گئی۔ صاحباں نے اسے قائل کرلیا کہ وہ اسے دانا آباد لے چلے ورنہ میرے گھر والے تجھے مار ڈالیں گے اور چدھڑ میری ڈولی اُٹھا لے جائیں گے۔

مرزا نے سرگوشیوں میں صاحباں سے معاملات طے کیے اور وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔ مرزا وہاں سے اُٹھ کر لوہار کے پاس پہنچا اور اسے کچھ کھونٹیاں بنانے کو کہا لیکن شرط رکھی کہ آدھی رات تک تیار مل جائیں۔

رات کو مرزا نے کھونٹیاں لیں اور انہیں مخصوص فاصلے سے کھیوا خان کے گھر کی عقبی دیوار میں گاڑ دیا اور خود صاحباں کا انتظار کرنے لگا۔ مقررہ وقت پر صاحباں چھپتی چھپاتی چھت پر پہنچی اور کھونٹیوں کے سہارے نیچے اُتر کر مرزا کی گھوڑی پر آ بیٹھی۔ دونوں ہر ممکن خاموشی کے ساتھ گاؤں سے باہر آئے اور پھر مرزا کی گھوڑی بکی یا نیلی تیز رفتاری سے دانا آباد کی طرف چل دی جو کھیوا سے ایک دن سے بھی کم مسافت پر تھا۔

صبح دم جب برات پہنچی تو صاحباں کو تلاش کیا گیا۔ سب سے پہلے صاحباں کے ماموں کے دوست فیروز ڈوگر نے راز کھولا کہ مرزا خان، صاحباں کو بھگا لے گیا ہے۔

یہاں کہانی کے واقعات میں ہلکا سا تضاد ہے۔ کچھ داستان نویسوں کا کہنا ہے کہ مرزا خان اس وقت کھیوا پہنچا تھا جب صاحباں کی برات آ چکی تھی اور اس کی تواضع کی جا رہی تھی جبکہ صاحباں اپنے ہاتھ پیر مہندی میں رنگ کر کسی چوبارے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مرزا سالوں اس گھر میں رہ کر گیا تھا اس لیے اسے گھر کا نقشہ نہ صرف ازبر تھا بلکہ یہ بھی علم تھا کہ صاحباں کس کمرے میں ہو سکتی ہے۔ اس نے خاموشی سے گھر میں داخل ہو کر ایک بااعتماد عورت کے ذریعے صاحباں کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ خود بھی صاحباں کے کمرے میں جا گھسا، صاحباں کو لے کر نیچے اُترا اور اسے گھوڑی پر بٹھا کر فرار ہو گیا۔ کہانی نویسوں نے جو نقشہ کھینچا ہے، اس کے مطابق صاحباں گھوڑی پر اس کی گود میں بیٹھی اور اس سے چمٹی ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحباں رات کی تاریکی میں کھیوا سے نکلے تھے۔

سیالوں کی عزت ایک بار پھر خاک میں ملنے کی خبر زیادہ دیر راز نہ رہ سکی۔ خان کھیوا نے چیخ کر اپنے بیٹوں اور کارندوں سے کہا کہ فوراً مرزا کا پیچھا کریں اور اسے دانا آباد پہنچنے سے پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کا گاؤں مرزا صاحباں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ عشق انسان کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جیسے برف درختوں کو اجاڑ دیتی ہے۔ چور کو کبھی گہری نیند نہیں آتی اور عاشق کی بھوک اڑ جاتی ہے۔ مرزا عاشق بھی تھا اور عورت چُرا کر بھی لے جا رہا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ دو راتوں سے مسلسل جاگنے کے باعث اسے نیند آنے لگی یا ممکن ہے کہ وہ فتح کے نشے میں چور ہو گیا ہو چنانچہ ستانے کے لیے وہ راستے میں ایک جنگل میں رک گیا (اس جنگل کا حدود اربعہ موجودہ فیصل آباد سے پچیس کلومیٹر دور سرشمیر روڈ کے نواح میں بتایا گیا ہے۔ یہ قصبہ بھی صاحباں کے بڑے بھائی شمیر خان کے نام پر آباد ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ مرزا کو اسی جگہ کے آس پاس موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا)

صاحباں نے اسے رکنے سے منع کیا۔ وہ جانتی تھی کہ سیال ان کا تعاقب ضرور کریں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ دانا آباد پہنچ کر دم لیا جائے لیکن مرزا کا جواب تھا کہ وہ سیالوں کے زیرِ اثر علاقے سے نکل آیا ہے لہٰذا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اور یوں بھی کوئی سورما، مرزا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں سیالوں کے سر کاٹ کر رکھ دوں گا۔ میرے تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ بس مجھے چند گھڑیاں سو لینے دو۔

صاحباں کہہ رہی تھی۔

عشق لتاڑے آدمی، برف لتاڑے رکھ
نیندر نہ آوندی چورنوں، عاشق نہ لگے بکھ
صاحباں مرزے دی دوستی، جگ نہ رہنی لک
لے چل دانا آبادنوں، جان لکاوے مکھ

مرزا تو سو گیا لیکن صاحباں اپنے عاشق کی رکھوالی کرتے ہوئے سیکڑوں وسوسوں کا شکار ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر اس کے بھائیوں نے انہیں پکڑ لیا اور مرزا کو مار دیا تو کیا ہوگا۔ مرزا کمال کا نشانے باز ہے۔ اگر اس کے بھائی، مرزا کے نشانے پر آ گئے تو کیا وہ بچ پائیں گے؟

صاحباں سوچتی رہی اور اپنے سوئے ہوئے عاشق کی رکھوالی کرتی رہی لیکن اس کے دل کا خوف اور وسوسے بہت جلد حقیقت کا روپ دھار گئے۔ سیالوں کو دانا آباد کے راستے کا تو علم تھا۔ پھر ایک کمہار نے بھی تصدیق کر دی کہ اس نے مرزا صاحباں کو ایک گھوڑی پر سوار اسی طرف جاتے دیکھا ہے چنانچہ سیال گھڑسوار بہت جلد ان کے سروں پر آ پہنچے۔ صاحباں نے مرزے کو جگانے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی۔ صاحباں کی منت زاری کسی کام نہ آئی اور مرزا بہ دستور پڑا سوتا رہا۔

اٹھیں مرزا ستیا، گھیے آئے اسوار
ہتھیں تیغاں رنگیاں کردے ماروامار
میرے بابل ورگیاں گھوڑیاں ویر میرے اسوار
کی ڈھنڈاون اساں دے، کی میر شکار

اب آنے والے صاحباں کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے آگے اس کا بھائی شمیر تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مرزا کے تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ اس نے اپنا ترکش اور کمان سنبھال لی تو سب سے پہلے میرا بھائی اس کی زد میں آئے گا۔ اس وقت مرزا کے ترکش میں تین سو ساٹھ تیر تھے۔ بعض شاعروں کے مطابق تین سو تھے لیکن یہ طے تھا کہ سیالوں سے مقابلے کے لیے مرزا کو یہ تیر بہت تھے۔ یہی سوچ کر صاحباں کو فکر ہوئی کہ اگر یہ سارے تیر موجود رہے تو میرے بھائی شمیر خان کا بچنا محال ہے۔

اس وقت وہ مرزا خان کی محبوبہ کے بجائے خان شمیر کی بہن بن گئی جبکہ بعض نے لکھا ہے کہ ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح صاحباں کی محبت بھائیوں اور محبوب میں تقسیم ہو گئی۔ وہ ان میں سے کسی کی موت نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سارا معاملہ بغیر کسی خون خرابے کے طے ہو جائے گا چنانچہ اس نے جلدی سے اُٹھ کر مرزا کا ترکش درخت کے بہت اوپر ٹانگ دیا جہاں مرزا کا ہاتھ نہ جا سکتا تھا۔ اس کی کمان کے ساتھ صرف تین تیر رہ گئے تھے۔ بعض شاعروں نے لکھا ہے کہ صاحباں نے ترکش کے تمام تیر توڑ دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ مرزا جاگ جائے اور وہ دونوں گھوڑی پر سوار ہو کر سیالوں کی دسترس سے دور ہو جائیں۔

لیکن اس کی یہ آخری کوشش بھی بے کار گئی۔ سیال جب قریب پہنچے اور انہوں نے للکارنا شروع کیا تو شور سے مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ تیزی سے اپنی کمان کی طرف لپکا لیکن جب یہ دیکھا کہ وہاں صرف تین تیر رہ گئے ہیں اور باقی اسی ترکش میں تھے جو درخت کے اوپر لٹک رہا تھا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ صاحباں نے کیا ہے جس کی محبت پر بھائی کا پیار غالب آ گیا تھا۔

حافظ برخوردار، مرزا کی زبان سے آخری شکوہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

مندا کیتوئی صاحباں، میرا ترکش ٹنگیوئی جنڈ
ترے سوسٹھ کانی میرے سار دی، دیندا سیالیں ونڈ
پہلی ماراں خان شمیر نوں، دوجی کلے دے تنگ
تریجی ماراں اوس نوں، جس دی توں سیں منگ
چوتھی ماراں اوس نوں، جیندی توں سیں فرزند
میرے سروں منڈا ساڈھب پیا، ننگی ہو گئی جھنڈ
باہجوں بھراواں سکیاں، میری کون کھیسی کنڈ
کول ہندے بھائی سکے، میریاں پیڑاں لیندے ونڈ

اور پیلو کہتا ہے۔

سرتوں منڈا سا اڈگیا، گل وچ پیندی جھنڈ
باجھ بھراواں جٹ ماریا، کوئی نہ مرزے دے سنگ

مرزا نے صاحباں کو سیالوں سے مل جانے کا طعنہ دیتے ہوئے پہلا تیر پوری طاقت سے کمان کھینچ کر چھوڑا جو خان شمیر کے گھوڑے کو لگا اور وہ گھوڑے سمیت نیچے گر پڑا۔ اس سے پیشتر کہ وہ دوسرا تیر اچلاتا۔ خود اس پر تیروں کی بارش ہو گئی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ اس نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے صاحباں کو دیکھا اور لڑکھڑاتی زبان میں شکوہ کیا ”صاحباں! تم نے مجھے دھوکے سے مروا دیا۔ کاش تم میرا ترکش ٹانگ کر مجھے بے بس نہ کرتیں۔ تم نے صرف مجھے ہی نہیں، خود کو بھی مروا دیا۔“

دھرنہ پڑی رن صاحباں، میری وچالیوں ٹٹی لاں
جے نہ سی توڑ نبھاونی، میری کاہنوں پکڑی بانہہ
چھوٹی کنی غضب دی، لے گئی مرزے نوں نال
روح مرزے دی نکل گئی، لگی جند ور نال!
منداں کیتا صاحباں، توں رل گئیں سیالاں نال

بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ مرزا کے تیر نے گھوڑے کو نہیں بلکہ شمیر خان کو نشانہ بنایا تھا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا جبکہ دوسرے کہتے ہیں کہ مرزا نے نیند سے اُٹھ کر اپنی کمان اور ترکش تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ نہیں ملا اور اسی اثنا میں خان، شمیر کا چلایا ہوا تیر اس کے حلق میں ترازو ہو گیا۔ دوسرا تیر مرزا کے سینے میں لگا اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے شکوہ بھری نگاہوں سے صاحباں کی آنکھوں میں جھانکا اور بہ قول پیلو...... کہا۔

مندا کیتا سن صاحباں، میرا ترکش ٹنگیا جنڈ

چیختی، سسکتی اور بلکتی صاحباں نے مزید تیروں اور زخموں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بچانے کے لیے خود کو مرزا کے نیم جاں بدن پر گرالیا لیکن سیالوں کے تیروں نے ایک دوسرے میں پیوست جسموں کو وہیں چھید ڈالا۔ کچھ کہتے ہیں کہ مرزا کی لاش وہیں جلادی گئی۔ بعض شاعروں نے لکھا ہے کہ صاحباں کو زندہ کھیوا لے جایا گیا اور وہاں اسے قتل کردیا گیا لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں کی لاشوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

مرزا کی گھوڑی نیلی (بکی) البتہ اس قتل و غارت سے بچ نکلی چنانچہ جب وہ خالی زین کے ساتھ دانا آباد پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ سوار کا غائب ہونا، سیالوں کی سفاکی کی داستان سنانے کو کافی تھا۔

مرزا کی ماں (اور بعض شاعروں کے مطابق اس کا چچا ابراہیم) اپنے قبیلے کے سردار رحموں کو سیالوں کے ظلم کی داستان سناتی ہے چنانچہ کھرل پوری قوت کے ساتھ کھیوا پر حملہ کرتے ہیں اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے ہیں۔ ماہنی سیالوں کے ساتھ ساتھ چدھڑ بھی اس قتلِ عام کا نشانہ بنتے ہیں اور یوں گلاب کے پھولوں سی اس داستانِ محبت کا انجام خوں ریزی اور قتل و غارت پر ہوتا ہے۔

کھرل، مرزا اور صاحباں کی لاشیں بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ پورے کھیوا شہر میں حملہ آوروں کے ہاتھوں صرف ایک مسجد باقی بچی جسے احتراماً چھوڑ دیا گیا۔ یہ مسجد آج بھی موجود اور مرزا صاحباں کی لازوال محبت کی گواہ ہے۔

پنجابی زبان میں مرزا صاحباں کی داستان محبت کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے راوی پیلو نے تو یہ لکھ کر قصّہ تمام کردیا کہ

مرزا ماریا ملک الموت دا، کجھ ماریا اوہنوں گمان
وچ قبراں دے کھپ گیا، مرزا سوہنا جوان

لیکن اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گیا جن میں سب سے بڑا سوال محققین کی نظر میں یہ ہے کہ خود پیلو کون تھا۔ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا؟ کچھ لوگ بے شک اسے چکوال کے نواحی گاؤں کا باشندہ قرار دیتے ہیں لیکن مستند ذرائع اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ پیلو 1601ء سے 1650ء کے درمیان حیات تھا اور دیگر تمام رومانوی داستانوں کی طرح مرزا صاحباں کی کہانی بھی نسل در نسل سنائے جانے کے بعد پیلو تک پہنچی اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیلو خود بھی کوئی قصّہ خواں یا داستان گو ہی رہا ہو۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ پیلو کی بیان کردہ داستان متعدد حوالوں سے بے حد اہم ہے۔ اس نے اپنے دور کے پنجاب اور اس سرزمین پر جنم لینے والی محبت کی صحیح عکاسی کی ہے جو کسی خاص مذہب، فرقے یا قبیلے کے پابند نہیں۔ کچھ محققین کہتے ہیں کہ ہم تک پہنچنے والا پیلو کا قصہ مکمل نہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے کئی مقامات پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے جیسے اختتام پر مرزا تو مرگیا لیکن صاحباں پر کیا بیتی؟ پیلو اس بارے میں خاموش ہے چنانچہ بعد کے شاعروں اور مصنفوں نے اپنے طور پر اندازہ لگالیا کہ صاحباں کو تیروں سے چھید دیا گیا ہوگا یا پھر اس نے اسی تلوار کو اپنے سینے میں گھونپ لیا ہوگا جس سے مرزا کو قتل کیا گیا ہوگا۔

پیلو نے لکھا ہے کہ مرزا، شمیر خان کے تیروں کا نشانہ بنا لیکن دیگر مصنفین لکھتے ہیں کہ سیالوں اور چدھڑوں نے مشترکہ طور پر مرزا پر چڑھائی کی۔ مرزا اپنی بہادری اور جانفشانی کے جوہر دکھاتا رہا اور نہایت دلیری سے لڑا لیکن بہت سے لوگوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ اسے عقب سے کسی نے وار کرکے گرایا اور بعد میں اس کے سر پر تلوار سے ضرب لگائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ لب مرگ مرزا نے صاحباں سے پوچھا کہ اس نے تیر کیوں توڑے؟ صاحباں نے اسے بتایا کہ اگر وہ تیر نہ توڑتی تو وہ انہیں صرف ہوا میں چلاتا تاکہ آنے والے ڈر جاتے کیونکہ وہ اس کے بھائیوں کے قتل کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ صاحباں یہ سن کر رونے لگی۔ وہ چونکہ مرزا کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی اس لیے اس نے وہی تلوار اُٹھائی جس سے مرزا کو قتل کیا گیا تھا اور اپنے سینے میں اُتار کر اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

پیلو نے لکھا ہے کہ مرزا دانا آباد میں رائے ونجھل اور صاحباں، کھیوا کے سردار کے گھر پیدا ہوئی۔ اس کے فوراً بعد دونوں کو مسجد میں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے بتایا گیا۔ بعد میں لکھی جانے والی کہانیوں سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ مرزا کو ابتدائی دینی تعلیم کی تکمیل کے لیے دانا آباد سے کھیوا بھیجا گیا تھا اور دونوں کے درمیان محبت، مسجد میں دوران تعلیم پروان چڑھی۔ یہاں ایک دلچسپ حقیقت کی نشاندہی بھی کردی جائے کہ پیلو نے مرزا اور صاحباں کی داستانِ محبت تو لکھی لیکن اپنی تحریر میں کہیں پیار یا محبت کے الفاظ ادا نہیں کیے بلکہ مرزا صاحباں کی محبت کو دوستی کا نام دیا۔ مجموعی طور پر پیلو نے سات مقامات پر لفظ ''دوستی'' کا استعمال کیا ہے۔

پیلو کے بہ قول مرزا کو اچانک اس کے گاؤں واپس بھیج دیا جاتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ کیوں بھیجا جاتا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کی پڑھائی مکمل ہوگئی ہو یا شاید اس لیے کہ صاحباں سے اس کی محبت راز نہ رہ سکی تھی۔ اسی طرح خان کھیوا نے صاحباں کی شادی کے لیے چدھڑوں کو کیوں چنا جبکہ مرزا اس کا بھانجا تھا اور صاحباں، طاہر چدھڑ کی نسبت مرزا کے ساتھ زیادہ پُرسکون زندگی گزار سکتی تھی کیونکہ چدھڑ کسی بھی مرحلے پر معاشقے کا حوالہ دے کر صاحباں کی زندگی اجیرن کرسکتے تھے لیکن مرزا کے ساتھ شادی میں ایسا کوئی معاملہ کبھی پیش نہ آتا۔

دو اور معمے بھی حل طلب ہیں کہ مرزا، صاحباں کی شادی والے دن کھیوا پہنچا تھا یا منہدی والے روز۔ بعض شاعر اور مصنف مصر ہیں کہ مرزا، کھیوا میں زیادہ وقت نہیں رکا لیکن کچھ کہتے ہیں کہ وہ تمام دن وہاں رہا اور اس نے لوہار سے کھونٹیاں بھی بنوائیں تاکہ ان کے سہارے صاحباں چھت سے اُتر کر اس کے پاس آسکے۔ پیلو اس پر بھی کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتا تاہم بعض معروف روایات کے مطابق صاحباں' دلہن کے لباس میں مرزا کے ساتھ فرار ہوئی تھی جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مرزا اس کی شادی والے دن کھیوا پہنچا اور رات کی تاریکی میں اسے لے کر دانا آباد روانہ ہوا۔

دوسرا معمّا مرزا کا راستے میں رکنا ہے کیونکہ کھیوا سے دانا آباد کا فاصلہ محض چالیس کوس تھا اور گھوڑے پر ایک دن سے بھی کم وقت میں منزل پر پہنچا جاسکتا تھا۔ مرزا یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ان سیالوں کی سرزمین پر ہے جن کی بیٹی بھگا کر دشمنی کی بنیاد رکھ چکا ہے اور وہ اس کا تعاقب ضرور کریں گے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صاحباں نے مرزا کی گھوڑی بکی کا مذاق اُڑایا تھا جو اسے بے حد عزیز تھی اور وہ محض یہ ثابت کرنے کے لیے رکا تھا کہ کچھ وقت آرام کے باوجود سیال اس کی گھوڑی کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے۔

ایک اور وجہ ''مردانگی'' ہوسکتی ہے جس کا تقاضا تھا کہ وہ چوروں کی طرح نہ بھاگے بلکہ مردوں کی طرح دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ پیلو کی شاعری سے پتا چلتا ہے کہ مرزا، صاحباں کے بھائیوں اور ان کے ساتھیوں کو جان سے مارنا چاہتا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ جب مرزا کے ستانے کے دوران شمیر وہاں پہنچا تو مرزا نے ایک ہی تیر میں اسے مار بھی گرایا تھا۔ صاحباں کے خیال میں ممکن ہے کہ یہ تیراندازی کے جوہر دکھانے کا مناسب موقع نہ ہو اور شاعر اس بارے میں کوئی بھی جواز کیوں نہ پیش کرے لیکن حقیقت یہی ہے کہ صاحباں نے اپنے عاشق سے غداری کی اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں اسے مروادیا لیکن اس کے باوجود وہ خود بھی زندہ نہ رہ سکی۔ محققین اس بارے میں کچھ بھی کہیں لیکن فی زمانہ قاری اسے یہی سمجھتا ہے۔

صاحباں کے جرم کی شدت کو کم کرنے کے لیے یہ استدلال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ظاہری طور پر خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ من کی بھی خوبصورت تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے خون بہایا جائے۔ وہ حنا کے بجائے اپنے ہاتھوں کو خون سے نہیں رنگنا چاہتی تھی جبکہ وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوگئی تھی کہ دونوں جانب سے مرنے والا اس کا اپنا ہی ہوتا۔ ایک طرف اس کی محبت مرزا تھا تو دوسری جانب اس کا بھائی۔ وہ جانتی تھی کہ مرزا کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا اور اگر مرزا نشانہ لے گا تو نشانہ بننے والا اس کا اپنا بھائی ہی ہوگا۔ بھائی پر اعتماد اسے ایک بہت بڑی غلطی پر مجبور کرتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کا بھائی اس پر ترس کھائے گا اور انہیں معاف کرکے گلے لگالے گا۔ اسی خیال سے وہ مرزا کو جگانے سے پہلے اس کا تیر کمان ہٹادیتی ہے لیکن بھائی اس کی سوچ کے برعکس مرزا پر حملہ کردیتا ہے اور مرزا مارا جاتا ہے۔ صاحباں یہ برداشت نہ کرسکی اور اس نے تلوار اپنے سینے میں اُتار کر خودکشی کرلی۔

پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی رومانوی داستانوں میں مرزا صاحباں کا قصّہ وہ واحد کہانی ہے جس میں مرد کا نام پہلے آتا ہے اور عورت کا بعد میں۔ دوسری کہانیوں یعنی ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال میں لڑکی کا نام پہلے لکھا جاتا ہے۔ سسی پنوں کو بھی اسی صف میں شامل کیا جاتا ہے اور پنجاب کی لافانی رومانوی داستان ہی قرار دیا جاتا ہے لیکن مصدقہ حقائق سے ثابت ہے کہ سسی پنوں کی کہانی سندھ اور بلوچستان کی داستان ہے، پنجاب کی نہیں۔

یہ تمام داستانیں محبت کرنے والوں کی موت پر ختم ہوتی ہیں' لیکن پنجابی اس المناک انجام کو محبت کرنے والوں کی فتح قرار دیتے ہیں۔ ان کرداروں پر لاتعداد لوک گیت لکھے گئے ہیں جنہیں نہایت محبت و عقیدت سے گایا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے کیونکہ محبت مر نہیں سکتی بلکہ ان محبت کرنے والوں کے دنیا ترک کرنے سے ان کی محبت امر ہوگئی ہے۔

اسی قسم کے خیالات کا اظہار وارث شاہ کے کلام ہیر میں بھی ملتا ہے جو ہیر کی محبت کو اسی انداز سے دیکھتے ہیں جیسے خدا سے حقیقی محبت۔ جب وارث شاہ محبت کے مضمون کو شروع کرتا ہے تو پہلے خدا سے مدد مانگتا ہے۔ یہی ریت ہے پنجاب کی اور پنجابیوں کی، جہاں مرنے والوں کی محبت کو زندہ سمجھا جاتا ہے اور اسے حقیقی محبت کی روح گردانا جاتا ہے۔

ناقدین کا کہنا ہے کہ جیسے ہر معاشرے میں اخلاقیات کی جانچ کے لیے دو معیار ہوتے ہیں ایسے ہی پنجابی معاشرے میں بھی ہیں۔ ان معیاروں کے تحت ہر شے کو دو زاویوں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

دیکھا جاتا ہے۔ ایک انتہائی نزدیک سے اور دوسرا ذرا فاصلے سے، جہاں ایک طرف تو اخلاقی اقدار ہیر کو زہر کھانے پر مجبور کرتی ہیں اور دوسری جانب اس کے مزار پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، چراغ جلائے جاتے ہیں اور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ سسی، ہیر، سوہنی، صاحباں اور ان جیسے بے شمار دوسرے لوگوں نے اسی دوغلے معیار کے خلاف جنگ کی ہے چنانچہ اسی لیے پنجابی ادب اور تہذیب ان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔

پنجابی کے لیجنڈ گلوکار عالم لوہار مرحوم نے مرزا صاحباں کی داستان اپنے رنگ میں گا کر امر کر دیا ہے۔ عالم لوہار کا کہنا ہے کہ ”اگر کوئی کپڑا پھٹ جائے تو اسے پیوند لگایا جاسکتا ہے لیکن پھٹے آسمان کو کیسے سیا جائے؟ اسی طرح شوہر مر جائے تو دوسرا مل سکتا ہے لیکن محبوب کے مرنے پر بھلا کیسے زندہ رہا جاسکتا ہے؟

اور شاید یہی ایک بہادر (اور کسی حد تک باغی) پنجابی عورت کا حوصلہ ہے جو اسے بے وقوفی کی آخری حدوں تک لے جا کر اس طرح کا وژن دیتا ہے کہ جب وہ اپنے محبوب سے تحفہ مانگتی ہے تو کہتی ہے ”میرے لیے آسمانوں سے ایک شرٹ بناؤ اور اسے زمین پر رکھ کر سیو۔“ مرزا صاحباں میں پنجابی عورت کی یہ فرمائش بدرجہ اتم موجود ہے اور عالم لوہار نے اسی جذبے کو اُجاگر کیا ہے۔

ایک اور پنجابی گلوکار ہربھجن مان نے بھی مرزا صاحباں کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے لیکن اس کی بنیاد پیلو کا قصہ ہی ہے۔ گانوں کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں مرزا صاحباں پر کئی فلمیں بھی بنائی گئیں جن میں سے 1957ء میں بننے والی فلم نے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ اس فلم میں بھارتی اداکار شمی کپور نے مرزا، اداکارہ شیاما نے صاحباں، رام سنگھ نے میر اور مدن پوری نے شمیر کا کردار ادا کیا۔

آج کے پنجابی ادب میں رانجھا کو اس کی بانسری، سوہنی کو کچے گھڑے (جس پر وہ بپھرے ہوئے دریائے چناب کو پار کیا کرتی تھی) اور مرزا کو اس کی بہادری و دلیری کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال معروف شاعر منیر نیازی مرحوم کی نظم کا ایک بند ہے۔

جتاں کرو کجھ دوستو، توڑو موت دا جال
پھڑ مرلی اورانجھیا، کڈھ کوئی تیکھی تان
مار کوئی تیر او مرزیا، پچھ کے دل آسمان

دوستو! اس مایوسی اور اداسی کو کم کرنے کے لیے کچھ کرو، رانجھا اپنی بانسری نکال اور کوئی مدھر تان فضا میں بکھیر۔ او مرزے آسمان کی طرف کمان کا رُخ کر کے کوئی تیر چلا، تا کہ مسرت و شادمانی کا یہ بند برتن ٹوٹے۔

جہاں تک مرزا اور صاحباں کا تعلق ہے تو وہ آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں حکمران ہیں لیکن صدیاں گزرنے کے باوجود سیال، ہیر اور صاحباں کا ذکر کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کیونکہ اتفاق سے دونوں ہی ان کی بیٹیاں تھیں۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن قابلِ حیرت امر یہ ہے کہ کھرل بھی مرزا صاحباں سے اجتناب برتتے ہیں۔

مرزا صاحباں کا مقبرہ تحصیل جڑانوالہ کی یونین کونسل دانا آباد کی حدود میں چک 484 جی بی (ج ب) جھنڈ والی میں نہایت خستہ حال میں موجود ہے۔ ان قبروں کی نہ تو دیکھ بھال کی جاتی ہے اور نہ ہی مقامی آبادی اپنی عورتوں کو اس مقبرے پر حاضری کی اجازت دیتی ہے کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اس طرح وہ مرزا صاحباں کی تقلید کریں گی، اس پابندی کی حمایت میں وہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مقبرے کے اردگرد کئی ایسے واقعات پہلے ہی رونما ہو چکے ہیں۔

2009ء میں دانا آباد یونین کونسل کے ناظم رائے رشید کھرل نے بتایا کہ پچاس برس پہلے مزار کے متولی پیلو میراثی کی بیٹی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ پیلو میراثی یہ خبر سن کر انتقال کر گیا اور اس کی قبر بھی مزار کے نزدیک ہی موجود ہے۔ اس واقعے کے بعد علاقے کے رہائشی اس نتیجے پر پہنچے کہ مقبرہ پر حاضری سے عورتوں کے اپنے گھروں سے فرار کے مزید واقعات رونما ہو سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی خواتین کے مزار پر جانا بند کرا دیا۔

جھنڈ والی کے رہائشی حیات کھرل نے اس پابندی کی حمایت کرتے ہوئے بتایا کہ آٹھ سال پہلے یعنی 2004ء میں اسی گاؤں کے رہنے والے اکرم عرف اکرمی کی بیٹی، مزار سے واپسی پر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ایک اور رہائشی شہادت علی کھرل نے انکشاف کیا کہ ان کے بزرگوں کے خیال میں اس مقبرے کو مسمار کر دیا جانا چاہیے کیونکہ یہ مرزا صاحباں کی ”گندی آرام گاہ“ ہے۔ ایک اور رہائشی قاسو کھرل کا کہنا تھا کہ مرزا صاحباں کی یادگار مٹا دینی چاہیے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ پنجاب اور پنجابی ثقافت کی آبرو کہلانے والے مرزا صاحباں کی قبروں سے اتنی نفرت کیوں کی جاتی ہے؟ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو مرزا صاحباں اور ہیر کے بغیر سیالوں اور کھرلوں کی حیثیت ایک عام سے قبیلے یا برادری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عشقِ شش جہت

عافیہ فاروقی

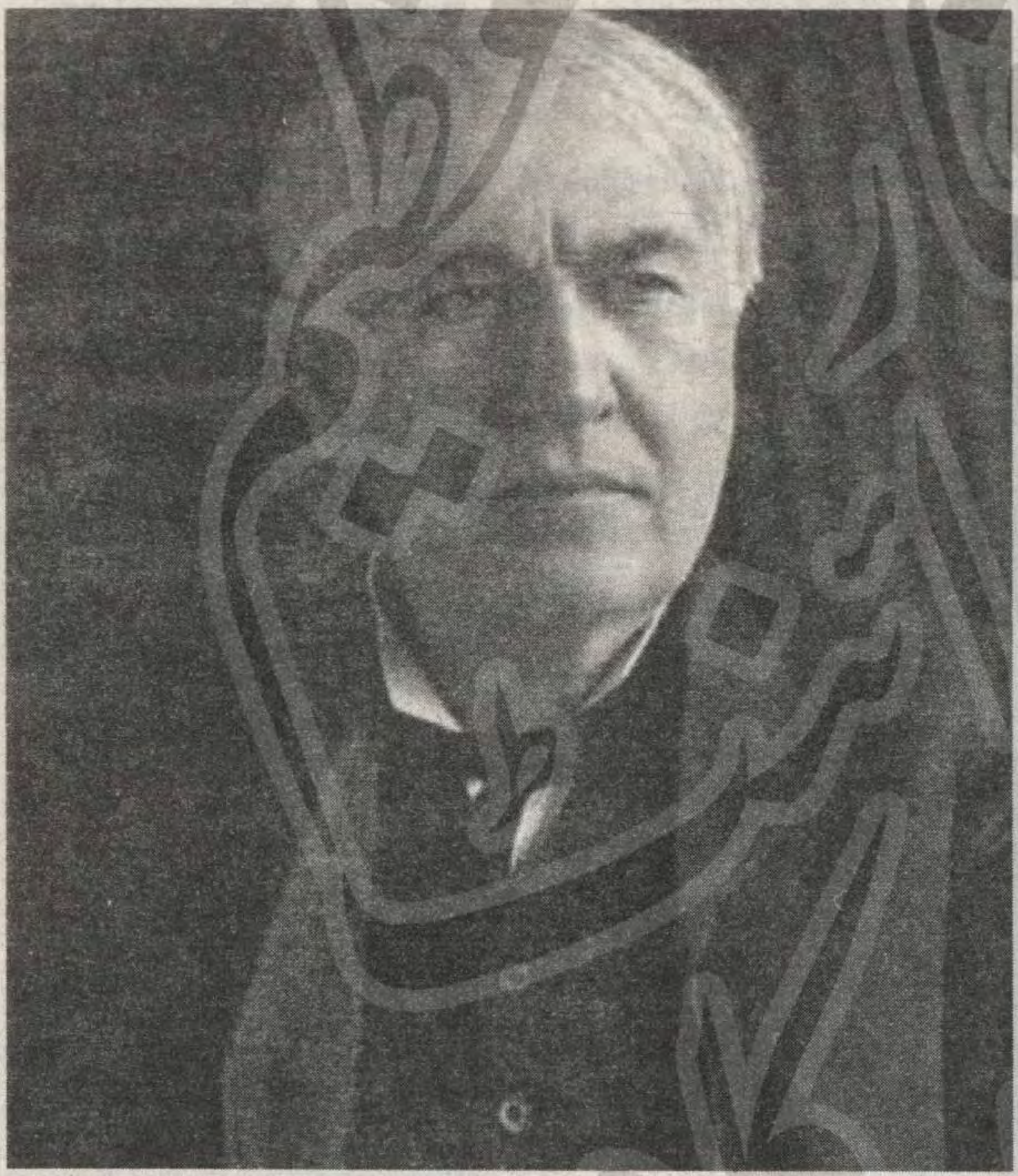

عشق اپنے آپ میں شش جہت ہے۔ عشق صرف دو دلوں کے ملن کا نام نہیں۔ عشق جاندار کے علاوہ بے جان ہستیوں سے بھی ہوجاتا ہے۔ کسی کو تحصیلِ علم سے عشق ہوتا ہے تو کسی کو اپنے پیشے سے۔ اور کسی کو قدرتی مناظر سے۔ ایسے ہی چند باکمال شخصیات کا تذکرہ جنہیں عشق کسی اور چیز سے تھا مگر ناکامی کے بعد قسمت نے کسی اور طرف ہانک دیا۔

عشق کی ایک اور شاخ کا تذکرہ

عشق کے ہزار پہلو ہوتے ہیں۔
کوئی ضروری نہیں ہے کہ عشق صرف انسان سے ہو۔ خدا سے بھی ہوتا ہے، کسی جانور سے بھی اور اپنے کام سے بھی۔

ایسے ہزاروں لوگ گزرے ہیں جنہیں اپنے مقصد سے عشق تھا۔
وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جنونی ہو گئے تھے۔
انہیں خود اپنا ہوش نہیں تھا کیونکہ عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عاشق کو اپنے محبوب کے علاوہ کسی اور کا دھیان نہیں رہتا۔

یہ جنونی اور ایب نارمل لوگ جب کام کرنا شروع کرتے ہیں تو انہیں کھانا پینا بھی یاد نہیں رہتا۔

ایسے لوگوں میں تاریخ کے بہت بڑے بڑے نام ہیں۔

یہ لوگ اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب بھی نہیں رہے بلکہ ناکام ہی ہوتے ہیں ''ناکامیوں نے اور بھی خودسر بنادیا۔ اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہوگئے''۔

انہوں نے اپنی ناکامیوں سے توانائی حاصل کی۔ طاقت پائی، بددل نہیں ہوئے اور اپنے مقصد اپنے کام سے عشق کرتے رہے اور اس عشق نے انہیں وہ مقام عطا کردیا کہ ساری دنیا ان کے ناموں اور کاموں سے واقف ہے۔

گلوکار ایلوس پریسلے

ہم نے ایسے چند کامیاب لیکن ناکام لوگ تلاش کیے ہیں۔ آئیں، آپ بھی ہمارے ساتھ شیئر کریں۔

دنیا کا یہ کامیاب ترین شخص بے تحاشا ناکام ہوا۔

اس کو غلطیوں اور تجربات کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اپنے کام سے عشق کی مثال قائم کردی تھی۔

کون نہیں جانتا کہ تھامس ایڈیسن کون تھا؟

اس نے پوری دنیا کو اپنی سیکڑوں ایجادات کے تحفے دیے ہیں۔ بلب، مشینیں، سلائی مشین اور نہ جانے کیا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کی ایجادات کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔

اور سیکڑوں چیزیں ایجاد کرنے والا ہزاروں بار ناکام ہوا۔ اس کی ناکامیوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ اس نے ایک بار اپنی ناکامیوں کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کیا خوبصورت بات کہی ہے۔

''کون کہتا ہے کہ میں ناکام ہو رہا ہوں۔ میں ناکام نہیں ہو رہا۔ بلکہ میں نے ایسے ہزار طریقے ڈھونڈ لیے ہیں جو کارآمد نہیں ہیں۔''

یعنی وہ ناکام راستوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا رہا تھا اور جب نوسو ننانوے راستوں کے بعد ہزارویں راستے پر پہنچا تو پوری دنیا میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی۔

اس نے پوری دنیا کو اپنی ایک اور ایجاد کا تحفہ دے دیا تھا۔

یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ بچپن میں وہ بہرا تھا۔

اپنی کلاس میں اس کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ اس کے استاد اس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ آگے چل کر کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔

اس کا کہنا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ بہرا تھا، ورنہ لوگوں کی بددل کرتی باتیں اور ان کے دل شکن تبصرے اسے کبھی آگے نہیں بڑھنے دیتے۔

اسی لیے وہ تبصرے اس نے سنے ہی نہیں اور اپنے کاموں میں مصروف رہا اور آج ہم اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔

موسیقی سے شوق رکھنے والا ہر شخص اس کو جانتا ہے۔

پوری دنیا میں اس کے کروڑوں پرستار تھے۔ وہ جدھر سے گزرتا صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ سڑکوں پر کھڑے رہتے۔

بلاشبہ وہ موسیقی کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنی سفید گاڑی ایک طرف کھڑی کرکے کسی کام سے گیا تھا۔ واپس آیا تو لپ اسٹک والے ہونٹوں کے نشانات نے اس گاڑی کا رنگ بدل دیا تھا۔

ایلوس پریسلے بھی عاشق تھا۔

اپنے کام کا، موسیقی کا۔ ایسا جنونی شاید ہی کوئی اور ہوتا ہو۔ موسیقی کو اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ موسیقی اس کا شوق نہیں بلکہ عبادت تھی۔

وہ کمال کا آدمی تھا لیکن اس کمال کے رتبے تک پہنچنے کے لیے اسے بے شمار ناکامیاں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ اتنی بددلی ہوئی تھی کہ وہ کچھ عرصے تک گوشۂ گمنامی میں چلا گیا تھا۔

اس نے اپنے پہلے البم میں اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔ اسے اپنے اس البم سے بہت سی امیدیں تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ یہ البم پوری دنیا میں دھوم مچادے گا لیکن کیا ہوا۔ وہ البم فضا میں تحلیل ہوگیا۔ اس کا نوٹس ہی نہیں لیا گیا تھا۔ کسی نے سنا ہی نہیں تھا۔ ایلوس کے لیے یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔

اس نے کچھ دنوں کے بعد پھر محنت کی۔ یہ نغمہ اس نے بہت دل لگا کر گایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بار اس کا یہ نغمہ اس کے لیے کامیابیوں کے راستے کھول دے گا۔

لیکن وہ نغمہ بھی ناکام ہوا۔ لوگوں نے اس پر تبصرے تو کیے لیکن بہت حوصلہ شکن۔ بددل اور مایوس کردینے والے۔

لیکن جن کو اپنے مقصد سے عشق ہوتا ہے، وہ ایسی باتوں کی کب پروا کرتے ہیں۔ اس نے بھی حوصلہ نہیں ہارا۔ ناکامیاں اسے مہمیز کرتی رہیں اور بالآخر وہ اپنے عہد اور بعد کے عہد کا سب سے بڑا گلوکار بن کر سامنے آگیا۔

ایک بے مثال مصور

مصور وان گوگ

مصوری سے دلچسپی رکھنے والے وان گوگ کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں مصوری میں گنتی کے چند ہی نام لیے جاسکتے ہیں اور ان میں سے ایک نام بلاشبہ وان گوگ کا ہے۔

وان گوگ صحیح معنوں میں ایک بہت بڑا فنکار تھا۔

اور صحیح معنوں میں ناکامیاں اس کے مقدر میں آئی تھیں۔ نہ جانے اس نے کتنی محروم زندگی گزاری تھی، کتنی ناکامیاں اس کے حصے میں آئی تھیں۔

اس کا عشق صرف رنگوں سے تھا۔ دل فریب رنگ۔ وہ جب کینوس پر رنگ بکھیرتا تو رنگ بولنے لگتے تھے۔ آج اس محروم شخص کی ایک ایک تصویر لاکھوں کروڑوں میں فروخت ہوتی ہے۔

جبکہ ابتدا میں یہ حال تھا کہ کوئی اس کو مصور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا اسی لیے وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ گیا تھا۔

اس نے ایک بار غصے اور جھلاہٹ میں آکر اپنی نہ جانے کتنی تصویریں جلا ڈالی تھیں۔ تصویروں کو ایک جگہ جمع کرکے اس نے آگ لگادی تھی۔

جب ان تصویروں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تو ان کا جل جانا ہی بہتر ہے۔ اگر وان گوگ کہ وہ تصویریں باقی رہ جاتیں تو مصوری کی دنیا کو نہ جانے کتنی نایاب تصویروں کا مزید خزانہ مل جاتا۔

اس شخص نے مفلسی کی زندگی گزاری اور مفلسی ہی میں مرگیا اور آج اس کی بنائی ہوئی ایک ایک تصویر کروڑوں میں بک جاتی ہے۔

بے مثال مصنف

اس نے اپنے اسکول میں پہلا مضمون لکھا جو زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔ اس کے ٹیچر نے کہا کہ وہ لکھنے کے بجائے کسی اور شعبے کی طرف دھیان دے۔

اس نے پھر ایک کہانی لکھی۔ بہت سوچ سمجھ کر۔ اس کے پڑوس میں ایک صاحب رہا کرتے تھے، جن کی حرکتیں بہت عجیب ہوتی تھیں۔

مصنف اسٹیفن کنگ

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے ان صاحب کو مرکزی کردار بنا کر ان پر ایک کہانی لکھ ڈالی۔ اس میں جذبات نگاری اور مشاہدے کا کمال تھا۔

اس کے استادوں نے وہ کہانی پڑھ کر اس کے بارے میں فیصلہ دے دیا کہ وہ آگے چل کر ایک بڑا کہانی کار بن سکتا ہے۔

یہاں تک تو اس کی کامیابی ہے۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہوا اور اس نے تحریر کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا چاہا تو ناکامیاں اس کا مقدر بن گئیں۔

وہ کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی عشق کیا ہے اور وہ عشق ہے میرا لکھنا۔ میں لکھے بغیر رہ نہیں سکتا۔ میری تحریریں میری محبوبہ ہوتی ہیں۔ میں اپنی محبوبہ کو ہر طرح سنوارا کرتا ہوں۔ اس کے نخرے برداشت کرتا ہوں اور جب وہ مجھے خوبصورت لگتی ہے تو میں اسے دوسروں کو دکھانے لے آتا ہوں۔

لیکن اس کے ساتھ بدقسمتی یہ رہی کہ اس کی محبوبہ کی کسی نے قدر نہیں کی۔

ناکامیاں اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

اس نے ایک ناول لکھا۔ پبلشر کے پاس لے گیا۔ اس نے ریجیکٹ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس ناول میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے جو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

یہ اس کی پہلی ناکامی تھی۔ پھر ناکامیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ تیس بار ناکام ہوا ہے، تیس بار۔ اور وہ پھر بکھر کر رہ گیا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا ”گرچہ لکھنا میرا عشق ہے۔ وہ تو میں ترک نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کون ہوگا جو اپنی زندگی سے دور ہونا چاہے گا؟ لیکن میں اب اپنے اس شوق کو اپنا پروفیشن نہیں بنا سکتا، مجھے کچھ اور سوچنا ہوگا۔“

لیکن اس وقت اس کی بیوی نے اس کی حوصلہ افزائی کی، اس نے کہا ”تم تیس بار ناکام ہوئے ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم ایک بار اور کوشش کرو۔“

اور جب اس نے اکتیسویں بار کوشش کی تو اس کے ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد اسٹیفن کنگ آپ کے سامنے ہے۔

لکھنے پڑھنے سے دلچسپی رکھنے والا ایسا کون ہے جو اس کو نہیں جانتا۔

مقبول مصنفہ

اس بچی نے پریوں، شہزادیوں اور جادوگروں کے خواب دیکھے تھے۔

اس کی بچپن سے خواہش تھی کہ وہ ہواؤں میں اُڑتی پھرے۔ پُراسرار مقامات پر جائے۔ طرح طرح کے انوکھے واقعات اس کے ساتھ پیش آئیں۔

لیکن اس کے حالات ایسے تھے کہ وہ بازار سے کوئی گڑیا بھی نہیں خرید سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔

ملک کے ایک فلاحی ادارے نے اس کی پرورش کی تھی۔ ایسی لڑکی جب جوان بھی ہو جائے تو کون اس کی طرف دیکھتا ہے؟

پھر کسی نہ کسی طرح اس کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور طلاق بھی ہو گئی۔ اب وہ مکمل ٹوٹ چکی تھی۔ زندگی نے اسے بہت دکھ دیے تھے۔ اب دکھوں کے ازالے کا وقت آ گیا تھا۔

اس نے خدا سے دعا کی ”یا خدا! مجھے لکھنے کی توفیق دے۔“

پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ وہی پُراسرار کہانیاں جو زندگی بھر اس کے خوابوں کا حصہ رہی تھیں لیکن کسی نے بھی ان کہانیوں کو قبول نہیں کیا۔

لوگ کہا کرتے ”تم کن چکروں میں پڑی ہو، یہ سائنسی دور ہے۔ آج کل یہ الف لیلہ والی کہانیاں نہیں چلتیں، کچھ اور لکھ کر لاؤ۔“

لیکن وہ کچھ اور تو لکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اس کے بس ہی میں نہیں تھا اس نے تو ہمیشہ ایسے ہی جزیروں اور انوکھی دنیاؤں کے خواب دیکھے تھے۔

وہ ان خوابوں میں ایسے کرداروں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ان سے عشق تھا اس کو۔ یہ کردار، اس کی محبت تھے، اس کی زندگی تھے۔

وہ اپنے عشق کو کسی طور اُدھورا نہیں چھوڑ سکتی تھی اسی لیے اس نے دوسری کہانی لکھی۔ اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی کہانی کا ہو چکا تھا۔

اس کہانی کا بھی وہی ماحول تھا، وہی پُراسرار ماحول۔

لیکن وہ بددل نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ عشق کرنے والوں کے یہاں مایوسی گناہ ہے۔ انہیں مسلسل آگے بڑھنا چاہیے۔ بہ قول شاعر۔ عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم جس میں۔ ایک لحظہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے۔

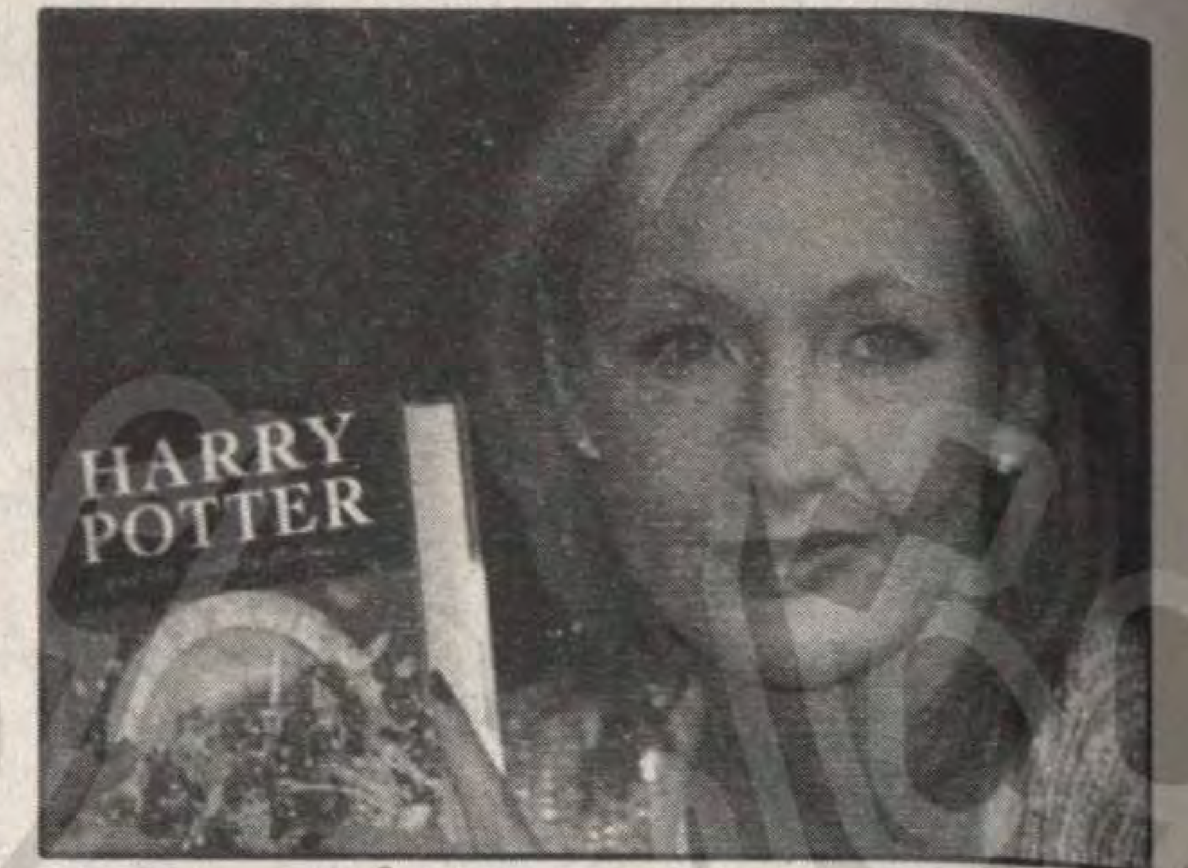

جے کے رولنگ

وہ اپنی تحریروں سے عشق کرتی رہی۔

بالآخر اس کا یہ جنون، یہ عشق رنگ لے آیا۔ اب کی بار اس نے اسی ماحول کی جو کہانی لکھی، وہ انتہائی مقبول ہوئی۔

کہتے ہیں کہ خدا کے یہاں ہر قبولیت کا ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ اس کا وقت آ گیا تھا۔ وہی پبلشر جو ایسی غیر حقیقی کہانیوں کا مذاق اُڑاتے تھے، وہی اس کے پیچھے ہو گئے اور اس کی سیریز ”ہیری پورٹر“ اپنے عروج اور شہرت کی انتہا کو پہنچ گئی۔

پوری دنیا میں ایسا کون سا بچہ ہے یا جوان ہے جو ہیری پورٹر کو نہیں جانتا؟ اس سیریز کی خالق جے کے رولنگ کو تو شاید کم ہی لوگ جانتے ہوں لیکن ہیری پورٹر کو سب جانتے ہیں۔

اور اب کچھ ایسے لوگ جن کا عشق کچھ اور تھا لیکن زندگی نے انہیں ان کے عشق سے محروم رکھا اور وہ کسی اور میدان میں کامیاب ہوئے۔

کتابوں کا عاشق

ایسی ایک خوبصورت مثال ڈیوڈ میکنیل ہے۔

وہ کتابوں کا عاشق تھا۔

بچپن ہی سے کتابیں اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔

اس کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر بہت مشہور پبلشر بنے گا۔ مشہور لوگوں کی کتابیں شائع کیا کرے گا۔

وہ اپنے والدین سے کھلونوں کے بجائے کتابوں ہی کی فرمائش کیا کرتا اور وہ بھی اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے کتابیں لایا کرتے۔

والدین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ڈیوڈ کو آگے جا کر کیا بننا ہے۔ صرف کتابوں کے شوق سے تو بات نہیں بنے گی۔ وہ اس سے دریافت کرتے تو وہ کہہ دیتا۔ کتابیں، صرف کتابیں۔ میں کتابیں چھاپوں گا، آپ لوگ دیکھ لیجئے گا کہ یہ کتابیں مجھے کیا کچھ دیتی ہیں۔

اس کے والد نے اس سے وعدہ کر لیا کہ اس کے پبلشر بننے پر وہ اس کی مدد کریں گے لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ جوان ہونے تک اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

اب ڈیوڈ کو اپنی زندگی خود بنانی تھی۔

وہ کتابوں کے چکر میں رہتا لیکن صرف کتابوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو کہاں نوکری ملتی ہے۔

پھر جب اس کی پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اس نے ایک چھوٹی سی فرم میں ملازمت کر لی جس کا باس ایک نرم مزاج انسان تھا۔

اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ڈیوڈ کو اپنے کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے ایک دن ڈیوڈ سے دریافت کیا ”آخر تم کام پر کیوں دھیان نہیں دیتے؟ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟“

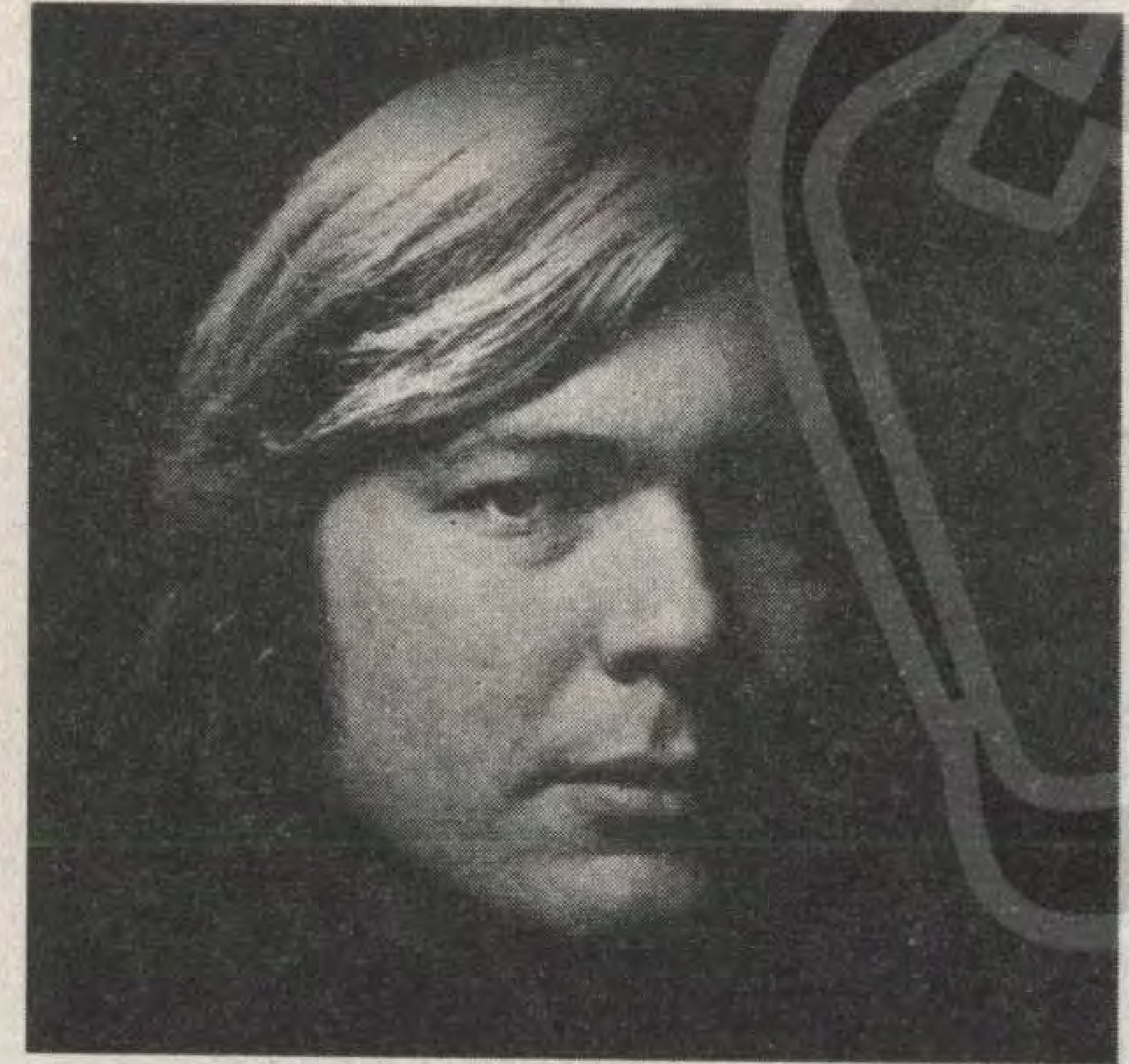

ڈیوڈ میکنل

”جناب، میرے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ میرا شعبہ کتابیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یا تو کتابیں خود چھاپوں یا کسی بڑے پبلشر کے یہاں کام کر لوں۔“

”ہوں......“ باس نے ایک گہری سانس لی ”سمجھ گیا۔ میرا ایک دوست پبلشر ہے۔ زیادہ بڑا اور مشہور تو نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارا کام وہاں بن جائے۔“

اس کے باس نے اسے اپنے پبلشر دوست کے پاس بھیج دیا۔

پبلشر نے اس سے کہا ”دیکھو، ہمارے یہاں پبلشنگ ہاؤس میں تو کوئی کام نہیں ہے لیکن اتنا ہو سکتا ہے کہ گھر، گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

جا کر کتابیں فروخت کیا کرو...... یعنی سیلز مین بن جاؤ۔"
ڈیوڈ نے فوراً یہ آفر قبول کرلی۔ بہرحال اس طرح بھی اس کا تعلق کتابوں سے تو رہا تھا۔
لیکن وہ بہت بُری طرح ناکام رہا۔
وہ جب دروازوں پر دستک دیتا اور خواتین باہر آتیں تو سیلز مین کو دیکھ کر اس سے پہلا سوال یہی کرتیں "کیا تمہارے پاس کوئی پرفیوم ہے؟"
وہ بہت بددل ہو کر بتاتا "نہیں میڈم، میں پرفیوم فروخت نہیں کرتا، میرے پاس کتابیں ہوتی ہیں۔"
خواتین اسے ٹرخا دیا کرتیں۔
وہ بہت بددل ہوگیا اور ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ پرفیوم ہی بیچنا شروع کردے۔ اس کا عشق تو کچھ اور تھا اور یہ شعبہ اس کے لیے بالکل مختلف تھا۔
پھر بھی اس نے جھلا کر خود اپنا بنایا ہوا پرفیوم بیچنا شروع کردیا اور یہاں سے اس کی قسمت نے اس کا ساتھ دینا شروع کردیا۔
اس کا پرفیوم مقبول ہوتا چلا گیا اور آج پوری دنیا میں پرفیوم کا ایسا کون سا شوقین ہے جو AVON برانڈ کو نہیں جانتا۔
ڈیوڈ کہا کرتا "یہ ٹھیک ہے کہ آج میرے پاس عزت، دولت سب کچھ ہے لیکن میں اپنے عشق میں تو ناکام رہا ہوں نا...... وہ عشق جو مجھے کتابوں سے تھا۔"

ٹوتھ پیسٹ کا بانی

اور اب ایک دوسری کہانی بھی پڑھ لیں۔
ایک شخص تھا ولیم۔ سیدھا سادا لیکن بہت محنتی نوجوان۔
وہ جب بے روزگار تھا تو اس زمانے میں اسے موم بتیوں سے پیار تھا۔ وہ رنگ برنگی خوبصورت موم بتیاں جو سالگراہوں پر روشن کی جاتی ہیں۔
وہ موم بتیاں جو ہر خوشی کے موقع پر اور مقدس تہواروں میں جلائی جاتی ہیں۔ جن کی روشنی اسے بہت پاکیزہ اور اُجلی اُجلی محسوس ہوتی۔
وہ سوچا کرتا کہ موم بتیاں خوشیوں کے اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ ہیں تو وہ بھی موم بتیوں کا کاروبار کرے گا۔
اور بڑے ہو کر اس نے واقعی موم بتیاں بنانی شروع کردیں۔ رنگ برنگی خوبصورت موم بتیاں جو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا کرتیں۔
اسے چونکہ موم بتیوں سے پیار تھا اس لیے اس نے موم بتیوں کی ساخت میں بھی جدت پیدا کردی۔ وہ ان پر تجربات کرتا رہتا۔ مختلف سائز اور مختلف صورت کی موم بتیاں۔
اس کا موم بتیوں کا شوق یا پیار تو اپنے عروج پر تھا لیکن اس کی مالی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کا یہ پیار اسے زیادہ فائدے نہیں پہنچا رہا تھا۔
ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کو کھانے پینے کی بھی دشواری ہونے لگی۔ بالآخر اس نے اپنے باپ کی ڈائری نکالی جس میں طرح طرح کی چیزیں بنانے کے طریقے لکھے ہوئے تھے۔
اس نے ٹوتھ پیسٹ کا انتخاب کیا اور پُرانے طریقوں میں کچھ اور شامل کر کے ایک نیا ٹوتھ پیسٹ بنا کر بازار میں بیچنا شروع کردیا۔
اس ٹوتھ پیسٹ کا نام اس نے اپنے نام پر رکھا تھا۔ کولگیٹ ...... کیونکہ اس کا پورا نام ولیم کولگیٹ ہے۔ اس نے موم بتیوں کا کاروبار 1806ء میں شروع کیا تھا اور ٹوتھ پیسٹ بنانے کا کام 1873ء میں۔ اب پوری دنیا میں ایسا کون ہے جو کولگیٹ کو نہیں جانتا۔

نوکیا کا خالق

فن لینڈ کے ایک شہر میں کاغذ بنانے کی ایک فیکٹری تھی۔
کاغذ کا معیار بھی اچھا تھا۔ ریاضت بھی تھی، محنت بھی تھی، اس کے باوجود وہ فیکٹری نقصان میں جا رہی تھی۔ ایک سال، دو سال...... پانچ برس۔ وہ فیکٹری نقصان ہی میں جاتی رہی۔
مالکان چونکہ صنعت کاغذ سازی کی وجہ سے اس فیلڈ میں آئے تھے اسی لیے وہ اس فیکٹری کو سنبھالنے کی لگاتار کوشش کرتے رہے۔
لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔
فیکٹری نقصان ہی میں جاتی رہی۔ آخرکار مجبور ہو کر انہوں نے ایک دوسرا بزنس شروع کردیا۔ لطف یہ ہے کہ اس بزنس کا کوئی تعلق بھی کاغذ کی صنعت سے نہیں تھا۔
یہ ایک الگ ہی کام تھا جس کا انہیں کوئی خاص تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس میدان میں کود پڑے تھے۔
پھر خدا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کے بنائے ہوئے موبائل سیٹ نے اپنی ساکھ قائم کرنی شروع کردی۔ یہ واقعہ ہے 1980ء کا۔ اور آج پوری دنیا کے موبائل استعمال کرنے والے کے ہاتھ میں "نوکیا" کا موبائل ضرور ہوتا ہے۔
انہوں نے اس جگہ کے نام پر اپنے موبائل کا نام رکھا تھا یعنی نوکیا نام کی بستی کے نام پر۔

پُرخطر عشق

تسنیم رضا مھکری

وہ پوری دنیا کو فتح کرلینے پر کمربستہ تھا۔ ظلم کا نشان کہلاتا تھا۔ تاریخ نے اسے جابروں کا سرخیل قرار دیا ہے۔ لوگ اسے ہٹلر کے نام سے پہچانتے ہیں مگر اس ظالم شخص کے سینے میں بھی دل تھا۔ اس نے بھی پیار کیا تھا اور اپنی محبوبہ کو حاصل بھی کرلیا لیکن قسمت کو تو کچھ اور منظور تھا۔ یہ پیار ناکام ثابت ہوا اور ناکامی کی سمت اسے موت نے دھکیلا تھا۔

ہٹلر کے عشق کا قصۂ پُرلطف

عشق ناکام نمبر

یہ ایک عجیب محبت کی عجیب داستان ہے۔ ایک ایسے شخص کی داستان جسے پوری دنیا ظالم و جابر کے طور پر جانتی ہے یعنی ایڈولف ہٹلر۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی شخصیت کا یہ پہلو بہت نمایاں تھا۔ لیکن اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ ایک مصور تھا، شاعر تھا اور محبت کرنے والا تھا اور ایسے شخص کی محبت میں پاگل ہونے والی کا نام تھا ایوا براؤن۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

ایوا کی پیدائش 6 فروری 1912ء کو جرمنی کے شہر میونخ میں ہوئی تھی۔

وہ ایک اسکول ٹیچر فریڈرکس کی دوسری بیٹی تھی۔ اس کی ماں کا نام فرانزسکا تھا۔ ایوا کی بڑی بہن الیس 1904ء میں پیدا ہوئی اور اس کا چھوٹا بھائی 1915ء میں پیدا ہوا تھا۔

ایوا نے ابتدا ہی سے اپنے گھر کے حالات عجیب دیکھے تھے۔

والدین کے درمیان مالی معاملات پر تناؤ کی کیفیت رہتی۔ دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا رہتا جس کو ایوا کا حساس ذہن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر 1921ء میں اس کے والدین کے درمیان کسی بات پر علیحدگی ہوگئی۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر دونوں پھر ایک ساتھ ہوگئے تھے۔

ایوا نے میونخ میں اپنی ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد ایک سال کے لیے بزنس اسکول میں پڑھتی رہی۔

پڑھائی کے اعتبار سے وہ زیادہ ذہین نہیں تھی۔ مگر اس میں دیگر خوبیاں ضرور تھیں جیسے وہ بہت اچھی ایتھلیٹ تھی۔ ایک اچھی فوٹوگرافر تھی۔

بعد میں یہی شوق اسے نازی پارٹی تک لے گیا اور ہٹلر سے ملاقات کا سبب بن گیا۔ صرف سترہ برس کی عمر میں وہ نازی پارٹی کے آفیشل فوٹوگرافر ہاف مین کی اسسٹنٹ بن گئی تھی۔

ہاف مین کا اسٹوڈیو بہت بڑا تھا۔ وہاں کئی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ ایوا کی بڑی بہن بھی اسی اسٹوڈیو میں ملازم تھی۔

وہیں ایوا کو کیمروں کے بارے میں مکمل معلومات ہوئی۔ اسے بتایا گیا کہ کس رینج کے کیمرے کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ کس کی کیا لمٹ ہے، وغیرہ وغیرہ۔

زندگی عام انداز سے گزر رہی تھی کہ ایک دن سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ یہ وہ دن تھا جب ہٹلر ہاف مین کے اسٹوڈیو میں آیا تھا۔

ایوا اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔ اس نے ہٹلر کے بہت چرچے سن رکھے تھے لیکن ملنے کا اتفاق پہلی بار ہوا تھا۔

ہٹلر ایوا سے تیئس برس بڑا تھا جبکہ ایوا ابھی صرف سترہ برس کی جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ چونکہ ایک اچھی ایتھلیٹ بھی تھی اس لیے اس کا جسم بھی بہت خوبصورت تھا۔

ایوا نے اس زمانے میں ماڈلنگ بھی کی تھی۔ جبکہ ہٹلر میں ایسی کوئی ظاہری خوبی نہیں تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا انسان تھا۔ اس کے باوجود اس میں کوئی خوبی ضرور ہوگی جس نے ایوا کو پاگل بنا دیا تھا۔

ایوا نے ہٹلر میں اپنے لیے کشش محسوس کی اور اسی کی ہوکر رہ گئی۔

ہٹلر اس زمانے میں رابیل نام کی ایک لڑکی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ہٹلر اس لڑکی کو بہت پسند کرتا تھا۔ رابیل سے اس کی بہت گہری جذباتی وابستگی تھی۔

18 ستمبر 1931ء کو رابیل اپنے اپارٹمنٹ میں مردہ پائی گئی۔ اس نے خودکشی کرلی تھی۔ ہٹلر اس وقت کسی دوسرے شہر میں تھا جہاں اسے رابیل کی موت کی خبر دی گئی۔ ہٹلر کو اس کی موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔

اس نے رابیل کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن رابیل کی موت نے اس کی خوشیاں غارت کردیں۔

ایسی ٹوٹی اور بکھری ہوئی کیفیت میں اسے ایوا مل گئی۔

اگر ایک طرف ایوا اس کے لیے پاگل ہو رہی تھی تو دوسری طرف ہٹلر کو بھی اس سے اُنسیت ہوگئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔

ہٹلر کو ایوا میں رابیل کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

کسی وجہ سے خود ایوا نے بھی خودکشی کی کوشش کی تھی۔

یہ واقعہ گیارہ اگست 1932ء کا ہے۔ اس نے اپنے باپ کے پستول سے خود کو گولی ماری تھی۔

ویسے مورخ یہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ حرکت ہٹلر کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔

محبت واقعی ایک دیوانگی ہے۔

اس کھیل میں نیک نامی اور بدنامی نہیں دیکھی جاتی۔ اپنی پوزیشن کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو پالینے اور حاصل کرلینے کی خواہش ہوتی ہے۔

ذرا سی دیر کے لیے سہی اور کسی طرح بھی سہی۔

ایوا کو فوری طور پر اسپتال منتقل کردیا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی۔ بالآخر ڈاکٹرز اس کی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

ایوا کی اس حرکت نے ہٹلر کو اس کے اور قریب کردیا۔

وہ ہر طرح اس کا خیال رکھنے لگا اور دونوں ایک دوسرے

کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ گویا محبت پروان چڑھنے لگی۔

ایوا اس وقت بھی فوٹوگرافر کے طور پر کام کر رہی تھی۔

چونکہ وہ نازیوں کی آفیشل فوٹوگرافر تھی اس لیے اسے ہٹلر کے ساتھ جگہ جگہ جانے کے مواقع ملتے رہے تھے۔ اور یہی محبت کو پختگی عطا کر رہی تھی کہ ایوا کا تبادلہ.... ہاف مین کے پریس میں ہوگیا۔

یہ زمانہ ہٹلر کے عروج کا تھا۔

فتوحات، سیاست، حکمرانی، جنگیں۔ اس کی مصروفیات اتنی زیادہ ہوگئی تھیں کہ شاید اس کے پاس اپنے آپ کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔

ایوا سے بھی وہ بہت کم ملا کرتا۔ یہ صورتِ حال ایوا کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ہٹلر کی مصروفیات اس کے لیے اس کی سوکن بن گئی تھیں۔

بالآخر اس نے ہٹلر کی مصروفیات سے دل برداشتہ ہوکر ایک بار پھر خودکشی کی کوشش کی۔ اس بار اس نے خواب آور گولیاں کھالی تھیں مگر اس بار بھی اس کی جان بچالی گئی۔ ہٹلر اس کے لیے بہت فکرمند رہا کرتا تھا۔ ایک طرف کاروبارِ سلطنت تھا تو دوسری طرف کاروبارِ محبت اور اسے دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا تھا۔

ہٹلر نے ایوا کی دل جوئی اور اس کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے ایوا اور اس کی بہن کو میونخ میں ایک خوبصورت اپارٹمنٹ خرید کردے دیا۔

اور دوسرے سال اس نے دونوں بہنوں کے لیے پرچیں گاڈن نامی ایک علاقے میں ایک وِلا خرید دیا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آئی کہ ہٹلر بھی ایک عام انسان ہی کی طرح تھا۔

محبت، نفرت، دکھ اور خوشیوں کے جذبے اس کے ساتھ بھی تھے۔ وہ بھی کسی کے ناز اُٹھا سکتا تھا۔ کسی کی دل جوئی کرسکتا تھا اور کسی کو اپنا بنانے کی کوشش کرسکتا تھا۔

ہٹلر کی ایک رشتے دار عورت تھی جس کا تعلق مرنے والی رابیل سے تھا۔ وہ اس وِلا کی نگراں بن کر آگئی جو وِلا ہٹلر نے ایوا کے لیے خریدا تھا۔

ہٹلر اس عورت پر بہت اعتماد کیا کرتا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا کہ وہ عورت وِلا چھوڑ کر چلی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ایوا پسند نہیں تھی۔ اس لیے اکثر اس کے اور ایوا کے درمیان کھٹ پٹ ہوا کرتی۔

ہٹلر کے نظریات مرد اور عورت کے حوالے سے بہت قدامت پسندانہ تھے۔ اس کی فلاسفی یہ تھی کہ مردوں کو میدانِ جنگ میں جاکر شجاعت دکھانی چاہیے۔ ایک جنگ جو کی طرح زندگی گزارنی چاہیے۔ جبکہ عورت کا کام صرف گھر سنبھالنا ہے۔

(یہی نظریہ ہمارا سماجی نظریہ بھی ہے کہ مرد گھر سے باہر کا ذمے دار ہے اور عورت کا کام گھر چلانا ہے)

ہٹلر خود کو پُرانے زمانے کے ایسے ہیرو کی طرح پیش کرنا چاہتا تھا جس کو پورے شہر کی عورتیں پسند کرتی ہوں۔

اس کا خیال تھا کہ اس میں بے پناہ کشش ہے اور اسے اپنی اس خوبی کو سیاسی کامیابیوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

اسی لیے اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ یہ کہا کرتا کہ اگر وہ کسی ایک کا ہوکر رہ گیا تو سیاسی طور پر بہت سی طاقت ور خواتین اس سے دور ہوجائیں گی اور اس کی پوزیشن کمزور ہوجائے گی۔

گرچہ وہ ایوا کے لیے وقف ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس تعلق کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔

کہنا یہ چاہیے کہ وہ دونوں ہی کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی دینا نہیں چاہتے تھے۔

اسی لیے دونوں کے کمرے الگ الگ تھے۔ اس سلسلے میں بھی بے انتہا احتیاط برتی گئی تھی۔ صرف ایک موقع پر وہ دونوں ایک ساتھ دیکھے گئے تھے۔

اور وہ موقع تھا 1936ء کے موسم سرما کے اولمپک کا، جب وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ جرمنی کے لوگ جنگ عظیم تک ان دونوں کے تعلقات سے ناآشنا تھے۔

انہیں اس کا علم جنگ کے خاتمے کے بعد ہوا تھا۔

ایوا اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ اس نے کبھی ہٹلر کے سیاسی اور سرکاری معاملات میں مداخلت نہیں کی۔

خود ہٹلر کو بھی یہ پسند نہیں تھا۔ وہ اس سے کہا کرتا، میں نے تم سے محبت کی ہے، کیا تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں ہے؟

اگر ایوا کی موجودگی میں سیاسی گفتگو کے لیے کچھ لوگ آجاتے تو ایوا کو اس کمرے میں رکنے کی اجازت نہیں تھی۔

ایوا خود بھی ایسی باتوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

نازی پارٹی کی ممبر ہی نہیں تھی۔ اس کا شوق، خوبصورت لباسوں، جیولریز، کھیل کود اور فلموں کا تھا۔

بنیادی طور پر وہ ایک کھلنڈری لڑکی تھی جو ہٹلر کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ اس وقت پیش آیا جب جرمنی کی حالت کو دیکھتے ہوئے میک آپ وغیرہ کے سامان پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔

جرمنی کی معاشی حالت جنگ کی وجہ سے بہت خراب ہو چکی تھی۔ یہ پابندی اسی لیے لگائی گئی تھی کہ خواتین کو فضول خرچی سے روکا جا سکے۔

ایوا چونکہ ایک عورت تھی، اور وہ بھی فیشن ایبل قسم کی ماڈل۔ اسے یہ پابندی ناگوار گزری۔ اور پہلی بار اس نے ہٹلر سے اس معاملے پر بحث کی۔

اس کی ضد تھی کہ عورتوں پر سے یہ پابندی ہٹائی جائے۔ ہٹلر اس کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے پابندی مکمل طور پر تو نہیں ہٹائی لیکن نرم کر دی گئی۔

ہٹلر کی تاریخ لکھنے والے اسپیئر میمورس نے اس واقعے کا بہت دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ایوا بہت غصے میں تھی جبکہ ہٹلر اس کو منانے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ بالآخر ایوا نے ہٹلر سے اپنا مطالبہ منوا ہی لیا تھا۔

ہٹلر سے دوستی اور تعلقات کے باوجود ایوا ہاف مین کے لیے کام کرتی رہی۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بے شمار تصاویر اُتاریں اور وہ بھی نازی پارٹی کے خاص خاص لوگوں کی۔

اس وقت اس نے بہت عقل مندی سے کام لیا تھا۔

وہ قیمتی تصویریں ہاف مین کے ہاتھوں مہنگے داموں فروخت بھی کرتی رہی اور لوگوں سے شناسائی بھی پیدا کرتی رہی۔ ہٹلر سے تعلقات نے اسے نازی پارٹی کے اندر کے لوگوں تک رسائی دے دی تھی۔

وہ ایک طرف ہاف مین کے لیے کام کر رہی تھی تو دوسری طرف وہ ہٹلر کی سیکریٹری بھی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ ہر مقام پر احتیاط کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ اس کی سب سے پہلی احتیاط تو یہی تھی کہ وہ عوامی مقامات پر ہٹلر کے ساتھ بہت کم دیکھی جاتی۔

اس کے علاوہ ہٹلر نے اسے جو اپارٹمنٹ تحفے کے طور پر دیا تھا، اس میں اس کا آنا جانا بھی خفیہ طور پر ہوا کرتا۔ وہ آنے جانے کے لیے عقبی زینہ استعمال کیا کرتی تاکہ نگاہوں میں نہ آسکے۔

تین جون 1944ء کو ایوا کی بہن نے ہٹلر کے ایک اعلیٰ فوجی آفیسر سے شادی کر لی۔ اس شادی میں ہٹلر اور ایوا دونوں ہی شریک ہوئے تھے۔

لیکن وہ آفیسر یعنی ایوا کا بہنوئی ہٹلر ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو اس وقت پہنچا جب وہ اپنی بیوی کو لے کر جرمنی سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایوا کی سفارش پر اس کی بہن کو تو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس فوجی آفیسر کو گولی مار دی گئی تھی۔

یہ واقعہ اپریل 1945ء کا ہے۔

اوبرسالزبرگ کی پہاڑی پر ہٹلر نے ایک مکان خریدا تھا۔ جس کا احاطہ بہت بڑا تھا۔

ہٹلر نے اس مکان کو ایک قلعے کی شکل دے دی، وہ ایسا قلعہ تھا کہ باہر والوں کو اس کے اندر کے حالات معلوم ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

ہٹلر نے اس قلعہ نما مکان میں ایوا اور کچھ ایسے لوگوں کو رکھا ہوا تھا جو ان کے لیے خدمات انجام دیا کرتے۔

لیکن ایوا اس قلعے میں اپنے آپ کو قید محسوس کرنے لگی تھی۔ باہر کے حالات معلوم ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس قلعے نما مکان میں کئی کمرے تھے۔ لیکن ان دونوں نے اپنے لیے ایک ایک کمرا مخصوص کر رکھا تھا۔ اس میں ایک لائبریری بھی تھی۔

ہٹلر شام سے رات تک کا وقت اسی لائبریری میں گزارا کرتا۔ دونوں کے درمیان یا تو گہری خاموشی رہتی یا پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتیں۔

ایوا شراب نوشی کی عادی تھی۔ جبکہ ہٹلر چائے پیا کرتا تھا۔ لائبریری میں ایوا شراب کی اور ہٹلر چائے کی چسکیاں لیتے رہتے۔

اور جب سونے کا وقت ہوتا تو دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے جایا کرتے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ دونوں ایک ساتھ ایک کمرے میں سوئے ہوں۔

دراصل دونوں اب ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ ان کے درمیان قربت کے لمحات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔

اس مکان میں معزز مہمانوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا

www.paksociety.com

تھا۔ ایسے وقت ایوا مہمان نوازی کے فرائض انجام دیا کرتی۔

وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں اور اپنے رشتے داروں کو بھی مکان میں بلا لیا کرتی اور خوب ہنگامے ہوتے۔ رقص اور موسیقی سر فہرست رہتی۔

ہٹلر نے ایوا کے ان معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی تھی۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہٹلر ایوا کے معاملے میں کتنا حساس تھا۔ اسے ہر وقت ایوا کی فکر رہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسی لیے اس نے وصیت میں ایوا کے لیے اچھی خاصی رقم مخصوص کر دی تھی۔

ایوا سے اس کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایوا جب کبھی باہر جاتی اور اسے واپسی میں دیر ہو جاتی تو ہٹلر ایک عام آدمی کی طرح اس کے لیے پریشان رہا کرتا تھا۔

ہٹلر ایک عام آدمی نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی محبت بھی عام نہیں تھی اور اس کی موت بھی عام نہیں تھی۔ اس نے ایوا کے لیے بہت سے خواب دیکھ رکھے ہوں گے لیکن موت کا دائرہ ان کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

ایوا کو یہ معلوم تھا کہ ہٹلر کے ساتھ رہنے کا مطلب موت ہے۔ اس کے باوجود اس نے ہٹلر کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔

سرخ فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ موت سامنے تھی لیکن ان دو محبت کرنے والوں کو موت سے کوئی ڈر نہیں تھا۔

انہوں نے ایک غیر معمولی زندگی گزاری تھی اور ایک غیر معمولی انجام ان کے انتظار میں تھا۔

ایک دن پہلے ہٹلر نے ایوا کے سامنے زہریلی گولیوں کا تجربہ اپنے کتوں پر کیا تھا۔ کتے گولیاں کھا کر ذرا سی دیر میں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

ایوا جانتی تھی کہ اس طرح کی موت خود اس کا بھی مقدر بن چکی ہے لیکن محبت نے ایسی باتوں کو کب پروا کی ہے۔

بالآخر اپریل 1945ء میں ہٹلر نے برلن میں اپنے وہ بنکر دکھائے جو اس نے اپنی حفاظت کی غرض سے تعمیر کروائے تھے۔

ہٹلر کا کہنا تھا کہ اس کے لیے موت بہتر ہے، بجائے اس کے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو۔ سرخ فوج نے برلن کو گھیر رکھا تھا۔

ہٹلر نے ایوا سے کہا ”ابھی بھی موقع ہے، تم یہاں سے جا سکتی ہو۔ تمہارے لیے بہت زندگی باقی ہے۔ تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا ہے۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا“ ایوا نے جواب دیا ”میں نے آپ کے ساتھ ہی مرنے اور جینے کا عہد کر رکھا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ ہٹلر نے ایک گہری سانس لی ”اب یہ بتاؤ، کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟“

”ہاں۔“ ایوا نے اپنی گردن ہلا دی ”یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ اس کے باوجود میں ابھی تک ایوا براؤن ہوں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ میری موت کے بعد مجھے ایوا ہٹلر کے نام سے یاد کیا جائے۔“

”سمجھ گیا۔ تم شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”ہاں، ایک عورت کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے نام سے پہچانی جائے۔“

ان کی شادی 28 اور 29 اپریل کی درمیانی رات کو ہوئی تھی۔ گنتی کے چند لوگ اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک گوبلز بھی تھا۔

کاغذی کارروائیوں کے بعد ایوا براؤن ایوا ہٹلر ہو چکی تھی لیکن یہ غیر معمولی شادی دوسرے ہی دن ناکامی میں تبدیل ہو گئی اور اس عشق کی ناکامی کا سبب وقت کے بدلتے دھارے بنے۔ سرخ فوج کی آمد ظالم سماج بن گئی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ 30 اپریل کی رات ہٹلر کے اسٹاف نے ہٹلر کے کمرے سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے مگر کہانی ختم ہو چکی تھی۔

ایوا نے زہریلا کیپسول کھا لیا تھا۔ جبکہ ہٹلر نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر خود کو مار لیا تھا۔ اس طرح ہٹلر اور ایوا براؤن کی محبت کی کہانی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ایک رات بھی وہ اکٹھے گزار نہ سکے۔

یہ محبت کی ایک ایسی المناک داستان ہے جس کا کردار پوری دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وہ موت کو فتح نہیں کر پایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراب

راوی : شہبازملک
تحریر: کاشف زبیر

قسط 64

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیجا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہوگیا پھر دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہورہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی

www.paksociety.com

کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میں زرین کو لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرا لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرا دوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا و سادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو مدد لانے کے لیے فرار کرا دیا۔ تب فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بلوا لیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اُٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر پیغام پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہو گئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے اغوا کیا تھا پھر اسے حویلی پہنچا دیا۔ میں نے شہلا کا نیا ٹھکانا دریافت کر لیا اور رات کے اندھیرے میں گھر کی تلاشی لینے پہنچ گیا۔ باہر وسیم وغیرہ کو پہرے پر بٹھا دیا تھا کہ مجھے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ وسیم وغیرہ کے موبائل سے جواب نہیں آ رہا تھا پھر کمرے میں آ کر گیس کا گولا گرا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو فتح خان کی قید میں تھا۔ اس نے مجھے ایک گاڑی میں بند کر کے روانہ کر دیا۔ گاڑی طویل سفر کے بعد رکی تو سامنے کرنل کھڑا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عشق ناکام نمبر

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس طویل قامت شخص نے پی کیپ پہن رکھی تھی جس کے نیچے اس کے خدوخال چھپ گئے تھے۔ مگر اس کی آواز الگ سے پہچانی جا رہی تھی۔ یہ آواز سنے ہوئے مجھے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ زریسکی کو شیف عرف عبدالرحمٰن تھا۔ وہ بغیر نشانات کی مکمل فوجی وردی میں میرے سامنے تھا۔ کیبن ایک چھوٹی پہاڑی کے سب سے اوپری حصے میں تھا اور اس کی چمنی سے مسلسل دھواں

خارج ہو رہا تھا۔ درجہ حرارت منفی سے کہیں نیچے تھا اور اندر موجود لوگ آگ جلائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں معمولی گرم کپڑوں میں ٹھٹھر رہا تھا لیکن اس غیر متوقع صورتِ حال نے مجھے کچھ دیر کے لیے ماحول سے بے خبر کر دیا تھا۔ چوٹی اوپر سے ہموار تھی۔

مجھے فتح خان نے شہلا کا چارا ڈال کر پکڑا اور پھر نامعلوم لوگوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں میری ملاقات نادر علی سے ہوئی۔ اس نے مجھ سے مصالحت کی بات کی لیکن ساتھ ہی مجھے کہیں روانگی کا اذن سنایا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اصل میں نادر علی کی قید میں بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ مجھے کہیں بھیجنے کے بجائے دوسری دنیا بھیجنا پسند کرتا۔ جب منکر نکیر کے ساتھ روانہ ہوا تو میرا خیال تھا کہ اب میرا سامنا اس شخصیت سے ہو گا جس نے مجھے اغوا کرایا تھا۔ مگر یہاں میرے استقبال کے لیے راجا عمر دراز کا سیکورٹی انچارج موجود تھا اور میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ یہاں کیسے تھا؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ وہ دشمنوں سے مل گیا تھا یا پہلے ہی دشمنوں کا آدمی تھا اور راجا عمر دراز کو دھوکا دے رہا تھا۔ اس کی آواز پہچانتے ہی میرے ذہن میں ایک لمحے کو وہ منظر آیا جب میں نے خانہ بدوشوں کے قبیلے میں مہرو کی جھلک دیکھی تھی اور اس وقت اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔ جب کرنل زریسکی یہاں ہو سکتا تھا تو مہرو اس خانہ بدوش قبیلے میں کیوں نہیں ہو سکتی تھی؟ میں سوچ رہا تھا اور خاموش تھا وہ بھی خاموشی سے میرے ردِعمل کا جائزہ لے رہا تھا۔

"خوب میں تمہیں زریسکی کو شیف کہوں یا عبدالرحمٰن؟"

"جو تمہاری مرضی.... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "آؤ اندر یہاں بہت سردی ہے۔"

میں اس کے ساتھ اندر آیا۔ ہمارے پیچھے دونوں گارڈز بھی تھے۔ کیبن بہت بڑا نہیں تھا، اس میں شاید دو ہی کمرے تھے۔ ہم لاؤنج میں داخل ہوئے، یہاں آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور خوشگوار حرارت موجود تھی۔ زریسکی نے ایک کرسی نما صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھو۔"

میں بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے میز پر ایک چھوٹی ٹرے رکھی جس میں چند سینڈوچز تھے اور پھر پاٹ سے کافی کا مگ بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "کھانا شروع کر دو مجھے پتا ہے تم بھوکے ہو۔"

اس طویل سفر نے میرا پیٹ بالکل خالی کر دیا تھا اور روانگی سے پہلے بھی مجھے نام نہاد سا ناشتا دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ یہ انڈے اور پنیر کے سینڈوچز تھے اس لیے حرام کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ گوشت کے ہوتے تو میں ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ میں نے کھاتے ہوئے کہا۔ "یہ گورکھ دھندہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"کون سا گورکھ دھندا؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"یہی کہ بہ ظاہر تم راجا عمر دراز کے محل میں انچارج ہو اور تم نے اس کی ایک ملازمہ سے شادی کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ یہ ملازمہ فتح خان کے ہاتھوں عبرت ناک حالات سے گزری تھی اور اس کی زندگی بچانے میں ایک کردار میرا بھی تھا۔ اس لحاظ سے تمہیں فتح خان کا جانی دشمن ہونا چاہیے تھا۔"

"یہ پُرانی بات ہو چکی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ غالباً یہاں اسے مہرو کا ذکر پسند نہیں آیا تھا۔

"لیکن دوسری طرف مجھے اسی فتح خان نے باقاعدہ جال بچھا کر پکڑا اور میرے ایک اور جانی دشمن نادر علی کے حوالے کر دیا۔ اس نے حیرت انگیز سلوک کرتے ہوئے مجھے اس دنیا سے رخصت کرنے کے بجائے اس گاڑی میں بند کر کے روانہ کیا اور میں توقع کر رہا تھا کہ اس شخص سے ملوں گا جو اس چکر کے پیچھے ہے تو میرا سامنا تم سے ہو گیا۔ اب میں کیا سمجھوں؟"

میرے ساتھ آنے والے دونوں کمانڈو اسی مستعدی سے کیبن میں دو الگ جگہوں پر موجود تھے، وہ بیٹھے تھے لیکن ان کی شارٹ گنیں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ پوری طرح چوکس تھے۔ ان کے انداز میں طویل سفر کی تھکاوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا مجھے وہ تربیت یافتہ کمانڈوز لگ رہے تھے۔ زریسکی کے علاوہ کوئی دوسرا کیبن میں نظر نہیں آیا تھا وہ یقیناً اکیلا تھا۔ زریسکی نے میرے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے اُٹھ کر اپنے لیے واڈکا کی بوتل سے ایک جام بنایا اور دوبارہ آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک چسکی لی اور کھردری آواز میں بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کوئی خیال نہیں ہے۔ دشمنوں کی چین میں تمہاری موجودگی بتا رہی ہے کہ تم کس طرف ہو اور اب تک ہمیں دھوکا دیتے آئے تھے۔"

"یہ غلط ہے میں نے راجا صاحب کو دھوکا نہیں دیا اور

www.paksociety.com

نہ انہیں کوئی نقصان پہنچایا۔ میں کبھی ان کا وفادار رہا ہی نہیں اس لیے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے؟" میں نے طنز کیا۔

"تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔" اس نے کہا۔ "یوں سمجھ لو میں کچھ خاص مقاصد کی وجہ سے یہاں آیا اور اتفاق سے راجا عمر دراز سے ملاقات ہوگئی اس نے مجھے ملازمت کی پیشکش کی اور میں نے قبول کرلی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "راجا عمر دراز کسی ایسے ہی راہ چلتے شخص سے ملاقات کر کے اسے جاب کی پیشکش نہیں کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں مانتا ہوں میں نے پلاننگ کے تحت جاب حاصل کی لیکن میں اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

"او کے راجا عمر دراز کے لیے مجھے تمہاری نیک نیتی پر یقین آگیا ہے اب یہ بتاؤ کہ مجھے کس لیے اغوا کیا گیا ہے؟ کیا یہ بھی تمہاری طرف سے خیر سگالی کے جذبے کا اظہار ہے؟"

اس نے میرا طنزیہ لہجہ نظر انداز کیا اور آہستہ سے بولا۔ "شہباز ابھی تم ناواقف ہو۔ یہ معمولی کھیل نہیں ہے۔ تم جلد سب جان جاؤ گے۔"

"اس چکر کے پیچھے کون ہے؟"

"اس سے بھی جلد تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔" اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "اب تم آرام کرو گے۔ صبح تمہیں پھر روانہ ہونا ہے اور ایک طویل سفر کرنا ہے۔"

"ایک .... منٹ .... مجھے اب کہاں .... جانا ہے؟"

میں نے رک رک کر کہا حالانکہ میں روانی سے کہنا چاہتا تھا۔ مگر میری زبان اٹک رہی تھی اور جب میں نے اُٹھنا چاہا تو مجھ سے اُٹھا بھی نہیں گیا تھا۔ میری سمجھ میں ذرا دیر سے آیا۔ "تت .... تم نے کھانے .... میں کچھ ...."

"ہاں تم طویل سفر کر کے آئے ہو اور کل صبح تمہیں دوبارہ ایک طویل سفر پر روانہ ہونا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں تم تازہ دم ہو جاؤ۔"

کافی یا سینڈوچز میں کوئی زود اثر دوا تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب مجھے اس کمرے میں منتقل کیا گیا جو کیبن کے اندر تھا۔ یہاں صرف ایک بیڈ اور دو معمولی سی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف کھڑکی تھی لیکن اس میں مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ دیواریں، چھت اور فرش سب لکڑی کا تھا۔ مجھے جاگ آئی تو صبح ہو چکی تھی اور کھڑکی کے شیشوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ سورج بادلوں کے پیچھے روپوش تھا لیکن دن نکل آیا تھا۔ مجھ پر ایک ہلکا کمبل پڑا تھا اور اس کمرے میں بھی ایک آتش دان جل رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وقفے وقفے سے ایک ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی فرش پر کوئی چیز مار رہا ہو۔ لگنے کی آواز میں لرزش سی بھی آ جاتی تھی۔ پھر ایسی آواز آتی جیسے اس چیز کو فرش سے کھینچ کر نکالا گیا ہو۔

کیبن مکمل طور پر لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے فرش بھی لکڑی کا تھا۔ اس آواز کے علاوہ خاموشی تھی لیکن کچھ دیر بعد ایک ہلکی سی کھڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد سمجھ میں آیا کہ یہ کسی ریڈیو کی آواز ہے جس پر کوئی بار بار مخاطب کر رہا ہے۔ میرے جسم پر رات والا لباس تھا اور پیروں میں جوتے بھی تھے۔ میں اُتر کر دروازے تک آیا۔ اب آواز صاف آ رہی تھی۔ کوئی انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ "بیئر .... بیئر ڈو یو ریڈمی۔"

بولنے والا کسی ریچھ کو پکار رہا تھا مجھے خیال آیا کہ مرحوم سوویت یونین کو بھی ریچھ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ کہیں یہ کال کرنل زریسکی کے لیے تو نہیں تھی اس کا تعلق سوویت فوج سے تھا۔ کیبن میں خاموشی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں نے کرنل کی آواز سنی وہ ریڈیو کال کا جواب دے رہا تھا۔ "بیئر از ہیر .... اوور۔"

"بیئر پارسل کب بھیجا جائے گا اوور۔" دوسری طرف سے اسی کھڑکھڑاتی آواز نے سوال کیا۔

"آج بھیجنا تھا لیکن موسم پرندوں کی اُڑان کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ جیسے ہی موسم صاف ہوتا ہے پارسل بھیج دیا جائے گا اوور۔"

"اسے جلد از جلد بھیجنے کا حکم ہے اوور اینڈ آل۔"

دوسری طرف سے کہہ کر کال ختم کر دی گئی۔ لازمی بات تھی کہ یہ ذکرِ خیر اس خاکسار کا تھا جسے کہیں پارسل کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ نہ جانے اس کوریئر سروس کو آرڈر کرنے والا کون تھا جسے میرا پارسل درکار تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے رہ رہ کر ڈیوڈ شا کا خیال آ رہا تھا۔ کیونکہ اس سارے کھیل کے پسِ پشت مہرے اسی کے تھے۔ صرف کرنل زریسکی کی اس کھیل میں شمولیت میرے لیے غیر متوقع تھی لیکن ڈیوڈ شا کے لیے اس جیسے مہروں کو توڑ لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا بلکہ اس کا پورا امکان تھا کہ ڈیوڈ شا نے ہی اسے راجا عمر دراز کے محل میں

بھیجا ہو اور وہ اس کے کام کر رہا تھا۔ کم سے کم فتح خان سے اس کا گٹھ جوڑ ثابت تھا جو اس کے ہونے والی یا ہو جانے والی بیوی کی بے آبروئی کا براہِ راست ذمّے دار تھا۔ میں واپس آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ کیونکہ میرے پاس کرنے کے لیے سوائے غور و فکر کے کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے یہی شروع کر دیا۔

میرے دشمن دو طرح کے تھے۔ ایک مرشد اور نادر جنہیں مجھ سے کوئی مفاد نہیں تھا اور وہ میری اور میرے دوستوں کی جان کے دشمن تھے۔ دوسرے طرح کے دشمن میری جان کے گاہک نہیں تھے بلکہ مجھے اپنے کسی مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے جیسے ڈیوڈ شا اور فتح خان وغیرہ۔ اب سے پہلے یہ میرے دونوں دشمن الگ الگ سرگرم عمل تھے اور اگر میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتے تھے تو اکیلے ہی اُٹھاتے تھے۔ لیکن اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وجہ سے میرے تمام دشمنوں نے میرے خلاف ایکا کر لیا ہے۔ نادر علی، فتح خان، شہلا اور کرنل زریسکی مجھے اغوا کر کے کہیں پہنچانے کے لیے ایک ہو گئے تھے۔ اگر اب تک مرشد اور ڈیوڈ شا سامنے نہیں آئے تھے لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس معاملے میں کہیں نہ کہیں شامل تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ میرے ان دشمنوں کو کس نے یکجا کر دیا تھا؟ کیا وہ شخص ڈیوڈ شا تھا یا اس کے پسِ پشت بھی کوئی اور شخصیت تھی؟ اس نے مجھے کیوں اغوا کرایا ہے؟ اور سب سے اہم سوال مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا؟ سرد ترین موسم بتا رہا تھا کہ میں پاکستان کے کسی شمالی علاقے میں ہوں جہاں تک سڑک کے ذریعے رسائی ممکن تھی۔ مجھے اس سے بھی آگے کہیں بھیجا جانا تھا لیکن موسم راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ میری منتقلی یقیناً ہیلی کاپٹر کے ذریعے کی جاتی۔ کرنل زریسکی نے جن پرندوں کا ذکر کیا تھا ان سے مراد ہیلی کاپٹر ہی تھے۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور کرنل زریسکی کی صورت دکھائی دی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "گڈ مارننگ۔"

"ابھی تک تو گڈ ہی ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا تو اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"تمہارا رویہ کچھ عجیب سا نہیں ہے؟"

"میرے رویّے میں تمہیں کیا عجیب لگ رہا ہے؟"

"تم کچھ زیادہ ہی مطمئن اور پُرسکون ہو۔"

"اگر میں کچھ کم مطمئن اور پُرسکون رہوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟" میں نے سوال کیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے اطمینان سے کرنل شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"کیا تمہیں امید ہے تمہارے ساتھی تمہیں چھڑانے کے لیے یہاں تک آئیں گے؟"

"مجھے ایسی کوئی امید نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ بے چارے تو ابھی مجھے اسلام آباد کی حدود میں تلاش کر رہے ہوں گے۔"

"آؤ ناشتا کر لو۔" اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"ضرور لیکن اس سے پہلے مجھے باتھ روم جانے کا موقع ملے گا؟"

"بالکل۔" اس نے کہا۔ لاؤنج میں منکر نکیر موجود تھے کرنل کے حکم پر وہ مجھے کیبن کے عقبی حصے میں موجود لکڑی کے بنے چھوٹے سے واش روم میں لے گئے۔ یہ صاف ستھرا تھا لیکن پانی جان لیوا حد تک سرد تھا۔ نہ جانے انہوں نے اسے پانی کی شکل میں کیسے رکھا تھا ورنہ اسے تو برف بن جانا چاہیے تھا۔ میں واپس آیا تو میرا حشر ہو گیا تھا۔ اتنا سرد پانی میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا اور واپس آنے کے بعد میں تقریباً دس منٹ آتش دان کے سامنے ہاتھ سینکتا رہا تب کہیں جا کر ان کی حالت نارمل ہوئی تھی۔ اس بار بھی کھانے میں سینڈوچز اور کافی تھی۔ یہ آسانی سے اور فوراً بن جانے والی چیز ہے جس کے اجزائے ترکیبی یعنی ڈبل روٹی، پنیر اور انڈے خاصی دیر تک محفوظ رکھے جا سکتے ہیں۔ اس موسم میں ان کے خراب ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لہٰذا وہ وافر مقدار میں یہاں ذخیرہ کیے جا سکتے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور نہ کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ مجھے کھانے میں نیند کی دوا دے رہا تھا اور میں نہ کھاتا تو وہ مجھے کسی دوسرے طریقے سے سلا دیتا۔

کرنل اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی فرش میں ایک چھوٹا سا چاقو گڑا ہوا تھا۔ وہ شاید چاقو فرش پر مارنے کا شغل کر رہا تھا۔ آواز اسی کی آ رہی تھی۔ منکر نکیر رات بھر آرام کے بعد بالکل تازہ دم اور چوکس نظر آ رہے تھے۔ صورت سے وہ وسطِ ایشیائی لگ رہے تھے۔ ممکن ہے ان کا تعلق براہِ راست کرنل زریسکی سے رہا ہو۔ "یہ تمہارے آدمی ہیں؟"

"ہاں یہ میری یونٹ میں رہے ہیں میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔"

"تم ایک پلان کے تحت راجا عمر دراز تک آئے تو کسی کے پے رول پر تو ہو گے۔"

"تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صاف ظاہر تھا اس کا بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سینڈوچز سے فارغ ہو کر میں نے کافی کا مگ سنبھالا۔ یہ تلخ اور سیاہ کافی تھی۔

''یہ جگہ کہاں ہے؟''

''چترال میں ایک جگہ ہے۔'' اس نے بتایا تو میں حیران رہ گیا۔ بے شک میں نے کوئی بارہ تیرہ گھنٹے سفر کیا تھا لیکن اتنی جلدی چترال تک رسائی آسان نہیں ہے اور وہ بھی اگر لواری ٹنل کھلی ہو۔ لیکن یہ سفر سولہ سترہ گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہوتا ہے۔ بس تو دو دن سفر کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے انہوں نے غیر معمولی رفتار سے ڈرائیونگ کی تھی۔ اس اطلاع نے مجھے حیران ہی نہیں فکر مند بھی کر دیا تھا۔ چترال پاکستان کے انتہائی شمال میں چین اور افغانستان کی پٹی کے ساتھ واقع ہے یہ نہایت دشوار گزار پہاڑی سلسلہ ہے جو آگے جا کر سطح مرتفع پامیر سے جا ملتا ہے۔ یہاں سال کے چھ مہینے برف جمی رہتی ہے اور ہر قسم کی آمد و رفت بند ہوتی ہے۔ باقی چھ مہینوں میں برف نہیں ہوتی ہے لیکن آمد و رفت پھر بھی دشوار رہتی ہے۔ اس سے آگے صرف چین اور افغانستان تھے۔ مجھے بھلا کہاں آگے بھیجا جا رہا تھا؟

یہ جاننے کے بعد کہ کرنل زریسکی کس کے لیے کام کر رہا تھا اس کی میری نظر میں نادر علی اور فتح خان جیسی اہمیت نہیں رہی تھی اور نہ اس کی اہمیت رہی تھی کہ وہ راجا عمر دراز سے غدّاری کر رہا ہے اہمیت اس شخص کی تھی جس نے مجھے کہیں منگوایا تھا۔ اب تک میں سکون سے تھا لیکن یہ جاننے کے بعد کہ مجھے چترال سے آگے کہیں بھیجا جا رہا ہے میں فکر مند ہو گیا تھا۔ مجھے اب کچھ کرنا تھا۔ اگر اس معاملے میں ڈیوڈ شا ملوث تھا تب بھی مجھے ملک سے باہر بلوانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ مجھ سے پاکستان میں ملاقات کر سکتا تھا کیونکہ وطنِ عزیز آج کل پاکستانیوں کا کم اور ان گوروں کا زیادہ ہو گیا ہے جو دو سو سال سے ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہاں ان کو وہ سہولتیں حاصل ہیں جو خود اپنے ملکوں میں بھی نہیں حاصل ہیں۔

مگر میں نہتا تھا اور میرے تینوں دشمن پوری طرح مسلح تھے۔ منکیر نکیر کے پاس مہلک شارٹ گن تھیں جبکہ کرنل کے پاس بھی سروس پستول دکھائی دے رہا تھا۔ کرنل کا انداز بہت پُرسکون اور دھیما تھا لیکن مجھے یقین تھا اندر سے وہ بھی پوری طرح چوکنا تھا۔ اس کے آدمیوں کے بارے میں مجھے شک نہیں تھا کہ میری کسی بھی حرکت کے نتیجے میں وہ مجھے شوٹ کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ صرف ایک خیال امید افزا تھا کہ انہیں مجھ کو گرفتار کر کے کہیں پہنچانا تھا اور ظاہر ہے زندہ پہنچانا تھا مجھے مارنے کے لیے کسی کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے یہ خیال بھی تھا کہ وہ مجھے مارنے سے ہر ممکن گریز کریں گے۔

کرنل زریسکی اپنے نشست پر کسی قدر آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دونوں آدمی کچھ دیر تو کھڑے رہے پھر وہ بھی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے شارٹ گنیں اپنے پاس زمین پر رکھ لی تھیں۔ مجھے ان کے انداز پر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ کرنل سمیت وہ تینوں اچانک ہی ریلیکس نظر آنے لگے تھے۔ مجھے لگا جیسے قدرت نے مجھے یہ موقع دیا ہے۔ اگر میں کرنل پر قابو پا لیتا اور اس سے پستول چھین کر اسے یرغمال بنا لیتا تو اس کے آدمی یقیناً ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں نامحسوس طریقے سے اپنے جسم کو اس پوزیشن میں لانے لگا کہ ایک ہی جست میں کرنل پر جا پڑوں جو مجھ سے کوئی چھ فٹ کی دوری پر تھا۔ ایک بار اس پر گرنے کے بعد اس کے آدمی مجھ پر گولی چلانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورت میں کرنل کو بھی گولی لگنے کا پورا امکان تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے آدمی پاس آتے میں کرنل کو ناک آؤٹ کر کے اس کا پستول حاصل کر سکتا تھا۔

لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کرنل میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوتا وہ خود ہی میرا حملہ بچا لیتا اور خود ہی مجھے ناک آؤٹ کر دیتا۔ اپنے انداز سے وہ کوئی کمانڈو قسم کی چیز لگتا تھا اور عین ممکن تھا فوج میں وہ اسپیشل گروپ میں ہو۔ اگر وہ مجھ پر قابو پا لیتا تب بھی اس کا امکان کم تھا کہ وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔ ہاں وہ مجھے بے ہوش کر کے یا بے بس کر کے رکھ سکتا تھا۔ سارے امکانات ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے چانس لینے کا فیصلہ کیا اور اچانک ہی کرنل پر یہ چھلانگ لگائی۔ لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکوں گا۔ بہ ظاہر تو میں نے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں کرنل پر اس کی بے خبری میں لینڈ کروں گا۔ مگر ہوا یہ کہ میں کچھوے کی سی سستی سے کرسی سے اُٹھا۔ یہ بالکل ایسا سین تھا جیسے کرکٹ میچ میں الٹرا اسلو موشن میں دکھاتے ہیں۔ میرا جسم سست روی سے میرا ساتھ دے رہا تھا جبکہ میرا ذہن اس سے کہیں آگے تھا۔ میرے خیال میں مجھے سیکنڈ کے ایک تہائی حصے میں کرنل پر جا گرنا تھا لیکن میں تیسرے سیکنڈ میں کرسی سے کھڑے ہونے کے بعد ڈگمگا رہا تھا جیسے سوچ رہا ہوں کہ آگے گروں یا پیچھے۔ میرا جسم کسی شرابی کی طرح ڈول رہا تھا۔ جبکہ ذہن پوری طرح چاق و چوبند تھا۔

بالآخر میں منہ کے بَل سامنے گرا اور میرے سر سے ذرا آگے کرنل کے پاؤں تھے۔ ہاتھ بر وقت آگے کر لینے سے میرا منہ ناک ایک ہونے سے بچ گئے تھے۔ اگر کوئی اس وقت دیکھتا تو اسے لگتا جیسے میں کرنل کے قدموں میں گر رہا ہوں۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں اس طرح سست کیوں ہو گیا ہوں؟ کیا پھر کھانے میں مجھے بے ہوشی کی دوا دیدی گئی تھی اور اس کا اثر اب ہو رہا تھا۔ میں نے اُٹھنا چاہا تو میرا خیال تھا کہ اب مجھ سے اُٹھا بھی نہیں جائے گا اور میں یہیں پڑے پڑے بے ہوش ہو جاؤں گا۔ مگر میں اُٹھ گیا۔ مشکل نہیں ہوئی مگر انداز وہی تھا الٹرا اسلو موشن والا۔ اسی طرح دھیرے سے میں کھڑا بھی ہو گیا اور مجھے نہ تو مشکل ہوئی اور نہ ہی کسی ناتوانی کا احساس ہوا۔ مجھے چکر بھی نہیں آ رہے تھے اور میں پہلے بھی اس وجہ سے گرا تھا کہ میں نے جسم کے ردِعمل سے زیادہ کام لینے کی کوشش کی تھی۔ اب میں اس سلو موشن کا عادی ہو رہا تھا اس لیے بہ آسانی اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

کرنل بالکل میرے سامنے کرسی پر اسی طرح آرام سے بیٹھا تھا اور مجھے کسی قدر تمسخرانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جواب میں اُٹھنے یا کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور میں نے بھی دوبارہ کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں سمجھ گیا تھا میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے البتہ یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ گڑبڑ کیا ہوئی ہے۔ میں پیچھے ہوا میرے قدم اسی طرح سست روی سے اُٹھ رہے تھے۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کرنل کی طرف دیکھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

میرا خیال تھا کہ میرے منہ سے الفاظ بھی سست روی سے یا ٹوٹ ٹوٹ کر نکلیں گے۔ مگر بولنے میں بالکل ٹھیک تھا۔ کرنل نے آرام سے جواب دیا۔ ''ایک دوا کا معمولی سا ڈوز ہے۔ یہ دوا جسم پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالتی ہے سوائے اس کے کہ دماغ کے احکامات کی رفتار سست کر دیتی ہے۔ یہ جسم کے متعلقہ حصوں تک سستی سے پہنچتے ہیں اور نتیجے میں جسم سست ردِعمل دیتا ہے۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔''

کرنل نے نہایت چالاکی سے کام لیا تھا۔ اس نے مجھے سلانے کے بجائے یہ حربہ استعمال کیا تھا۔ اس کا تعلق دنیا کی ایک بڑی فوج سے رہا ہے اور فوج کے خصوصی شعبوں میں اس قسم کی دواؤں کا استعمال اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے۔ حد یہ کہ انسانی حقوق کے نام نہاد چیمپئن بھی اپنی فوج پر خصوصی دواؤں کے تجربے کرتے رہے ہیں۔ کرنل نے ایک ایسی ہی دوا کا استعمال مجھ پر کیا تھا۔ شاید آج کسی وقت بھی میری منتقلی عمل میں آ سکتی تھی اس لیے اس نے سلانے کے بجائے مجھے یوں بے بس کر دیا۔ اب ایک آدمی خالی ہاتھ سے بھی با آسانی مجھے قابو کر سکتا تھا۔ اسلحے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے کرنل سے پوچھا نہیں کہ اس دوا کا اثر کتنی دیر رہے گا۔ اس کا اندازہ مجھے خود ہو جاتا جب میرا جسم میرے قابو میں آ جاتا۔ لاؤنج میں مجھے وہ ریڈیو نظر نہیں آیا تھا جس پر کرنل نے کسی سے بات کی تھی۔

''جب تمہارے پاس ان جیسے تربیت یافتہ آدمی ہیں تو تم نے فتح خان یا نادر علی کی مدد کیوں حاصل کی؟'' میں نے منکیر نکیر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چونکا۔ ''نادر علی یہ کون ہے؟''

اس بار میں چونکا۔ ''تم نادر علی کو نہیں جانتے مرشد علی کا بھائی۔''

''میں مرشد کو جانتا ہوں اس کے بھائی کا نام پہلی بار سنا ہے لیکن تمہارے اغوا میں وہ کہاں سے آ گیا؟''

''یہ تمہارے گرگے جانتے ہیں جہاں مجھے رکھا گیا تھا وہاں نادر علی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہی دونوں اس کو گارڈ کر رہے تھے۔''

کرنل نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تم نے ہماری کمان فتح خان کے ہاتھ میں دی تھی ہم اس کے کہنے پر عمل کر رہے تھے۔''

''تم اس وہیل چیئر والے کو نہیں جانتے؟'' میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فتح خان نے کہا تھا وہ تم سے بات کرے گا اور ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے وہ باہر سے آیا تھا اور تم سے مل کر چلا گیا۔''

کرنل کی پیشانی کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ یہ بات اس کی توقع کے خلاف تھی۔ شاید اس نے فتح خان کی خدمات حاصل کی تھیں اور فتح خان نے اس کے علم میں لائے بغیر نادر علی کو مجھ سے ملاقات کا موقع دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ اتنا بے بس کیوں تھا اور پاگل کتّے کی طرح غرانے اور بھونکنے کے بجائے شرافت سے بات کر رہا تھا۔ ظاہر ہے فتح خان نے اسے مجھ سے صرف ملاقات کی اجازت دی تھی۔ وہ

www.paksociety.com

مجھے انگلی لگانے کا مجاز بھی نہیں تھا۔ کرنل خاموش تھا میں اس کا جائزہ لے رہا تھا میں نے اچانک کہا۔

''کرنل مہرو کہاں ہے؟''

وہ چونکا۔ ''تمہیں اس سے کیا کہ وہ کہاں ہے؟''

''میرا مطلب ہے اب وہ راجا کے محل میں تو نہیں ہوگی؟''

''ظاہر اب اس کا وہاں کیا کام؟''

''گویا وہ پوری طرح تمہارے ساتھ مل گئی ہے۔''

''وہ میری بیوی ہے اور اسے میرے ساتھ ہی ہونا ہے۔'' کرنل نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ لیکن اس کی بات نے میرے اندر ایک نئی سوچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مہرو راجا عمر دراز کے محل میں نہیں تھی۔ فتح خان کے سابقہ ٹھکانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے خانہ بدوشوں کے درمیان جس عورت کی جھلک دیکھی تھی کیا وہ مہرو ہی تھی اور کسی خاص وجہ سے وہاں موجود تھی۔ فتح خان اور کرنل کے گٹھ جوڑ کے بعد مجھے اب سب کچھ ممکن نظر آ رہا تھا۔ کرنل نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ کچھ دن میرے ساتھ رہی ہے اور میں نے اس کی جان بچائی تھی اس لیے پوچھ لیا ورنہ تمہاری بیوی سے مجھے کیا سروکار۔''

وہ مطمئن ہو گیا۔ کیبن کے باہر موسم بدستور سرمئی اور سرد تھا ہوائیں برف کے ٹکڑے اُڑا کر کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتے تو ان کی شدت کا اندازہ ہوتا تھا۔ فی الحال موسم میں بہتری کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور اس لیے میری روانگی کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ کرنل نے چالاکی سے کام لیا تھا اس نے مجھے معمولی گرم کپڑوں میں رکھا تھا جو کیبن کی حد تک گزارے کے قابل تھے لیکن اگر میں کیبن سے نکل جاتا تو چند گھنٹوں میں سردی مجھے منجمد کر دیتی اور میں دنیا سے مفرور ہو جاتا۔ یہ اس کی ایک احتیاطی تدبیر تھی ورنہ آدمی فرار ہونے کا ارادہ کرلے تو دنیا کی کوئی جیل اسے نہیں روک سکتی تھی۔ اس لیے کرنل نے صرف اسی پر بھروسا نہیں کیا اس نے مجھے ناکارہ بنانے کے لیے دوا بھی استعمال کی اور اب میں صحیح معنوں میں اس کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ ریڈیو کی کھڑکھڑاہٹ ایک بار پھر سنائی دی۔ ''بیئر ڈو یو ریڈ می اوور۔''

اس بار میں نے اندازہ کر لیا کہ ریڈیو ایک طرف رکھے ریک کے پیچھے تھا۔ کرنل نے اُٹھ کر ریک سرکایا اور مائک اُٹھا کر اس کا بٹن دبایا۔ ''یس بیئر از ہیر اوور۔''

''آدھے گھنٹے بعد پرندہ اُڑے گا اور آدھے گھنٹے بعد تمہارے پاس ہوگا اوور۔''

کرنل نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ''موسم ٹھیک نہیں ہے اوور۔''

''موسم دوپہر کے بعد مزید خراب ہوگا اس لیے پارسل کی منتقلی کا فیصلہ کرلیا گیا ہے اوور۔''

کرنل نے سوچا اور شانے اُچکائے۔ ''او کے.... اوور اینڈ آل۔''

مجھے گفتگو کے دوران ریڈیو کی جھلک دکھائی دی تھی۔ یہ فوجی نوعیت کا طویل فاصلوں اور ہر موسم میں کام کرنے والا ریڈیو تھا۔ دوسری طرف سے ہیلی کاپٹر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور کرنل کو سنا دیا گیا تھا اگرچہ وہ اس کے حق میں نہیں تھا مگر دوسری طرف اس کے بھی آقا تھے اس لیے وہ ان کے فیصلوں کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ انہوں نے موسم کی خرابی کے باوجود مجھے لانے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ آخر وہ کون تھا اور میرے لیے اتنا بے تاب کیوں تھا؟ کرنل زریسکی نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ''جا کر چوپر کے لیے جگہ تیار کرو۔''

انہوں نے اپنے ہتھیار اُٹھائے اور خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔ کرنل میرا دشمن نہیں تھا وہ ایک پروفیشنل تھا۔ جو کام لیتا اسے بہترین طریقے سے انجام دیتا تھا۔ اسے مجھے کہیں پہنچانے کا ٹاسک دیا گیا تھا اور اس نے یہ کام تقریباً کر لیا تھا۔ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کتنا خطرناک آدمی تھا لیکن ساتھ ہی اسے معلوم تھا میں خودکشی نہیں کرسکتا تھا۔ میں آخر تک لڑنے اور کبھی ہمت نہ ہارنے والا انسان تھا۔ اس لیے اس نے مجھے قابو میں رکھنے کی بہترین حکمت عملی اپنائی تھی۔ اس نے کسی بھی مرحلے پر مجھے ڈی گریڈ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا۔ میرے دوسرے دشمنوں کے مقابلے میں اس کا رویہ خاصا بہتر تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مجھے کسی قسم کی رعایت دیتا اگر میں فرار کی کوشش کرتا تو وہ بے دریغ اپنے ہتھیار استعمال کرتا اور اگر میں اس کے ہاتھ سے نکلنے لگتا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا۔ مجھے وسیم اور اس کے آدمیوں کی فکر ہو رہی تھی۔ ''میرے ساتھ تین افراد اور تھے ان کو بھی اغوا کیا گیا ہے؟''

''ان کے بارے میں فتح خان بہتر جانتا ہوگا میں نے

صرف تمہیں لانے کو کہا تھا اس نے تمہارے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا ہے میں اس سے بے خبر ہوں۔''

وسیم اور اس کے آدمیوں کا فتح خان کے پاس بھی کوئی مصرف نہیں تھا اس لیے امکان یہی تھا کہ اس نے انہیں قید میں رکھنے یا مار ڈالنے کے بجائے چھوڑ دیا ہوگا۔ دوسری صورت میں اسے معلوم تھا وہ کہیں بھی چین سے نہیں بیٹھ سکے گا میرے ساتھی ایک انتقامی جذبے کے ساتھ اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ گیس کا شکار ہونے سے پہلے میں عبداللہ کو بتا دیا تھا کہ یہ فتح خان کا کام ہے اس لیے میرے ساتھی اب بھی اس کے پیچھے ہوں گے۔ اس لیے فتح خان کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بار میرے یا میرے ساتھیوں کے ہاتھ آنے کے بعد اس کی گلوخلاصی ناممکن ہو جائے۔ دوسری صورت میں ایک دوسرے کو رعایتیں دیتے رہتے تھے۔

''تمہارا فتح خان سے رابطہ کیسے ہوا؟''

''میرا اس سے براہِ راست رابطہ نہیں ہے بلکہ مجھے بتایا گیا کہ وہ تمہیں اغوا کرنے کا کام کرے گا اور اس کے بعد میرے آدمیوں کے حوالے کر دے گا۔'' کرنل نے ایک بار پھر دامن بچانے والے انداز میں کہا جبکہ مجھے یقین تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''پھر بھی تم نے اپنے آدمیوں کو اس کے پاس بھیجا ہوگا تو اس سے رابطہ کیا ہوگا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے اوپر والوں نے تمام معاملات طے کر دیے تھے۔ میرے آدمی گئے اور تمہیں یہاں لے آئے۔''

اس سے گفتگو کے دوران میں غور بھی کرتا جا رہا تھا۔ ''جہاں مجھے لے جایا جا رہا ہے کیا تم بھی چلو گے؟''

''نہیں۔'' اس نے کسی قدر بے دھیانی سے کہا۔ ''مجھے واپس جانا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے یک دم اُٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور میری طرف دیکھا۔ ''تیار ہو جاؤ چوپر آ گیا ہے۔''

بند کیبن میں باہر کی آوازوں کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو تیز ہوا کے ساتھ واضح طور پر ہیلی کاپٹر کا شور بھی اندر تک آیا تھا۔ جب وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو میں کرسی پر واپس بیٹھ رہا تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا ارادہ ہے؟''

''ارادہ تو یہ ہے کہ آتش دان کی سلاخ تمہارے سر پر رسید کروں لیکن افسوس جتنی دیر میں یہ کام کروں گا تم مجھے اس دوران میں چار بار ناک آؤٹ کر چکے ہو گے اور میں ناک آؤٹ ہونا نہیں چاہتا اس لیے دوبارہ بیٹھ گیا۔''

اس کا شک ختم ہو گیا اور وہ مسکرایا۔ ''تم عقل مند آدمی ہو۔''

کرنل نے فائبر اور اسٹیل کی بنی ہوئی ہلکی لیکن نہایت مضبوط قسم کی ہتھکڑی نکالی۔ یہ اصل میں ہاتھوں اور پیروں کو بیک وقت جکڑنے والی ہتھکڑی تھی جس میں ایک نائلون جیسے ریشے سے بنی رسّی بھی تھی۔ اس میں جکڑے جانے کے بعد آدمی نہ تو ایک حد سے زیادہ قدم اُٹھا کر چل سکتا تھا نہ ہاتھ اوپر اُٹھا سکتا اور نہ ہی دونوں ہاتھ الگ الگ استعمال کرسکتا تھا۔ مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے بے چوں چرا ہتھکڑی پہن لی۔ کرنل نے مجھے کھینچ کر کھڑا کیا اور کھینچ کر ہی باہر لے جانے لگا۔ باہر نکلتے ہی قیامت خیز ہواؤں اور سردی نے استقبال کیا تھا۔ کیبن سے ذرا نیچے ایک کھلی جگہ ہیلی کاپٹر کھڑا تھا اور اس کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے۔ پائلٹ سیٹ پر ایک آدمی موجود تھا جبکہ دوسرا پچھلا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کرنل کے دونوں آدمی بھی اس کے پاس تھے۔ میں بہ مشکل قدم اُٹھاتا ہوا ہیلی کاپٹر تک پہنچا تھا ایک تو ویسے ہی میرے اعصاب سست ہو رہے تھے پھر پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے میں ایک فٹ سے زیادہ حرکت نہیں کرسکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر چھوٹا تھا اس میں آگے پیچھے چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کرنل نے مجھے پچھلے حصے میں دھکیل دیا۔ یہاں بس دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ انجن کا شور کان کے پردے پھاڑ رہا تھا اس لیے گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کرنل دوسرے آدمی کو کچھ کہنے کے لیے ہیلی کاپٹر سے ذرا دور لے گیا تھا۔ ہوائیں ویسے ہی کم نہ تھیں اوپر سے ہیلی کاپٹر کے پنکھے نے ان میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ یہ میرے معمولی کپڑوں اور گوشت سے گزر کر جیسے ہڈیوں میں پیوست ہو رہی تھی۔ پائلٹ نے سر گھما کر دیکھا تو مجھے اس کی صورت صاف دکھائی دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دوسرا فرد بھی آ گیا جو ہیلی کاپٹر کے ساتھ آیا تھا اور شاید اسے بھی ساتھ ہی جانا تھا۔

وہ پستہ قد لیکن بہت گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے اوپر ایسی جیکٹ پہن رکھی تھی جس میں فر والا ہڈ بھی تھا اور اس قسم کی جیکٹ عام طور سے بہت سرد علاقوں میں رہنے والے اسکیموز پہنتے ہیں۔ ہڈ میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی سلائیڈنگ ڈور کھینچ کر بند کر دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

اور اندر یک لخت شور میں کمی آ گئی تھی۔اس کا کیبن یقیناً پریشرائزڈ تھا۔دروازہ بند کرتے ہی اندر کا درجہ حرارت بھی تیزی سے اوپر گیا تھا اور ایک منٹ سے بھی پہلے یہ صفر سے اوپر جاچکا تھا۔اس کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہوا اور ایک طرف پرواز کر گیا۔میرے ساتھ بیٹھے آدمی نے ہڈ پیچھے کیا اور میری طرف دیکھا تو پائلٹ کو دیکھ کر مجھے جو شک ہوا تھا وہ اسے دیکھ کر یقین میں بدلنے لگا۔

"تم انڈین ہو؟"

وہ مسکرایا تو اس کے سیاہ رنگ پر سفید دانت بہت نمایاں نظر آئے تھے۔وہ اور پائلٹ دونوں ساؤتھ انڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا انداز اور گٹھا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق فوج سے یا ایسے ہی کسی ادارے سے تھا۔وہ بولا۔"تم نے ٹھیک پہچانا شہباز ملک۔"

میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ دشمن ملک کے یہ دو افراد ایک ہیلی کاپٹر میں دندناتے ہوئے میرے ملک کی سرحد میں داخل ہوئے اور نہایت آرام سے مجھے اغوا کرکے لے جا رہے تھے۔بے شک یہ علاقہ سرحد کے نہایت نزدیک تھا مگر کیا ہمارے فضائی محافظ اس سرحد کی نگرانی نہیں کر رہے تھے۔وہ میرے تاثرات سے بھانپ گیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔"تم حیران ہو کہ ہم یہاں کیسے آئے؟"

"ہاں۔"

"کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تم بیکار کی باتیں کر رہے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔"کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ مجھے کیوں اغوا کرایا ہے؟"

"تمہیں اس کا جلد پتا چل جائے گا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔"تمہاری تلاش میں ہم نے بہت وقت اور پیسا ضائع کیا ہے۔"

سچی بات ہے کہ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔جب میں انڈیا میں تھا اور میں نے وہاں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ان کو مدِنظر رکھتے ہوئے بھارتی سرکار کا میرے پیچھے پڑنا لازمی بات تھی۔یہی وجہ تھی جب تک میں بھارتی سرزمین پر رہا میں نے گرفتار ہونے کی کوشش نہیں کی اور اگر دوسری طرف سے ایسی کوئی کوشش کی گئی تو میں نے جان پر کھیل کر اسے ناکام بنا دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک بار بھارتیوں کے ہتھے چڑھ گیا تو میری گلوخلاصی مشکل ہو گی۔لیکن جب میں وہاں سے نکلا اور اس بات کو خاصا عرصہ گزر گیا تو میرے ذہن سے بھی بھارتی خطرہ محو ہو گیا۔میں نے ایک طرح سے انہیں اپنے دشمنوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا، یہ سوچ کر کہ رات گئی بات گئی مگر بھارتی بھولے نہیں تھے وہ مجھے تلاش کر رہے تھے اور انہوں نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔

درحقیقت مجھے تلاش کرنا کوئی بہت دشوار کام نہیں تھا۔میں بھارت میں جتنے عرصے رہا اور پھر جابجا دکھائی دیا اس کے بعد میری شناخت کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔مشکل کام مجھے تلاش کرنا تھا۔یہ کام بنیوں نے ان لوگوں سے لیا جو مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور مجھے تلاش کر سکتے تھے۔جیسا کہ انہوں نے کر لیا۔اب بھارتی مجھے کشاں کشاں لیے جا رہے تھے۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے؟ سوویت یونین کے خاتمے اور سینٹرل ایشیا کے مسلم ممالک کی بہ ظاہر آزادی کے باوجود وہاں آج بھی روس کا راج تھا اور اس کی مرضی کے بغیر یہ ممالک نہ تو کوئی بڑا فیصلہ کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی پالیسی بنا سکتے تھے۔درحقیقت روس نے وہاں اپنے پٹھو حکمران بٹھا دیے تھے جیسے انگریز اس خطے سے جاتے ہوئے حکومت اپنے مہروں کو سونپ گیا تھا۔

روسی آشیرباد سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھارت نے سینٹرل ایشیا میں اپنے کئی فوجی اڈے قائم کر لیے تھے۔ان اڈوں کو مکمل طور پر بھارتی حکومت چلاتی تھی اور وہاں سارا عملہ بھارتی ہوتا تھا۔مجھے ایسے ہی کسی اڈے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ہیلی کاپٹر پہاڑوں کے درمیان پرواز کر رہا تھا اور پائلٹ دانستہ کوشش کر رہا تھا کہ اسے بلند ہونے سے بچائے حالانکہ پہاڑوں کے درمیان بعض اوقات ہوائیں بے قابو رفتار سے چلتی ہیں اور راہ میں آنے والی ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح اُڑا لے جاتی ہیں۔موسم ویسے ہی اچھا نہیں تھا اس موسم میں بھارتیوں کا خطرہ مول لے کر یہاں آنا بتاتا تھا کہ وہ میرے لیے کس قدر بے تاب تھے۔میں مکمل طور پر کرنل زریسکی کے قابو میں تھا اس کے باوجود انہوں نے موسم بہتر ہونے تک کا انتظار نہیں کیا۔

"تم بنئے کسی پر اپنا وقت اور پیسا ضائع نہیں کرتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم ایک ایسی شخصیت ہو جس کے لیے ہم منہ مانگی رقم دینے کو تیار تھے۔"

میں ہنسا۔"میں خود کو اتنا اہم نہیں سمجھتا۔"

"ہاں تم اہم نہیں ہو لیکن ہم تمہیں اہم بنا دیں گے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔"تمہارے ملک میں رہنے والے بہت سارے عام سے لوگوں کو بھی ہم نے بہت اہم بنا

دیا ہے۔"

اس کا انداز خطرے کی گھنٹی تھی۔میرا خیال تھا کہ مجھے اغوا کرانے والا ڈیوڈ شا ہو گا۔جیسے جنگل میں جانے والا شیر یا چیتے کے خطرے کے بارے میں سوچ اور اچانک ہی اسے لکڑبھگوں کا گروہ گھیر لے جو شیر یا چیتے سے کہیں زیادہ سفاک اور خطرناک درندہ ہے۔یہ اگر اکیلا شیروں کے ہاتھ لگ جائے تو یوں چیخ و پکار کرتا ہے جیسے اس سے زیادہ مظلوم دنیا میں کوئی نہیں ہے لیکن جب گروہ کی صورت میں ہو اور کوئی اکیلا جانور ان کے ہاتھ آ جائے تو یہ اپنی اصلیت پر آ جاتے ہیں، اس وقت ان کی سفاکی دیکھنے والی ہوتی ہے۔اسی طرح میں بھارتیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور ان کی اصلیت مجھے پہلے ہی معلوم تھی۔کیا یہ مجھے بھارت لے جا کر سزا دینا چاہتے تھے یا مجھ سے کچھ اور مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ بھارتی نیتاؤں نے روزِ اوّل سے پاکستان کا وجود دل سے تسلیم نہیں کیا اور ان کی پہلی اور آخری سوچ پاکستان کا خاتمہ ہے۔اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔آج کل وہ یوں شیر ہو رہے ہیں کہ امریکا نے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بھارت کو بھی گود لے لیا ہے اور وہ اس خطے میں وہی رول ادا کرنے کی تیاری کر رہا ہے جو اسرائیل مشرق وسطیٰ میں کرتا ہے۔اس کا پہلا ہدف پاکستان ہے اور اسے چاروں طرف سے گھیرنے کے لیے بھارت نے آس پاس کے ملکوں میں اپنے کئی فوجی اڈے قائم کر لیے ہیں۔مجھے یقیناً ایسے ہی کسی اڈے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

مجھے لے جانے والا مجھ سے واقف تھا یعنی وہ کوئی اہم افسر تھا۔میں ان کے لیے اتنا اہم تھا کہ انہوں نے عام آدمیوں کے بجائے اسے بھیجا تھا۔میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔پھر میں دوا کے زیرِ اثر تھا اس لیے جسمانی ردِعمل سست تھا اور میں کسی ایڈوینچر کے لائق نہیں تھا۔یعنی فرار کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔اپنا جسمانی ردِعمل جاننے کے لیے میں مستقل اپنی شہادت کی انگلی کو تیزی سے حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔تقریباً ہر منٹ بعد میں یہ مشق دوہرا رہا تھا۔مجھے ناشتا کیے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔اس دوا کا اثر مزید کتنی دیر قائم رہتا یہ میں کہہ نہیں سکتا تھا۔مگر ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے جسمانی ردِعمل میں بہتری آ رہی تھی۔اگر آنے والے نصف گھنٹے میں اپنے جسم پر اسی فیصد قابو پا لوں تو میں کچھ کر سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر جن پہاڑوں سے گزر رہا تھا ان پر برف ہی برف تھی۔میرا خیال تھا ہم پاکستان کی سرحد عبور کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے تھے۔کیونکہ کرنل جس کیبن میں تھا وہ سرحد کے پاس ہی ہو گا۔بھارتی اتنے دلیر نہیں تھے کہ میرے ملک کی سرحدوں میں ایک حد سے زیادہ درانہ وار گھس آتے۔وہ مجھے لے کر دس منٹ سے بھی پہلے سرحد کے دوسری طرف جا چکے تھے۔اب ہیلی کاپٹر بلندی پر آ گیا تھا اور زیادہ تیز رفتاری سے پرواز کر رہا تھا۔یہ نیم فوجی ساخت کا ہیلی کاپٹر تھا جو بلندی پر تیز رفتاری سے اُڑنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔اس میں اسلحے کی گنجائش نہیں تھی یعنی یہ نہتا تھا اور معمولی سا گن شپ بھی اسے مار گرا سکتا تھا۔اس لیے بھارتیوں کی کوشش تھی کہ جلد از جلد پاکستان کی فضائی حدود سے نکل جائیں۔

سطح مرتفع پامیر کا شمار دنیا کے بلند ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔پاکستان، افغانستان اور چین کی سرحدوں پر پھیلے اس وسیع سطح مرتفع کو دنیا کی چھت بھی کہتے ہیں۔نہایت بلند اور سرد ہونے کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا بالکل مختلف ہے۔اس میں جانوروں اور نباتات کی مختلف اقسام ہوتی ہیں جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتی ہیں۔بہت بلندی کی وجہ سے یہاں عام پائے جانے والے پودے اور جاندار دکھائی نہیں دیتے ہیں۔سال کے چھ سے آٹھ مہینے برف جمی رہتی ہے اور بعض جگہوں پر تو سارے سال ہی برف ہوتی ہے۔موسم کی شدت کی وجہ سے پامیر میں مستقل آبادیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔چین نے مخصوص مقاصد کے تحت اپنے علاقے میں کچھ شہر بسائے ہیں لیکن افغانستان اور پاکستان میں ایسی کوئی آبادی نہیں ملتی ...... یہاں صرف خانہ بدوش ہوتے ہیں۔جو سارے سال بلندیوں سے پستیوں کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر کی بلندی کم ہونے لگی کیونکہ اونچی پہاڑیاں ختم ہو گئی تھیں اور اب ہلکا پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔میں جہاں بیٹھا تھا یہاں سے ہیلی کاپٹر کا فلائنگ پینل صاف دکھائی دے رہا تھا۔آلٹی میٹر تین ہزار میٹرز کی بلندی ظاہر کر رہا تھا اور بتدریج اس میں کمی آتی جا رہی تھی۔جہاں سے ہیلی کاپٹر وادیوں سے بلند ہوا تھا وہاں سے افغانستان شروع ہو گیا تھا اور ان لوگوں کو دیکھ لیے جانے اور گرائے جانے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔جب بلندی کم ہونے لگی تو میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

خیال میں واخان کا حصہ بھی گزر گیا تھا اور اب آگے میدان آنے والے تھے۔ ہیلی کاپٹر تاجکستان میں داخل ہو چکا تھا کیونکہ اس سے آگے یہی ملک پڑتا تھا۔

دس منٹ بعد پہاڑی علاقہ ختم ہو گیا تھا اور نیچے اب ناہموار میدان تھا۔ ہم یقینی طور پر تاجکستان یا شمالی افغانستان میں تھے۔ پھر ہیلی کاپٹر کی بلندی تیزی سے کم ہونے لگی اور ذرا دیر بعد ہیلی کاپٹر ایک چھوٹی سی ائرفیلڈ پر اُتر رہا تھا۔ یہ کوئی عارضی اور ہنگامی حالات میں کام آنے والی ائرفیلڈ تھی کیونکہ یہاں نہ تو کوئی خاص تنصیبات تھیں اور نہ ہی لوگوں کی سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر کا انجن بند کر کے نیچے اُتر گیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے بھارتی سے پوچھا۔ ”یہاں کیوں رکے ہیں؟“

”فیول لینا ہے ابھی مزید سفر کرنا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر تم فرار کا سوچ رہے ہو تو تم کہیں نہیں جاسکتے۔“

روانگی کے وقت سے میری جسمانی حالت میں بہتری آئی تھی یعنی دوا کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ جس وقت یہ ہیلی کاپٹر کرنل زریسکی کے کیبن کے باہر آ کر اُترا تھا اور وہ اسے دیکھنے گیا تھا تو میں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر کرنل کا فرش میں گڑا ہوا چاقو نکال کر جیب میں رکھ لیا تھا اور واپس بیٹھ رہا تھا کہ اس نے دیکھ لیا مگر اس نے شک نہیں کیا چاقو اس کے ذہن سے نکل گیا تھا ورنہ وہ میری تلاشی لے سکتا تھا۔ اگر میری جسمانی حالت بہتر ہوتی تو میں ہیلی کاپٹر کے روانہ ہوتے ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ کم سے کم اپنے نگران کو مار سکتا تھا۔ اس کے بعد اس سے ہتھیار حاصل کر کے پائلٹ کو قابو کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر اس وقت میں اس قابل نہیں تھا کہ چاقو کو موثر طریقے سے استعمال کر سکوں۔ لیکن دوسری طرف خطرہ یہ تھا کہ ایک بار میں ان بھارتیوں کے اڈے پر پہنچ جاتا تو وہاں کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ اب میری حالت بہتر تھی۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ میرا جسم کس قدر میرے قابو میں آ گیا تھا یہ تو جب میں کوشش کرتا تب ہی پتا چلتا۔ میں نے ہاتھ یوں ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے جیسے انہیں سردی سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ لیکن میرے دائیں ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس کا بلیڈ چار انچ سے زیادہ لمبا نہیں تھا لیکن یہ نہایت تیز اور خطرناک چاقو تھا۔

”برڈون.... برڈون ڈو یو ریڈمی۔“ اچانک ہی ہیلی کاپٹر کے ریڈیو سے آواز آئی۔ انجن بند تھا اس لیے آواز نہایت واضح تھی۔ ”برڈون اگر تم سن رہے ہو تو جواب دو.... برڈون ڈو یو ریڈمی....“

میرے ساتھ بیٹھے بھارتی نے جو میری نگرانی کر رہا تھا چونک کر آگے دیکھا اور وہ ذرا آگے کھسکا تھا۔ یہاں جگہ محدود تھی اور وہ میرے پاس آ گیا۔ میرا ہاتھ جیب سے باہر آیا اور اس میں دبا چاقو اس کے بائیں پہلو کی طرف لپکا۔ میں نے اس کے دل پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وار کو مزید موثر بنانے کے لیے میں اس کی طرف گرا بھی تھا۔ چاقو دیکھتے ہی اس نے لات مار کر مجھے دور کرنے کی کوشش کی تھی مگر مسئلہ وہی تھا یہاں گنجائش ہی نہیں تھی۔ لات میرے پاؤں پر لگی اور میں اس کے اوپر گرا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا لیکن اسے استعمال کرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چاقو کی نوک اس کی پسلیوں تک پہنچ گئی تھی اور جب یہ پسلیوں میں اُتری تو اس نے تڑپ کر چیخ ماری اور پھر پستول والا ہاتھ میرے سر پر مارا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا۔ پستول ہلکا لگا تھا لیکن تکلیف زیادہ ہوئی تھی۔ اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے میں نے پستول کا رُخ فرش کی طرف کر دیا۔

قوت آزمائی میں اس سے کم نہیں تھا بس رفتار میں مات کھا رہا تھا۔ چاقو سے بچنے کے لیے وہ محدود سی جگہ میں تڑپ تڑپ کر پینترے بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کا دایاں ہاتھ میرے قابو میں تھا ورنہ وہ ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھول کر باہر گر جاتا اور بچ جاتا۔ بایاں ہاتھ میرے اور اس کے درمیان میں تھا اور وہ اسی سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا پستول والا ہاتھ موڑ کر نیچے سیٹ سے لگا دیا تھا اور اب وہ فائر کرتا تو کسی کو گولی نہ لگتی۔ عجیب بات تھی اس نے کسی کو متوجہ کرنے کے لیے شور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کا منہ آزاد تھا اگر وہ چلّاتا تو اس ویران ائرفیلڈ پر بھی کوئی نہ کوئی اس کی فریاد و فغاں کا جواب دینے کو دوڑتا۔ لیکن شاید یہ اس کی انا کے خلاف تھا کہ وہ اپنے قیدی کے خلاف کسی سے مدد طلب کرے۔

اس کی مزاحمت کی وجہ سے چاقو کی نوک پسلیوں سے آگے جانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی پسلیوں کو ضرور چھیل رہی تھی۔ یقیناً تکلیف سے اس کا بُرا حال تھا مگر ابتدائی چیخوں کے بعد وہ خاموشی سے اس اذیت کو برداشت کرتے ہوئے مجھے خود سے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا مجھے ایک لمحے کی مہلت بھی مل گئی تو میں چاقو اس

کے دل میں اُتار دوں گا اور وہ مر جائے گا۔ اس کا سر آزاد تھا اور وہ کئی بار مجھے سر سے ٹکر مار چکا تھا۔ میں اس کے وار نا کام بنا رہا تھا۔ وہ اذیت میں تھا۔ چاقو نے اسے کچھ اور چھیلا تو اس نے کراہ کر مجھے اپنی زبان کی کلاسیکل گالیوں سے نوازا۔ وہ ساؤتھ انڈیا کی کوئی مقامی زبان بول رہا تھا۔ گالیوں کا اندازہ لہجے سے ہوا۔

ایک بار اس نے میرے سر پر پھر ٹکر مارنا چاہی تو میں نے سر نیچے کیا اور اس کی ناک پوری قوت سے میرے ماتھے سے ذرا اوپر لگی اور شاید ٹوٹ گئی۔ وار اُلٹا ہو گیا تھا اور اسے یقیناً دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ وہ ذرا ڈھیلا ہوا تو میں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور چاقو اس کی پسلیوں میں داخل کر دیا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی اور اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے سست پڑتے ہی میں نے پے در پے وار کیے اور ان میں سے کم سے کم ایک اس کے دل میں اُتر گیا تھا اس کے منہ سے آخری کراہ نکلی اور وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اسے پیچھے دھکیل کر میں نے اس کے مردہ ہاتھوں سے پستول لیا اور اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اب بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بیٹھا ہوا اور زندہ ہو۔ اگر خون نکلا تھا تو وہ جیکٹ کے اندر ہی رہا تھا اس لیے پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔

پائلٹ کا فی الحال دور تک پتا نہیں تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے آگے ہو کر ریڈیو بند کر دیا۔ دوسری طرف سے بک بک جاری تھی۔ پھر میں نے نگران کی تلاشی لی لیکن اس کے پاس سوائے اس پستول اور اس کے دو عدد فاضل میگزین کے اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ میری ہتھکڑی کی چابی اس کے پاس ہو گی۔ مگر شاید وہ پائلٹ کے پاس بھی نہیں تھی مجھے جہاں لے جایا جا رہا تھا وہیں انہیں کھولنے کا کوئی بندوبست ہوتا یا پھر مجھے سرے سے کھولا ہی نہیں جاتا اور اس کی بجائے ایسے ہی بھارت پارسل کر دیا جاتا۔ دور سے ایک فیول ٹینکر آتا دکھائی دیا تو میں چوکس ہو گیا۔ ٹینکر کے ساتھ پائلٹ بھی تھا۔ اس نے آتے ہی ٹینک کا ڈھکن کھول کر اس میں ایندھن بھروانا شروع کر دیا اگرچہ اس نے ابھی تک اندر توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کا امکان تھا کہ وہ توجہ دیتا اور مجھے اس کو ہینڈز اپ کرانا پڑتا۔ ٹینکر کا ڈرائیور لاتعلقی سے بیٹھا تھا۔ ایندھن خود پائلٹ بھر رہا تھا اور شاید اسے بھی یہ ڈیوٹی کھل رہی تھی اس لیے وہ جلد از جلد اسے بھگتا کر یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔

جلدی کے چکر میں پائلٹ نے اندر کی طرف توجہ نہیں دی۔ ہیلی کاپٹر کا اگلا حصہ زیادہ تر شیشے کا تھا لیکن پچھلا حصہ دھاتی تھا اور دروازوں میں چھوٹے چھوٹے شیشے لگے تھے جن سے باہر یا اندر دیکھا جا سکتا تھا۔ پانچ منٹ میں ہیلی کاپٹر کا ٹینک فل ہو گیا تھا۔ پائلٹ نے پائپ واپس ٹینکر پر رکھا اور اسے پیچھے ہٹنے کو کہا ڈرائیور فوراً ٹینکر لے کر روانہ ہو گیا۔ اس موسم میں باہر کے کام سب کو ہی کھل رہے تھے۔ سردی سے ٹھٹرتا پائلٹ اندر گھسا اور سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے اس نے ریڈیو کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔ ”اسے کس نے بند کیا ہے؟“

سوال اس نے اپنے ساتھی سے کیا تھا لیکن میں نے پستول اس کی گدی پر رکھ کر جواب دیا۔ ”میں نے.... اور اب اسے بند ہی رکھنا۔“

وہ ساکت رہ گیا تھا۔ ”ویراما....“

”وہ مر چکا ہے اور اگر تم بھی مرنا نہیں چاہتے ہو تو ہیلی کاپٹر اسٹارٹ کرو۔“

”تم مجھے اپنی مرضی پر نہیں چلا سکتے۔“ اس نے بہادری دکھانے کی کوشش کی۔

”مہاشے تم کیا چیز ہو میں یہ ہیلی کاپٹر بھی چلا سکتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں نرکھ بھیج دوں گا۔“

مہاشے جی نے یہ بات سمجھ لی اور اس نے بادل ناخواستہ انجن اسٹارٹ کیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے ہیلی کاپٹر کے پر گھومنے لگے تھے اور ایک ہلکے سے دھچکے سے وہ فضا میں بلند ہو گیا۔ ذرا بلندی پر آتے ہی میں نے اسے حکم دیا۔ ”اپنا رُخ جنوب مشرق کی طرف کر لو ہمیں وہیں جانا ہے جہاں سے آئے تھے۔ یاد رکھنا سمتیں دیکھنا مجھے بھی آتی ہیں اور ہاں اپنا ہتھیار میرے حوالے کر دو بغیر کسی چالاکی کے۔“

مجبوراً اس نے اپنا پستول نکال کر پیچھے پھینک دیا۔ لیکن میں مطمئن نہیں تھا میں نے ذرا آگے ہو کر جہاں تک ممکن ہوا اس کی تلاشی لی۔ اوپری جسم سارا دیکھ لیا تھا صرف پیروں کو نہیں دیکھ سکا۔ اگر اس نے وہاں بھی کوئی ہتھیار چھپا رکھا تھا تو میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کا رُخ جنوب مشرق کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ریڈیو سے غائب ہوتے ہیلی کاپٹر کی تلاش شروع ہو جائے گی۔“

”اس لیے تم اب نیچی پرواز کرو گے اور اپنا ریڈیو بند ہی رکھو گے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی ایسی ڈیوائس آن ہے جس

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

سے ہیلی کاپٹر کی نشان دہی ہو سکے تو اسے بند کردو کیونکہ تلاش کرنے کی صورت میں سوائے مرنے اور مارنے کے کچھ نہیں ہوگا۔ میں زندہ تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا اور میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ بچنے کی ایک ہی صورت ہے مجھے واپس وہیں پہنچادو جہاں سے لائے تھے اس کے بعد تم واپس جانے کے لیے آزاد ہوگے۔''

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا واقعی تم مجھے جانے دوگے؟''

''ہاں میں نے تمہارا کیا اچار ڈالنا ہے۔ میں کسی کو نہیں مارتا سوائے اس کے جو میرے لیے خطرہ بن جائے۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

اس نے چند لمحے کے لیے سوچا پھر ہیلی کاپٹر کی چھت پر لگے ہوئے چند سوئچز آف کردیے۔ ان کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''میں نے ٹرانسپونڈر آف کردیا ہے اب کوئی اس ہیلی کاپٹر کا سراغ نہیں لگا سکے گا سوائے ریڈار کی مدد کے۔''

''اس کے لیے تم زمین سے پانچ سو فٹ کی بلندی پر پرواز کروگے۔''

اس نے حیرت سے کہا۔ ''تم اس قسم کی ٹیکنیکل باتیں جانتے ہو۔''

''جانتا نہیں تھا حالات نے سکھا دیا ہے۔ اب بھی تمہیں خبردار کررہا ہوں اگر کوئی ڈیوائس آن ہے تو اسے آف کردو بعد میں پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملے گا۔''

ویراما کی موت کا سن کر وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ شاید وہ ان کا کوئی خاص کمانڈو تھا اور اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے اتنی آسانی سے ماردیا تھا یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا تھا۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ ایک تو وہ بہت بھاری لباس میں تھا جس میں وہ آسانی سے حرکت نہیں کرسکتا تھا دوسرے وہ محدود سی جگہ میں پھنس گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے بہادری سے مقابلہ کیا تھا اور آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک چانس تھا کہ وہ فائر کرتا تو اس کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی اس کی مدد کو آجاتا لیکن نہ جانے کیوں اس نے فائر نہیں کیا تھا؟ شاید اس کا ذہن اس طرف نہیں گیا اور وہ چاقو سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بالآخر اسی کا شکار ہوگیا۔

ہیلی کاپٹر واپس جارہا تھا کچھ دیر بعد جانی پہچانی پہاڑیاں نمودار ہونے لگیں۔ میں آتے ہوئے راستوں کا جائزہ لیتا ہوا آیا تھا اور مخصوص نشانیاں ذہن میں رکھی تھیں اب وہی کام آرہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ پائلٹ ٹھیک راستے پر جارہا تھا۔ کیبن میں سردی نہیں تھی لیکن مجھے جہاں اُترنا تھا وہاں قیامت کی سردی ہوتی۔ اس سے نمٹنے کے لیے میرے پاس نہ تو جوتے تھے اور نہ کپڑے۔ لیکن سب سے پہلے مجھے اس ہتھکڑی سے نجات حاصل کرنا تھی۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ''تمہارے پاس لائیٹر ہے۔''

اس نے ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے لائیٹر نکال کر مجھے تھمادیا۔ میں نے سب سے پہلے ہاتھ اور پیروں کے درمیان والی رسّی کو جلا کر کاٹ دیا۔ مضبوط ترین نائلون کی بنی یہ رسّی شاید ہاتھی سے بھی نہ ٹوٹتی لیکن معمولی سے شعلے نے اسے لمحوں میں پگھلا دیا۔ ہاتھوں اور پیروں کی ہتھکڑیوں کو بھی نائلون کی رسّی سے جوڑا ہوا تھا یعنی زنجیر کی جگہ اس سے کام لیا گیا تھا صرف کلائیوں اور ٹخنوں میں پہننے والے کڑے اسٹیل کے تھے اس لیے نہایت ہلکے ہونے کے باوجود نہایت مضبوط بھی تھے۔ میں نے درمیانی رسّیوں کو بھی جلا دیا اور اب میرے ہاتھ پاؤں مکمل طور پر آزاد ہوگئے تھے سوائے اسٹیل کے کڑوں کے جو بدستور کلائیوں اور ٹخنوں میں تھے اور انہیں صرف چابی سے یا کسی دھات کاٹنے والی چیز سے کھولا جاسکتا تھا۔ مگر اب یہ میری نقل وحرکت میں مزاحم نہیں تھے۔

یہ کام کرتے ہوئے میں پوری طرح پائلٹ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے پائلٹ کا پستول اور چاقو اپنے پاس رکھ لیا اور ہاتھ میں ویراما کا پستول رکھا۔ ہر منٹ بعد میں فلائنگ پینل پر سمت دیکھتا تھا۔ اب میں نے دوسرا کام شروع کیا اور ویرانا کی جیکٹ اُتارنے لگا۔ اس محدود سی جگہ میں اس بھاری جیکٹ کو اُتارنا آسان کام نہیں تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح یہ کام کرلیا۔ اس کے بعد اس کے جوتے اور پھر اس کا گرم ترین ٹراؤزر اُتارا۔ نیچے اس نے سوتی پاجامہ پہن رکھا تھا جبکہ جیکٹ کے نیچے گرم جرسی تھی۔ وہ مرچکا تھا اور اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے جوتے بھی خاص قسم کے تھے اور سائز ذرا سا بڑا تھا لیکن جب میں نے ویرانا کی پتلون کے بعد اس کے موزوں کے ساتھ جوتے پہنے تو مجھے بالکل فٹ آگئے تھے۔ آخر میں میں نے اس کے دستانے بھی اُتار کر پہن لیے۔ اب میں سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

پائلٹ کی نظر سامنے تھی لیکن وہ یقیناً محسوس کررہا تھا کہ پیچھے کوئی کارروائی ہورہی ہے۔ اس کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ پلٹ کر دیکھتا یا کوئی خطرہ مول لینے کی کوشش کرتا۔ اسے خوف

تھا کہ کہیں میں جاں بخشی کا وعدہ واپس نہ لے لوں۔ اب صرف بھاری جیکٹ رہ گئی تھی لیکن ابھی میں اسے پہننا نہیں چاہتا تھا۔ پائلٹ نے خاصی دیر بعد کہا۔ ''تم واپس جاکر بچ نہیں سکو گے۔ ہمارے آدمی تمہیں پہلے کی طرح پکڑ لائیں گے۔''

''چشم ما روشن دل ما شاد۔'' میں نے کہا۔ ''مطلب ہے کہ ہم انتظار کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس بار کون کسے پکڑتا ہے؟''

''ہم صرف دو افراد ہیں اور ہمیں قابو کرکے تم کسی خوش فہمی کا شکار مت ہونا۔'' وہ بہت صاف اردو بول رہا تھا۔ حالانکہ صورت سے وہ بھی ساؤتھ انڈیا کا ہی لگتا تھا۔

''میں کبھی بھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہا۔ لیکن مجھے اپنے زورِ بازو سے زیادہ اللہ کی مدد کا بھروسا ہے کیونکہ میری نیت صاف ہے اس لیے وہ مجھے ہر آزمائش سے بچالے جاتا ہے لیکن تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ جہاں تک دو آدمیوں کا تعلق ہے تو تمہارے دیش میں ہی میں نے پوری پوری بٹالین کا سامنا کیا ہے اور وہاں سے بھی بچ نکلا تھا۔ اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہوگے؟''

وہ چپ ہوگیا۔ ایک بار پھر ہم بلند ترین برف پوش پہاڑوں کے اوپر محوِ پرواز تھے۔ یہ پامیر کی پٹی تھی۔ دنیا کے مشہور ترین سیاحوں نے یہیں شاہراہ ریشم کے راستے سفر کیا ہوگا۔ کیونکہ چین اور وسطِ ایشیا کے دوسرے راستے بھی یہیں سے گزرتے ہیں۔ آنے والے دنوں میں یہ دنیا کا حساس ترین خطہ بن جائے گا کیونکہ دنیا کی چار بڑی طاقتیں اس پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کررہی ہیں۔ امریکا اور چین یہاں موجود ہیں جبکہ روس اور بھارت بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔

یہ تلخ خیالات ان چند منٹوں میں میرے ذہن سے گزرے تھے جب ہیلی کاپٹر دوبارہ پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تھا اور اب پائلٹ ان ہی تنگ وادیوں کے درمیان اپنا چوپر اُڑا رہا تھا جہاں اس کے ریڈار پر دیکھ لیے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہ جگہ کتنی دور ہے اب؟''

''مشکل سے پانچ منٹ کا راستہ ہے۔'' وہ فلائنگ اسٹک کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا کیونکہ یہاں موسم خراب تھا اور تیز ہوائیں ہیلی کاپٹر کی ہموار پرواز میں خلل ڈال رہی تھیں اس نے بھی تشویش سے کہا۔ ''موسم خراب ہو رہا ہے ایسے میں لینڈنگ بہت مشکل ہوتی ہے۔''

''تمہیں لینڈنگ کرنی ہے۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''چاہے یہ کریش لینڈنگ کیوں نہ ہو۔''

''اس صورت میں میرے ساتھ تم بھی مروگے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''موسم دیکھ رہے ہو؟''

موسم واقعی تشویشناک ہورہا تھا۔ برف کے ٹکڑے اُڑاتا ہوا طوفان آرہا تھا اور حدِ نظر محدود ہوگئی تھی۔ نیچے زمین صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ واقعی لینڈنگ کا مطلب کریش لینڈنگ بھی ہوسکتا تھا۔ بہرحال میرے لیے اطمینان کی بات تھی کہ میں خطرناک دشمن کی سازش ناکام بنا کر دوبارہ اپنے وطن کی سرزمین پر آگیا تھا اور اب مجھے مرنا بھی پڑتا تو میرے لیے بُرا سودا نہیں تھا۔ میں نے پائلٹ سے پوچھا۔ ''دوسری صورت کیا ہوگی؟''

''تمہیں نیچے جمپ کرنا ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''میں ہیلی کاپٹر اتنا نیچے لے جاؤں گا کہ تم رسّی کے سہارے نیچے اتر سکو گے۔''

''رسّی کے سہارے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تاکہ میں جیسے ہی باہر نکلوں تم ہیلی کاپٹر اُڑا لے جاؤ اور اس کے بعد مجھے گرادینا یا پہاڑ سے ٹکرادینا تمہارے اختیار میں ہوگا۔''

وہ ایک لمحے کو چپ ہوا پھر کمزور لہجے میں بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔''

''تم کیا اور تمہارا وعدہ کیا۔'' میں نے جواب دیا اور پستول اس کے سر سے لگادیا۔ ''تم ہیلی کاپٹر نیچے اُتاروگے اور جب تک میں اجازت نہیں دوں گا دوبارہ فلائی نہیں کروگے۔''

وہ مجبور تھا اس لیے حکم ماننے لگا۔ پانچ منٹ سے بھی پہلے ہم اس پہاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے جہاں کرنل زریسکی کا کیبن تھا۔ بلندی سے کیبن صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس کے پاس وہ وین بھی کھڑی تھی جس میں مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ ذرا نیچے برف پر وہ نشان بھی دکھائی دے رہے تھے جو کرنل کے ساتھیوں نے پائلٹ کی رہنمائی کے لیے برف پر بنائے تھے یہ اب بھی نمایاں تھے۔ لیکن میرا اس مقام پر لینڈنگ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ''یہاں سے ذرا آگے چلو ہم کسی اور جگہ اُتریں گے۔''

''آگے کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''اس موسم میں کسی اجنبی جگہ اُترنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔''

www.paksociety.com

"تم فکر مت کرو تم نہیں مرو گے۔"

"اگر مرا نہیں تب بھی کریش لینڈنگ کے بعد میں یہیں پھنس کر رہ جاؤں گا۔" اس نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد چوپر اُڑنے کے قابل ہی کہاں رہے گا۔"

"یہ سب تم سوچ سمجھ کر ہی یہاں آئے ہو گے۔" میں نے پستول اس کی گدی پر دبا کر کہا۔ "تم کسی پکنک پر نہیں آئے تھے جو تم کہو کہ تمہیں خطرات کا احساس نہیں تھا۔"

اس نے ہیلی کاپٹر آگے بڑھایا۔ اس وقت یہ زمین سے کوئی پانچ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ مجھے امید تھی کہ نیچے جاری ہواؤں کے طوفان کے شور میں کرنل زریسکی یا اس کے آدمیوں نے ہیلی کاپٹر کی آواز نہیں سنی ہو گی۔ اس پہاڑی سے آگے بہت ناہموار اور دشوار قسم کا علاقہ تھا جہاں کسی ہیلی کاپٹر کا اُتارنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہی بات پائلٹ نے مجھ سے کہی۔ "یہاں کہیں بھی چوپر نہیں اُتر سکتا ہے۔"

"اُتر سکتا ہے۔" میں نے کہا مجھے وہ جگہ نظر آ گئی تھی جہاں ہیلی کاپٹر کو اُتارا جا سکتا تھا۔ یہ وہی سڑک تھی جو آگے کیبن والی پہاڑی کی طرف جا رہی تھی دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر سڑک کے آس پاس تمام جگہیں کھلی تھیں اور یہاں مختصر سی پٹی پر ہیلی کاپٹر کے اسکیز ٹِک سکتے تھے۔ میں نے پائلٹ کو وہ جگہ دکھائی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بہت مشکل ہے ذرا سی غلطی سے چوپر کے پَر کہیں نہ کہیں ٹکرا سکتے ہیں۔"

"تمہیں یہ رِسک لینا ہی پڑے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تمہارے پاس بچنے کا یہی ایک راستہ ہے اگر تم نے مجھے اُتار دیا تو میں تمہیں واپس جانے دوں گا ورنہ...."

اس نے مجبوراً رضامندی ظاہر کی۔ "اگر تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

"یہ تمہاری پیشہ ورانہ مہارت کا امتحان بھی ہے۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "مجھے اُتارو اور انعام میں واپس چلے جاؤ۔"

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر سر ہلا کر ہیلی کاپٹر کو نیچے اس جگہ لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں پہاڑیوں کے درمیان ہوا بہت تیز تھی اور یہ ہیلی کاپٹر کو پتے کی طرح اُڑا لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ہیلی کاپٹر ہلکا پتا نہیں تھا بلکہ فولاد کی بنی ٹنوں وزنی مشین تھی اور اس میں ایک بہت طاقتور انجن بھی لگا ہوا تھا۔ کچھ پائلٹ کی مہارت تھی اور کچھ جان بچانے کے لیے اس کی کوشش بالآخر وہ ہیلی کاپٹر کو سڑک کے اس مقام پر لے آیا جہاں اس کے اسکیز سڑک سے ٹکرا سکتے تھے۔ جیسے ہی اسکیز سڑک سے ٹکے میں نے دروازہ کھول دیا۔ طوفانی ہوا کا جھکڑ اندر آیا تھا۔ میں نے ویراما کی جیکٹ اُٹھائی اور نیچے اُتر گیا۔ طوفان کا شور ہی کم نہیں تھا کہ انجن بھی سر پر موجود تھا۔ ایک شورِ قیامت برپا تھا۔ پائلٹ پاگلوں کی طرح کچھ اشارے کرنے لگا۔ پہلے میں سمجھا نہیں پھر میری سمجھ میں آیا تو میں نے کھلا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بغیر وہ پرواز نہیں کر سکتا تھا۔

عام موسم میں دروازہ کھلا بھی ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس ہوا میں کھلے دروازے کے ساتھ ہیلی کاپٹر درست انداز میں پرواز نہیں کر سکتا تھا اور پھر درجہ حرارت بھی بہت کم تھا۔ اندر سب ٹھٹھر کر رہ جاتے۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر ذرا بلند ہوا۔ میں نے پستول سے اس کے ایندھن کے ٹینک کا نشانہ لیا اور لگاتار اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک ٹینک میں سوراخ نہیں ہو گیا اور اس سے فوارے کی طرح پھوٹنے والے ایندھن نے آگ نہیں پکڑ لی۔ جیسے ہی اس نے آگ پکڑی میں نزدیکی پہاڑی کی طرف بھاگا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا ہیلی کاپٹر بے قابو ہو کر مجھ پر ہی آ گر سکتا تھا یا اس کا گھومتا پَر مجھے چھو بھی جاتا تو میرے چیتھڑے اُڑ جاتے۔ اس پہاڑی کے دامن میں مجھے کچھ گڑھے دکھائی دے رہے تھے جن میں گھس کر میں ہیلی کاپٹر سے کسی قدر محفوظ ہو جاتا۔

ایندھن کی ٹینکی میں آگ لگتے ہی ہیلی کاپٹر بے قابو ہو کر گھومنے لگا تھا۔ پائلٹ نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ میں اسے جانے کی اجازت دینے کے بعد یہ حرکت کروں گا اور یہ اس کی حماقت تھی۔ وہ میرا اور میرے ملک کا دشمن تھا اور یہاں کسی خیر سگالی کے مشن پر نہیں آیا تھا۔ اس نے بین الاقوامین کی سرحدی خلاف ورزی کی تھی اور اگر اسے یہاں مار گرایا جاتا تو کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ یہ ان بھارتی نیتاؤں کے لیے ایک سبق تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مجھے آسانی سے اغوا کر کے لے جائیں گے اور میرے ساتھ جو چاہے سلوک کریں گے۔ مگر اُلٹا ان کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے ان کے دو آدمی اور ایک ہیلی کاپٹر ان کے ہاتھ سے گیا تھا اور ابھی جب اس ہیلی کاپٹر کا ملبہ اور لاشیں ملتیں تو ان کو اس کی جواب دہی بھی کرنا پڑتی۔

دوا کا اثر کم ہونے سے میرا جسمانی ردِعمل بہتر ہو رہا تھا اور پھر خطرے کے احساس نے اسے سو فیصد نہیں تو اسی یا نوّے فیصد ٹھیک کر دیا تھا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا نہ جانے ہیلی کاپٹر اتفاقی میرے طرف آیا تھا یا خبیث پائلٹ نے بدلہ لینے کے لیے اسے جان بوجھ کر مجھ پر گرانے کی کوشش کی تھی۔ عقب سے آتی انجن کی مہیب آواز جیسے میرے سر پر آ گئی تھی اور پنکھوں کی ہوا صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ گڑھے کچھ دور تھے۔ اور وقت نہیں تھا میں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے جست لگائی اور زمین کے ساتھ ساتھ ہوتا ایک گڑھے میں لینڈ کر گیا اسی لمحے ہیلی کاپٹر کا ترچھا ہوتا پَر زمین پر لگا اور برف کے ساتھ مٹی کا ایک طوفان اُٹھا تھا۔ پَر اپنی قوت میں زمین میں دھنستا چلا گیا اور جب یہ رکا تو ردِعمل میں ہیلی کاپٹر گھوما اور پَروں سے الگ ہو کر اس کا جسم دور سڑک پر گرا اور فوراً ہی شعلوں میں بدل گیا تھا۔ ٹینکی سے پہلے ہی شعلے نکل رہے تھے گرنے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی ٹینکی پھٹی اور مجھے یقین ہے پائلٹ کو اندر سے نکلنے کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ وہ مارا گیا تھا۔

میں کچھ دیر حفظ ماتقدم گڑھے میں دبکا رہا۔ ممکن تھا ہیلی کاپٹر میں مزید کوئی خطرناک چیز ہوتی اور وہ پھٹتی تو میں زیادہ دور نہیں تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد میں گڑھے سے نکلا تو ہیلی کاپٹر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اس سے شعلوں کے ساتھ گاڑھا دھواں بھی اُٹھ رہا تھا اور اس کے قریب جانا محال لگ رہا تھا۔ مجھے قریب جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دھویں کے ساتھ اُٹھتی چراند نے بتا دیا کہ جلنے والی اشیا میں انسانی جسم بھی شامل تھے۔ دوسرے اگر پائلٹ کسی طرح بچ کر ہیلی کاپٹر سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا تب بھی اسے آس پاس ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہاں دور تک سیدھی زمین تھی یا بلند ہوتے پہاڑ تھے جہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بالفرض محال وہ بچ بھی گیا تھا تب بھی میری بلا سے، میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اور کچھ دیر بعد یہاں کوئی نہ کوئی آ جاتا اور ہیلی کاپٹر کے آثار دیکھتے ہی یقیناً متعلقہ اداروں کو اطلاع دی جاتی۔

میں نے جیکٹ پہنی جو یقیناً اسی قسم کی سردی کے لیے مخصوص تھی۔ اس کے اندر ذرا سا خون لگا ہوا تھا۔ جسے میں نے برف سے رگڑ رگڑ کر صاف کر دیا۔ اب میں سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ دوسرے لوگوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی نہ سہی لیکن اس کی تباہی کی آواز یقیناً کرنل زریسکی تک گئی ہو گی۔ وہ اور اس کے آدمی اس طرف آنے والے ہوں گے۔ اگر اس تک حادثے کی اطلاع نہیں بھی پہنچی تھی تب بھی کرنل کو واپس اسلام آباد کی طرف جانا تھا کیونکہ وہ میرے سامنے اس کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ یہاں اس کا کام یعنی مجھے سرحد پار بھیجنا اس کی دانست میں مکمل ہو چکا تھا اور اس کی ذمّے داری بھی ختم ہو گئی تھی۔ اگر بھارتی مجھے قابو نہیں رکھ سکے تو یہ بھی اس کی ذمّے داری نہیں تھی۔ لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ اس کی ذمّے داری تھی یا نہیں۔ وہ بھارتیوں کے لیے معاہدے پر کام کر رہا تھا یا صرف مجھے اغوا کر کے حوالے کرنے کا کام ذمّے لیا تھا۔

طوفان کی شدت بڑھ رہی تھی اور میرا جسم گرم لباس میں چھپا تھا اس کے باوجود سردی رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا اگر میں نارمل لباس میں ہوتا تو مشکل سے آدھے ایک گھنٹے بعد میرے ہوش و حواس جواب دے جاتے۔ درجہ حرارت منفی دس کے آس پاس تھا۔ مجھے اس سے پہلے اتنی سردی کا تجربہ کم ہی ہوا تھا۔ ہیلی کاپٹر سڑک سے ذرا ہٹ کر تباہ ہوا تھا۔ اس کی آگ ابھی مدھم نہیں ہوئی تھی اور گاڑھا سیاہ دھواں خاصی بلندی تک پہنچ گیا تھا۔ یہ خاصے فاصلے سے بھی صاف دکھائی دیتا۔ میں سڑک تک آیا اور کیبن کی طرف جانے لگا۔ یہاں سڑک بَل کھا رہی تھی۔ دوسری پہاڑی شروع ہوتے ہی سڑک تنگ اور خراب ہو گئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا بہ ظاہر چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے میں پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اوپر گھنے درخت دکھائی دے رہے تھے وہاں میں کسی کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکتا تھا اور سرد ہواؤں سے بھی کچھ نہ کچھ بچت ہو جاتی۔

تیز ہوا کے مقابلے میں اوپر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ مجھے پتھروں اور سوکھی جھاڑیوں کی مدد لینا پڑ رہی تھی۔ درخت کوئی پچاس گز اوپر تھے۔ نیچے کے درخت یقیناً سڑک بنانے کے دوران میں صاف کر دیئے گئے ہوں گے۔ یہاں بلندی بھی خاصی تھی شاید سطح سمندر سے کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی تھی اس لیے ہوا نہایت ہلکی تھی اور ذرا سی مشقت سے سانس پھول رہی تھی۔ میں درختوں میں داخل ہوا تو ہواؤں کی شدت میں ذرا سی کمی محسوس ہوئی تھی اور یہ بھی کافی تھی۔ میں ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں دو درختوں کے درمیان میں ہواؤں سے کسی حد تک محفوظ تھا اور سامنے نیچے دور تک دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ موسم اتنا صاف نہیں تھا۔ برف کے اُڑتے ٹکڑے حدِ نگاہ محدود کر رہے تھے لیکن یہ دھند کی طرح منظر کو اندھا نہیں کر رہے تھے کچھ نہ کچھ نظر آ رہا تھا اور کوئی چیز حرکت کرتی تو وہ صاف دکھائی دیتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

سوال یہ تھا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا میں کیبن کی طرف بھی جا سکتا تھا یا اس سے مخالف سمت میں دوڑ لگا سکتا تھا؟ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ہیلی کاپٹر کی تباہی پر کسی کی طرف سے کیا ردِعمل سامنے آتا ہے دوسرے کرنل زریسکی اگر روانہ ہوتا ہے یا اس طرف آتا ہے تو میں اپنا اگلا لائحہ عمل طے کر سکتا تھا۔ کرنل یا اس کے ساتھیوں پر حملہ کرنا بہت ہی دشوار تھا۔ وہ مسلح اور چوکنے ہوتے۔ لیکن میں ان سے دور رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر کرنل یا اس کے ساتھی اس طرف نہیں آتے یا پھر سیدھا جنوب کی طرف نکل جاتے۔ تب میں کیبن کا رُخ کرتا۔ اس لیے اب مجھے سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں کرنا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ ویراما کے پاس بھی گھڑی نہیں تھی ورنہ میں وہ بھی اُتار لاتا۔ بہرحال میرا اندازہ تھا کہ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔

میرا جسم تقریباً میرے قابو میں آ گیا تھا اور میں نہتا بھی نہیں رہا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا، اگر کرنل زریسکی یا اس کے ساتھی مجھے تلاش بھی کر لیتے تو وہ مجھ پر اتنی آسانی سے قابو نہیں پا سکتے تھے۔ اس بار انہیں خاصی کوشش کرنا پڑتی اور عین ممکن تھا کہ معاملہ اُلٹا ہو جاتا۔ میں ان کو قابو کر لیتا۔ نیچے ہیلی کاپٹر کی آگ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ ایک تو اس کا ایندھن ختم ہو رہا تھا، دوسرے اوپر سے گرتی برف بھی پانی بن کر اس آگ کو سرد کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ دھواں بھی خاصا کم ہو گیا تھا اور صاف دکھائی دے رہا تھا کہ پندرہ بیس منٹ میں ہیلی کاپٹر کے ملبے کی آگ مکمل طور پر بجھ جائے گی۔ ابھی تک کسی بھی جانب سے کسی کے نوٹس لیے جانے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے تھے۔ اگر کرنل یا اس کے ساتھیوں نے ہیلی کاپٹر کریش کا دھماکا سن لیا تھا تو انہیں اب تک یہاں آ جانا چاہیے تھا کیونکہ کیبن یہاں سے مشکل سے نصف کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

میرا خیال تھا کہ یہاں سے سرحد پاس ہے اگر زمینی محافظ نہ سہی لیکن سرحدوں کی فضائی نگرانی کرنے والے ضرور اس حادثے کا نوٹس لیں گے مگر فضا میں بھی کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی تھی۔ شاید یہ جگہ عام فضائی روٹس سے خاصی ہٹ کر تھی اس لیے یہاں فورسز کی طرف سے فضائی نگرانی بھی خاص نہیں تھی۔ بہرحال میرا مسئلہ کرنل اور اس کے ساتھی تھے انہیں اب تک یہاں آ جانا چاہیے تھا اور وہ بھی نہیں آئے تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ انہیں حادثے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ وہ طوفان میں کیبن میں دبکے بیٹھے تھے۔ طوفان کے شور میں انہیں ہیلی کاپٹر کریش کا دھماکا بھی سنائی نہیں دیا تھا۔ مجھے خود کیبن تک جانا تھا۔

دیکھا جائے تو یہ آ بیل مجھے مارنے والی بات بھی ہو سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا میں اس علاقے سے قطعی ناواقف تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں راستے کہاں جاتے تھے اور نزدیک ترین آبادی کہاں تھی؟ اگر میں کسی آبادی تک پہنچ بھی جاتا تو تب بھی اس کا امکان کم تھا کہ مجھے اسلام آباد جانے کے لیے کوئی گاڑی مل سکے۔ یہاں آس پاس سارے غریب غربا کی آبادی ہو سکتی تھی جن کے پاس سے گاڑی ملنا بہت مشکل تھا۔ گاڑی مجھے کیبن کے باہر سے مل سکتی تھی۔ دوسرے میں کرنل پر قابو پانے کے بعد جاننا چاہتا تھا کہ بھارتی مجھے کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے اور مجھ تک ان کی رہنمائی کرنے کی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا بظاہر لگ رہا تھا۔ اگر بھارتی میرے پیچھے تھے تو مجھے اغوا کرنے کا تک مشکل سے بنتا تھا۔ وہ مجھے مار ڈالتے اور یہی ان کا انتقام ہوتا۔ اصل کہانی کیا تھی یہ مجھے کرنل زریسکی سے معلوم ہو سکتی تھی۔

میں اُٹھ کر روانہ ہوا لیکن میں نے سڑک پر آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بجائے میں اوپر جنگل میں چلتا رہا۔ یہاں ہواؤں کا دباؤ کم تھا اور میرا کسی کی نظروں میں آنے کا امکان بھی کم تھا۔ سڑک پر میں فوراً نظروں میں آ جاتا اور عین ممکن ہے جو بات میرے ذہن میں ہو وہی کرنل کے ذہن میں بھی ہو۔ دشمن کو کبھی بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ سمجھ رہا ہوگا کہ ان حالات میں ردِعمل کیا ہوگا اور وہ اسی کے لحاظ سے حکمت عملی بنائے کیبن یا اس کے آس پاس میرا انتظار کر رہا ہو۔ مجھے جو قدم اُٹھانا تھا بہت سوچ سمجھ کر اُٹھانا تھا دوسری صورت میں میرے پاس سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ یہ طے تھا مجھے کیبن کی طرف جانا تھا بس پوری طرح محتاط ہو کر جانا تھا۔

پہاڑی کے دوسری طرف آتے ہی مجھے سامنے سڑک پار وہ پہاڑی اور اس پر بنا ہوا کیبن دکھائی دیا تھا۔ کیبن کی طرف جانے کے لیے مجھے لازمی پہاڑی سے اُتر کر سڑک عبور کر کے دوسری طرف جانا ہوتا اور اس دوران ..... میرا نظروں میں آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ یہ پہاڑی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ اس کی ڈھلان صرف سامنے کی طرف تھی اور بہ ظاہر کیبن تک جانے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں درختوں کی آخری حد تک آیا۔ یہاں سے کیبن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہاں کے ماحول میں کوئی تبدیلی آئی تھی لیکن یہ تبدیلی کیا تھی میرا ذہن اس کا ادراک نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر میں نے اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا اور کسی ایسی ترکیب پر غور کرنے لگا جس سے میں دیکھے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر کیبن تک پہنچ جاؤں۔ مگر فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

طوفان جاری تھا لیکن بادل بہت گہرے نہیں تھے اور برف کی سفیدی کی وجہ سے ماحول تاریک نہیں تھا۔ اس لیے اگر میں سامنے کی طرف سے کیبن والی پہاڑی پر چڑھتا تو میرے نظر آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ جیکٹ کا رنگ ہلکا سرمئی تھا اور برف کے پس منظر میں فوراً نظر آ جاتا۔ ابھی میرا ذہن واضح نہیں تھا اس لیے میں ذرا پیچھے درختوں میں ایک ایسی جگہ دبک گیا جہاں سرد ہواؤں کا گزر ذرا کم تھا۔ اب مجھے شام ہونے کا انتظار تھا۔ روشنی کم ہونے پر ہی میں کچھ کر سکتا تھا۔ یا موسم مزید خراب ہو جاتا اور حد نگاہ محدود ہو جاتی تب میں کیبن کی طرف جا سکتا تھا۔ اس روشنی میں اس طرف جانے سے میرا کرنل یا اس کے ساتھیوں کی نظر میں آ جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔

آرام سے بیٹھتے ہی مجھے ان لوگوں کا خیال آیا جنہیں میں پیچھے چھوڑ آیا تھا اور وہ میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ بہرحال اس بار میں اتا پتا چھوڑے بغیر غائب نہیں ہوا تھا اس لیے میرے لواحقین ملنے والے نشانات پر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ مجھے ایمن کا خیال آیا۔ اس کے پاس مہلت مزید کم رہ گئی ہوگی۔ شاید دو دن کی اور اگر ڈیوڈ شا کی مداخلت جاری رہی تو اس کا امکان کم تھا کہ برٹش حکومت تاوان کی ادائیگی پر آمادہ ہو جائے۔ دوسری طرف فتح خان کسی صورت رقم لیے بغیر ایمن کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ مجھے درمیان کا آدمی بنائے لیکن بعد میں خود اس نے مجھے اغوا کر کے کرنل کے آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا کھیل کھیل رہا ہے اور اس کے اصل مقاصد کیا ہیں؟

اس نے مجھے اغوا کیا لیکن کرنل کے آدمیوں کے حوالے کرنے سے پہلے اس نے نادر علی سے میری ملاقات کرائی۔ کیا اسے علم تھا کہ مجھے بھارتیوں کے حوالے کیا جانے والا ہے؟ اگر اسے علم تھا تو اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ بھارتی میرے خون کے پیاسے تھے اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کیا فتح خان مجھے مارنے کی اس کوشش میں شریک تھا؟ یا وہ کسی کے دباؤ پر ایسا کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ مجھے تقریباً یقین تھا کہ فتح خان کو شک ہے میں ہیروں کے جائے مدفن سے واقف تھا۔ کیونکہ مرتے برٹ شا کے پاس میں ہی تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا لیکن فتح خان اس سے ناواقف تھا۔ اس کے شک کی بنیاد پر میں اس کے لیے خاصا اہم ہو گیا تھا اور وہ مجھے اتنی آسانی سے گنوانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا کہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر یہاں بیٹھ کر غور و فکر کرنے سے معاملہ سمجھ میں بھی نہیں آنے والا تھا۔ طوفان خلافِ توقع دھیما پڑنے لگا تھا اور اب ہواؤں کی رفتار میں تیزی نہیں رہی تھی۔ برف باری بھی رک گئی تھی۔ اس سے موسم مزید صاف ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ پانچ بجے کے بعد یہاں اندھیرا چھانے لگے گا۔ اس وقت میں موقع سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ رات ہوتے ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا اور اس موسم میں

عطیہ فیضی

یہ اس عورت کا قصہ ہے جو اپنے عہد کی ایک اہم شخصیت تھی۔ اس نے ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے لیے اپنی سی بھرپور کوشش کی۔ اس نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں پردہ ترک کیا اور عورتوں کے لیے مساوی حقوق اور مساوی مواقع کی آواز بلند کی۔ اس کے ذکر کے بغیر ہندوستانی عورت کی بیداری کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی لیکن آج اس کا نام خال خال ہی لیا جاتا ہے۔ کتابوں کی ورق گردانی کیجیے یا کسی بزرگ کے سامنے اس کا نام لیجیے تو چند سفید مونچھوں پر ایک پرلطف مسکراہٹ تھرتھراتی ہے اور بجھتی ہوئی آنکھوں میں چنگاری سی بھڑکتی ہے۔ یہ مسکراہٹ چپکے سے کہتی ہے ''اجی ہاں، وہی عطیہ جس کے شبلی اور اقبال سے عشق کے چرچے تھے۔ وہی عطیہ جس کو اقبال نے ''بانگ درا'' میں سلیما کے نام سے یاد کیا ہے اور ایک دوسری جگہ اس کے لیے کہا ہے۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

www.paksociety.com

رات باہر گزارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے کسی طرح کرنل سے گاڑی حاصل کرنی تھی اور اس کے بعد ہی میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ کیبن کی طرف سے مکمل خاموشی تھی نہ کوئی باہر آیا تھا اور نہ کوئی اندر گیا تھا۔

میری چھٹی حس دھیمے سُروں میں خطرے کا الارم بجانے لگی۔ دشمن کی طرف سے اتنی خاموشی بھی ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔ اگر کرنل اور اس کے ساتھیوں کو ہیلی کاپٹر کی تباہی کا پتا نہیں چلا تھا تب بھی انہیں ریڈیو پر تو اطلاع مل گئی ہوگی کہ یہاں سے جانے والا ہیلی کاپٹر دو سرحدیں پار کرنے کے بعد بھی اپنی منزل پر نہیں پہنچا اور کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اس صورت میں کرنل کو حرکت میں آنا چاہیے تھا۔ مگر وہ سکون سے کیبن میں بیٹھا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کرنل نے ہیلی کاپٹر کی واپسی کا سوچا ہی نہ ہو اور وہ سمجھ رہا ہو کہ جب ہیلی کاپٹر تاجکستان کی سرحد پار کر گیا تھا تو اس کے دوبارہ یہاں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر سوال نہیں پیدا ہوا تھا میں خود آ گیا تھا اور ہیلی کاپٹر یہاں سے کچھ دور پڑا تھا۔ اب تو اس کے ملبے کی آگ بھی بجھ گئی ہوگی۔

وقت گزر رہا تھا اور میں اب حرکت میں آنے کے لیے بے چین تھا سردی اتنی تھی کہ گرم ترین لباس کے باوجود ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ میں وقفے وقفے سے اُٹھ کر جسم کو حرکت دیتا تب کہیں جا کر جسم حرکت میں آنے کے قابل ہوتا تھا۔ پھر اندھیرا چھانے لگا۔ بادل اتنے تھے کہ ان میں سورج کی پوزیشن کا معمولی سا احساس تھا۔ جب مشرقی اُفق تاریک ہونے لگا تب سمتوں کا صحیح سے پتا چلا۔ سورج غروب ہوتے ہی ماحول یک دم تاریک ہو گیا تھا۔ روشنی کم ہوتے ہی میں نیچے اُتر آیا۔ اوپر کیبن کی کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی یعنی وہاں کرنل اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ میں ایسے زاویے سے جانے لگا کہ اگر کوئی کھڑکی سے دیکھے تو میں اسے آسانی سے دکھائی نہ دوں ویسے اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ روشن کیبن میں کھڑے ہو کر کوئی رات کی تاریکی میں مجھے دیکھ سکے۔ سرمئی جیکٹ جو دن میں مجھے نمایاں کر رہی تھی اب تاریکی میں مل کر مجھے چھپا رہی تھی۔ سڑک سے اوپر جانے کے بجائے میں نے پہاڑی کے بائیں طرف سے چڑھنا شروع کیا اس کے لیے مجھے سڑک عبور کرنا پڑی تھی اور تازہ برف پر میرے قدموں کے نشانات بن گئے تھے لیکن صبح سے پہلے یہ کسی کی نظر میں نہیں آتے اور اس وقت تک میں کچھ نہ کچھ کر گزرتا۔

چھوٹی موٹی خشک جھاڑیوں اور ٹنڈ منڈ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے میں کیبن کے پاس پہنچا۔ یہ عقبی حصہ تھا اور اس طرف وہ کمرا تھا جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ اس میں ایک کھڑکی تھی جس پر فولادی سلاخیں لگی تھیں۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا کھڑکی کے نیچے آیا اور پہلے اندر کی سن گن لی۔ پھر سر سے ہُڈ ہٹاتے ہوئے بہت احتیاط سے اندر جھانکا۔ کرنل کے دونوں ساتھی وہاں موجود تھے ایک بستر پر دراز تھا اور دوسرا ایک کرسی پر بیٹھا ہوا پاؤں ہلا رہا تھا۔ کرنل یقیناً لاؤنج والے حصے میں تھا۔ میں دبے قدموں چلتا لاؤنج کی عقبی کھڑکی کی طرف آیا۔ یہاں چھوٹا سا کچن تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو کرنل مجھے آتش دان کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا دکھائی دیا۔ اس کے اطمینان سے ظاہر تھا کہ اسے میری کوئی پروا نہیں تھی اس کی بلا سے میں پورا بھارتی اڈہ تباہ کر کے فرار ہو گیا ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ معاوضے پر کام کر رہا تھا۔ اس نے جس کام کا معاوضہ لیا تھا وہ کر دیا تھا آگے اس کی کوئی ذمّے داری نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ مجھے بھارتیوں کے حوالے کر کے اس نے ریڈیو بھی آف کر دیا ہو۔ اگر وہ بھارتیوں کے لیے مستقل کام کر رہا ہوتا یا اسے میرے فرار کی اطلاع مل گئی ہوتی تو وہ اتنے سکون سے نہ بیٹھا ہوتا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے پارسل کر کے وہ یہاں رکے گا نہیں بلکہ چلا جائے گا لیکن وہ بدستور یہاں موجود تھا۔

کیبن کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اگر کھلا بھی ہوتا تب بھی دروازہ کھلتے ہی کرنل ہوشیار ہو جاتا اور اس کے بعد اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ مجھے کرنل کو قابو کرنا تھا اس کے بعد اس کے دونوں گرگے خود ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کرنل کو قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر کروں کہ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک طرف رکھی اپنی گرم جیکٹ پہنی تو میں سمجھ گیا کہ وہ باہر آنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا کونے تک آیا۔ سامنے والے حصے میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس کا بھی امکان تھا کہ کرنل باتھ روم جاتا اور میں فوراً اس کی نظروں میں آ جاتا۔

میرا خدشہ درست نکلا۔ کرنل باتھ روم کی طرف ہی جا رہا تھا اور وہ مجھ سے صرف چند فٹ کے فاصلے سے گزرا۔ میں دیوار سے چپک گیا تھا اور اگر کرنل میری موجودگی محسوس کر لیتا تو میں اسے ہینڈز اَپ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا لیکن وہ اپنی دھن میں پتلون کی بیلٹ کھولتا ہوا تیز قدموں سے باتھ

روم کی طرف چلا گیا۔ یقیناً فطرت کی پکار خاصی تیز تھی اور اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ باتھ روم میں گھس کر اس نے دروازہ بند کر لیا اور میں دبے قدموں باتھ روم کی طرف بڑھا۔ کیبن کی کھڑکیوں سے آتی روشنی دیکھنے میں مدد کر رہی تھی۔ میں باتھ روم کے دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اندر کرنل کی مصروفیت کی اطلاع باہر تک آ رہی تھی۔ پھر وہ خود باہر آ گیا اور میں نے اس کی پشت پر پستول رکھ دیا۔

''کرنل چالاکی مت دکھانا۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''ورنہ مرحوم کہلاؤ گے۔''

وہ دم بہ خود رہ گیا تھا۔ اپنی پشت پر پستول کے دباؤ سے زیادہ شاید یہاں میری موجودگی اس کے لیے ناقابلِ یقین تھی کیونکہ اپنے طور پر اس نے مجھے پارسل کر دیا تھا اور اس کی نظروں کے سامنے بھارتی مجھے لے کر روانہ بھی ہو گئے تھے۔ ''تم.... واپس آ گئے۔'' اس نے مشکل سے کہا۔

''ہاں تمہارے بغیر دل نہیں لگا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاتھ اوپر کر لو۔''

اس نے ہاتھ اوپر کیے اور میں نے اوپر سے لے کر نیچے تک اس کی تلاشی لی۔ پستول اس کی جیکٹ میں تھا۔ میں نے اسے اپنی جیکٹ میں ڈال لیا۔ اب میرے پاس تین پستول ہو گئے تھے اور میں اچھا خاصا چلتا پھرتا اسلحہ خانہ بن گیا تھا۔ کرنل نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

''یہ میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گا۔'' میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ''اتنا خیال رکھنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میرے نزدیک بالکل بھی ضروری نہیں ہے اس لیے مرنے کی کوشش مت کرنا۔''

''تم بچ نہیں سکو گے وہ تمہیں پھر پکڑ لیں گے۔''

''وہ مجھے پہلے بھی نہیں پکڑ سکے تھے میں راستے سے بھاگ آیا ہوں۔'' میں نے اسے مطلع کیا۔ ''ہیلی کاپٹر کا ملبہ یہاں سے کوئی نصف کلومیٹر مشرق میں موجود ہے۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ''چوپر کریش ہو گیا.... کیسے؟''

''جیسے ہوتا ہے اور وہ جو مجھے لے آئے تھے خود پرلوک سدھار گئے۔''

''شہباز، یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے تم نہیں جانتے تم کن سے دشمنی مول لے رہے ہو؟''

میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وہ مجھے دعوت میں لے جا رہے تھے اور میں نے بھاگ کر اچھا نہیں کیا۔''

''وہ تمہیں پھر لے جا سکتے ہیں۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ابھی تو اندر چلو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ بادل ناخواستہ حرکت میں آیا۔ ہم کیبن میں آئے تو ایک خوشگوار حرارت کے احساس نے استقبال کیا لیکن مجھے حرارت سے زیادہ دوسری چیزوں کی فکر تھی جو کیبن کے دوسرے کمرے میں تھیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ان دونوں کو آواز دے کر بلاؤ۔ بغیر کوئی اشارہ کیے۔''

اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''آغا.... مبشر۔''

دونوں کمرے سے نمودار ہوئے اور مجھے کرنل کے پیچھے دیکھ کر ساکت رہ گئے تھے۔ ''دونوں ہاتھ اوپر کر کے اور سامنے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔ ''جس نے پیچھے دیکھنے یا ہاتھ نیچے کرنے کی کوشش کی اس کے سر میں سوراخ ہو جائے گا۔''

انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے دوسرا حکم دیا۔ ''اب اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرو اور اپنے پاس موجود ہتھیار نکال کر نیچے پھینک دو۔''

انہوں نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ مگر مجھے اطمینان نہیں تھا عین ممکن تھا کہ ان کے موٹے گرم لباسوں تلے مزید ہتھیار چھپے ہوں اور وہ موقع ملنے پر انہیں استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میں نے انہیں لباس اُتارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے برہمی سے کرنل کی طرف دیکھا۔ یہ ان کی تذلیل تھی لیکن کرنل خود گن پوائنٹ پر تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا۔ ''مرنے کے مقابلے میں کچھ دیر کے لیے بے لباس رہ لینا زیادہ آسان ہے۔''

انہوں نے مجبوراً اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ میں نے انہیں کمرے میں چلنے کا حکم دیا اور خود کرنل کے پیچھے رہتے ہوئے ان کے ساتھ کمرے میں آیا میں نے وہاں کی تلاشی لی کہ کوئی اسلحہ یا ایسی چیز تو نہیں تھی جس سے وہ خود کو آزاد کرا لیتے اور پھر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کرنل میرے ساتھ ہی تھا اور خلافِ توقع وہ پوری تابع داری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کرسی پر بٹھایا جس پر اس نے مجھے بٹھایا تھا اور خود آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرنل کی نظر میری جیکٹ میں چاقو کے وار سے ہونے والے سوراخوں پر تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم کو بعد میں پتا چل گیا ہوگا کہ میں چاقو چھپا کر لے گیا ہوں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تمہارے جانے کے خاصی دیر بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

مجھے احساس ہوا کہ چاقو غائب ہے۔ پائلٹ نے راستے میں ریڈیو بند کر دیا ہوگا اس لیے میں اسے کال بھی نہیں کر سکا۔"

"ہاں جب وہ فیول لینے اُترا تب اس نے ریڈیو آن کیا تھا۔"

"مگر اتنی دیر میں تم اپنا کام کر چکے تھے۔" کرنل نے کہا۔

"ہاں، چاقو چھوٹا لیکن بہت کام کا ثابت ہوا۔ میرا نگران فوراً مارا گیا تھا۔ پائلٹ البتہ کریش میں ہلاک ہوا۔"

"شہباز تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس سے معاملات بہت خراب ہو جائیں گے۔"

"یقیناً دشمنوں کے معاملات بہت خراب ہو جائیں گے۔" میں نے خوشدلی سے کہا اور پھر سنجیدہ ہوگیا۔ "کرنل میں جاننا چاہتا ہوں اس سارے چکر کے پیچھے کون ہے؟"

"تم جانتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارا مطلب ہے بھارتی ہیں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں تم نے خود دیکھا تھا تمہیں لے جانے والے بھارتی تھے۔"

"اس میں مجھے بھی کوئی شک نہیں ہے لیکن مجھے بلوانے والے صرف بھارتی ہیں، یہ بات میرا ذہن قبول نہیں کر رہا ہے، بھارتی میرے دشمن ہیں مجھے اغوا کرانے کے بجائے مروانا پسند کریں گے۔"

"ممکن ہے تم انہیں زندہ ہی مطلوب ہو۔" کرنل نے جلدی سے کہا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "گویا تم سچ نہیں بولو گے؟"

"سچ بس ایک ہی ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

میں تشدد کے ذریعے اس سے حقیقت اُگلوا نہیں سکتا تھا۔ پھر میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس سے پہلے کہ بھارتی یا کوئی اور مصیبت نازل ہو جاتی۔ ہیلی کاپٹر کی تباہی زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اب تک بھارتی ہیلی کاپٹر کو اپنے اڈے کے آس پاس ہی تلاش کر رہے ہوں گے کیونکہ ان تک ری فیولنگ کی رپورٹ پہنچ گئی ہوگی۔ جب انہیں ہیلی کاپٹر وہاں نہیں ملے گا تو وہ دوسرے امکانات پر غور کریں گے اور ریڈیو بند ہونے والے واقعے سے کڑیاں ملاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نے اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

"کرنل سچ ایک ہی ہوتا ہے لیکن وہ تمہاری زبان سے نکل نہیں رہا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، ورنہ میں نکلوانے کی کوشش کرتا۔" میں کہتے ہوئے اس کی پشت کی طرف آیا اور اس سے پہلے وہ ہوشیار ہوتا میں نے پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کی گدی پر مارا۔ میں ہلکا وار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ سخت جان فوجی تھا اور عین ممکن تھا اس پر اتنا اثر نہ ہوتا۔ پوری قوت سے وار کرنے میں صرف یہ خطرہ تھا کہ وہ مر بھی سکتا تھا تو مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ میرا دشمن تھا اور اس نے مجھے بدترین دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کرنل چشم زدن میں بے ہوش ہو کر آگے جھکا اور کرسی سے لڑھک کر فرش پر دراز ہوگیا۔ میں نے اس کی نبض کا معائنہ کیا جو سست لیکن مستقل چل رہی تھی اور اس کے دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مزید تسلی کے لیے میں نے ایک کونے میں رکھی رسی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے۔ اب وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس سے فارغ ہو کر میں نے کیبن کی تلاشی لی اور سب سے پہلے پیٹ پوجا کی۔ بھوک سے میرا بُرا حال تھا۔ وہاں ڈبل روٹی۔ دودھ، انڈے اور مکھن پنیر جیسی محفوظ رہ جانی والی خوراک وافر مقدار میں تھی۔ میں نے کھانے کے بعد راستے کے لیے بھی کچھ چیزیں پیک کر لیں۔ کھانے کے دوران میں کیبن کی تلاشی لیتا رہا تھا۔ وہاں اسلحے کے نام پر صرف وہی دو شارٹ گنیں تھیں جو کرنل کے آدمیوں کے پاس تھیں یا پھر وہ پستول تھے جو میں نے کرنل کی اور اس کے آدمیوں سے حاصل کیے تھے۔ اتنے پستول بیکار تھے لیکن میں نے وہ بھی ساتھ رکھ لیے۔ شارٹ گن اور ان کے فاضل بلٹس بھی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہر قسم کا اسلحہ ساتھ لے جاؤں گا۔ دشمن کو جتنا نہتا کر سکوں اتنا ہی میں محفوظ رہوں گا۔

ایک چھوٹی سی الماری کا تالا توڑا تو اس میں سامنے ہی خاصی بڑی رقم رکھی دکھائی دی اور یہ ڈالرز کی صورت میں تھی۔ میں نے گڈیاں اُٹھا کر دیکھیں یہ دس ہزار ڈالرز والی گڈیاں تھیں اور ان کی کل تعداد بیس تھی۔ یعنی یہ دو لاکھ ڈالرز کی رقم تھی۔ پاکستانی روپے میں یہ رقم کوئی ایک کروڑ ستر لاکھ روپے بنتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کرنل نے اتنی بڑی رقم یہاں رکھی تھی شاید یہ رقم اس نے میرے بدلے حاصل کی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں یہ رقم ساتھ لے جاؤں یا کم سے کم آتش دان میں ڈال جاؤں۔ تاکہ کرنل اس سے محروم ہو جائے مگر پھر میں نے یہ خیال مسترد کر دیا۔ رقم خاصی بڑی تھی اور عین ممکن تھا اس کی واپسی یا پھر اس کا بدلہ لینے کے لیے کرنل میرے پیچھے آتا اور میں پہلے ہی دشمنوں سے بیزار تھا۔ ان میں کمی کی کوشش کر رہا تھا اضافہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ رقم جوں کی توں چھوڑ دی البتہ کرنل کی تلاشی کے دوران اس کی جیب سے کوئی چودہ ہزار کی رقم ملی تھی، وہ میں نے بلا تکلف رکھ لی کیونکہ راستے میں مجھے لازمی ضرورت پڑتی اور ان لوگوں نے میری جیب میں ایک روپیا نہیں چھوڑا تھا۔ پھر میں نے کرنل کی قیمتی رولیکس اُتار لی۔ آخر میں کرنل کی تلاشی لی اور اس کی ایک جیب سے وہ چابی ملی جس سے میرے ہاتھ پیروں میں پڑی ہتھکڑیاں کھل گئیں۔ اس مصیبت سے بھی جان چھوٹی تھی۔ کیونکہ یہ زبردستی کے کڑے ہاتھ پیروں میں چبھ رہے تھے۔

کیبن میں اور کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ میں نے وین کی چابیاں تلاش کیں، لیکن وہ مجھے کرنل سمیت کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ وین میں نہ لگی ہوں۔ میں باہر وین کے پاس آیا تو مجھے وہی عجیب سا احساس ہوا تھا جو اوپر جنگل سے وین دیکھ کر ہوا تھا لیکن میں اسے اس وقت بھی نہیں سمجھ سکا۔ دروازہ کھول کر دیکھنے پر چابیاں سامنے نظر آئیں تو میں نے سر پیٹ لیا۔ یہاں کون چابیاں سنبھالتا پھرتا ہے جبکہ چوری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں نے پہلے ڈیزل کی پوزیشن دیکھی۔ ٹینک تین چوتھائی فل تھا اور وین کے درمیانی حصے میں چار گیلن والے تین جیری کین رکھے تھے۔ یہ سب ڈیزل سے بھرے ہوئے تھے۔ گویا مجھے راستے میں شاید ہی کہیں ایندھن بھروانے کی شاید ہی ضرورت پیش آتی۔

میں نے وین اسٹارٹ کی اس کے انجن کو چوک دینا پڑی تھی سردی کی وجہ سے جام ہو رہا تھا لیکن یہ غنیمت رہا کہ اس سردی میں چوک سے اسٹارٹ ہوگیا۔ انجن کو چلتا چھوڑ کر میں کیبن میں آیا۔ میں نے سب سے پہلے ریڈیو اُٹھا کر اسے فرش پر دے مارا۔ مزید دو تین بار جوتے تلے کچلنے سے وہ بالکل تباہ ہوگیا اور اب اس کی مرمت وہاں بھی نہیں ہو سکتی تھی جہاں یہ کبھی بنا ہوگا۔ کرنل بدستور بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے کرسی پر ڈال کر میں نے سامان اور اسلحہ سمیٹا اور باہر وین میں لا کر ڈالا۔ انجن کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ نہایت بہترین حالت میں تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے صرف کیبن کا دروازہ بند کیا تھا۔ اسلحہ اور دوسری ساری چیزیں میں نے عقبی خانے میں ڈال دی تھیں۔ اس موڑ سے ذرا پہلے وین روک کر میں پیدل وہاں تک گیا جہاں نیم تاریکی میں مجھے ہیلی کاپٹر کا جلا ہوا ڈھانچا دکھائی دیا تھا۔ ابھی تک اس حادثے کا احوال لینے نہیں آیا تھا اور یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا کہ اگر سرکاری لوگ آگئے ہوتے تو وہ مجھے روک سکتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے گزرنے کا بہ ظاہر ایک یہی راستہ تھا۔ میں واپس آیا اور وین میں اس جگہ کے پاس سے نکلتا چلا گیا۔

مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میں چترال کے کس حصے میں تھا سوائے اس کے کہ یہ حصہ سرحد سے بہت قریب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ان لوگوں نے راستوں کی تلاش کے لیے کوئی نقشہ رکھا ہو۔ میں نے ڈیش بورڈ کے خانے میں ہاتھ مارا تو ایک ٹارچ کے نیچے مجھے کوئی کاغذ محسوس ہوا تھا۔ میں نے اسے باہر کھینچا تو کھلنے پر یہ ایک چھوٹا سا نقشہ ثابت ہوا تھا جو پاکستان کے شمالی حصے کے بارے میں تھا۔ اس میں سڑکوں کی وضاحت کی ہوئی تھی۔ نقشے میں پین سے سڑک کی وضاحت بھی کی گئی تھی جو اس کیبن تک آتی تھی۔ میں نے وین ایک طرف روک دی اور کچھ دیر مغز ماری کرنے کے بعد نقشہ میری سمجھ میں آگیا۔

رات کا وقت تھا لیکن خوش قسمتی سے موسم صاف تھا آسمان پر بادل تھے لیکن تیز ہوا کی وجہ سے دھند کا نام و نشان نہیں تھا۔ سڑک پر برف تھی لیکن اب یہ جم کر سخت ہو گئی تھی جس پر وین کے خصوصی ٹائر بہت اچھی طرح گرپ کر رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے رفتار اتنی رکھی تھی کہ ٹائر سلپ کرنے کی صورت میں وین کو سنبھال لوں۔ مجھے جلدی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں خطرہ مول لے کر ڈرائیو کرتا۔ ایک مناسب جگہ رک کر میں نے سوائے ایک شارٹ گن اور دو عدد پستولوں اور ان کے فاضل ایمونیشن کے باقی سارا اسلحہ سڑک کے ساتھ ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ پستول میں نے جیکٹ میں رکھ لیے تھے جبکہ شارٹ گن اگلی نشست کے سامنے والے حصے میں اس طرح رکھی تھی کہ باہر سے کوئی دیکھے بھی تو اسے نظر نہ آئے۔ شروع کے ایک دو گھنٹے میں مجھے خطرہ لگا رہا تھا کہ کہیں دشمن سے سامنا نہ ہو جائے۔ کہیں وہ گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ یہ تو ان کو معلوم تھا کہ فرار کے لیے میں کون سا روٹ منتخب کروں گا۔

لیکن جب کہیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو میں کسی قدر پُراعتماد ہوگیا۔ یہ میری بہت ہی بڑی خوش قسمتی تھی کہ میں

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

بھارتی درندوں کی قید میں جانے سے پہلے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا' ورنہ ایک بار میں ان کی قید میں چلا جاتا تو میری گلوخلاصی بہت ہی مشکل ہو جاتی۔ اب مجھے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ میرے دشمنوں میں ایک خطرناک دشمن کا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ یوں زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس کے پاس ریاست کی طاقت تھی اور ریاستی دہشت گردی اور پڑوسی ممالک میں مداخلت کا وسیع تجربہ بھی تھا۔ اس ناکام کوشش نے بھارتیوں کو سخت مشتعل کر دیا ہوگا اور وہ پہلے سے زیادہ کوشش کرتے مجھے گرفتار کرنے یا اس دنیا سے رخصت کرنے کی۔

چار گھنٹے بعد میں ایک جگہ رک گیا۔ مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ وین کا کیبن اندر سے گرم تھا اور باہر کے موسم کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر وین روکی اور انجن چلتے رہنے دیا۔ کیبن میں کھانے کا سامان سمیٹنے کے دوران میرے ہاتھ ایک بڑے سائز کا تھرماس بھی لگا تھا اور میں نے اسٹیل کے ایک مگ سمیت اسے اُٹھالیا۔ کیتلی بھر کر کافی بنائی اور تھرماس میں بھر لی۔ بغیر شکر اور دودھ کی یہ کافی مجھے اس رات میں تازہ دم رکھتی۔ تھرماس اچھی کوالٹی کا تھا اور یہ کم سے کم دس بارہ گھنٹے تک کافی کو گرم رکھ سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کے آرام اور دو مگ کافی نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک بار پھر نقشے کا جائزہ لیا تو مجھے ایک چیز دکھائی دی۔ یہ راستہ اسی وادی کے پاس سے گزرتا تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے اور پھر خود بھی اسی وادی میں اپنی آخری سانسیں لی تھیں۔ اب اس کی بیٹی عذاب میں گرفتار تھی۔ فتح خان نے اسے بارودی جیکٹ پہنا دی تھی اور اس کے پاس شاید چالیس گھنٹے سے زیادہ کی مہلت باقی نہیں رہی تھی۔ نقشہ دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر میں راستے میں ایک دن اس وادی میں رک کر ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کروں تو شاید مجھے ہیرے مل جائیں۔ میرے پاس ہنٹ تو تھی۔ شمال میں سب سے بڑا تنا۔ یہی برٹ شا کے آخری الفاظ تھے۔ اگر ہیرے مل جاتے اور ایمن کی جان بچنے کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی تو میں یہ ہیرے فتح خان کے حوالے کر کے اسے بچا سکتا تھا۔

جیسے جیسے میں ڈرائیو کرتا ہوا وادی کے قریب ہوتا جا رہا تھا یہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ مجھے کل کے دن ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اس سے زیادہ وقت ایمن کے پاس نہیں تھا۔ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ برٹش حکومت اسے بچانے کے لیے فتح خان کو تاوان ادا کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ اس میں صرف بین الاقوامی جرائم کی پیچیدگیاں ہی ملوث نہیں ہوتیں بلکہ سیاسی معاملات بھی آسکتے تھے۔ جہاں تک میرے علم میں تھا کہ دنیا کے دوسرے خطوں کی نسبت اس خطے کے لیے مغربی حکومتوں کی پالیسی مختلف تھی۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں اگر مغربی ممالک کے باشندے اغوا ہوتے تھے تو ان کو رہا کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی اور اکثر اوقات اغوا کاروں کو منہ مانگا تاوان ادا کیا جاتا تھا۔

لیکن اس خطے میں مغربی طاقتیں براہِ راست جنگ میں ملوث تھیں اور اگر وہ یہاں اپنے مغویوں کو چھڑانے کے لیے تاوان کی ادائیگی کریں تو اس سے ان کا تاثر خراب ہوتا۔ ان مغربی حکومتوں کے ووٹرز ان سے سوال کر سکتے تھے کہ جب تاوان ہی دے کر اپنے آدمیوں کو چھڑانا ہے تو اس خطے میں جنگ پر اربوں ڈالرز کیوں خرچ کیے جا رہے ہیں؟ اس لیے وہ یہاں تاوان کی ادائیگی سے گریز کرتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے اپنے مغویوں کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ان کی یہ کوششیں ناکام رہتی ہیں۔ ایسے کئی واقعات میری نظروں سے گزرے ہیں جب اغوا کاروں نے مغربی سیاحوں (عام طور سے انہیں سیاح ہی ظاہر کیا جاتا ہے) کو اپنے مطالبات پورے نہ ہونے پر قتل کر دیا اور اکثر ان کے قتل کی ویڈیوز بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہوئی تھیں۔

اس لیے اگر ایمن کو بچانا تھا تو مجھے ہی کوشش کرنا تھی یا فتح خان کو رحم آ جاتا اور وہ اسے بخش دیتا۔ دوسری صورت بھی محال لگ رہی تھی اس لیے اب مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ صبح چار بجے میں وادی کے پاس پہنچ گیا تھا اور یہاں موسم اتنا سرد نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ایک تو بلندی زیادہ نہیں تھی دوسرے آس پاس بلند پہاڑ بھی نہیں تھے جبکہ چترال میں بلندی بہت زیادہ تھی اور اس کے آس پاس پہاڑ مزید بلند تھے۔ صبح کا وقت پاس ہونے کی وجہ سے وادی کی طرف جانے والے نالے میں پانی زیادہ نہیں تھا لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا اور درجہ حرارت بڑھتا یقیناً اس نالے میں خاصا پانی آ جاتا۔ فروری کا آخری ہفتہ ہونے کی وجہ سے اب موسم بدل رہا تھا۔ ابھی تاریکی تھی اور میں گاڑی نالے میں اُتارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا یہ بڑی وین تھی اور ذرا سا بیلنس خراب ہوتے ہی اُلٹ جاتی۔

اس لیے میں آرام کرنے کے ساتھ صبح کا انتظار کرنے لگا۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں دشمنوں کا خیال موجود تھا۔ وہ اگر اتفاق سے بھی آجاتے تو مجھے سوتے سے گرفتار کر کے بہت خوش ہوتے۔ میں نے اُبلے انڈوں اور ڈبل روٹی مکھن سے ناشتا کیا۔ کافی خلاف توقع تیزی سے ٹھنڈی ہوئی تھی اور اب برائے نام ہی گرم رہ گئی تھی بہرحال اس کی خون کی روانی تیز کرنے کی صلاحیت برقرار تھی۔ کافی نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ مجھے جاگتے ہوئے بیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر یہ پہلا موقع نہیں تھا جب میں دن رات دربدر پھرتا رہا اور سونے یا آرام کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

چھ بجے مشرقی اُفق سے روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ اگر آسمان پر ہلکے بادل نہ ہوتے تو روشنی ذرا پہلے ہو جاتی۔ میں نے گاڑی کو احتیاط سے نالے میں اُتارا۔ یہ طاقتور انجن اور فور وہیل ڈرائیو وین تھی اس لیے با آسانی نالے میں اُتر گئی۔ ابھی پانی کم تھا مگر بعد میں پانی زیادہ ہو جاتا تو وین اس میں ڈوب سکتی تھی یا پانی اس کے انجن میں گھس جاتا۔ تقریباً دو سو گز آگے جا کر جب مجھے خدشہ نہیں رہا کہ وین پُل سے نظر آ سکتی ہے تو میں نے اسے ایک طرف دیوار پر چڑھا دیا اور ہینڈ بریک لاک کر دیا۔

مجھے یاد تھا کہ اسی نالے میں ذرا آگے جا کر جہاں نالا ایک چھجے سے گر رہا تھا وہیں میں نے وہ جیپ کھڑی کی تھی جو فتح خان نے مجھے زبردستی دی تھی وادی تک سفر کے لیے۔ لیکن جب میں ایک گھنٹے بعد اس چھجے تک پہنچا تو وہاں کسی جیپ کا نام و نشان نہیں تھا۔ یقیناً فتح خان یا اس کے ساتھی اسے نکال لے گئے تھے اور عین ممکن ہے فتح خان اس پر فرار ہوا ہو۔ میں نے چابی چھپا دی تھی لیکن فتح خان جیسے آدمی کے لیے کسی گاڑی کو بغیر چابی کے کھولنا اور اسٹارٹ کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چھجے سے اب پانی کا اچھا خاصا آبشار گر رہا تھا۔ گرمی کے دنوں میں اس نالے میں اس طرح سفر کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ پانی سے لبالب بھر جاتا ہوگا۔ سردی کی وجہ سے یہ خالی تھا اور اس میں سفر کرنا بھی ممکن تھا۔

نالے میں نمی بڑھ گئی تھی اسی تناسب سے سردی بھی لگ رہی تھی لیکن یہ پھر بھی چترال کی سردی سے خاصی کم تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ دن میں یہاں درجہ حرارت صفر سے اوپر آجاتا ہوگا۔ کھانے کا سامان اور شارٹ گن ایک چھوٹے سے تھیلے میں تھے۔ اسے میں نے پشت پر لاد لیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد میں وادی میں داخل ہو رہا تھا۔ بادلوں کو چیرتے

....سورج کی روشنی نے زمین تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اس وجہ سے موسم خوشگوار لگنے لگا تھا۔ میں سیدھا وادی کے درمیان میں موجود پتھریلے علاقے کی طرف گیا۔ اس کا اوپری حصہ دھوپ کی زد میں آ گیا تھا میں سب سے اوپر والے پتھر پر چڑھا اور یہاں سے میں نے سورج کی پوزیشن دیکھ کر شمال کا اندازہ لگایا۔ شمالی ڈھلان وادی میں سب سے بڑی ڈھلان تھی اور اس پر تقریباً ایک کلومیٹر کے رقبے میں گھنا جنگل اُگا ہوا تھا۔

میرا دل ڈوب گیا اتنے بڑے جنگل میں ایک درخت تلاش کرنا جس کا تنا سب سے بڑا ہو بھوسے میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا کیونکہ سوئی پھر بھی دھات کی ہوتی ہے اور بھوسے کے تنکوں سے الگ ہوتی ہے۔ یہاں اس ڈھلان پر سارے ہی درخت باون گز کے تھے اور ان میں سب سے بڑے تنے کا فیصلہ کرنا ہی مشکل ترین کام تھا۔ کم سے کم ایک دن میں یہ کام ممکن نہیں تھا۔ بہرحال' مجھے کوشش تو کرنا تھی۔ میں نے کھانے کا سامان پتھروں کے درمیان رکھا۔ اس وقت مجھے خوش گوار حیرت ہوئی جب مجھے اس چھوٹے سے غار میں پُرانا سامان مل گیا جب میں برٹ شا کے ساتھ یہاں مقیم تھا اور اس میں سے اہم رسی تھی۔ میں نے رسی کا لچھا لیا اور اس کے سرے پر ایک لمبی کیل باندھ لی۔ کھنڈر کے باہر پانی کے تالاب تھے۔ زمین سے آنے والے اس پانی میں الکلی شامل ہو رہی تھی اس لیے تالاب کے آس پاس جمع پتھروں پر سفیدی چڑھ گئی تھی۔ میں نے ایسے ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کر کے جیکٹ کی جیبوں میں بھر لیے اور شمالی ڈھلان کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے شمالی ڈھلان پر دائیں طرف سے آغاز کیا۔ میں بڑے تنوں والے درخت تلاش کر رہا تھا اور دل ہی دل میں برٹ شا کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا جسے ہیرے چھپانے کے لیے یہی جگہ ملی تھی۔ ایک کلومیٹر کے رقبے میں کوئی ہزاروں درخت تھے اور ان میں سے ایک تہائی بڑے تنوں والے تھے۔ ان کے تنوں کا قطر کم سے کم بھی چھ فٹ تھا اور اونچائی سو فٹ یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس جنگل کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ ابھی اسے ٹمبر مافیا کی دیمک نہیں لگی تھی۔ آبادی سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں چرواہے بھی کم آتے ہوں گے۔ جنگل میں خود بہ خود ہواؤں یا طوفانوں سے گر جانے والے درخت یا ان کی سوکھی شاخیں تک ویسی ہی پڑی تھیں۔ مجھے جو سب سے بڑا تنا دکھائی دیا۔ میں نے اس پر

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کیل گاڑھ کر اور تنے کے گرد رتی گھما کر جتنا محیط بنا اتنا رتی پر نشان بنا دیا اور تنے پر الکلی زدہ پتھر سے بڑا سا ایک نمبر لکھ دیا۔

یہاں سے میں اوپر کی طرف بڑھا۔ مجھے جو تنا پہلے والے سے بڑا محسوس ہوتا میں اسے رتی سے ناپ کر دیکھ لیتا اور اگر وہ پہلے والے سے بڑا نکلتا تو میں اس پر سفیدی سے اگلا نمبر ڈال دیتا۔ ڈھلان کے اوپری حصے تک پہنچتے پہنچتے ایسے ایک درجن تنے مل گئے جن میں ہر ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ نمبر لکھنے کے ساتھ ساتھ میں جن درختوں کے پاس سے گزرتا تھا۔ ان پر سفید پتھر سے لکیر مار دیتا تھا اس طرح مجھے پتا چل جاتا کہ میں اس جگہ کو دیکھ چکا ہوں۔ اوپر پہنچنے میں مجھے ایک گھنٹا لگا اور اس دوران میں میں نے کوئی بیس گز کی چوڑائی میں درختوں کو دیکھا تھا۔ ایک کلومیٹر کی چوڑائی ایسے پچاس عدد بیس گز تھے اور اس لحاظ سے مجھے پورا جنگل چیک کرنے کے لیے پچاس گھنٹے درکار تھے اس کے بعد ہی میں فیصلہ کرسکتا تھا کہ سب سے بڑا تنا کس درخت کا ہے۔

میں پریشان ہوگیا۔ میرے پاس پچاس گھنٹے کا وقت نہیں تھا زیادہ سے زیادہ آج رات تک کا وقت تک تھا اور مجھے کل صبح تک لازمی واپس اسلام آباد پہنچنا تھا تاکہ فتح خان سے بات کرکے اس سے بارودی جیکٹ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے والا کوڈ لے سکوں اور وہ بھی اس صورت میں جب مجھے ہیرے مل جائیں اور فتح خان سے سودے بازی کر سکوں۔ اب میرے پاس روشنی کے صرف آٹھ نو گھنٹے تھے اس کے بعد یہاں تاریکی چھا جانی تھی اور میرے پاس صرف ایک ٹارچ تھی جس سے میں راستہ تلاش کرسکتا تھا ہیرے نہیں.... بہرحال پریشان ہونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے ہیں مسئلے کوشش سے حل ہوتے ہیں اس لیے میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

اوپر سے نیچے آتے ہوئے میں نے چکر جلد نمٹا لیا تھا۔ کیونکہ اُترنا زیادہ آسان تھا اس میں توانائی اور وقت دونوں کم لگے تھے۔ مگر صرف آنا نہیں تھا اسی طرح مجھے دوبارہ اوپر بھی جانا تھا۔ آنے والے تین گھنٹوں میں آنے اور جانے کے دو دو چکر مکمل کرچکا تھا اور اس دوران میں صرف سو گز کی پٹی میں اوپر سے نیچے تک درختوں کو دیکھا تھا۔ جیسے جیسے میں بڑے تنے تلاش کر رہا تھا ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب تک جو سب سے بڑا تنا نکلا تھا اس کا محیط کوئی چوبیس فٹ تھا یعنی یہ تقریباً سات ساڑھے سات فٹ قطر کا درخت تھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ یہ سب دیوار قسم کے سیدھے تنے والے درخت تھے اگر یہ صنوبر یا چنار جیسے درخت ہوتے جن کا تنا ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہے تو انہیں ناپنا ہی دشوار ہو جاتا۔ اس کے باوجود یہ کام ناممکن حد تک دشوار لگ رہا تھا۔ چار گھنٹے بعد میں تھک کر چور ہوگیا تھا اور یہ جسمانی سے زیادہ ذہنی تھکن تھی کیونکہ اب تک کامیابی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔

اب جو بھی سب سے بڑا تنا ملتا تھا میں اس کا بہ غور معائنہ کرتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ برٹ شا نے تنے میں ہی ہیروں کا باکس چھپایا ہوگا۔ زمین میں چھپانا بے کار تھا کیونکہ اتنے عرصے میں زمین میں بہت تبدیلی آجاتی ہے اور خاص طور سے پہاڑوں میں یہ تبدیلی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈھلانوں کی مٹی ہمیشہ کھسکتی رہتی ہے۔ پھر درختوں کی جڑیں زمین میں پھیل کر اس کی شکل ہی بدل دیتی ہیں۔ اس لیے برٹ شا نے زمین میں ہیرے نہیں چھپائے ہوں گے اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو یہاں کی تقریباً پتھر جیسی سخت زمین کھود کر کچھ چھپا سکتا۔ اس کے لیے سب سے بہترین جگہ درخت کے تنے میں ہونے والے قدرتی سوراخ ہوتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں یا پرندوں کے بنائے یہ سوراخ ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ان میں اگر کوئی چیز چھپائی جائی تو وہ اس وقت تک محفوظ رہتی ہے جب تک یہ درخت محفوظ ہوتا ہے۔ کوئی زمینی یا موسمی تبدیلی چھپائی ہوئی چیز کو متاثر نہیں کر سکتی ہے۔

اسی لیے میری توجہ کا مرکز تنے تھے اور ان کا اتنا اوپری حصہ تھا جہاں ایک آدمی کی رسائی آسانی سے ہو سکے۔ دو بجے میں کھنڈر کی طرف آیا اور ڈبل روٹی پنیر اور مکھن سے لنچ کیا۔ میرے پاس سفید پتھر ختم ہوگئے تھے میں نے وہ جمع کیے اور دوبارہ مشن امپوسیبل میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اوپر نیچے اتنا سفر کیا کہ زندگی میں کبھی ایک دن میں اتنا سفر پیدل نہیں کیا ہوگا۔ اس کے باوجود شام ہونے تک میں نے بہ مشکل ایک تہائی جنگل دیکھا ہوگا۔ ابھی دو تہائی حصہ باقی تھا کہ شام ہوگئی اور تاریکی میں کام ناممکن تھا۔ میں نیچے آتے ہوئے تھک ہار کر ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ تھکن سے زیادہ مایوسی نے میرے ذہن اور جسم پر قبضہ کرلیا تھا۔ ایمن کے لیے میری کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے پاس کل دوپہر دو بجے تک کا وقت تھا اس کے بعد بارودی جیکٹ خود یہ خود پھٹ جاتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس پر کیا گزر رہی تھی اور اسے بچانے کے لیے کیا کیا جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے رابطہ کرنے

کی کوشش کی ہوگی اور مجھ سے رابطہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ اس کا سیل چھین لیا گیا تھا لیکن اس کے پاس عبداللہ کی کوٹھی کا فون نمبر تھا۔

شام ہوتے ہی سردی کی شدت میں یک لخت اضافہ ہوا تھا اور رات بغیر آگ کے اس کھلی جگہ گزارنا ناممکن تھا۔ مجھے خیال آیا کہ نیچے جاتے ہوئے لکڑی جمع کرتا جاؤں۔ میں اُٹھا تھا کہ درخت کے تنے کے ساتھ زمین پر جہاں پاؤں رکھا تھا اچانک میرا پاؤں زمین میں دھنس گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ یہاں زمین میں کوئی سوراخ تھا۔ اس پر پتے اور مٹی اس طرح جمع ہوگئے تھے کہ اس کا منہ بند ہوگیا تھا۔ میرے پاؤں کا دباؤ آیا تو یہ تہ ٹوٹ گئی۔ شکر ہے سوراخ بڑا نہیں تھا ورنہ میرا پورا پاؤں ہی چلا جاتا اور شاید ٹوٹ بھی جاتا۔ اس کے بعد میں بے یار و مددگار یہاں پڑا رہ جاتا اور کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ میں کہاں تھا؟

میں نے سنبھل کر ٹارچ کی روشنی میں سوراخ دیکھا۔ یہ دو جڑوں کے درمیان والی جگہ میں قدرتی طور پر بن جانے والا سوراخ تھا۔ یہاں جڑیں پھیلنے کے لیے الگ ہوئیں تو ان کے درمیان میں خلا آگیا۔ یہ خلا خاصا اندر تک چلا گیا تھا۔ میں نے درخت کا معائنہ کیا اور اس کا تنا خاصا بڑا پایا۔ مجھے لگا میں نے اب تک جو درخت دیکھے تھے ان میں سب سے بڑا تنا اسی کا تھا۔ میں نے رتی اُٹھائی اور تنا ناپ کر دیکھا۔ یہ واقعی سب سے بڑا تنا تھا۔ جو آخری بڑا تنا دیکھا تھا محیط میں یہ اس سے بھی کوئی ایک فٹ بھر بڑا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال سرسرانے لگا۔ کہیں برٹ شا نے یہیں تو ہیرے نہیں چھپائے تھے۔ میں نے آس پاس کوئی لکڑی تلاش کی جو اس سوراخ میں جا سکے مگر وہاں کہیں ایسی لکڑی نہیں تھی۔ البتہ درخت پر کوئی سات آٹھ فٹ کی اونچائی پر ایک چھوٹی اور لمبی شاخ نکلی ہوئی تھی۔ اس تک رسائی کے لیے میں تنے پر ہاتھ جماتے ہوئے اوپر چڑھا تھا۔ میں ٹٹولتا ہوا اوپر چڑھا ایک جگہ میرا ہاتھ جم گیا اور میرا دوسرا ہاتھ جو شاخ کی طرف بڑھ رہا تھا اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔

مجھے لگا جیسے دور کہیں کوئی چھینکا ہو۔ سچ مچ کوئی چھینکا تھا یا یہ میرا وہم تھا۔ میں نے شاخ توڑی اور نیچے اُتر آیا۔ سوراخ میں جہاں تک ممکن ہوا میں نے شاخ گھسا کر دیکھ لی۔ مگر اس خلا میں کچھ نہیں تھا۔ میں کھڑا ہوگیا اور ڈھلان سے نیچے اُترنے لگا۔ میں نے لکڑیاں جمع کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا اور جب ڈھلان کے نچلے حصے میں پہنچا تو دوبارہ ویسی ہی چھینک جیسی آواز سنائی دی۔ اس بار یہ آواز واضح آئی تھی اور میں نے پستول نکالتے ہوئے ٹارچ بجھا دی۔ یہاں میرے علاوہ بھی کوئی تھا اور اگر کوئی تھا تو وہ یقیناً چھپ کر میری نگرانی کر رہا تھا لیکن کسی کو کیا معلوم کہ میں یہاں وادی میں تھا۔

میں آگے جانے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ وادی میں کھلی جگہ دیکھ لیے جانے کے زیادہ امکان تھے بہ نسبت تاریک جنگل کے۔ میں دبے قدموں حرکت کر رہا تھا کیونکہ اب آواز سے ہی پتا چل سکتا تھا کہ میں کہاں تھا؟ اگر میں خاموش رہتا اور یہاں کوئی میری نگرانی کر رہا تھا تو اس کے لیے پتا چلانا ناممکن تھا کہ کہاں ہوں؟ میں درمیانی ڈھلان تک آیا اور پھر اس نالے کی طرف جانے لگا جو اس وادی سے باہر لے جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اس نالے میں تھا۔ یہاں سفر کرنا مزید مشکل ثابت ہوا ایک تو تاریکی مکمل ہوچکی تھی اور دوسرے نالے میں پتھروں کا ڈھیر تھا جن پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ کچھ دیر سفر کے بعد جب میں تیسری بار گرا تو میں نے ٹارچ روشن کرلی۔ موٹے کپڑوں کی وجہ سے مجھے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن تیسری بار گرنے سے پتلون گھٹنے سے پھٹ گئی تھی اور پانی میں جانے سے اس کا پائنچہ بھی گیلا ہوگیا تھا۔

مجبوراً میں نے ٹارچ روشن کرلی۔ ویسے اس محدود نالے میں کوئی آسانی سے نظروں میں آئے بغیر میرا تعاقب نہیں کرسکتا تھا۔ چلتے چلتے میں اچانک پلٹ کر پیچھے ٹارچ کی روشنی ڈال لیتا تھا۔ اگر کوئی دبے قدموں تعاقب کر رہا تھا تو میری نظر میں آجاتا لیکن اب تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ میرا وہم نہیں تھا۔ پہاڑوں میں نامانوس قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ بہرحال اب میں وادی سے نکل آیا تھا اور نالے میں سفر کر رہا تھا رات ہوتے ہی اس میں پانی کی مقدار خاصی کم ہوگئی تھی کیونکہ سردی کی وجہ سے اوپر پانی جم گیا ہوگا اور نالے میں کم آرہا تھا۔ بھیگے پتھروں اور ریت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دن میں یہاں خاصا پانی بہتا رہا تھا۔

ٹارچ ایک ہی تھی اور اس میں اضافی سیل بھی نہیں تھے۔ یہ سیل مسلسل استعمال سے کمزور پڑ رہے تھے اور میری کوشش تھی کہ ٹارچ کی روشنی ختم ہونے سے پہلے میں وین تک پہنچ جاؤں۔ اس لیے میں تیز چل رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ٹارچ کی روشنی برائے نام رہ گئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ مکمل طور پر ختم ہوتی اچانک ہی آسمان صاف ہوگیا اور چاند نکل آیا۔ یہ نویں یا دسویں کا چاند تھا اس لیے اس کی روشنی اچھی خاصی

www.paksociety.com

تھی۔شمال کی طرف سے تیز... سرد ہوا چلنے لگی تھی اور شاید بادل بھی اسی وجہ سے چھٹے تھے۔ میں نے مرحوم ویراما کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا جس کے گرم کپڑوں نے مجھے اب تک سردی سے محفوظ رکھا تھا۔ جواب میں، میں نے اس کے لیے شاندار قسم کی چتا مہیا کردی تھی۔ پھر بھی میں اس کا شکر گزار تھا۔

مزید کچھ دیر سفر کے بعد میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں میں نے وین کھڑی کی تھی اور مجھے کچھ دیر کے لیے شبہ ہوا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہو رہا ہے یا میں کسی غلط جگہ وین تلاش کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہاں وین نہیں تھی۔ مگر ذرا سی تحقیق نے واضح کر دیا کہ نہ تو میری آنکھیں دھوکا دے رہی تھیں اور نہ میں غلط جگہ آیا تھا ریت پر وین کے ٹائروں کے نشانات واضح تھے۔ کوئی اسے دوبارہ سڑک کی طرف لے گیا تھا اور اس کام کو زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اگر یہ کام صبح یا دن میں ہوا ہوتا تو ریت پر ٹائروں کے نشانات نہ ملتے پانی انہیں برابر کر دیتا۔ وین شاید آدھے گھنٹے پہلے یہاں سے ہٹائی گئی تھی۔ وین کو غائب پاتے ہی وہ تمام خدشات جنہیں میں اب تک اپنا وہم قرار دیتا آیا تھا یک دم قہقہے لگاتے اور حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے آگئے تھے۔

میں شروع سے زیرِ نگرانی تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے گئے تھے کہ میں وادی کی طرف آؤں اور ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ میں نالے کی طرف پلٹا تھا کہ پُل کی جانب سے ایک فائر ہوا اور گولی آ کر میرے پیروں کے پاس لگی۔ پھر وہ منحوس آواز سنائی دی جسے سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔

''شہباز خانا ہلنا مت.... ہاتھ اوپر کرلو.... تم میرے کو نہیں دیکھ رہا ہے پر میں تیرے کو دیکھ رہا ہے۔''

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے اور بلند آواز سے بولا۔ ''فتح خان مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ میرے پیچھے تم ہو۔''

''تم کو کب شک ہوا؟'' اس نے عیاری سے پوچھا۔

''جب میں نے کسی کے چھینکنے کی آوازیں سنیں۔''

''وہ بد بخت میرا آدمی تھا غلطی سے نسوار لگا لی۔ اب زندگی بھر نسوار نہیں کھائے گا۔''

''اتنا ظلم۔'' میں نے افسوس سے کہا۔

''تم اس کا نہیں اپنا فکر کرو۔'' اس نے للکار کر کہا۔ ''تم نے اب تک ہاتھ اوپر نہیں کیا۔''

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ''اور کوئی حکم....؟''

فوراً ہی پُل کی طرف سے دو سائے نمودار ہوئے انہوں نے مجھے گھیر کر میری تلاشی لی اور سارا اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے مجھے دھکا دیا۔ ''چلو خدائی خوار.....''

''دھکے تو نہ دو۔'' میں نے چلتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں مجھے پُل کے اوپر لائے جہاں وہ وین موجود تھی جسے میں نالے میں چھوڑ کر گیا تھا اور وین کے پاس فتح خان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے وین کا عقبی دروازہ کھولا۔ ''ابھی تم ادھر تشریف رکھو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔''

''فتح خان میرے صرف ایک سوال کا جواب دو۔ کیا تم لوگ شروع سے میرے پیچھے تھے؟''

''اس سوال اور دوسرا تمام سوال کا جواب تم کو ملے گا لیکن یہاں نہیں ابھی اندر بیٹھو۔''

فتح خان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ میری بات کا جواب نہیں دے گا۔ وہ خوش تھا کہ ایک بار پھر مجھ پر حاوی آگیا۔ مجبوراً میں دوبارہ اس ڈربے میں داخل ہوا اور پیچھے سے دروازہ بند ہو گیا۔ فتح خان نے میرے اندازے کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک منٹ بعد وین ہلکے سے دھچکے کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ اس ساؤنڈ پروف باکس میں باہر کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اور اندر کا درجہ حرارت بھی وین کے چلنے کے ایک منٹ بعد نارمل ہو گیا تھا۔ یہاں ہیٹنگ کا سسٹم موجود تھا۔ اسے کہتے ہیں کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے۔ میں نے اتنی کوشش کی سرحد پار کرنے کے بعد واپس بھی آگیا لیکن ہوا کیا دوبارہ چوہے کی طرح پکڑ لیا گیا۔

وین کا سفر زیادہ دیر جاری نہیں رہا تھا جبکہ میرا خیال تھا میں دوبارہ کیبن کی طرف جا رہا تھا جہاں ایک بار پھر بھارتیوں کو مدعو کیا جائے گا کہ آئیں اور اپنی امانت لے جائیں۔ وہ ایک بار پہلے بھی لے جا چکے تھے مگر میں بھاگ آیا تھا۔ اب دوبارہ ان کے حوالے کیا جانے والا تھا مگر وین تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد رکی اور عقبی خانہ کھلا۔ فتح خان اور اس کے دونوں آدمی چوکس تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار یوں مجھ پر تان لیے تھے جیسے انہیں خدشہ ہو ابھی میں کسی فلمی ہیرو کی طرح حرکت میں آجاؤں گا اور ان کی ایسی کم تیسی کر دوں گا۔ حالانکہ میں نے کبھی فلمی ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ میں جانتا تھا ایسا وہ سب صرف فلم کے سیٹ

www.paksociety.com

پر ہی ممکن ہے۔ عام زندگی میں اس قسم کی کوئی کوشش عرفِ عام میں خودکشی کہلاتی ہے۔

وین ایک چھوٹی سی کوٹھی میں کھڑی تھی۔ تاریکی میں آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میرا خیال تھا یہ جگہ ویرانے میں ہے اور یہاں باقاعدہ آبادی نہیں ہے۔ سردی کی شدت وہی تھی۔ گرم کپڑوں میں ہونے کے باوجود میں ایک لمحے کو کانپ کر رہ گیا تھا۔ کوٹھی کے سامنے چھوٹا سا لان اور ڈرائیو وے تھا جس میں وین کھڑی تھی۔ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی کم سے کم سامنے سے ایسا ہی لگ رہا تھا دو منزلہ تھی لیکن کورڈ ایریا شاید چار مرلے سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ فتح خان کا کوئی ٹھکانا تھا۔ ابھی میں معائنہ ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے ایک مقامی شخص نمودار ہوا۔ فتح خان غرا بولا۔

''کدھر مر گیا تھا دروازہ کھول کر.....''

''گیٹ جام ہو رہا ہے خان جی۔'' اس نے پشتو میں کہا۔ ''بند نہیں ہو رہا تھا۔''

''ابھی ہوشیار رہنا سو مت جانا۔'' فتح خان اندر جاتے ہوئے بولا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھے اپنی رائفل سے ٹہوکا دیا کہ میں بھی فتح خان کی پیروی کروں۔ کوٹھی اندر سے بھی بہت شاندار ثابت ہوئی تھی۔ سامنے نشست گاہ تھی جس میں اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا خوب صورت صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ اگر یہ باہر کسی ملک میں ہوتا تو اس کا شمار نوادرات میں ہوتا۔ فرش پر بے حد دبیز قالین تھا۔ لیکن سب سے اچھی چیز آتش دان میں جلتی آگ تھی جس نے اندر کا ماحول خوشگوار کر دیا تھا۔ میں فتح خان یا اس کے آدمیوں کی اجازت کے بغیر ہی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میرے پیچھے موجود شخص غرایا۔

''کیا کرتا ہے کھڑا ہو جا۔''

''جابر بکواس بند کر اور جا کر کچھ پینے کو لا۔'' فتح خان نے اسے گھرکا اور میری طرف دیکھا۔ ''تم کیا پیو گے؟''

''دل تو تمہارا خون پینے کو چاہ رہا ہے لیکن ایک تو وہ حرام ہے اور دوسرے تم پینے نہیں دو گے اس لیے فی الحال چائے کافی میں سے جو مل جائے چلے گا۔''

فتح خان نے جابر کو چائے لانے کے حکم کے ساتھ دفع ہو جانے کو کہا اور وہ دم دبا کر چلا گیا۔ البتہ دوسرا چوکس انداز میں نشست گاہ کے ایک کونے میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میں پوری طرح اس کی زد میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے قابو کر لینے کے باوجود فتح خان کچھ متفکر تھا۔ اگر میرے کچھ اندازے درست تھے تو اسے اس سے زیادہ ہی پریشان ہونا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

وزن: مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن

بحر: ہزج مثمن سالم

غالب نے اس وزن میں بہت کم شعر کہے ہیں۔ اس وزن میں ان کی مشہور ترین غزل ''فغاں کیوں ہو، زباں کیوں ہو'' ہے۔ یہ شعر لفاظی پر مبنی ہے جس میں چند در چند رعایات لفظی و معنوی نے نئی شان پیدا کر دی ہے۔ طباطبائیؔ نے ''اسد'' اور ''آہو'' کی لطیف رعایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''سر پنجہ، مژگاں، جنوں جولاں، پشت خار، گدا، بے سر و پا وغیرہ رعایتیں بھی قابلِ لحاظ ہیں لیکن ''بے سر و پا'' اور ''سر پنجہ'' میں ایک دُہری رعایت بھی ہے اور اس شعر میں غالب کا محبوب فن، قولِ محال (Paradox) بھی اپنی پوری کیفیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ شعر کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ میں وہ گدائے بے سر و ماں ہوں کہ میرے پاس پشت خار بھی نہیں ہے اور وحشت کا یہ عالم ہے کہ آہو سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔ لہٰذا آہو کی مژگاں کا سر پنجہ میرے لیے پشت خار کا کام کرتا ہے۔ اس بے کیف مضمون میں قولِ محال یوں پیدا ہو گیا ہے کہ ایک طرف اپنی جنوں جولانی میں یہ تیزی دکھائی ہے کہ آہو سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور دوسری طرف بے سامانی کا یہ رنگ ہے کہ ''سر و پا'' بھی نہیں رکھتے۔ قولِ محال یہ ہے کہ سر اور پاؤں نہ ہونے کے باوجود گرمی رفتار اس قدر ہے کہ باید و شاید۔ ظاہر ہے کہ سر و پا نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وجود ہی باقی نہیں ہے اور جب وجود ہی نہیں تو رفتار بھی نہیں۔ پھر میں بے سر و پا ہوں لیکن مژگاں آہو کا سر پنجہ میرے کام آتا ہے۔ لفظ ''پنجہ'' ہی کافی تھا ''سر پنجہ'' کہہ کر بے سر و پائی کو ایک انوکھا لطف بخش دیا ہے کہ اپنا سر نہ سہی، لیکن مژگاں آہو کا ''سر پنجہ'' تو موجود ہے۔ اسی ''سر'' پنجہ کی مناسبت سے ''پشت'' خمار کا لفظ بھی قابلِ لحاظ ہے۔

اقتباس: تفہیم غالب از شمس الرحمٰن فاروقی

چاہیے تھا جتنا کہ وہ نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’حیرت ہے تم مجھے یہاں لے آئے جبکہ میرا خیال تھا مجھے دوبارہ بھارتیوں کے حوالے کردیا جائے گا۔‘‘

فتح خان نے ایک گندی سی گالی دی۔ ’’میں ان کے باپ کا نوکر نہیں ہے ایک بار ان کا کام کردیا اب ہمیشہ کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے۔‘‘

’’یہ تو تم کہہ رہے ہو لیکن تم نے اللہ واسطے کام تو کیا نہیں ہوگا اور جو پیسے دیتے ہیں وہ آدمی کو اپنے باپ کا غلام ہی سمجھ لیتے ہیں۔‘‘

فتح خان نے دوسری گالی زیادہ وزنی دی تھی۔ ’’.....غلام سمجھنے والوں کی میں ان کو بھی دیکھ لے گا۔‘‘

کچھ دیر میں جابر فتح خان کے لیے جام وسبو اور میرے لیے چائے بنا کر لے آیا تھا۔ یہ بس نام کی چائے تھی کیونکہ اس میں دودھ، چینی اور پتی تینوں وافر مقدار میں ڈالی گئی تھیں۔ اس کی واحد خوبی اس کی گرمی تھی اس لیے میں نے پینا شروع کردی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ فتح خان مجھے یہاں کسی قسم کی گفتگو یا ڈیل کے لیے لایا تھا تبھی میں اس کے ساتھ یہاں بیٹھا تھا ورنہ کسی کوٹھری میں قید پڑا ہوتا۔ فتح خان نے اپنے لیے جام بنایا اور اس سے شغل کرتے ہوئے کچھ غور وفکر فرمانے لگا۔ ایک طرف لگی دیوار گیر کلاک رات کے نو بجا رہی تھی۔ میرا زادراہ وادی میں رہ گیا تھا اور اگر ساتھ ہوتا تب بھی مجھے کھانے پینے کی اجازت کہاں ملتی۔ کھایا پیا کب کا ہضم ہوگیا تھا اور اب بھوک سے پیٹ کے چوہے بھی کچھ نڈھال سے تھے۔

’’شہباز خان تم جانتا ہے ایمن کے پاس صرف سولہ گھنٹے کا ٹیم رہ گیا ہے۔‘‘

میں نے سر ہلایا۔ ’’اسی لیے میں نے سوچا کہ ایک کوشش کرکے دیکھ لوں۔ ممکن ہے مجھے ہیرے مل جائیں۔‘‘

’’میں بھی یہی سمجھ رہا ہے پر تم کو کیسے پتا کہ ہیرا ادھر ہی چھپا ہے۔‘‘

’’مجھے پتا نہیں ہے لیکن تمہیں یاد ہوگا کہ برٹ شا تمہاری نیت خراب ہونے سے پہلے اسی ڈھلان کی طرف گیا تھا۔ اس لیے میں نے وادی میں اسی جگہ کا انتخاب کیا۔‘‘

’’پر تم ناکام رہا۔‘‘ فتح خان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

’’ہاں۔‘‘ میں نے گہری سانس لی۔ ’’فتح خان میں ناکام رہا لیکن مجھے حیرت ہے تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس وقت وادی میں ہوں۔‘‘

’’میرا چھٹی حس نے بتایا۔‘‘ وہ بولا۔ ’’مجھے کرنل زریسکی نے بتا دیا تھا کہ تم بھاگ آیا ہے اور میں اسی وقت روانہ ہوگیا تھا پر تم راستے میں نہیں ملا تو مجھے وادی کا خیال آیا۔‘‘

وہ جھوٹ بول رہا تھا کرنل خود لاعلم تھا کہ میں بھارتیوں کی قید سے بھاگ آیا ہوں یا وہ ظاہر ایسا ہی کررہا تھا۔ اس لیے کرنل اسے مطلع نہیں کرسکتا تھا۔ میرے وہاں سے نکلنے کے بعد کم سے کم دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے کرنل کو ہوش نہیں آیا ہوگا۔ ریڈیو میں نے تباہ کردیا تھا اس لیے وہ فتح خان کو فوری مطلع نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ بعد میں کسی طریقے سے مطلع کرنے میں کامیاب بھی رہا تھا تب بھی فتح خان اتنی تیزی سے میرے پیچھے نہیں آسکتا تھا اور نہ ہی وہ اتنی جلدی وادی تک پہنچ سکتا تھا۔ اتنی صفائی سے پیچھا کرنا اور پھر اتنی منصوبہ بندی سے مجھے پکڑ لانا ظاہر کرتا تھا کہ وہ شروع سے میرے پیچھے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنا بھی ایک ڈھونگ تھا اور فتح خان جانتا تھا کہ میں واپس بھاگ آؤں گا۔

’’فتح خان مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنے کا کیا مقصد تھا کیا انہوں نے تمہارے آگے رقم ڈال دی تھی؟‘‘

فتح خان کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ’’میں ان کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔ میرا مجبوری دوسرا تھا۔‘‘

’’ڈیوڈ شا..... اس نے اس کام کے لیے کہا تھا اور تم اسے انکار نہیں کرسکتے تھے۔‘‘

اس نے مجبور انداز میں سر ہلایا۔ ’’تم جانتا ہے میں ڈیوڈ شا کو انکار نہیں کرسکتا ہوں۔‘‘

’’لیکن یہ طے ہے کہ تم لوگوں نے بھارتیوں سے اس کام کا اچھا خاصا معاوضہ وصول کرلیا ہے۔ میں نے خود کرنل کے پاس دو لاکھ ڈالرز کی رقم دیکھی ہے۔‘‘

’’تم نے وہ رقم قبضے میں نہیں کی.....؟‘‘ فتح خان کے لہجے میں سوال سے زیادہ حیرت تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

’’تمہیں اب تک جان جانا چاہیے کہ دولت کبھی میری منزل نہیں رہی۔ تم مٹھی بھر ہیروں کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو اس کے لیے اتنی لمبی جدوجہد کی۔ انڈیا میں مجھے اس سے کہیں زیادہ ہیرے حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں تو ہیروں کی وادی سے ہوکر آیا تھا۔ وہاں صدیوں سے جمع ہونے والے قیمتی ترین ہیرے موجود تھے۔‘‘

فتح خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ’’شہباز خان، تم مجھے بے وقوف بناتا ہے۔‘‘

’’خدا نے تمہیں جو بنایا ہے بس اسی نے بنایا ہے میری کیا مجال کہ اس کی تخلیق میں ترمیم کا بھی سوچوں۔‘‘

’’وہاں سچ مچ بہت سارے ہیرے تھے؟‘‘

’’ہاں، شاید اربوں ڈالرز مالیت کے ہوں گے لیکن خدا کے لیے اب وہاں جانے اور ہیرے حاصل کرنے کے بارے میں مت سوچنے لگنا۔ ان منحوس ہیروں کی خاطر انڈین حکومت نے اپنے سینکڑوں شہری مار دیئے اور ہیرے اب اس کے قبضے میں ہیں۔‘‘

فتح خان نے گہری سانس لی۔ ’’شہباز خان، مجھے یہی ہیرے مل جائیں میرے لیے یہی کافی ہے۔‘‘

’’ایمن کی خاطر میں نے کوشش کی تھی لیکن افسوس میں بھی ناکام رہا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’فتح خان اس لڑکی کو چھوڑ دو۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘

’’ایسا نہیں ہوسکتا......‘‘ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’میں نے قسم کھایا تھا کہ اگر مجھے ہیرا نہیں ملا تو میں اس لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

’’تم نے قسم کھائی تھی یا تمہیں تمہارے گرو ڈیوڈ شا نے حکم دیا کہ ایمن کو زندہ نہیں رہنا چاہیے؟‘‘

’’تم جو چاہے سمجھے پر اگر ایمن کو بچانا ہے تو میرے کو رقم یا ہیرے میں سے ایک چیز چاہیے۔‘‘

’’تب میں یا کوئی بھی ایمن کے لیے کچھ نہیں کرسکتا‘‘۔ ...... میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ’’میرا خیال ہے تم بھی اس حقیقت کو تسلیم کرچکے ہو اس لیے یہاں بیٹھے ہو۔‘‘

وہ چونکا۔ ’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ تم یہاں بیٹھے ہو اگر تمہیں ہیرے مل جائیں یا برٹش حکومت تمہیں تاوان ادا کردے تو تم اتنی جلدی اسلام آباد پہنچ کر کیسے جیکٹ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے والا کوڈ بتاؤ گے۔‘‘

’’تم فکر نہ کرو اس کام کے لیے میرا ایک آدمی اسلام آباد میں موجود ہے میری سفارت خانے والوں سے بات ہوگئی ہے اور ان کا ایک نمبر مستقل میرے آدمی کے لیے خالی رہے گا۔ وہ آخری ایک منٹ میں بھی کال کرکے جیکٹ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرا سکتا ہے۔‘‘

میں نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ’’فتح خان تم سچ مچ ہوشیار ہوتے جارہے ہو آگے پیچھے ہر چیز کا خیال رکھتے ہو۔‘‘

دنیا کے ابتدائی لوک گیتوں، دردِ محبت سے لبریز کی تاریخ اتنی سہل نہیں کہ آسانی سے قلم اُٹھالیا جائے۔ فنِ تحریر کی تشکیل سے بہت پہلے یہ عالم وجود میں آچکے تھے۔ ہزارہا سال تک یہ لوک گیت زبانی یادداشت کے طریقے سے ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہے، اَن گنت گیت آہستہ آہستہ معدوم ہوتے گئے اور تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں جب سمیریوں نے پہلی بار رسم الخط ایجاد کیا تو ساری دنیا میں ایک انقلاب سا آگیا۔ رفتہ رفتہ مختلف ممالک نے اس فن سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے اپنے رسم الخط ایجاد کیے۔ رسم الخط کی ایجاد کے بعد زبان وبیان کے فن پر مسلسل زور دیا جانے لگا اور قدیم روایات وحکایات کو قلم بند کیا جانے لگا۔ موجودہ صدی میں دنیا کی لوک رچناؤں کا حلقہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اس موضوع پر کچھ لکھنا، طویل و وسیع مطالعہ طلب کرتا ہے۔

تین ہزار قبل مسیح کے بعد جب اہلِ سمیریہ اور اہلِ مصر نے ان قدیم گیتوں کو حرف بند کرنا شروع کیا تو ان گیتوں کا بیشتر حصہ معدوم ہوچکا تھا۔ باقی رہے سہے گیتوں اور پچھلی روایتوں کو حرف بند کرنے میں ان دو قوموں نے بڑی جاں فشانی سے کام لیا۔ ابتدا میں نقل کیے گئے سمیری زبان کے باقی ماندہ گیت کسی حد تک طویل حکایتی نظموں پر مشتمل ہیں۔ یہ نظمیں بڑی تعداد میں علم دینیات وعلم کائنات سے متعلق ہیں اور ان میں ایک حصہ حمد ومناجات کا ہے جو دیویوں اور دیوتاؤں کے تصور کو ظاہر کرتے ہیں۔ اہلِ مصر کے ابتدائی لوک گیت تیس سو پچاس قبل مسیح میں پیپی اوّل کے سپاہیوں کی زبانی گائے گئے مگر سچ تو یہ ہے کہ ان دو قوموں کے عروج سے بہت پہلے گیت وجود میں آچکے تھے اور وہ گیت اس لیے محفوظ نہ رہ سکے کہ انسانوں کے پاس نقل کرلینے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ہمیں بھی ان معدوم گیتوں سے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں حاصل ہوسکتیں مگر کسی حد تک ہم ان کے اشکال کو ضرور محسوس کرسکتے ہیں بشرطیکہ ہم فنِ تحریر، سماج، فطرت اور مادی ضرورت کے پس منظر کا صحیح خاکہ تشکیل دے سکیں۔ اور اس کے لیے ہمیں لوک گیتوں میں پوشیدہ علم دینیات اور علم کائنات اور مظاہر فطرت کو کریدنا، داخلی اور خارجی نظام کی گتھیوں کو سلجھانا ہوگا۔

مرسلہ: فیاض اختر، راولپنڈی

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ مسکرانے لگا۔ ”شہباز خان، اب تو تم بھی مجھے ماننے لگا ہے۔“

”یہ سچ ہے گزشتہ کچھ عرصے سے تم مجھے چکرانے والی چالیں چل رہے ہو۔ لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں تمہاری ہر چال کے پیچھے ایک ہی مقصد ہوتا ہے کسی طرح میرے توسط سے ہیرے حاصل کرنا۔“

فتح خان کی مسکراہٹ کافور ہو گئی تھی۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں سو فیصد نہیں جانتا یہ دعویٰ تو تم خود بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے عزائم کے بارے میں سو فیصد جانتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس بار تم نے جو چال چلی وہ میں کسی حد تک سمجھ گیا ہوں۔“

”کیا سمجھ گئے ہو؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”فتح خان تم ایک بگ گیم کا ایک چھوٹا حصہ ہو۔ یہ بگ گیم کون کھیل رہا ہے تم اس سے ناواقف نہیں ہو کیونکہ تم اس کا ایک حصہ ہو۔ بے شک چھوٹا سہی۔ اس کھیل کا اصل کھلاڑی ڈیوڈ شا ہے اور تم اس کے مقصد سے بھی واقف ہو لیکن اس کے ساتھ ہی تم اپنا کھیل بھی کھیل رہے ہو جس سے ڈیوڈ شا واقف ہے یا شاید ناواقف ہے۔ بہر حال، وہ تم پر ظاہر نہیں کر رہا ہے۔“

فتح خان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میری بات اسے کہیں نہ کہیں لگی ہے پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”تم کیا جانتے ہو؟“

”فتح خان کہانی وہاں سے شروع کرتے ہیں جب تم نے برٹ شا کی موت کے بعد اپنے دوسرے پلان پر عمل درآمد شروع کیا اور ایمن کو جیکٹ پہنا دی۔ یہ تمہارا اپنا کھیل تھا لیکن برٹش سفارت خانے تک جانے کے بعد یہ صرف تمہارا کھیل نہیں رہا بلکہ اس میں ڈیوڈ شا بھی شامل ہو گیا۔ ڈیوڈ شا کی سب سے بڑی خواہش یہی ہو سکتی ہے کہ ایمن نہ رہے تاکہ اس کی جاگیر اور خطاب کو کوئی خطرہ بھی نہ رہے۔ دوسری طرف اسے تمہارا خیال بھی ہو گا وہ کھل کر تمہاری مخالفت نہیں کر سکتا ہو گا کیونکہ اس سرزمین پر تم اس کے سب سے زیادہ قابل مہرے ہو۔ لہٰذا اس نے تمہیں چکر دینے کے لیے ایک اور چکر چلایا اور اس نے تم سے کہا کہ شہباز ملک بھارتیوں کو مطلوب ہے۔ اگر تم کسی طرح اسے پکڑ کر بھارتیوں کے حوالے کر دو تو وہ تمہیں برٹش حکومت سے تاوان دلوا دے گا.... میں نے ٹھیک کہا ناں؟

وہ غور سے سن رہا تھا اس لیے میں نے اچانک پوچھا تو اس نے غیر ارادی طور پر سر ہلا دیا۔ پھر وہ گڑبڑا گیا۔ لیکن میں نے اس کا ردِعمل نظر انداز کر دیا اور بات جاری رکھی۔ ”تم نے ڈیوڈ شا کی بات مان لی لیکن ساتھ ہی ایسا بندوبست کیا کہ میں بھارتیوں کی قید میں نہ جانے پاؤں۔ پہلے تو میں تمہاری منصوبہ بندی کی داد دوں گا جو تم نے شہلا کی مدد سے مجھے ٹریپ کیا۔ مگر اس سے پہلے اجازت پا کر ایک سوال کروں گا۔“

”کیسا سوال؟“

”شہلا نے مجھے جو بریف کیس دیا تھا اس میں ٹائم بم تھا اور میں ایک منٹ کے فرق سے بچ گیا۔ مجھے مارنا تمہارا مقصد نہیں تھا تب میں اسے کیا سمجھوں۔“

فتح خان کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرانی اصلی تھی۔ ”بریف کیس میں ٹائم بم تھا....؟“

”بالکل، اگر میں اسے ایک کھائی کے کنارے نہ رکھ دیتا تو آج اپنی قبر میں پڑا ہوتا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ شہلا کا کام ہے میں نے اسے ایسا کرنے کو نہیں کہا۔ وہ پہلے بھی کہتی رہی تھی کہ تمہارا کام تمام کر دوں.... کتیا کی بچی۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری بات تسلیم کر لیتا ہوں کہ یہ شہلا کا کام ہے لیکن وہ ہے تو تمہارے ساتھ ہی۔ تم نے اس کی مدد سے مجھے ٹریپ کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ تمہارے لیے ہی کام کر رہی ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن جہاں تک تمہیں ختم کرنے کی کوشش کا تعلق ہے یہ اس کا انفرادی فعل تھا۔“

”میں یہ بھی تسلیم کر لیتا ہوں لیکن مستقبل میں تمہارا یہ عذر نہیں مانا جائے گا تم شہلا کے ذاتی عزائم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے بڑی خوب صورتی سے چارا ڈال کر مجھے اس جگہ پہنچا دیا جہاں شہلا کا ٹھکانا ہے۔ وہاں سے مجھے یوں پکڑ لیا جیسے پنیر کے لالچ میں آنے والا چوہا ٹریپ میں پکڑا جاتا ہے۔ تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

”ان کو وہیں چھوڑ دیا تھا ان سے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بعد میں تمہارے آنے والے آدمی انہیں لے گئے تھے۔“

”بات آگے بڑھانے سے پہلے میں ایک سوال اور کروں گا؟“ میں نے کہا فتح خان میری داستان میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا شاید وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں کس حد

تک حالات سے باخبر ہو گیا تھا۔

”کرو۔“

”تم جانتے ہو کرنل زریسکی اور مہرو میں کیا رشتہ ہے اس کے باوجود تمہارا اس سے تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا؟“

”اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے۔ کرنل اور میرا تعلق شروع سے تھا۔ بعد میں اسے مہرو پسند آ گئی اور اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہ ماضی میں ہوا تھا اس لیے کرنل اور میرے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

”مہرو تمہارے خون کی پیاسی ہو رہی تھی اس نے اتنی آسانی سے تمہیں کیسے معاف کر دیا؟“

”یہ اس کا اور کرنل کا معاملہ ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”میں نے اس سے کہا جو پہلے ہو چکا ہے اس کا ذکر بیکار ہے آئندہ کوئی شکایت ہو تو کہنا۔“

”کرنل بھی چالاک اور مفاد پرست آدمی ہے اس نے بھی ماضی پر مٹی ڈال دی ہو گی۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی مہرو اس خانہ بدوش قبیلے میں کیا کر رہی تھی جو ٹھیک اس جگہ موجود ہے جہاں مہرو کا اپنا قبیلہ آباد تھا؟“

فتح خان جو کئی جام پینے کے بعد خاصا سرور میں آ گیا تھا اور بڑے موڈ میں میری بات سن رہا تھا یک دم اس کا چہرہ بدل گیا وہ پتھریلے انداز میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”یہ بات تم کیسے جانتا ہے؟“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں اسے حیران کرنے کے جوش میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ ”میں نے اتفاق سے اسے دیکھ لیا تھا۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اسے پکڑ بھی لیتا لیکن اسی وقت شہلا کے بارے میں اطلاع آ گئی اور مجھے وہاں جانا پڑا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔ کرنل اس بات سے لاعلم تھا کہ تم نے نادر علی کو مجھ سے ملنے کا موقع دیا تھا۔“

”اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“ فتح خان نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ مہرو کا اس خانہ بدوش قبیلے میں ہونا کسی بہت خاص اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ اس نے خود موضوع ختم کر دیا تھا اس لیے میں نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔ بعد میں اس معاملے کو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

”لیکن میرا تو ہے۔“ میں مسکرایا۔ ”نادر بھی اپنے بھائی کی طرح مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے وہ مجھ سے صلح کرنا چاہتا ہے۔“

”شہباز خان بہتر ہو گا ان لوگوں سے صلح کر لو تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، میرا مطلب ہے تم ان کے ذہن کا نہیں ہے ورنہ اب تک یہ دونوں بھائی مٹی میں مل چکا ہوتا۔“

”یہی تو مسئلہ ہے لیکن میں ان کے سامنے سر تو نہیں جھکا سکتا اور نہ ان پر اعتبار کر سکتا ہوں وہ بچھو فطرت رکھتے ہیں ڈنک مارنے سے باز ہی نہیں آ سکتے۔“

”خیر یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔“ فتح خان بولا۔ ”میرا مسئلہ مرشد ہے میں اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ میرے چچا زاد بھائی شہباز خان کا قاتل ہے اور اس کا بدلہ لینا میرا فرض ہے۔“

”لیکن تم جو کر رہے ہو اس سے مرشد کا کچھ نہیں بگڑتا۔“

”میں سمجھ گیا ہے اور تم جلد دیکھے گا مرشد کو ایسا جھٹکا لگے گا کہ وہ قدموں میں گرے گا اور اس کا اپنا لوگ اسے گدی سے اُتار کر پھینک دے گا۔“

”پھر اس گدی پر نادر کو بٹھا دیا جائے گا جو مرشد سے زیادہ ہی دشمن ہے میرا۔“

فتح خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”شہباز خان فکر مت کرو ایک بار مرشد کا کانٹا نکل جائے اس کے بعد نادر بھی زیادہ دن نہیں رہے گا۔ ہاں تو تم کہہ رہا تھا۔“

”کرنل زریسکی کے آدمی مجھے لے گئے اور اس نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے پہلے تو بے ہوش کرنے والی دوا دی اور پھر ایک ایسی دوا دی جس سے میرا جسم سست ہو گیا۔ اس نے اسی حالت میں مجھے بھارتیوں کے سپرد کر دیا لیکن اس نے دو کام کیے ایک تو دوا کی مقدار کم رکھی تھی جس سے میرا جسم جلد میرے قابو میں آ گیا۔ دوسرے اس نے مجھے جان بوجھ کر ایک چاقو فراہم کر دیا۔ اس کے بعد میرا کام آسان تھا۔ تم لوگوں نے اپنا معاہدہ پورا کر دیا۔ بھارتی مجھے لے کر دو ملکوں کی سرحد پار کر گئے اور اس کے بعد میں نے انہیں قابو کر لیا۔ تمہاری توقع کے عین مطابق اور انہیں واپس لے آیا۔ کرنل نے کمال اداکاری کی اور آخر تک انجان بنا رہا۔ اس نے مجھے شک کا موقع دیے بغیر وہ سب کیا جو تم لوگوں کی پلاننگ تھی۔“

فتح خان چونکے بغیر انجان بن کر بولا۔ ”کیا پلاننگ تھا ہمارا....؟“

”یہی کہ میں کرنل سے کیبن اور زادِ راہ حاصل کروں اور اس کے بعد جب واپسی کا سفر کروں تو راستے میں مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

وادی کا خیال آئے گا۔ مزید نشان دہی کے لیے کرنل نے وین میں نقشہ بھی رکھ دیا تھا جس میں خاص طور سے وضاحت تھی کہ یہاں آنے والا راستہ وادی کے پاس سے گزرتا ہے۔ ٹائمنگ بھی پرفیکٹ تھی۔ ایمن کے پاس چالیس گھنٹے سے بھی کم کا وقت رہ گیا تھا اور میں ایک آخری کوشش کرسکتا تھا۔ جیسا کہ میں نے کی۔ تم لوگوں نے اس حد چالاکی کی کہ وین کا رُخ سڑک کی طرف کر کے کھڑا کیا اور اس میں چابی بھی لگی رہنے دی تھی۔ جس وقت بھارتی مجھے لے جارہے تھے وین کا رُخ کیبن کی طرف تھا اور اس محدود جگہ اسے گھمانے میں وقت لگتا۔ تمہارا مقصد تھا میں وین لے کر بھاگ نکلوں لیکن میں پہلے کیبن میں پہنچ گیا۔“

فتح خان نے سر ہلایا۔ “پر افسوس ہیرا پھر بھی نہیں ملا۔”

“میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟”

“اب وہ بھی بتادو۔”

“فتح خان تمہیں شبہ تھا کہ برٹ شا مرنے سے پہلے مجھے کچھ بتا گیا ہے کم سے کم ہیروں کی جگہ کے بارے میں اشارہ ضرور دے گیا ہے۔ اب تم مجھ سے براہِ راست یہ بات معلوم نہیں کرسکتے تھے۔ زبردستی کرنے کا مطلب ہوتا کھلی دشمنی اور تمہاری اس پالیسی کا پردہ چاک ہوجاتا جو تم نے میرے سلسلے میں اپنا رکھی ہے۔ یعنی اوپر اوپر سے دوستی جتاتے رہو اور اندرونِ خانہ میری جڑیں کاٹنے کا کام کرتے رہو۔”

“ٹھیک ہے میں نے یہ منصوبہ بنایا لیکن کامیابی تو پھر بھی نہیں ملا۔” اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

“میرا خیال تمہیں اب بھی شبہ ہے کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں حالانکہ تم پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے جب میں وادی میں پاگلوں کی طرح اوپر نیچے بھاگ دوڑ کر رہا تھا تو تم اور تمہارے ساتھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ اگر میں ہیرے تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو تم اسی وقت مجھے گھیر لیتے۔ مگر جب میں ناکام رہا اور تمہارے ساتھی کے چھینکنے کی وجہ سے ہوشیار ہوکر وادی سے نکل بھاگا تب تم نے دوسرے متبادل منصوبے کے تحت مجھے قابو کرلیا۔”

فتح خان کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر مخصوص عیارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ “شہباز خان تم سب جانتا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی جانتا ہے۔ اب کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم پہلے سے جاننے کے بعد ہم سب کو بےوقوف بنا رہا ہو؟”

“تمہارا مطلب ہے کہ میں جانتا ہوں کہ ہیرے کہاں ہیں لیکن میں جان بوجھ کر تمہیں نہیں بتا رہا ہوں؟”

“ہاں میرا یہی خیال ہے۔” فتح خان نے سر ہلایا۔ “تم جان گیا ہے کہ ہیرا کدھر ہے۔”

“اگر میں جان گیا ہوں تو مجھے ایمن کے لیے بارگننگ کرلینی چاہیے تھی۔”

“نہیں تم آخری لمحے تک بارگننگ نہیں کرے گا۔” فتح خان نے یقین سے کہا۔ “تم کو امید ہے میں ایمن کو چھوڑ دے گا یا برٹش حکومت تاوان ادا کردے گا۔”

“تم غلط فہمی کا شکار ہو میں نے پورے خلوص نیت سے ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں ناکام رہا۔ ویسے تم تسلیم کرتے ہو کہ ڈیوڈ شا سے تمہاری یہی ڈیل ہوئی تھی کہ تم مجھے پکڑ کر بھارتی حکومت کے حوالے کرو گے۔ اس کے بدلے ڈیوڈ شا برٹش حکومت پر تاوان کی ادائیگی کے لیے دباؤ ڈالے گا۔”

اس نے سر ہلایا۔ “پر ڈیوڈ شا نے پکّا وعدہ نہیں کیا تھا کہ کام لازمی ہوگا۔”

“اسی سے اس کی نیت کا اندازہ کرلو۔”

“میں جانتا ہے لیکن اسے صاف جواب نہیں دے سکتا، نہ اسے مجبور کرسکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ برٹش گورنمنٹ کی پالیسی نہیں ہے۔ یہاں اغوا ہونے والے کسی فرد کا تاوان نہیں دیا جاتا ہے۔”

“ہاں انہیں مرنے دیا جاتا ہے۔” میں نے تلخی سے کہا۔ “اپنی گندی سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ خطہ ویسے ہی ان کی سیاست کا نشانہ بنا ہوا ہے۔”

“اب ایمن ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہے کہ مجھے ہیرا مل جائے۔”

میں کچھ سوچ رہا تھا میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ “فتح خان ڈیوڈ شا، یہ تو جان گیا ہوگا کہ میں بھارتیوں کی قید میں آنے سے پہلے فرار ہوگیا ہوں۔ لیکن کیا وہ یہ جانتا ہے کہ میں اب تمہاری قید میں ہوں۔”

اس نے سر ہلایا۔ “وہ نہیں جانتا ہے۔”

“بھارتیوں نے میرے بدلے تم لوگوں کو کیا ادا کیا ہے۔”

“ایک ملین ڈالرز۔” فتح خان نے سوچ کر کہا۔ “اس میں سے آدھے مجھے ملے اور آدھے کرنل کو ملے۔”

“لیکن اس کے پاس صرف دو لاکھ ڈالرز تھے۔”

“یہ وہ رقم نہیں ہے ادا کی جانے والی رقم روس کے ایک بنک میں گئی ہے۔”

“بینک میں۔” میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ “فتح خان تمہارا روس کے کسی بینک میں اکاؤنٹ ہے؟”

“ہاں اگر مجھے ہیرے مل جائیں تو میں وہیں چلا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔”

“یہ تمہاری خوش فہمی ہے، پکڑنے والے تمہیں ہر جگہ سے پکڑ سکتے ہیں۔ تم کہیں بھی سو فیصد محفوظ نہیں ہوگے۔”

“وہ بعد کا بات ہے بعد میں دیکھا جائے گا۔” اس نے بےپروائی سے کہا۔

“اگر ڈیوڈ شا کو معلوم ہوجائے کہ ایک طرف تو تم لوگوں نے مجھے بھارتیوں کے حوالے کردیا تھا اور دوسری طرف مجھے بچ نکلنے کا موقع بھی دیا تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟”

فتح خان مسکرایا۔ “شاید وہ کچھ نہ بولے اور شاید اس کا ردِعمل اچھا نہ ہو۔ پر میرے کو اس کا پروا ہوتا تو میں یہ کام کیوں کرتا وہ مجھے استعمال کرتا ہے تو میں اسے استعمال کررہا ہوں۔”

میں ہنسا۔ “تم نے اور کرنل نے چالاکی سے کام لیا۔ نوٹ بھی کمالیے اور مجھ پر احسان بھی کردیا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ تم نے میرے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔”

فتح خان نے اپنے آدمی کو کھانے کے لیے لانے کو کہا۔ میرا خیال تھا اس وقت روکھی سوکھی کھانے کو ملے گی۔ مگر خلافِ توقع کچھ دیر میں ہمارے سامنے بھنا ہوا مرغ تھا۔ یہ دیسی مرغ تھا جو دیسی گھی میں تلا گیا تھا۔ کئی وقت کی ڈبل روٹی اور انڈوں کے کھانے کے بعد یہ من و سلویٰ تھا۔ مرغ خاصا بڑا تھا اس لیے ہم دونوں کا ہی پیٹ بھر گیا تھا۔ کھانے کے بعد فتح خان نے دوبارہ بوتل سنبھال لی اور میرے لیے کافی لانے کا حکم دیا۔ اس کا ایک آدمی شاید ان کاموں کا ماہر تھا۔ مرغ یقیناً پہلے ہی تیار ہوگیا تھا اور اوون میں رکھا تھا۔ وہ گیا اور بس فٹافٹ نکال لایا۔

“اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟” میں نے فتح خان سے پوچھا۔

“ارادہ بتا دیا ہے اگر میرے کو تاوان نہیں ملا تو ایمن نہیں بچے گا۔”

“اسے مار کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔”

“نہ ملے پر وہ بھی نہیں بچے گا۔ تم کو پتا نہیں ہے تم ادھر قید پڑا ہے لیکن انگلینڈ اور دنیا بھر میں میڈیا نے ایمن کے لیے ایک ہنگامہ کردیا ہے۔ بہت شور ہورہا ہے۔”

یہ میرا ہی کام تھا۔ مانی کی مدد سے ٹی وی چینلز کو اطلاع دی تھی اور اب اس کے نتیجے میں ایمن کا کیس میڈیا میں آگیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ مغربی ممالک کی حکومتیں میڈیا کے آگے اپنی پالیسی نہیں بدلتی ہیں، وہ جانتی ہیں میڈیا کی حیثیت ایک عارضی طوفان سے زیادہ نہیں ہوتی ہے جو بس چند دن دھوم مچاتا ہے اور پھر یوں غائب ہوجاتا ہے جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ ان کی نظریں ہمیشہ مستقبل میں ملک کے مفاد پر مرکوز رہتی ہیں۔ اگر وہ محسوس کریں کہ کسی پالیسی پر عمل کرنے سے ان کے ووٹرز ناراض ہوجائیں گے لیکن یہ ملک کے مفاد میں ہے تو وہ ووٹرز کی پروا کیے بغیر اپنی پالیسی پر عمل کرتی ہیں چاہے اس کے جواب میں ان کی حکومت کیوں نہ چلی جائے۔ اس لیے یہ سوچنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ ایمن کا کیس میڈیا میں جانے سے اس کی جان بچنے کی امید پیدا ہوگی۔ مگر میرے بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ فتح خان بھی میرے قبضے میں نہیں تھا اُلٹا میں اس کے قبضے میں تھا۔ اس کا آدمی میرے لیے چائے لے آیا تھا اور اس بار دودھ اور چینی کم تھی۔ فتح خان نے اچانک پوچھا۔ “شہباز تم ایمن کو بچانے کے لیے کیا کرسکتا ہے؟”

“میں اس کو بچانے کے لیے اپنی جان تک داؤ پر لگا سکتا ہوں۔”

“سچ کہتا ہے۔” فتح خان نے بےیقینی سے کہا۔ “تم اس سے محبت بھی نہیں کرتا ہے۔”

“میں اس سے وہ محبت نہیں کرتا ہوں جو آدمی کو اپنی عورت سے ہوتی ہے لیکن وہ میری دوست ہے۔ آدمی دوست کے لیے بھی تو جان دے سکتا ہے۔”

“اگر میں تم سے کہے کہ اس کے بدلے میں تم کو ماردیتا تو تم مان جاؤ گے؟” فتح خان نے کہا اور اچانک پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا اور اس میں سختی اور سفاکی آگئی تھی۔ میں مسکرایا۔

“فتح خان تم کوئی کام بےسبب نہیں کرتے ہو تو ایمن کے بدلے مجھے مارنے میں کیا مصلحت ہوسکتی ہے؟”

“تم میرے لیے خطرناک ہوتا جارہا ہے۔”

“حالانکہ میں نے کبھی تمہارے کاموں میں ٹانگ نہیں اڑائی یہ تم ہی ہو جو ہمیشہ میرے معاملے میں مداخلت کرتے رہے ہو۔ تمہیں مجھ سے جو نقصان ہوئے وہ ہمیشہ غیر ارادی

www.paksociety.com

ہوتے تھے جبکہ تم ہمیشہ جان بوجھ کر مجھے نقصان پہنچاتے رہے۔ اس لحاظ سے تو تم میرے لیے خطرناک ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نہیں جانتا کہ تمہاری وجہ سے میرے کو کتنا نقصان ہوا۔ وہ وقت جو میں ہیرے تلاش کرنے میں لگا سکتا تھا تمہارے پیچھے لگا۔''

میں نے شانے اُچکائے۔ ''فتح خان میں نے کبھی نہیں کہا آ بیل مجھے مار۔''

''تم بات بدل رہا ہے ابھی کہہ رہا تھا کہ ایمن کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔''

''میں بات نہیں بدل رہا، اگر تم مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو میں تمہارے قبضے میں اور بے بس ہوں۔ مجھے مارنے کے لیے تمہیں ایمن کا نام استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں شہباز خان میں تمہیں خالی ہاتھ دنیا سے نہیں بھیجنا چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہے کہ تمہارے قتل کی کچھ تلافی کرکے بھیجے۔''

''یعنی تم ایمن کو چھوڑ کر میرے قتل کی تلافی کرنا چاہتے ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہی بات ہے۔''

''لیکن تم نے ایمن کو نہیں چھوڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مرنے کے بعد مجھے کیا پتا چلے گا کہ تم نے اسے چھوڑ دیا ہے یا نہیں۔''

فتح خان نے میری بات پر غور کیا۔ ''تم چاہتا ہے میں پہلے اسے چھوڑ دے پھر تم کو مارے۔''

''ہاں تاکہ مجھے اطمینان رہے میں جس کام کے لیے جان دینے کو تیار ہوا تھا وہ ہو گیا ہے۔''

فتح خان سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں پہلے ایسا کرے گا اب تم آرام کرو۔''

''انسان اپنی زندگی کے آخری وقت میں آرام کیسے... کرسکتا ہے؟'' میں نے کہا تو میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور میں اسے خوف کی لہر سمجھا تھا لیکن جب یہ سنسنی رفتہ رفتہ پورے جسم پر حاوی ہونے لگی تب مجھے پتا چلا فتح خان میرے ساتھ ہاتھ کر گیا تھا چائے میں کوئی خواب آور دوا تھی۔ میں نے اُٹھنا چاہا لیکن ہاتھ پیروں کی سنسنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ مجھ سے ہلا بھی نہیں گیا۔ رفتہ رفتہ یہ سنسنی ذہن پر بھی طاری ہو گئی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک خالی کمرے میں بچھے قالین پر پڑا تھا۔ دروازے کی ساخت سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں اسی کوٹھی میں تھا کیونکہ اس میں ایسے ہی دروازے لگے تھے۔ یہ کیل یا دیودار کی نہایت مضبوط لکڑی سے بنے تھے اور انہیں کوئی رستم زماں ہی توڑ سکتا تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو میرے اندازے کے عین مطابق باتھ روم کا دروازہ ثابت ہوا۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے چکر نہیں آئے تھے اور نہ ہی طبیعت میں خرابی محسوس ہوئی تھی ہاں باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں وہاں چلا آیا۔ باتھ روم بھی نہایت محفوظ قسم کا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس سے زیادہ سے زیادہ درمیانے سائز کی بلی نکل سکتی تھی۔ وہ بھی اگر بلی آبادی بڑھانے کے موڈ میں نہ ہو۔ واش روم بھی بہترین قسم کا تھا اور یہاں گرم پانی آ رہا تھا۔ نہ جانے فتح خان کی اپنی کوٹھی تھی یا اس نے حسب معمول کسی ایسی جگہ کو تاڑا تھا جس کا مالک شہر میں ہوتا تھا۔ چوکیدار مجھے اسی کوٹھی کا لگا تھا شاید فتح خان نے اسے لالچ دے کر ساتھ ملا لیا تھا اور اب دھڑلے سے کوٹھی استعمال کر رہا تھا۔ میں باتھ روم سے باہر آیا تو فتح خان کے دونوں آدمی کمرے میں موجود تھے۔

''چلو خان جی نے بلایا ہے۔''

''چلو۔'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں شارٹ گنوں سے مسلح اور پوری طرح چوکس تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی صبح کا وقت تھا میں کم سے کم آٹھ گھنٹے تو سویا تھا۔ دوا کے اثر کے علاوہ تھکن بھی تھی کیونکہ میں ڈیڑھ دن سے جاگ رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے اسی نشست گاہ میں لائے۔ میز پر ناشتا سجا ہوا تھا اور یہ شاندار روایتی قسم کا ناشتا تھا۔ دیسی گھی میں بنے پراٹھے تھے۔ اُبلے اور تلے ہوئے انڈے تھے۔ مکھن کے ساتھ شہد اور پنیر بھی تھا۔ میں نے صوفے پر نیم دراز فتح خان کی طرف دیکھا۔

''یہ تو لگ رہا ہے کسی سزائے موت کے مجرم کے لیے آخری ناشتا آیا ہے۔''

فتح خان اس وقت سگریٹ نوشی کر رہا تھا اس نے سر ہلایا۔ ''تم ایسا بھی سمجھ سکتا ہے۔''

میں نے ناشتے کا آغاز کیا۔ ''تم نے کہا تھا کہ ایمن کی جان بخش دو گے؟''

''ہاں، میرا آدمی کام کر رہا ہے ابھی اس کی کال آئے گی۔''

''مجھے یہاں کہیں فون نظر نہیں آ رہا ہے اور موبائل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''تم فکر مت کرو میرے پاس یہ ہے۔'' فتح خان نے جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا سیٹلائیٹ فون نکال کر دکھایا۔ ''اس کے ساتھ میں کے ٹو کی چوٹی سے بھی کسی سے رابطہ کرسکتا ہے۔''

''تمہارے لیے کیا مسئلہ ہے تم ایک فون کال کرکے اپنے آدمی کو حکم دو گے اور وہ برٹش سفارت خانے کال کرکے جیکٹ کو ناکارہ بنانے والا کوڈ بتا دے گا۔''

''ہاں لیکن میرے آدمی کو اپنی حفاظت کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ وہ گورا بہت تیز ہوتا ہے۔ وہ کال کا سراغ لگا کر میرے آدمی تک آ سکتا ہے۔'' فتح خان نے کہا۔ ''پھر ایک چکر اور بھی ہے میرے کو شبہ ہے میرا آدمی کوڈ بتا دے گا تب بھی ایمن نہیں بچے گا۔''

میں چونک گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے وہ اسے مرنے دیں گے؟''

''ہاں یہ گورا لوگ بہت .... ہوتا ہے۔'' فتح خان نے روانی سے ایک گالی استعمال کی۔ ''ضرورت پڑنے پر مظلوم بننے کے لیے اپنی ماں کو بھی مروا سکتا ہے۔ پھر ڈیوڈ شا بھی ہے۔''

''اصل مسئلہ وہی ہے اور وہ ایمن کو مروانا چاہتا ہے۔''

''میں نے خود دیکھا ہے سفارت خانے کا لوگ اس کے سامنے خاندانی ملازموں کی طرح ہوتا ہے۔''

''تب تم نے اس کا کوئی حل سوچا ہوگا؟''

''وہی جو تم نے کیا تھا۔'' فتح خان مسکرایا۔ ''میں نے اپنے آدمی کو لگا دیا ہے وہ یہ کوڈ ٹی وی چینلز کو بھیجے گا اور پھر سفارت خانے کال کرے گا۔''

''یہ تم نے ٹھیک کام کیا ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''ابھی کیا وقت ہوا ہے؟''

''سات بجے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''ابھی سات گھنٹے کا وقت ہے اس کے بعد ہی جیکٹ پھٹے گا۔''

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر ڈیوڈ شا اس معاملے میں ملوث ہے تو وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کوڈ غلط بتایا تھا اور اسے لگاتے ہی جیکٹ پھٹ گئی۔''

فتح خان بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''ہاں ایسا ہو سکتا ہے میڈیا والا بھی کچھ نہیں کرسکتا ہے بلکہ وہ اُلٹا میرے خلاف بولے گا کہ میں جان بوجھ کر غلط کوڈ بتایا ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے اگر تم مان لو۔''

''کیا ترکیب ہے؟''

''مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنے دو۔''

فتح خان چونکا۔ ''اس سے بات کرکے تم کیا کرے گا؟''

''میں ظاہر کروں گا کہ میں نے تم پر قابو پا کر کوڈ حاصل کرلیا ہے اور میں ایمن کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں میں اسے لالچ دوں گا کہ اگر اسے میرا تعاون چاہیے تو وہ اس معاملے میں ٹانگ اڑانے سے باز رہے۔''

''تمہارے خیال میں وہ باز آ جائے گا؟'' فتح خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے آدمی کے بارے میں۔'' میں نے پراٹھا نگلتے ہوئے کہا۔ ''سوچا تو میں نے یہ بھی نہیں تھا کہ کبھی تم میری جان لینے کو کہو گے اور میں دے دوں گا۔''

فتح خان نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''شہباز خان کیا تم سنجیدہ ہے؟''

''یہ تو تم پر ہے کیا تم میری جان لینے میں سنجیدہ نہیں ہو؟''

''میں سو فیصد سنجیدہ ہے اگر میں نے ایمن کو چھوڑا تو تم کو نہیں چھوڑے گا۔''

''تب میں بھی سنجیدہ ہوں۔ شاید تم حیران ہو کہ میں اتنا خاموش کیوں ہوں جان بچانے کے لیے کوشش کیوں نہیں کر رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میری تم سے ڈیل ہو گئی ہے اگر تم ایمن کو چھوڑ دو گے اور وہ بچ جائے گی تو میں بغیر کسی مزاحمت کے خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر تم نے ڈیل پوری نہ کی تو میں اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

فتح خان ے سر ہلایا اور سیٹلائیٹ فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ ''میں ڈیوڈ شا کا نمبر ملا رہا ہے وہ اس نمبر کے بارے میں نہیں جانتا ہے تم بھی اسے نہیں بتائے گا کہ یہ میرا فون ہے اور تم میرے پاس ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون لے لیا۔ یہ عام موبائل فون کی نسبت موٹا اور بھدا سا تھا اس کی اسکرین بھی بالکل سادہ تھی جس میں صرف نمبر لکھا ہوا آ رہا تھا میں نے یہ نمبر ذہن نشین کرلیا۔ اگرچہ فی الحال اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہو سکتا تھا مستقبل میں کوئی فائدہ ہو بھی جاتا۔ آنے والا وقت تو اللہ کے ہاتھ میں تھا ہم صرف اندازے لگا سکتے ہیں کہ ایسا ہوگا اور ویسا ہوگا۔ ڈیوڈ شا نے

www.paksociety.com

خاصی دیر بعد کال ریسیو کی۔

''ڈیوڈ شا میں بات کر رہا ہوں اگر تم آواز سے پہچان سکو۔''

''شہباز تم....'' اس نے توقف کر کے کہا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں جہاں بھی ہوں آزاد ہوں اور اس قابل ہوں کہ تم سے بات کرسکوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ڈیوڈ شا میرے پاس وقت کم ہے اس لیے براہِ راست بات کروں گا۔ میں نے فتح خان پر قابو پا کر جیکٹ ڈی ایکٹی ویٹ کرنے والا کوڈ معلوم کرلیا ہے۔ میں وہ کوڈ برطانوی سفارت خانے کو بھیج رہا ہوں اور ساتھ ہی میڈیا کو بھی دے رہا ہوں۔''

''تو میں کیا کرسکتا ہوں۔'' اس کا لہجہ حسبِ معمول سرد تھا۔

''ڈیوڈ شا تم یہ کر سکتے ہو کہ اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالو گے...''

''میری طرف سے کوئی....''

''میری بات مت کاٹو۔'' میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کیا کر رہے ہو اور تمہاری کوششیں کتنی کامیاب جا رہی ہیں؟ اس لیے میں نے تمہیں کال کرنے کی زحمت کی ہے۔''

''تمہیں میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

''فتح خان سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔''

ڈیوڈ شا خاموش ہوگیا وہ شاید دل ہی دل میں تجزیہ کر رہا تھا کہ میری اس کال کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ میں سکون سے انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ''شہباز ملک اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟''

''میرا تعاون....''

''میں کیسے یقین کرلوں۔''

''میں تمہیں یقین دلانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، لیکن اگر ایمن کو کچھ ہوا تو اس پر پورا یقین کرلو کہ تم میرا تعاون ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔''

''اگر یہ ڈیل ہے تو مجھے منظور ہے ایمن کو کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر تم بعد میں مکرے تو وہ زندہ نہیں رہے گی۔'' ڈیوڈ شا نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس نے صاف دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے بعد میں تعاون سے گریز کیا تو وہ ایمن کو نہیں چھوڑے گا۔ فتح خان نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''وہ مان گیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن اس شرط پر کہ میں بعد میں اس سے تعاون کروں گا ورنہ وہ ایمن کو نہیں چھوڑے گا۔''

''تم زندہ رہے گا تو اس سے تعاون کرے گا۔''

''ہاں، یہ تو ہے لیکن بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ایمن بچ جائے پھر آگے اس کی حفاظت کرنے والا وہی ہے جو سب کی حفاظت کرتا ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ میرا ناشتا تقریباً مکمل ہوگیا تھا آخر میں میری پسند کی چائے تھی۔ فتح خان میری پسند ناپسند سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے ایسی چائے بنوائی تھی۔ فتح خان نے سیٹلائیٹ فون پر اپنے آدمی سے رابطہ کیا اور اسے حکم دیا۔

''برٹش ایمبیسی کال کرو اور خود کوڈ بتاؤ جب کام... ہوجائے تو مجھے کال کرنا۔''

میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''سنو فتح خان تم جو کہو گے وہ یک طرفہ ہوگا کیا میں خود تصدیق نہیں کرسکتا کہ ایمن محفوظ ہے یا نہیں۔''

''میں تصدیق کرا دے گا۔'' اس نے یقین دلایا۔

وقت گزرتا گیا ایک گھنٹے بعد میں نے کہا۔ ''تمہارا آدمی کتنی دیر لگائے گا تصدیق کرنے میں۔''

''زیادہ دیر نہیں لگائے گا یہ کام بہت نازک ہے وہ کئی بار کوڈ کی تصدیق کرے گا اور دوسری طرف سے بھی بار بار پوچھا جائے گا۔ ایک نمبر بھی غلط ہوگیا تو....'' فتح خان کی بات اُدھوری رہ گئی اس کے سیٹلائیٹ فون کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سن کر کال کاٹ دی اس نے میری طرف دیکھا۔

''کام ہوگیا ہے ایمن کی جیکٹ ڈی ویکٹی ویٹ کر دی گئی ہے تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو۔''

''وہ کیسے....سفارت خانے کال کر کے....؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ان کو اس نمبر کا پتا چل جائے گا میرے پیچھے تو وہ اب بھی پڑیں گے۔''

''پھر کیسے تصدیق ہوگی کہ ایمن کی جیکٹ اُتر گئی ہے؟''

''میرے ساتھی تصدیق کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن کیا تم مجھے ان سے بات کرنے کی اجازت دو گے؟''

''دے گا پر تم صرف بات کرے گا اس کے علاوہ کوئی اشارہ نہیں دے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا اور فتح خان نے مجھے فون دے دیا۔ میں نے عبداللہ والی کوٹھی کا نمبر ملایا اور اتفاق سے کال عبداللہ نے ریسیو کی۔ میری آواز سن کر وہ چلّایا۔

''آپ.....کہاں ہیں جناب؟''

''چلّاؤ مت....میری بات غور سے سنو میں بیس منٹ بعد دوبارہ کال کروں گا اس وقت تم تصدیق کرو کہ برٹش سفارت خانے میں موجود ایمن کو پہنائی جیکٹ اُتر گئی ہے یا نہیں اور وہ ٹھیک ہے۔''

''میری بات...''

''بعد میں پہلے یہ کام کرو۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فتح خان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''تم نے ٹھیک بات کیا۔''

''فتح خان میں تم سے معاہدے کا پابند ہوں مگر تم نے اچانک ہی دشمنی کا یہ باب ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کی وجہ بتا سکتے ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''لیکن یوں سمجھ لو کہ میں کچھ ایسا کام کر رہا ہوں جس میں تم لازمی ٹانگ اڑائے گا اگرچہ اس کا تمہاری یا تمہارے ساتھیوں کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہیرے میرے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اب میرے پاس یہ آخری چانس رہ گیا ہے۔ اسے میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔''

مجھے حیرت ہوئی ایسا کون سا کام ہوسکتا تھا جس میں فتح خان کو خطرہ تھا کہ میں لازمی ٹانگ اڑاؤں گا اور اس کا مجھ سے یا میرے ساتھیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر وہ کام ایسا تھا جس میں فتح خان کو ہیروں کا متبادل مل جانے کی امید تھی۔ ''مجھے بھلا کیا ضرورت ہے اپنے پھڈے چھوڑ کر پرائے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔ تم جانتے ہو میری ایسی فطرت نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہے لیکن یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس معاملے میں لازمی ٹانگ اڑائے گا اور مجھے بہت مشکل ہوگا۔ ورنہ میں آسانی سے یہ کام کر لے گا۔''

فتح خان سے گفتگو کے دوران میرا ذہن سوچتا جا رہا تھا کہ ایسا کون سا معاملہ تھا۔ مگر فی الحال میرے ذہن میں ایسا کوئی معاملہ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بیس منٹ بعد عبداللہ کو کال کی۔ میری آواز سنتے ہی اس نے کہا۔ ''جناب میں نے تصدیق کرلی ہے مس شا کی جیکٹ ڈی ایکٹی ویٹ ہونے کے بعد اُتر گئی ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہیں۔''

''یہ تم نے اچھی خبر سنائی۔ یہ بتاؤ کہ وسیم اور دوسرے لوگ ٹھیک ہیں؟''

''ہاں، وہ سب خیریت سے ہیں اور ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔''

''تم لوگ بیکار میں اپنی توانائیاں ضائع مت کرو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''اگر زندہ رہا تو جلد لوٹ آؤں گا۔''

''لیکن آپ ہیں کہاں؟''

''سمجھ لو دشمن کی قید میں ہوں۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی پھر موبائل فتح خان کی طرف بڑھا دیا جو اس نے جیب میں رکھ لیا۔ وہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''شہباز خان مجھے افسوس ہے۔''

''افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے تمہیں کبھی دوست نہیں سمجھا جو مجھے افسوس ہو۔''

اس نے سر ہلایا اور اپنا پستول نکال لیا۔ ''اُٹھو اور باہر چلو۔''

وہ غالباً اس جگہ کو خون سے صاف رکھنا چاہتا تھا۔ فتح خان کا ایک آدمی دروازے کی طرف بڑھا لیکن جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا اچھل کر اندر آ پڑا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ دوسرا آدمی دروازے کی طرف لپکا تھا مگر اسے وہاں تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا گولی اس کے سر میں لگی اور وہ لٹو کی طرح گھومتا اور سر سے خون اُچھالتا ہوا ایک صوفے پر جا گرا اس کا پستول اُچھل کر میرے سامنے میز کے ساتھ آ پڑا۔ جو نیچے پڑا تھا وہ لائٹ براؤن رنگ کے قالین کو سرخ کر رہا تھا۔ دوسرا صوفوں کو اپنے خون سے رنگ دے رہا تھا۔ فتح خان اس جگہ کو خون آلود ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن ایک منٹ سے کم وقت میں نشست گاہ میں خون ہی خون نظر آنے لگا تھا۔ فتح خان کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ دروازے کی طرف سے ایک فائر اور ہوا اور اس بار فتح خان کے ہاتھ سے پستول اُڑ گیا۔ اس نے چلّا کر گالی دی۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا لیکن زخم زیادہ خطرناک نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر موجود شخص بے آواز ہتھیار سے فائر کر رہا تھا اس لیے فائرنگ کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ جب اس نے فتح خان کو بھی نہتا کر دیا تو اندر قدم رکھا۔ میں اور فتح خان دونوں حیران رہ گئے تھے۔

جاری ہے

www.paksociety.com

عشقِ ناتمام

جناب مدیراعلیٰ
مودبانہ آداب!
میں نے پہلی بار لکھنے کی کوشش کی ہے۔ غلطیاں بھی یقیناً ہوئی ہوں گی ، اسے درست کرلیں ۔ اس میں ہر بات درست ہے۔ میں نے صرف نام اور مقام بدلے ہیں ، واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ امید ہے یہ اشاعت کے قابل ٹھہرے گا۔

صبیح یارخان
(کراچی)

عشقِ ناکام نمبر

رومی نے اندر جھانکا۔''دادا جان میں آجاؤں؟''

''آجاؤ۔'' میں نے ہینگنگ چیئر پر جھولتے ہوئے کہا وہ میری اجازت سے پہلے اندر آچکی تھی۔''آج صبح سویرے دادا کی یاد کیسے آگئی؟''

رومی کا جوش سے چمکتا چہرہ، سرخ ہوتی رنگت اور تیز چلتی سانس بتا رہی تھی کہ اسے کسی خاص بات کا علم ہوا تھا اور وہ مجھے بتانے کے لیے بے چین تھی اور یہ خاص بات یقیناً نومی کے بارے میں تھی۔ رومی کی ساری خاص باتیں نومی کے بارے میں ہوتی تھیں۔ رومی فصیح یار خان کی سب سے چھوٹی اولاد ہے جو میرے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ان سے چھوٹے شفیع یار خان ہیں اور نومی ان کا دوسرا بیٹا ہے۔ تیسرے صاحبزادے رفیع یار خان انگلینڈ میں ہیں اس لیے ان کی تینوں اولادیں بھی وہیں آباد ہیں۔ مل ملا کر تینوں بیٹوں کی کوئی گیارہ اولادیں ہیں اس لیے گھر میں ہمہ وقت رونق رہتی ہے۔ کوئی بارہ سال پہلے اٹھارہ گریڈ کے آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہونے کے بعد میں ایک فارغ اور آرام دہ زندگی گزار رہا ہوں۔ بیگم نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن پانچ سال پہلے چپکے سے نکل گئیں۔ تب سے اکیلے جی رہے ہیں۔ صاحبزادوں سے کبھی بے تکلفی نہیں رہی۔ بہ قول بیگم گھر میں بھی سرکاری افسر بنے رہتے تھے۔ اس وجہ سے بچوں سے ایک فاصلہ رہا۔ یہ فاصلہ پوتوں پوتیوں سے بھی رہا۔ سوائے رومی اور نومی کے۔

ان دونوں کی بچپن سے مجھ سے دوستی رہی۔ دوسرے بچوں کے برعکس وہ بے تکلفی سے میرے پاس گھس آتے تھے اور میری بات ماننے کے بجائے مجھے اپنی باتوں پر چلاتے تھے۔ ڈرنے کے بجائے میرے غصے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہاں کبھی سچ مچ خفا ہوتا تو سب بھول کر مجھے منانے کی فکر میں لگ جاتے تھے۔ اپنی ہر بات اور ہر مسئلہ جب تک مجھ سے شیئر نہیں کر لیتے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ انہیں نیند نہیں آتی بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ رات بارہ بجے میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوتی اور ان دونوں میں سے کوئی آجاتا۔ وہ کوئی ایسی بات بتانے آتا تھا جو دن میں بھول جاتا تھا۔

صبح فجر پڑھ کر لان میں چہل قدمی کر کے ناشتے کے بعد میں اپنے کمرے میں آجاتا جو بیگم کے بعد بیڈ روم سے زیادہ اسٹڈی روم لگنے لگا تھا۔ میں نے بڑا بیڈ نکلوا کر سنگل بیڈ ڈلوا دیا تھا۔ سنگار میز کی جگہ رائٹنگ ٹیبل نے لے لی اور کپڑوں کی الماری کی جگہ چاروں طرف کتابوں کی شیشے والی الماریاں لگوالی تھیں۔ کھڑکی کے سامنے جھولنے والی کرسی رکھوالی تھی۔ ناشتے کے بعد کا بیشتر وقت مطالعے یا ٹی وی دیکھنے میں گزرتا تھا۔ بچے اس وقت کالج اسکول گئے ہوتے تھے اور بہوئیں گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں۔ فصیح اوپر رہتے تھے جبکہ نچلے پورشن میں شفیع کے ساتھ میں تھا۔ یہ بڑا پورشن تھا۔ باہر سے آنے والے بھی یہیں رکتے

www.paksociety.com

www.paksociety.com

تھے۔ کسی زمانے میں گلشن میں یہ چار سو گز کا پلاٹ بہت سستا مل رہا تھا اس وقت لے لیا اور ریٹائرمنٹ تک اس پر گھر بھی بنوالیا تھا۔ رفیع شادی کے بعد انگلینڈ چلا گیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ اس کے بعد رومی اور نومی کا وقت شروع ہو جاتا۔ اگر وہ نہیں آتے تو میں خود ان کی تلاش میں نکل جاتا تھا۔ عصر کی نماز پڑھ نزدیکی پارک کی طرف چلا جاتا یا چھٹی ہوتی تو گھر آجاتا۔ تمام بچوں سے مل بیٹھنے کا موقع اسی وقت ہی ملتا تھا۔ مغرب کے بعد سب لاؤنج میں جمع ہوتے، اوپر سے فصیح اور اس کے بیوی بچے بھی آجاتے تھے۔ یہ محفل رات کے کھانے تک چلتی تھی اس کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ مجھے شروع سے دیر تک جاگنے کی عادت تھی اس لیے میں ٹی وی دیکھتا یا مطالعہ کرتا اور جب نیند آتی تو سو جاتا۔ نیند کے بارے میں میرا شروع سے خیال رہا ہے کہ اس کا انتظار فضول ہے جب اسے آنا ہوگا تو خود آجائے گی۔ انسان کو زبردستی یا دواؤں کی مدد سے سونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

اس صبح ناشتے کے بعد میرا کچھ آرام کا موڈ ہو رہا تھا اور میں ہینگنگ چیئر میں جھول رہا تھا کہ رومی آگئی۔ وہ آکر میرے پیروں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی اور سنسنی خیز لہجے میں بولی۔ ”دادا جان آپ کو کچھ پتا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”نومی کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔“ رومی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ میں چونک کر سیدھا ہوگیا۔

”کسی لڑکی کے چکر میں؟..... کیا مطلب؟“

”آپ لڑکی کے چکر کا مطلب نہیں سمجھتے دادا جان۔“ رومی نے افسوس سے سر ہلایا۔

”مطلب تو سمجھتا ہوں لڑکی۔“ میں نے خفا ہو کر کہا۔ ”میرا مطلب ہے نومی اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔“

”نومی لڑکا ہے۔“ رومی نے سادگی سے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے نومی لڑکا ہے اس لیے کسی لڑکی کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور مجھے غصہ آنے لگا تھا میں اپنے پوتے کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”وہ آج کل موبائل پر چھپ چھپ کر باتیں کرتا ہے ایس ایم ایس کرتا ہے۔ پہلے میں اس کا موبائل یوز کر لیتی تھی لیکن اب وہ اپنے موبائل کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتا ہے۔“

”اگر وہ تمہیں موبائل نہیں دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے تم اس پر اتنا بڑا الزام لگا دو۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔

”یہ الزام نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”آپ کے خیال میں، میں اتنی سی بات پر ایسا الزام لگا رہی ہوں۔ مجھے تو آپ کو بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔“

حالانکہ اسے شرم نہیں غصہ آرہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ نومی کو پکڑ کر لے آئے اور زبردستی میرے سامنے اقرارِ جرم کرائے۔ ”بس صرف اس وجہ سے تمہیں شک ہے یا تم نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے یا کوئی اور ثبوت بھی ہے۔“

وہ کسی قدر شرمندہ ہوئی۔ ”نہیں بس یہی وجہ ہے، میں نے اور تو کچھ نہیں دیکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے تب میں معلوم کر لوں گا۔“ میں نے دوبارہ جھولنا شروع کر دیا۔

”دادا جان، آپ صرف معلوم نہیں کریں اسے سیدھا کریں۔ اس نے ابھی یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اور وہ پڑھنے کے بجائے ان چکروں میں پڑ گیا ہے۔“

”بیٹا جی پہلے یہ بات ثابت تو ہونے دو اس کے بعد اسے سیدھا کریں گے۔“

”آپ دیکھ لیجئے گا بالآخر یہی بات نکلے گی۔“ اس نے یقین سے کہا۔

میں نے شام کو عصر کے لیے جاتے وقت نومی کو بلایا۔ ”آؤ برخوردار نماز پڑھنے چلتے ہیں۔“

وہ فوراً فکر مند ہو گیا اور فریادی لہجے میں بولا۔ ”میں نے کیا کیا ہے دادا جان....؟“

”کچھ نہیں میرے بیٹے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”بہت دن ہو گئے دادا پوتے ساتھ نہیں نکلے ہیں۔“

لیکن اسے یقین نہیں آیا تھا۔ وہ راستے میں بھی پریشان رہا اور پھر اس نے یقین سے کہا۔ ”ضرور رومی نے کوئی لگائی بجھائی کی ہے۔“

”گویا چور کی ڈاڑھی میں کوئی تنکا ہے۔“

”بالکل بھی نہیں دادا جان۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔ نماز کے بعد ہم پارک کی طرف چلے گئے اور ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ نومی مضطرب تھا کہ ابھی میں اسے فرد جرم سناؤں گا اور اسے صفائی پیش کرنا پڑے گی۔ لیکن اس کے بجائے میں نے اس سے گپ شپ شروع کر دی۔ اس سے یونیورسٹی کا حال احوال لینے لگا اور درمیان میں اپنے زمانہ طالب علمی کے قصے بھی سناتا گیا۔ ذرا دیر میں اس کی ٹینشن دور ہو گئی اور وہ بے فکری سے باتیں کرنے لگا پھر اس نے بتایا۔ ”دادا جان، ہمارا گروپ گرمیوں کی چھٹی میں ناردرن ایریا جانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

”اچھا تم نے بتایا نہیں تھا؟“

”دادا جان ابھی سب سے چھپایا ہے خاص طور سے اس چڑیل رومی سے ورنہ وہ ضرور ٹانگ اڑائے گی۔ ماما اور پاپا کو بہکا دے گی اور مجھے اجازت نہیں ملے گی۔“

مجھے ہنسی آگئی۔ ”بہکا دے گی.... یہ تو شیطان کا کام ہے۔“

”تو وہ کسی سے کم ہے۔“ نومی نے دانت پیسے۔ ”اس کے ڈر سے میں اپنے دوستوں سے بھی چھپ کر بات کرتا ہوں اور اسے اپنے موبائل کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا وہ میرے ایس ایم ایس پڑھ لے گی۔ ایک بار اسے میرے پروگرام کی بھنک پڑ گئی تو وہ میری زندگی حرام کر دے گی۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

”دادا جان، پلیز اسے مت بتائیے گا۔“ نومی نے التجا کی۔

”تم فکر مت کرو برخوردار اسے نہیں بتاؤں گا اور تم بے فکری سے تیاری کرو اگر اجازت کا مسئلہ ہوا تو میں تمہارے ماما، پاپا کے فیصلے کو ویٹو کر دوں گا۔ رومی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ڈنکے کی چوٹ پر جاؤ۔“

نومی کا چہرہ چمک اُٹھا۔ ”تھینک یو دادا جان۔“

رات کو کھانے کے بعد رومی برہم سی میرے سر پر موجود تھی۔ ”دادا جان وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔“

”بھئی مجھے تو سچ لگ رہا ہے۔ وہ تمہارے خوف سے اپنا پروگرام چھپا رہا تھا۔“

”وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ رومی نے ضدی لہجے میں پاؤں پٹخ کر کہا۔ اتنے میں نومی اندر آیا۔

”یہ خود جھوٹی ہے دادا جان، بچپن سے میری جھوٹی شکایتیں کر کے مار پڑوائی آئی ہے اور اب بے عزتی کرائی ہے۔“

”تم ہو ہی اس قابل۔“ رومی غرائی۔

”دادا جان....“ نومی نے فریادی لہجے میں کہا۔ ”اب یہ میری کردار کشی پر اُتر آئی ہے۔“

”رومی۔“ میں نے تنبیہ کی۔

”سوری دادا جان۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے لیکن اس نے مجھ سے کیوں چھپایا؟“

”تم میری بزرگ ہو نا جو تمہیں ہر بات بتاؤں اور اپنی جان عذاب میں ڈالوں۔“

اس سے پہلے کہ جھگڑا مزید بڑھتا میں نے دونوں میں صلح کرادی۔ رومی کو اب بھی یقین نہیں تھا لیکن وہ مجبور تھی جب میں دادا بنتا تو انہیں میری بات ماننا ہی پڑتی تھی۔ میں رومی کے اضطراب کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ پاگل لڑکی نومی کو پسند کرنے لگی تھی۔ دونوں بچپن سے ساتھ ساتھ رہے ایک ساتھ کھیلتے تھے اور ہر کھیل میں پارٹنر بنتے تھے۔ ایک طرح سے قدرت انہیں لائف پارٹنر کے طور پر تیار کر رہی تھی۔ نومی کا مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن رومی خواب دیکھنے لگی تھی اور اسی وجہ سے نومی کے سلسلے میں اتنی حساس ہو رہی تھی۔ نومی کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ مگر رومی اپنی محبت اور محبت کے شک کی وجہ سے مجبور تھی۔ بہرحال، ان کا جھگڑا ختم ہوا تو انہوں نے ایک دوسرا موضوع تلاش کر لیا۔

”دادا جان..... کبھی آپ نے محبت کی ہے؟“

میں اس اچانک حملے سے گڑبڑا گیا تھا۔ سوال رومی نے کیا تھا۔ وہ اپنی جھنجلاہٹ کا رُخ میری طرف موڑ رہی تھی۔ ”بھئی..... وہ تمہاری دادی سے کی تھی شادی کے بعد.....“

”نہیں دادا جان، ہم شادی سے پہلے والی محبت کی بات کر رہے ہیں۔“ نومی نے رومی کا ساتھ دیا۔ برخوردار اچھا صلہ دے رہے تھے جان بچانے کا۔ ان کے مشترکہ حملے سے بچنے کے لیے مجھے دادا بننا پڑا تھا۔ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔

”میرا خیال ہے یہ سوال آپ دونوں کو زیب نہیں دیتا، ٹھیک ہے ہم میں دوستوں والی بے تکلفی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ حدِ ادب بھول جائیں۔“

”سوری دادا جان۔“ دونوں ایک آواز ہو کر بولے

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

تو میں مسکرانے لگا۔

”گڈ۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا سوال اُدھار رہا اس کا جواب کبھی بعد میں دوں گا۔“

وہ دونوں خوش ہو گئے، نومی نے چہک کر کہنا چاہا۔ ”اس کا مطلب....“

میں نے گھورا تو اس کی زبان بند ہو گئی۔ ”کوئی مطلب نہیں ہے اب آپ دونوں جا سکتے ہیں۔“

رومی اٹھارہ سال کی تھی اور گریجویشن کے پہلے سال میں تھی۔ جبکہ نومی نے ابھی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ وہ ایم سی ایس کر رہا تھا۔ اسے شروع سے کمپیوٹر کا خبط تھا اور اس نے نہ جانے کتنے کورس کر رکھے تھے۔ اب وہ ایم سی ایس کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ کسی سافٹ ویئر ہاؤس میں کام بھی کر رہا تھا۔ صبح یونیورسٹی جاتا تھا اور شام کو جاب پر چلا جاتا تھا۔ اس روز چھٹی تھی اس لیے وہ گھر پر تھا۔ رومی اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر اس کے خلاف بات کر جاتی تھی، ورنہ نومی گھر میں ہوتا تو وہ بھی حد میں رہتی تھی۔ بات ان کی آپس کی چپقلش سے شروع ہوئی تھی لیکن اس نے میرے اندر سوئی برسوں پُرانی چپقلش جگا دی تھی۔ اس وقت میں نے ان کو ٹال دیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا ایک بار دو بار ٹالا جا سکتا تھا مستقل ٹالنا بہت مشکل تھا۔ اگرچہ میں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں ممکن حد تک ٹالتا رہوں گا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھول جاتے۔ مگر ایک فون کال نے گڑبڑ کر دی۔

میں عصر کی نماز پڑھ کر گھر آیا کیونکہ چھٹی کا دن تھا اور سب گھر میں موجود تھے۔ لان میں چائے پی جا رہی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا چند منٹ بعد رومی اندر سے کارڈلیس لے کر آئی۔ ”دادا جان آپ کی کال ہے، فرانس سے کوئی سلویا بات کر رہی ہیں۔“

فرانس سے کوئی سلویا بات کر رہی تھی یہی چونکانے کے لیے کم نہیں تھا لیکن اس سے زیادہ وہ لوگ میرے تاثرات دیکھ کر چونک گئے۔ میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”سلویا....“ اور رومی سے کارڈلیس لے لیا۔ ”ہیلو ....کون بات کر رہا ہے۔“

”ظالم اتنی جلدی بھول بھی گئے۔“ وہی شوخ کھنکتی آواز آئی جسے میں نے تقریباً نصف صدی قبل پہلی بار سنا تھا۔ ”تم نے تو کہا تھا مرتے دم تک نہیں بھولو گے۔“

”سلویا....یہ تم ہو۔“ میں نے بے یقینی سے کہا اور بچوں سے ذرا دور چلا گیا، اس کم بخت کارڈلیس کی آواز کچھ زیادہ ہی تیز تھی اور پھر وہاں موجود سب لوگ کچھ زیادہ ہی ہمہ تن گوش تھے۔ اوپر سے سلویا کی بے تکلفی....وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ جذبوں کے اظہار میں پُرجوش اور بے باک، حالانکہ یہ قصہ نصف صدی پُرانا ہو گیا تھا۔

”ہاں، صبیح ڈیئر میں سلویا ہوں ....وہی سلویا جو آدھی صدی پہلے تمہاری محبوبہ تھی۔“

وہ کم بخت فون پر ہی سارے انکشافات کرنے پر تلی ہوئی تھی شکر ہے اب میرے آس پاس کوئی نہیں تھا، پھر میں نے دیکھا رومی غائب تھی اور وہ یقیناً اندر کسی ایکس ٹینشن سے کان لگائے کھڑی ہو گی۔ ”سلویا اب تم کہاں ہو اور اتنے عرصے بعد میری یاد کیسے آئی؟“

”میں فرانس میں ہوں، گرینی بن گئی ہوں اور اب مرنے سے پہلے ایک بار پھر تم سے ملنا چاہتی ہوں اور ان جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں میں نے تین سال گزارے تھے۔“

میرا دل رک گیا۔ ”مرنے سے پہلے....کیا مطلب؟“

”مطلب یہ فرانس میں عورتوں کی ایوریج عمر سے اوپر جا چکی ہوں اور کسی وقت بھی خاتمہ ہو سکتا ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”تم فکر مت کرو مجھے کچھ ہوا نہیں ہے۔“

”تو تم یہاں آ رہی ہو؟“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”کب....اور تمہیں میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟“

”انٹرنیٹ سے ....آن لائن فون ڈائریکٹری میں تمہارا نام ڈالا تو یہ نمبر نکل آیا۔ میں نے نمبر ملایا تو تم سے بات ہو گئی....دیکھا آج کل کسی کو تلاش کرنا کس قدر آسان کام ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے بے خیالی سے کہا۔ ”جیسے نصف صدی پہلے کسی کو کھو دینا کس قدر مشکل کام تھا۔“

”قنوطی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر ہنسی۔ ”ہم نے زندگی سے اپنا اپنا شیئر لے لیا ہے اس لیے شکوہ کس بات کا؟“

اس کی بات پر میں شرمندہ ہو گیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو واقعی ہم اپنا شیئر لے چکے ہیں....خیر چھوڑو یہ بتاؤ کب آ رہی ہو؟“

”کل کی فلائٹ ہے۔“

”تم نے سیٹ پہلے بک کرا لی تھی؟“ میں نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

”ہاں....اگر تمہارا نمبر نہیں ملتا تو میں تمہیں وہاں آ کر تلاش کر لیتی۔ کراچی کوئی بہت بڑا شہر تو نہیں ہے۔“

وہ کر سکتی تھی وہ اتنی ہی خود اعتماد تھی۔ ہر کام تیزی سے اور اچانک کرنے والی۔ وہ ایک تیز اور ترقی کا عزم رکھنے والی قوم کی فرد تھی۔ جتنی دیر میں ہم سوچتے ہیں اتنی دیر میں وہ کام کر جاتی تھی۔ سلویا نے کال کاٹ دی تھی میں بچوں کی طرف آیا۔ سب منتظر تھے کہ میں انہیں سلویا کے بارے میں بتاؤں۔ ”سلویا میری یونیورسٹی فیلو تھی، ایکس چینج پروگرام کے تحت فرانس سے ایم فل کرنے یہاں آئی تھی۔ میرے ساتھ ہی ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔“

”آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا بابا جان؟“ شفیع نے کہا۔

”یونیورسٹی میں بے شمار فیلوز تھے جن کا میں نے تم سے ذکر نہیں کیا اس وقت غیر ملکی طلبا بھی بڑی تعداد میں آتے تھے۔“

شفیع اور فصیح تو مطمئن ہو گئے ان کی بیویاں بھی سادہ تھیں۔ اس طرح دوسرے بچے بھی آسانی سے مان جانے والے تھے لیکن مجھے یقین تھا رومی اور نومی اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ میری توقع کے عین مطابق وہ رات کے کھانے کے فوراً بعد نازل ہو گئے تھے۔ رومی نے چالاکی سے کام لیا تھا اور میرے لیے پسندیدہ الائچی والا سبز قہوہ بنا کر لے آئی تھی۔ ”دادا جان، یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔“

”دادا جان، آپ کیسے ہیں؟“ نومی نے سعادت مندی سے پوچھا۔

وہ دونوں مشترکہ طور پر مجھے قہوہ پلانے اور میری خیریت دریافت کرنے نہیں آئے تھے۔ ان کا مقصد سلویا کے بارے میں جاننا تھا اور وہ اس سے میرے رشتے کا کھوج لگانے آئے تھے۔ مجھے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے کیونکہ میں خود ہتھیار ڈالنا چاہتا تھا۔ نصف صدی کے اس بوجھ میں کسی کو شریک کرنا چاہتا تھا اور اپنے بچوں سے بہتر شریک اور کون ہو سکتا تھا؟

☆☆☆

میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھا تھا۔ یہ شعبۂ اردو کی عمارت تھی۔ میں نے اردو ادب کے لیے ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔ ایک آمر نے ملک کے اقتدار پر شب خون مارا تھا اور پھر دارالحکومت عوام سے دور لے گیا تھا۔ ہنگامے تازہ تازہ ختم ہوئے تھے اور شہر کی فضاؤں میں اُداسی تھی۔ میں گریجویشن کے بعد فارغ تھا لیکن نوکری کے بجائے میں نے ماسٹر میں داخلہ لے لیا۔ کلاسز شروع ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا اور نئے طلبا کی آمد جاری تھی۔ ان میں غیر ملکی طلبا اور طالبات بھی تھے جو اردو سیکھنے آئے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھے عمار حسن شکوہ کر رہے تھے کہ مقامی لڑکیوں کو تو چھوڑو غیر ملکی خواتین میں بھی ایک ڈھنگ کی صورت نہیں ہے۔ اسی لمحے ہماری توجہ اس غیر ملکی خاتون کی طرف گئی۔ اس کا رنگ و روپ بتا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے۔ اس نے سفید اسکرٹ اور اسی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پنڈلیوں تک آ رہا تھا اور بلاؤز ہاف سلیو تھا۔ بہت دل کش نقوش اور نہایت متناسب جسامت تھی۔ گھنگھریالے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں موجود بیگ بتا رہا تھا وہ بھی طالبہ تھی اور شاید ہمارے شعبے کی تھی۔ ورنہ اس جگہ کیوں پائی جاتی؟ میں نے عمار سے کہا۔

”لو بھائی تمہارا شکوہ دور ہو گیا۔“

”ممکن ہے یہ ہمارے شعبے کی نہ ہو؟“ کمال شاہ نے امید و یاس کے ساتھ کہا۔

”بھائی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر کہا۔ ”بلکہ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔“

وہ ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔ شاید اسے کسی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے نئی تھی۔ اس نے پاس آتے ہی پُرزور انداز میں ”السلام وعلیکم“ کہا۔ ہم سب نے اتنا ہی پُرجوش جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے فرانسیسی میں لمبی چوڑی بات کی۔ فرانسیسی مختصر بات نہیں کر سکتے۔ ان کا شمار دنیا کی چند باتونی اقوام میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی فرانسیسی ہمارے سروں سے گزر گئی۔ عمار نے کہا۔ ”یہ تو فرنچ ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”نو فرنچ....“

”میں تھوڑا اردو جانتا۔“ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”اب ہم آپ کی مدد

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کر سکتے ہیں۔“

وہ وہیں بیٹھ گئی اور اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام سلویا ہنائر تھا اور وہ فرانس کے شہر لیون سے آئی تھی۔ لیون یونیورسٹی اور ہماری یونیورسٹی کے درمیان طلبہ کا تبادلہ ہوا تھا وہ اسی کے تحت یہاں آئی تھی۔ اس نے اردو ادب کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ پڑھنے کی حد تک اسے اردو اتنی ہی آتی تھی جتنی کہ ہمیں آتی تھی اور اس نے اچھا خاصا اردو ادب پڑھ رکھا تھا۔ عمار حسن نے شاید امتحان کے لیے اس سے کچھ سوالات کیے تو اس نے اتنے مفصل جواب دیئے کہ ہم اس کے دعوے کے قائل ہو گئے۔ وہ صرف بولنے میں کمزور تھی۔ وہ ایک دن پہلے یہاں آئی تھی اور غیر ملکی طلبا کے ہاسٹل میں رکی تھی۔

”میں چاہتی ہوں مجھے چند اچھے دوست مل جائیں، جو یہاں کے معاملات میں میری مدد کریں اور مجھ سے دوستی میں جنس کی غرض نہ رکھیں۔“ یہ بات اس نے اتنی سادگی سے کہی کہ ہم سب بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ایک صاف گو معاشرے کی فرد تھی اس لیے یہ بات کہہ گئی۔ ہمارے ہاں کوئی لڑکی کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو اس قسم کا سوال لڑکوں سے نہیں کر سکتی تھی۔ بے شک وہ دل میں خیال بھی کرتی ہو۔ مگر شرم و حیا کے ساتھ ہماری مخصوص معاشرتی منافقت بھی اس کی زبان بند کر دیتی۔ یہی منافقت ہم لڑکوں میں بھی تھی۔ ہم زبان سے لڑکیوں کو کولیگ اور کلاس فیلو قرار دیتے لیکن ہمارے نزدیک ان کی اوّلین حیثیت ایک عورت کی ہوتی۔ سلویا کی بات نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں سب کی بات نہیں کرتا لیکن اپنی حیثیت میں یقین دلاتا ہوں کہ اس حوالے سے تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

وہ مسکرائی تو اس کے بہت خوب صورت اور چمکیلے دانت نمایاں ہونے لگے۔ عمار کچھ دیر بعد بولا۔ ”مس سلویا تم نے بہت کڑی شرط لگا دی ہے لیکن ہم بھی پاکستانی ہیں جب کسی سے عہد کرتے ہیں تو جان دے کر بھی نبھاتے ہیں۔“

بلاشبہ وہ حد درجے خوب صورتی رکھتی تھی۔ اپنے نقوش میں اور اپنے بدن میں۔ لیکن اس روز ہم تینوں نے اس سے جو عہد کیا تھا اس پر آخر تک قائم رہے۔ وہ خود یہ خود ہمارے گروپ کا حصہ بن گئی۔ ہم تین کے ساتھ وہ واحد لڑکی تھی۔ پھر غیر ملکی اور دلکش بھی تھی اس لیے ہمیں حاسدوں کی بہت ساری بکواس بھی سننا پڑی تھی۔ کئی بار ہماری لڑائی ہوئی اور ایک بار تو کمال شاہ نے ایک لڑکے کا سر پھاڑ دیا تھا جس نے سلویا کے حوالے سے نہایت نازیبا بات کی تھی۔ حالانکہ چند دنوں میں ہم جان گئے تھے کہ وہ کردار کی اتنی ہی شریف تھی جتنی ہماری کوئی لڑکی ہو سکتی ہے۔

پہلے دن وہ اسکرٹ پہن کر آئی تھی کیونکہ اس کے پاس مقامی لباس نہیں تھے۔ اگلے دن ہم نے اسے لے جا کر سب سے پہلے شاپنگ کرائی اور اسے لباس بھی دلوائے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ مقامی لباس میں ہی یونیورسٹی آئی۔

وہ ایک آزاد معاشرے کی پروردہ تھی اس لیے اس کی چال ڈھال اور ہنسنے بولنے کا انداز ویسا ہی آزادانہ تھا۔ یہ بات ہمارے ہاں ان لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی تھی جو اپنے ذاتی کردار کی گندگی نظر انداز کر کے یہی گندگی منہ کے راستے دوسروں پر اُچھالتے تھے۔ ان کے نزدیک سلویا ایک آبرو باختہ لڑکی تھی اور اس کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔ لڑکیوں کے بجائے تین لڑکوں سے گیدرنگ کر کے اس نے لڑکیوں کو بھی اپنے خلاف کر لیا تھا اس لیے اب اسے سوائے ہم تینوں کے کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اوباش قسم کے لڑکے اس کی قربت حاصل کرنا چاہتے تھے اور جب انہیں ناکامی ہوتی تو وہ گھٹیا حرکتوں پر اُتر آتے تھے۔ شروع میں اس وجہ سے بہت جھگڑے ہوئے، پھر سلویا نے ہمیں روک دیا۔

”سنو، جب میں پروا نہیں کرتی ہوں تو تم کیوں کرتے ہو؟“

”کیونکہ ہمارے ہاں عزت کا مسئلہ زندگی و موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔“ کمال شاہ نے وضاحت کی۔ ”اس پر خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور بعض اوقات تو نسل در نسل قتل ہوتے ہیں۔“

سلویا حیران ہوئی تھی۔ ”میرے خدا... لیکن ایسا یقیناً تم اپنی عورتوں کی عزت کی وجہ سے کرتے ہو۔ لیکن میں پاکستانی اور مسلمان نہیں ہوں بلکہ کرسچن اور فرانسیسی ہوں ہمارے ہاں عزت کا معیار تمہارے ہاں سے مختلف ہے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ہم فرانس میں ہوتے اور وہاں تم سے دوستی ہوتی۔ کوئی تمہارے اور ہمارے بارے میں اس قسم کے جملے کہتا تو شاید جھگڑے کی نوبت نہیں آتی۔ وہاں ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں ایسی باتوں کو چپڑاسی سے لے کر وی سی تک سب اہمیت دیتے ہیں۔“

”مگر تم لوگ میری خاطر جھگڑا مت کرو۔“ اس نے رسانیت سے کہا۔ ”میں چند سال کے لیے آئی ہوں پھر چلی جاؤں گی۔ تم لوگوں کو یہیں رہنا ہے۔“

”لیکن تم کیا تاثر لے کر جاؤ گی کہ ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکے۔“

وہ مسکرائی۔ ”میں تم لوگوں کے ساتھ خود کو اتنا ہی محفوظ تصور کرتی ہوں جتنا اپنے ملک اور شہر میں تھی۔“

سلویا کے اصرار پر ہم نے لوگوں کی باتوں کا نوٹس لینا چھوڑ دیا۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا پہلے ہمارے ردِعمل سے زبانیں ذرا خاموش رہتی تھیں خاص طور سے کمال سے سب ڈرتے تھے وہ وڈیرہ خاندان سے تھا اور پھر ہاتھ چھوٹ بھی تھا۔ کم میں اور عمار بھی نہیں تھے مگر ہم پہلے زبان سے سمجھاتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ ہم نے لوگوں کی باتوں کا نوٹس لینا چھوڑا تو ان کی زبانیں مزید کھل گئیں اور جو پہلے ذرا ڈر کر چپ رہتے تھے اب وہ بھی بولنے لگے۔ بعض اوقات تو ہمارے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اگر سلویا نے قسم نہ دے رکھی ہوتی تو شاید اسپتال اور تھانے تک کی نوبت آجاتی۔ پھر باتوں کا یہ طوفان رفتہ رفتہ تھمنے لگا۔ دوسرا سمسٹر ختم ہوتے ہوتے لوگ تقریباً چپ ہو گئے تھے۔

اچانک پتا چلا کہ کمال کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ اسے خود اچانک پتا چلا تھا اس نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کے خاندان میں شادیاں وفات کی طرح ہوتی ہیں اچانک اور ناگہانی۔ کمال کے لیے اس کی چچا کی بیٹی لی گئی تھی جو عمر میں اس سے چار سال بڑی تھی اور اس نے اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ سلویا حیران تھی۔ ”تم اس سے شادی کر لو گے؟“

”مجبوری ہے بابا کا فیصلہ ہے۔“

سلویا کے لیے یہ سب ناقابلِ یقین تھا۔ یہاں ماں باپ اتنے بڑے لڑکے کی شادی اس سے پوچھے بغیر اور اس کی مرضی کے خلاف کر رہے تھے اور وہ چوں بھی نہیں کر رہا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ تو اس سے کہیں زیادہ ہو سکتا تھا۔ سلویا کمال کی شادی میں گئی تھی۔ اس نے وہاں بہت انجوائے کیا تھا مگر اسے مقامی رسم و رواج خاص طور سے عورتوں کی حالت اور بے بسی نے شاک بھی پہنچایا تھا۔ واپسی میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”ہماری آزادی....“

”یہ آزادی ہے؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”ہاں مردوں اور بڑوں کو سب کرنے کی آزادی۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے ہاں شخصی آزادی ہے تو ہمارے ہاں خاندانی آزادی ہے۔ وہاں تم اپنی بربادی کا فیصلہ خود کرتے ہو اس لیے مطمئن ہو۔ یہاں ہماری بربادی کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں اس لیے ہم غیر مطمئن ہیں۔“

سلویا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، بربادی تو ہر صورت ہے۔ ہمارے ہاں بھی لوگوں کے ہاتھ آخر میں خسارہ ہی آتا ہے۔“

”ہمیں بس یہ اطمینان ہے کہ ہمارے ساتھ جو ہوا اس میں ہمارا قصور کم ہے۔ ہم کسی کو الزام تو دے سکتے ہیں۔ ہیں۔“

اس نے سرد آہ بھری۔ ”ہم کسی کو الزام نہیں دے سکتے۔“

”شخصی آزادی کے بہت سے فوائد ہیں تو بہت سے نقصانات بھی ہیں۔ جیسے معاشرتی پابندیوں کے بہت سے فوائد ہیں تو نقصانات بھی ہیں۔“

”لیکن میں نے اتنی شدید پابندی کا سوچا بھی نہیں ہے۔“ وہ جھرجھری لے کر بولی۔

”کمال شاہ اور اس کا خاندان صرف ایک مثال ہے، ورنہ ہمارے ہاں اس سے بھی بدتر مثالیں ہیں اور تمہیں بہت سے معتدل خاندان بھی ملیں گے جہاں پابندی اور آزادی دونوں ہوتی ہیں۔“

”جیسے تمہارا گھر ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے بتایا کہ تمہارے والد علی گڑھ سے پڑھے ہوئے ہیں اور انہوں نے پاکستان موومنٹ میں بھی حصہ لیا تھا۔“

”اسی وجہ سے وہ ہجرت کر کے یہاں آنے پر مجبور ہوئے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”تمہارے ہاں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں؟“

”ہاں، میری دونوں بہنیں کالج میں پڑھ رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

ہیں۔ تعلیم کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں تبدیلی آ رہی ہے۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تم مجھے اپنے گھر لے چلو گے۔ تم نے آج تک مجھے اپنے گھر چلنے کو نہیں کہا۔"

مجھے شرمندگی ہوئی۔ یہ حقیقت تھی میں نے ایک بار بھی اسے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ "دراصل ہم روز ہی مل لیتے ہیں اس لیے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ لیکن اب لے چلوں گا۔ اس اتوار کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں ضرور چلوں گی۔" وہ خوش ہوگئی۔

اس سے پہلے بھی مجھے کئی بار خیال آیا کہ اسے اپنے گھر لے جاؤں لیکن اماں بی کا سوچ کر ہمت جواب دے جاتی۔ جتنی قدامت کمال شاہ کے سارے خاندان میں تھی اتنی قدامت اکیلی اماں بی میں عورتوں کے حوالے سے تھی۔ ان کا تعلق ایک روایتی نواب خاندان سے تھا جس میں مرد تو شتر بے مہار ہوتے تھے لیکن عورتوں پر کسی غیر محرم کی نظر پڑ جانا قیامت سے کم نہیں ہوتا تھا اور اس چیز کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ دین تو مرد عورت کے لیے یکساں ہے۔ مگر اماں بی کے خاندان میں پردے اور غیر مردوں سے میل جول کے حوالے سے اس کا اطلاق صرف عورتوں پر ہوتا تھا۔ اماں بی اس ماحول کی تربیت یافتہ تھیں۔ پھر ان کی شادی ابا جان سے ہوگئی جو عورتوں کے لیے نہایت روشن خیال تھے اور عملی طور پر سرسید کی تحریک کے مبلغ تھے۔ انہوں نے تو اماں بی کی دوبارہ تربیت کرنے کی کوشش کی یعنی انہیں پڑھانا چاہا تھا لیکن اماں بی نے ان کی ساری کوششیں ناکام بنادیں۔ تھک ہار کر ابا جان نے اپنی کوششوں کا مرکز اپنی اولاد کو بنالیا۔ انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی اور آج ہم جس مقام پر تھے وہ سب ابا جان کی محنت اور تربیت کا اثر ہے۔ میرے دو بڑے بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت اچھے مقام پر تھے۔ اسی طرح میری دونوں بہنیں کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ جب ابا جان نے انہیں اسکول میں داخل کرایا تو اماں بی نے بہت واویلا مچایا۔ لڑکیوں کی تعلیم انہیں گوارہ نہیں تھی لیکن ابا جان نے ان کی ایک نہیں سنی۔

تعلیم کے معاملے میں اماں بی کی نہیں چلی تھی لیکن گھر تو ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے انہوں نے مخصوص ماحول بنایا تھا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو گھر میں نہایت مؤدب اور نستعلیق بن کر رہنا پڑتا تھا۔ لڑکیوں پر پابندیاں شدید قسم کی تھیں جن میں اوڑھنے پہننے، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور سونے جاگنے پر نظر رکھی جاتی تھی۔ اماں بی کسی سخت مزاج جیلر کی طرح بیٹیوں کی نگرانی کرتی تھیں۔ ابا جان ان کی پابندیوں پر جزبز ہوتے تھے لیکن ایک حد سے زیادہ ان کے معاملے میں دخل بھی نہیں دے سکتے تھے، ورنہ اماں بی ہتھے سے اُکھڑ جاتی تھیں اور ان کا نوابی خون جوش میں آجاتا تھا۔ انہوں نے ابا جان سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے لڑکیوں کی تربیت کے معاملے میں مداخلت کی تو ان کا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔

یہ سب بتانے کا مقصد اپنے گھر کے ماحول کو بیان کرنا ہے جہاں سلویا جانے کی بات کر رہی تھی۔ اماں بی غیر مسلموں کے معاملے میں اتنی سخت تھیں کہ گھر میں آنے والا جمعدار ایک حد سے آگے نہیں آ سکتا تھا اور وہ غلطی سے بھی کسی چیز کو چھو لیتا تو وہ پھر گھر میں نہیں رہتی تھی۔ غیر مسلموں کے بارے میں ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ وہ مجسم ناپاک ہیں۔ سلویا کے ساتھ گھر میں جو ہوتا اس کا مجھے اندازہ تھا لیکن اب یہ میری انا کا مسئلہ بھی تھا اور میں خود سلویا کو دعوت دے چکا تھا اور وہ قبول بھی کر چکی تھی۔ میں نے ابا جان سے بات کی۔ وہ بھی متفکر ہو گئے۔ "بیٹا مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم اپنی ماں کو جانتے ہو۔"

"جی ابا جان.... لیکن میں اسے زبان دے چکا ہوں اب یا تو وہ یہاں آئے گی یا پھر میں کہیں اور چلا جاتا ہوں اور اسے وہاں بلا لوں کہ یہ میرا گھر ہے۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔" ابا جان نے سوچ کر کہا۔ "میں تمہاری ماں سے بات کرتا ہوں۔"

حسبِ توقع اماں بی یہ سنتے ہی ہتھے سے اُکھڑ گئی تھیں کہ میرے ساتھ پڑھنے والی ایک غیر ملکی لڑکی گھر آ رہی تھی۔ انہوں نے فوراً انکار کر دیا۔ "وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔"

"اماں بی۔" میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "وہ بہت اچھی لڑکی ہے بالکل ہماری مشرقی لڑکیوں کی طرح۔"

"مشرقی لڑکی.... غیر مردوں کے ساتھ پڑھ رہی ہے اور یہاں اکیلی رہتی ہے۔" اماں بی نے طنز کیا۔ "پھر بھی شریف ہے۔"

"اماں، وہ فرانسیسی ہے اور وہاں کے معاشرے کے لحاظ سے شریف ہی ہے۔"

"میرے جیتے جی اس گھر میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔" اماں بی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر رکھے لیکن اب یہ میری زبان کا معاملہ ہے۔ میں اسے گھر بلا چکا ہوں۔ اگر یہ گھر آپ کا ہے تو میں اپنے لیے الگ گھر کا بندوبست کرتا ہوں۔"

اماں بی فکرمند ہو گئیں۔ "تو گھر چھوڑ کر چلا جائے گا؟"

"مجبوری ہے اماں بی.... اس مقدس جگہ کوئی ناپاک ہستی قدم نہیں رکھ سکتی ہے حالانکہ ہمارا مذہب چھوت چھات نہیں سکھاتا ہے اور غیر مسلموں سے تو ہمارے نبیؐ بھی میل جول رکھتے تھے۔"

اماں بی نرم پڑ گئیں۔ "وہ تو الگ ہی ہستی ہیں۔"

"اماں بی ہم مسلمانوں کا یہ تو المیہ ہے کہ جب اسلام پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم انہیں الگ ہستی قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ ہی ہمارے لیے اسلام لائے تھے۔ مگر آپ نے فیصلہ سنا دیا ہے اور مجھ میں سرتابی کی مجال نہیں ہے...."

"اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ اپنے فیصلے خود کر سکو گے۔" اماں بی خفگی سے بولیں۔

"میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہوں۔"

ابا جان نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ کچھ دیر میں ابا جان نے مجھے طلب کیا۔ "تمہاری ماں مان گئی ہے لیکن اس کی شرط ہے کہ وہ نشست گاہ تک محدود رہے گی اور گھر کی کوئی عورت اس سے نہیں ملے گی۔"

"یہ تو گھر بلا کر بے عزتی کرنے والی بات ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ میں اسے صاف انکار کر دوں۔"

بڑی مشکل سے اماں بی مانیں کہ وہ گھر بھی دیکھے گی اور بہنوں سے بھی ملے گی۔ اماں بی نے اپنے لیے صرف سلام کی اجازت دی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اتنا بھی بہت تھا۔ سلویا کو گھر لانے سے پہلے میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے گھر کے ماحول کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا، ویسے وہ کمال شاہ کا گھر بھی دیکھ چکی تھی اس لیے اس نے خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ کمال شاہ کے گھر میں اسے پوری عزت ملی تھی اور وہاں عورتوں نے بھی اس کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ لیکن یہاں اماں بی کی طرف سے خدشہ تھا کہ ان کا رویہ اسے دل برداشتہ کرے گا۔ اماں بی کی وجہ سے بہنیں بھی اس سے ٹھیک سے نہیں ملیں گی۔ بہرحال، اسے گھر لانے کی اجازت مل گئی تھی، یہی بڑی بات تھی۔

اتوار کو میں اسے لینے ہاسٹل پہنچا۔ وہ تیار تھی مجھے حیرت ہوئی جب میں نے اسے فراک اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ بڑی سی چادر میں ملبوس پایا اور اس نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ سوائے اس کے چہرے کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اسے لے کر گھر پہنچا تو وہ سب سے پہلے اماں بی کو سلام کرنے گئی۔ دونوں بہنیں اسے اندر لے گئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ میں ہی واپس آجائے گی اور پھر میری بہنوں کے ساتھ رہے گی۔ جس کی اماں بی نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ میں جان بوجھ کر اسے ذرا دیر سے لایا تھا تاکہ دوپہر کے کھانے کے بعد میں جلد اسے واپس لے جا سکوں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ خود بھی زیادہ دیر وہاں رکنا پسند نہیں کرے گی کیونکہ اسے محسوس ہو جائے گا کہ یہاں اسے دل سے خوش آمدید نہیں کہا گیا ہے۔

مگر آدھے گھنٹے بعد میری چھوٹی بہن کوثر میرے کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے پر بڑے شریر قسم کے تاثرات تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "بھائی یہ آپ کس جادوگرنی کو لے آئے ہیں۔"

"کیوں خیریت؟"

"اس نے اماں بی کو چند منٹ میں یوں قابو کیا ہے کہ اب وہ اسے اپنے پاس سے اُٹھنے نہیں دے رہی ہیں، صدقے واری جا رہی ہیں۔"

کوثر کے ساتھ اسما بھی آ گئی۔ وہ اپنی ہنسی روک رہی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "بھائی جان مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"کہیں آپ کسی خاص مقصد سے تو نہیں لائے ہیں ان صاحبہ کو۔"

www.paksociety.com

''تم دونوں چڑیلوں کے دماغ میں بس اتنی سی بات آسکتی ہے۔ بھئی وہ میری یونیورسٹی فیلو ہے اور بس۔''

سلویا نے کھانا بھی عورتوں والے حصے میں کھایا۔ اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی تھی کہ اماں بی نے اس کے ساتھ بیٹھ کر کھا کیسے لیا۔ کھانے کے بعد بھی وہ خاصی دیر اماں بی کے ساتھ رہی تھی کوثر اور اسما بھی اس کے ساتھ لگی رہی تھیں۔ جب وہ جانے لگی تو اماں بی نے اسے سو روپے کے ساتھ ایک سوٹ، ایک چادر اور ایک چپل تحفے میں دی تھی۔ اسما اور کوثر نے اسے چوڑیاں اور کچھ جیولری گفٹ کی تھی۔ وہ بہت خوش تھی، سارے راستے وہ میرے گھر والوں کی تعریف کرتی رہی تھی۔ یونیورسٹی میں اُتر کر میں اسے ہاسٹل تک چھوڑنے گیا۔ رکشے میں شور کی وجہ سے بات نہیں ہوئی تھی یہاں میں نے پوچھا۔ ''اماں بی اور دوسرے تم سے ٹھیک سے ملے؟''

''وہ اتنی محبت سے ملے کہ میں بتا نہیں سکتی۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''جب اماں بی نے مجھے گلے لگایا تو پتا نہیں کیا ہوا میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی رو دی، پھر تو انہوں نے مجھے گلے لگا کر اتنا پیار کیا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ شاید اس لیے کہ میری ماما کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب میں صرف تین سال کی تھی۔ مجھے پاپا نے پالا میں نے اماں بی کو اپنے بارے میں بتایا۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں نے کبھی نہ تو شراب پی اور نہ کبھی سور کا گوشت کھایا تو وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔ انہوں نے میرے لباس کی بھی بہت تعریف کی۔''

جب میں گھر واپس آیا تو میں نے اماں بی کو اس کی تعریف کرتے پایا کہ وہ فرانس جیسے آزاد خیال ملک کی لڑکی ہونے کے باوجود کتنی باوقار ہے کتنی اچھی طرح خود کو ڈھک چھپا کر آئی تھی۔ شکل صورت کی کتنی اچھی ہے۔ اپنی خوب صورتی کو کس طرح سنبھال کر رکھتی ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح نمائش کرتی نہیں پھرتی ہے۔ میں نے اماں بی سے پوچھا نہیں کہ کیا وہ دوبارہ اس گھر میں آسکتی ہے۔ انہوں نے خود مجھ سے کہا۔ ''صبیح اسے کہنا اس کا جب دل چاہے یہاں آجایا کرے، اب یہ اس کا اپنا گھر ہے۔''

''اماں بی، وہ کرسٹان ہے۔'' کوثر نے دبی زبان میں کہا تو اماں بی نے اسے گھورا۔

''تو اپنی زبان بند رکھ۔''

میں نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔ ''ٹھیک ہے بی اماں، میں اسے کہہ دوں گا۔''

ان دنوں ہمارا فائنل سمسٹر چل رہا تھا اس کے بعد میرا ارادہ تو کوئی نوکری کرنے کا تھا۔ سلویا ایم فل کرتی، وہ تین سال کے اسکالر شپ پر آئی تھی۔ کمال شاہ نے ماسٹر اُدھورا چھوڑ دیا تھا اور تیسرے سمسٹر میں ہی اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس چلا گیا تھا اس کا کہنا تھا جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ دوبارہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لے گا۔ عمار حسن بھی وقت گزاری کے لیے پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ کی ٹیکسٹائل مل تھی۔ اس کے بعد سلویا اور مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ اسے اپنے ہاں لے جاتا۔ ہمارے فائنل سمسٹر ہو گئے۔ جس دن ہم نے آخری پیپر دیا سب ہی اداس تھے۔ کینٹین میں بیٹھے چائے اور سموسے کھاتے ہوئے سلویا نے شکوہ کیا۔ ''میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔''

''ایسا نہیں ہے ہم تم سے ملنے آتے رہیں گے۔'' عمار نے اسے تسلی دی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''جھوٹ مت بولو تم اپنے باپ کے دفتر میں بیٹھو گے اور شام کو کلب چلے جاؤ گے جہاں حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں تمہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ سلویا نام کی کوئی دوست بھی ہے۔''

عمار کھسیا گیا کیونکہ سچ مچ اس کا ارادہ ایسا ہی تھا۔ سلویا نے میری طرف دیکھا۔ ''تم کیا کرو گے؟''

''میرے ابا جان کی کوئی مل نہیں ہے اس لیے میں کوئی نوکری تلاش کروں گا۔''

''میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ آجائے لیکن یہ مانتا نہیں ہے۔'' عمار نے سلویا سے شکایت کی۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''تم عمار کی بات کیوں نہیں مان رہے؟''

''بھئی میں اس کا دوست رہنا چاہتا ہوں ماتحت نہیں بننا چاہتا۔''

''یہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سلویا نے میری تائید کی۔ ''تم لوگوں کا رویّہ نان پروفیشنل ہے۔ یہاں لوگ دوستی اور ذمّے داریوں کو الگ الگ نہیں رکھتے ہیں۔''

''میں ایسا نہیں ہوں۔'' عمار نے احتجاج کیا۔

''تب تم کام میں مجھے رعایت دو گے اور یہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس لیے میں تمہاری نوکری قبول نہیں کر سکتا۔''

''مجھ سے ملنے آؤ گے؟'' سلویا نے مجھ سے پوچھا۔

''کوشش کروں گا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ورنہ ہفتے میں ایک بار تو ضرور آؤں گا۔''

میں نوکری کی تلاش میں لگ گیا اور سلویا سے ملنے کا موقع کم ملتا تھا۔ پہلی بار میں کوئی دس دن بعد اس سے ملنے گیا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کمزور اور پیلی ہو رہی تھی۔ ''یہ کیا.... تم بیمار رہی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''باری کا بخار آیا تھا دو دن پڑی رہی.... ابھی حالت سنبھلی ہے۔''

''تم میرے گھر چلو ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور تم یونیورسٹی آرہی ہو۔''

''نہیں چار دن کی چھٹی ہوئی ہے میرا بہت نقصان ہوا ہے اسے بھی پورا کرنا ہے۔''

''لیکن اس طرح تمہاری طبیعت پھر خراب نہ ہو جائے۔''

''میں اپنی حکومت کے خرچ پر یہاں آئی ہوں اور میرا فرض بنتا ہے میں ایم فل کر کے واپس جاؤں۔''

''یہ اچھی بات ہے لیکن صحت کی قیمت پر....''

''کچھ نہیں ہوتا مجھے میں بہت سخت جان ہوں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''جب میں پیدا ہوئی تو دوسری جنگِ عظیم کا پہلا سال تھا اور جب جنگ ختم ہوئی تو میں پانچ سال کی تھی۔ مجھے یاد نہیں لیکن اس دوران میں اتنا سخت وقت بھی دیکھا ہے کہ کئی کئی دن مجھے دودھ نہیں ملتا تھا۔''

اب میں روز اس سے ملنے جاتا تھا، اس کی طبیعت نہیں سنبھلی تھی۔ وہ کمزوری کے باوجود کلاسز اٹینڈ کر رہی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا ایک دن میں گیا تو وہ ڈیپارٹمنٹ میں نہیں تھی پتا چلا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ہاسٹل پہنچ گیا۔ وہاں مردوں کو لابی سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن سلویا کو پیغام بھیج دیا اور وہ ہانپتی ہوئی آئی۔ اسے پھر بخار ہو رہا تھا اور کمزوری کی وجہ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنکھیں اندر چلی گئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ آرام کرو لیکن تم....''

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔''

''تم نے شاید آئینہ نہیں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا اور پھر اس کی ایک سنے بغیر اس کا سامان منگوایا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ یہیں ڈاکٹر کو بلا کر اسے دکھایا تو اس نے نمونیہ تشخیص کیا۔ اماں بی نے سلویا کا چارج سنبھال لیا تھا۔ خاصی دیر تک وہ اسے ڈانٹتی رہی تھیں کہ جب اس کی ایسی حالت تھی تو وہ پہلے ہی کیوں نہیں ہمارے گھر آگئی تھی؟

''میں آپ لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

''بیٹیاں کبھی ماں باپ کو پریشان نہیں کرتی ہیں۔'' اماں بی نے محبت سے کہا۔ کوثر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''اتنی محبت سے اماں بی نے کبھی ہم سے بھی بات نہیں کی۔''

ڈاکٹر نے کم سے کم ایک ہفتہ مکمل آرام اور سادہ غذا کا مشورہ دیا۔ سلویا پریشان ہو گئی۔ ''میرا بہت نقصان ہوگا میں اتنا عرصہ بستر پر نہیں لیٹ سکتی۔''

کیوپڈ

محبت کے اس دیوتا کو یونانی اِیروز (Eros) اور رومن کیوپڈ (copid) کہتے ہیں لیکن اس کا رومن نام زیادہ معروف ہوا۔ یہ ایفروڈائٹ کی آوارگیوں کا نتیجہ تھا اور اس کے مارس سے تعلقات کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے محبت کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دیوتا اندھا تھا۔ اس کی تصویر ایک معصوم بچے کی ننگی تصویر ہوتی ہے جس کے ساتھ ایک ترکش اور ہاتھ میں کمان بنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے ترکش میں دو طرح کے تیر ہوتے تھے سنہرے اور آہنی۔ ان تیروں سے کیوپڈ، دیویوں، دیوتاؤں اور انسانوں کے سینوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کیوپڈ کے سنہرے تیروں کا نشانہ بننے والے اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن لوہے کے تیروں کا نشانہ بننے والے ناکام رہتے ہیں۔

کیوپڈ، سائیکی (psyche) سے محبت کرتا تھا لیکن اس کے پاس صرف رات کے وقت جایا کرتا تھا کیونکہ دن بھر ماں اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔

اسے پندرہ اولمپینز دیوتاؤں کا سب سے آخری دیوتا قرار دیا جاتا ہے تاہم بعض کے مطابق اولمپینز کی تعداد صرف بارہ تھی جبکہ باقی ان کے ماتحت دیوتا تھے اور ان کی طاقت و حیثیت اولمپینز کی نسبت بے حد کم تھی۔

مرسلہ: طاہر محمود، منڈی بہاالدین

www.paksociety.com

"ہونے دو نقصان۔" میں نے کہا۔

"نہیں صبیح تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میرے لیے صحت سے زیادہ اپنی تعلیم اہم ہے۔"

اس کی ضد دیکھتے ہوئے میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "تم فکر مت کرو تمہارا نقصان نہیں ہوگا۔"

وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کا نقصان کس طرح نہیں ہوگا۔

اس وقت میں نے اسے ٹال دیا۔ اگلے روز میں یونیورسٹی گیا اور اس کے تمام لیکچرز نوٹ کرکے لے آیا۔ میں ماسٹر کر چکا تھا اور تمام پروفیسر مجھے جانتے تھے۔ اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جب میں نے سلویا کو یہ نوٹس لے جا کر دیے تو وہ حیران ہوئی پھر میں نے اسے بتایا تو وہ خوش اور جذباتی ہوگئی۔ "صبیح تم میرے لیے کیوں اتنا سب کر رہے ہو؟"

"ہاں، تم میری دوست جو ہو اور دوست کے لیے آدمی سب کرتا ہے پھر یہ کون سا مشکل کام ہے؟"

"میں صرف دوست ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، دوستی سے بڑھ کر کون سا رشتہ ہو سکتا ہے؟" میں نے جواب دیا۔ سلویا دس دن ہمارے ہاں رہی اور میں دس دن تک اسے نوٹس اور کتابیں لا کر دیتا رہا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے پڑھ لیتی تھی۔ مسلسل علاج، آرام اور مناسب خوراک سے اس کی صحت بحال ہوگئی۔ رخساروں کی چمک لوٹ آئی تھی اور رنگت بحال ہوگئی تھی۔ اس کا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا جس طرح اماں بی اور بہنوں کا دل نہیں کر رہا تھا کہ وہ یہاں سے جائے لیکن اسے جانا تو تھا۔ میں اسے ہاسٹل تک چھوڑنے گیا تو وہ بہت اُداس تھی۔ ہم ایک درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ "کاش میں ہمیشہ اس گھر میں رہ سکتی۔"

میں ہنسا۔ "اماں بی، کوثر اور اسما کا بس چلے تو وہ بھی یہی کریں۔"

"اور تم۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ "کیا تم ایسا نہیں چاہتے؟"

میں گڑبڑا گیا۔ "میں.... ہاں.... میں بھی۔"

"ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گے؟"

"پوچھو۔" میں نے اسے غور سے دیکھا اور شاید پہلی بار اس طرح غور سے دیکھا تھا۔

"میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"

"کس لحاظ سے؟"

"ایک عورت کے لحاظ سے۔" اس نے ایک مغربی عورت کی طرح بے باکی سے پوچھ لیا اور پھر مشرقی عورت کی طرح شرما گئی۔

"اچھی لگتی ہو۔"

"صرف اچھی لگتی ہوں؟" اس نے مایوسی سے کہا۔

"تب تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں تمہیں سب سے اچھی لگوں اور مجھ سے زیادہ کوئی اچھی نہ لگے۔"

میں نے اس کا نرم، گداز اور جذبوں سے دہکتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "اچھی طرح معلوم ہے اور بہت عرصے سے معلوم ہے۔"

"تب تم نے پہلے کیوں نہیں کہا؟"

اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ "میں انتظار کر رہی تھی کہ تم کہو گے۔" اس کے لہجے میں شرم اور شکوہ دونوں تھے۔ میں نے گہری سانس لی اور نرمی سے کہا۔

"میں کیسے کہہ سکتا تھا جبکہ تم نے شروع میں وعدہ لیا تھا کہ ہماری دوستی میں کبھی جنس کا جذبہ شامل نہیں ہوگا۔"

"اس وقت میں ایسا ہی سوچ رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیسے میری سوچ بدلتی چلی گئی۔"

جب تک سلویا ہمارے ہاں رہی میں اس کے رویے میں تبدیلی محسوس کرتا رہا تھا اور اس امر کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے مجھے حیرت نہیں ہوئی، دوسرے میں خود اس کے لیے اپنے دل میں یہی جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ ہمارا دو سال سے زیادہ کا ساتھ بالاخر دوستی سے ہوتا ہوا محبت کے جذبے میں ڈھل گیا تھا۔ ہم دونوں ہی سمجھ گئے تھے لیکن اقرار کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "جب تمہارا ایم فل مکمل ہو جائے گا تو تم چلی جاؤ گی؟"

وہ پریشان ہوگئی۔ "ہاں مجھے واپس جانا ہوگا، میں ایک معاہدے کے تحت یہاں آئی ہوں واپس جا کر مجھے پانچ سال لیون یونیورسٹی میں لیکچررشپ کرنا ہوگی۔"

پانچ سال کی دوری بہت زیادہ تھی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا، مجھے ابھی جاب تلاش کرنی ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "تم میرے ساتھ فرانس نہیں چل سکتے، وہاں بھی تمہیں جاب مل سکتی ہے اور شاید یہاں سے اچھی مل جائے۔"

"میں تیار ہوں لیکن اماں بی کی طرف سے شاید ہی اجازت ملے۔"

اماں بی کے ذکر پر سلویا کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ "سنو کیا اماں بی ہمارے رشتے پر آمادہ ہو جائیں گی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بے شک اماں بی کا رویہ سلویا سے بہت اچھا تھا اور وہ اسے بیٹی کی طرح چاہنے لگی تھیں لیکن شادی ایک دوسرا معاملہ تھا اوّل تو سلویا عیسائی تھی دوسرے وہ فرانس کی شہری تھی اور واپس جانے کی پابند بھی تھی۔ پہلے مسئلے کا حل سلویا کے پاس تھا اس نے کہا۔ "میں مسلمان ہو جاتی ہوں ویسے بھی میں آدھی مسلمان ہوں صرف تمہارا کلمہ پڑھنا رہ گیا ہے۔"

"مگر دوسرے مسئلے کا کیا حل ہوگا؟ اماں بی مجھے گھر سے دور جانے کی اجازت نہیں دیں گی۔"

یہ مسئلہ ذرا گھمبیر تھا کیونکہ سلویا کو لازمی واپس جانا تھا۔ وہ پانچ سال کا بانڈ پورا کرتی یا پھر وہ تمام اخراجات ادا کرتی جو حکومتِ فرانس نے اس کی تعلیم پر کیے تھے تب اسے آزادی ملتی۔ اس کے پاس اتنی رقم ہوتی تو وہ حکومت سے اسکالر شپ کیوں لیتی؟ بہر حال، اسے بعد میں بھی دیکھا جا سکتا تھا اوّلین مرحلہ تو گھر میں سلویا سے شادی کی اجازت حاصل کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اماں بی کا سلویا سے جو رویہ تھا اس کے بعد انہیں شادی پر آمادہ کرنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا لیکن ان کا رویہ سلویا کے معاملے میں ایک بار پھر میری توقع کے خلاف ثابت ہوا۔ انہوں نے میری بات سنتے ہی انکار کر دیا۔ "صبیح یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں اماں بی؟"

"وہ عیسائی ہے اور غیر ملکی ہے۔"

"وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔" میں نے اگلی بات گول کرتے ہوئے کہا۔

"صبیح۔" اماں بی نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے کہہ دیا نا وہ اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی۔"

"مگر اماں بی آپ اسے اتنا پسند کرتی ہیں۔"

"اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ اس نیت سے اس گھر میں گھس رہی ہے، ورنہ اسی وقت اسے روک دیتی۔ اب مجھے اس کے نام سے چڑ آ رہی ہے۔" اماں بی بولیں اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ میں حیران پریشان بیٹھا رہ گیا۔ میں نے سلویا سے ذکر نہیں کیا کہ میں گھر میں بات کر چکا ہوں اور اس کا کیا ردِعمل سامنے آیا ہے۔ وہ اپنے تھیسس کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ صبح سے شام تک اس کا وقت لائبریری یا ڈیپارٹمنٹ میں گزرتا تھا۔ وہ ہاسٹل آکر پھر پڑھنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ صرف اتوار کے دن اسے کچھ فرصت ہوتی تھی اور ہماری ملاقات ہوتی تھی۔ اس دوران میں مجھے ایک کمپنی میں جاب مل گئی تھی اور میں نے جاب کے ساتھ ساتھ ابا جان کے مشورے سے سول سروس کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی تھی اس لیے مجھے بھی صرف اتوار کا دن فارغ ملتا تھا اور میں سلویا سے مل سکتا تھا۔ میں اسے ہاسٹل سے لیتا اور پھر ہم گھومنے نکل جاتے تھے۔ میں بڑے بھائی سے اسکوٹر لے لیتا اور اس پر ہم سارے شہر کی سیر کرتے کبھی ساحل کی طرف نکل جاتے اور چڑیا گھر جاتے تھے۔

میں نے سلویا سے ذکر نہیں کیا لیکن وہ بھانپ گئی کہ بات خراب ہوگئی ہے۔ میں نے اسے دوبارہ گھر چلنے کو نہیں کہا اور نہ اس کے سامنے اماں بی کا ذکر کرتا تھا۔ پھر میں شادی کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئی اور ایک دن اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے اب تم اپنے گھر والوں کا ذکر نہیں کرتے ہو اور نہ مجھے وہاں لے جانے کی بات کرتے ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم نے اماں بی سے بات کی ہے اور وہ اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کہا۔ "اماں بی نے صرف انکار نہیں کیا ہے بلکہ وہ شدید مخالف ہوگئی ہیں اب تمہیں بھی نہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔"

"مجھے اندازہ تھا۔ ان کے انکار کی وجہ کیا ہے؟"

"کوئی وجہ نہیں ہے انہوں نے بس انکار کر دیا ہے۔"

سلویا کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ "یعنی ہماری شادی ممکن نہیں ہے اب؟"

"میں ناامید نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اماں

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

بی کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں ان سے دوبارہ بات کروں گا۔''

سلویا کا چہرہ پھر سے چمک اُٹھا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی ذرا سی بات پر اُداس ہو جانے والی اور پھر کسی معمولی سی بات پر خوش ہو جاتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ اگر اماں بی کا انکار برقرار رہا تو میں خود کو سنبھال لوں گا مگر سلویا کا کیا ہوگا۔ وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے گی؟ وہ پاگل پن کی حد تک محبت کرنے لگی تھی۔ ان دنوں اس کے تھیسس کا آخری حصہ چل رہا تھا اور وہ بہت زیادہ مصروف تھی اس لیے میں نے اس سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ اتوار والے دن اس سے ملنے جاتا تھا لیکن اب ہم باہر نہیں نکلتے تھے بس یونیورسٹی کے سبزہ زاروں میں کچھ وقت ساتھ گزار لیتے تھے۔ ان ہی دنوں میں نے ابا جان سے بات کی۔ حسبِ توقع وہ راضی تھے لیکن مسئلہ اماں بی کا تھا اور بچوں کی شادی کا معاملہ اماں بی کے ہاتھ میں تھا۔ ابا جان مشورہ دے سکتے تھے لیکن آخری فیصلہ اماں بی کا ہوتا۔

''وہ انکار کر چکی ہیں۔''

''تو بس پھر صبر کرو برخوردار۔'' ابا جان نے کہا۔

''ابا جان۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''کوئی وجہ تو ہو، وہ پہلے اماں بی کو اتنی پسند تھی کہ اسے بیٹی کا درجہ دے دیا۔ جب کہ وہ غیر مسلم بھی ہے۔ اب وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے تو اماں بی اسے بہو نہیں بنا رہی ہیں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''بیٹا تم اپنی اماں بی کو جانتے ہو بچپن سے دیکھتے آئے ہو ان کے کسی فیصلے میں کوئی منطق نہیں ہوتی ہے۔ وہ صرف ذاتی پسند ناپسند پر فیصلہ کرتی ہیں اور پھر اس پر قائم ہو جاتی ہیں۔''

''چاہے اس سے ان کی اولاد کو نقصان ہو؟''

''ہاں، وہ ایسی ہی ہیں۔ اگر ان کی مرضی ہو گی تو سلویا مسلم نہ ہو تب بھی وہ اس سے رشتہ کر دیں گی، ورنہ اس کے مسلمان ہونے کی بھی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔''

''میں اماں بی سے پھر بات کرتا ہوں۔''

''کر لو بیٹا لیکن مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔''

''میں پھر بھی کروں گا اور وہ نہ مانیں تو....''

''تو تم اپنے طور پر....''

''ابا جان،'' میں نے احتجاج کیا۔ ''آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں میں کوئی فیصلہ آپ لوگوں کی مرضی کے بغیر نہیں کروں گا۔''

میں نے اماں بی سے پھر بات کی اور انہوں نے پھر اتنی ہی شدت سے انکار کر دیا۔ ''صبیح جب میں ایک بار منع کر چکی ہوں تو تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کی؟''

''اماں بی.... یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔''

''ہو گا۔'' وہ بے پروائی سے بولیں۔ ''میری طرف سے ہر صورت میں انکار ہے۔''

''آخر اس انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

''ہاں، اس کا رنگ و روپ مختلف ہے ہمیں اپنی اگلی نسل ایسی نہیں چاہیے۔''

میں اماں بی کی اس بات پر ششدر رہ گیا تھا ہر چیز چھوڑ کر انہوں نے یہ نقطہ نکالا تھا۔ ان کا انکار نہ بدلنا تھا اور نہ بدلا۔ میں نے سلویا سے دوبارہ ذکر نہیں کیا۔ اس نے ایم فل مکمل کر لیا اور جس دن اسے ڈگری ملی تھی اس سے دو دن بعد اس کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ میں اسے ائرپورٹ چھوڑنے گیا۔ وہ بہت حوصلے سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی صرف مجھے حوصلہ دینے کے لیے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا، وہ سارے راستے روتی جائے گی لیکن اس وقت وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''صبیح میں نے تمہارے ساتھ تمہارے ملک میں بہت اچھا وقت گزارا لیکن ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔''

''شاید۔'' میں نے کہا۔ ''سلویا مجھے معاف کر دینا میں اپنی ماں سے بغاوت نہیں کر سکتا اور ان کی مرضی....''

''تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے اور میرے دل میں اماں بی کے لیے احترام میں کوئی کمی نہیں آئی بس میں نے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ لیا ہے۔''

میں اس کے حوصلے اور ظرف پر شرمندہ تھا۔ ایک طرف اسے صرف اس لیے مسترد کر دیا گیا تھا کہ اس کا رنگ و روپ ہم سے مختلف تھا۔ دوسری طرف وہ ہمیں قصوروار نہیں ٹھہرا رہی تھی۔ میں نے طیارے پر سوار ہوتے اس کی آخری جھلک دیکھی جو ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش

ہو گئی۔

☆☆☆

نومی اور رومی دم بہ خود بیٹھے تھے پھر نومی نے کہا۔ ''مائی گاڈ! دادا جان! اس زمانے میں والدین ایسے ہوتے تھے؟''

''برخوردار بعض اب بھی ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''دادا جان۔'' رومی نے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے آپ دادی جان سے بہت محبت کرتے تھے ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔''

''ہاں، وہ میری بیوی اور میرے بچوں کی ماں تھیں۔ میرے دکھ سکھ کی ساتھی اور ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دینے والی تھیں۔''

''لیکن وہ محبت جو آپ سلویا....''

''بیٹا جی.... وہ بھی محبت تھی اور یہ بھی محبت ہے۔'' میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''اگر آدمی کسی ایک فرد سے محبت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے سے محبت نہیں کر سکتا ہے اور میں نے آپ کی دادی جان کو شادی کے بعد بتا دیا تھا کہ میں سلویا سے محبت کرتا تھا اور وہ ساری عمر مجھ پر پورا اعتماد کرتی رہیں۔''

رومی شرمندہ ہو گئی تھی، اس نے شاید آئینہ دیکھ لیا تھا چند دن پہلے اس نے نومی پر بلاوجہ شک کیا تھا۔ نومی نے کہا۔ ''دادا جان آپ ائرپورٹ جائیں گے؟''

''کیوں نہیں برخوردار.... وہ مجھ سے ملنے آ رہی ہے۔''

رومی نے شرارت سے نومی کی طرف دیکھا۔ ''ویسے اگر پردادی جان مان جاتیں تو آج تم گورے چٹے ہوتے.... دادی کا کچھ تو اثر تم پر بھی آتا۔''

نومی ذرا سانولے رنگ کا تھا۔ وہ کھسیا گیا۔ ''اپنے بارے میں کیا خیال ہے تم بہت گوری چٹی ہو؟''

''اللہ کا شکر ہے کبھی غرور نہیں کیا۔'' وہ اترا کر بولی۔ ''دادا جان میں بھی چلوں گی۔''

نومی نے منع کیا اس پر دونوں کا جھگڑا ہوا جو بالآخر میری مداخلت سے ختم ہوا کہ دونوں جائیں گے۔ فلائٹ صبح دس بجے پہنچ رہی تھی اس لیے ہم نو بجے گھر سے نکل گئے۔ سلویا کے لیے کمرا پہلے ہی سیٹ کر دیا گیا تھا۔ راستے میں وہ مجھ سے سلویا کے بارے میں پوچھتے رہے اور اپنے طور پر اندازے لگاتے رہے کہ وہ کیسی ہو گی جب وہ مجھ سے پوچھتے تو میرے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ وہ بہت حسین اور اچھی تھی۔ ''باقی آپ لوگ خود دیکھ لیں گے۔''

''اب تو وہ بالکل بدل گئی ہوں گی۔'' نومی نے کہا۔

''لیکن وہ اب بھی خوب صورت ہوں گی۔'' رومی نے یقین سے کہا۔ ''گوریاں خود کو بہت سنبھال کر رکھتی ہیں۔''

رومی کی بات پر میں مسکرانے لگا۔ ہم فلائٹ کی آمد سے نصف گھنٹا پہلے ہی ائرپورٹ پہنچ گئے تھے جبکہ سلویا کو آرائیول لاؤنج سے باہر آتے آتے ایک گھنٹا مزید لگ گیا تھا۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار کر رہے تھے۔ پھر مسافروں کی آمد شروع ہوئی۔ رومی اور نومی ہر بوڑھی سفید فام عورت کے بارے میں دریافت کرتے تھے کہ وہی سلویا ہے اور میں انکار میں سر ہلاتا۔ پھر سلویا باہر آئی۔ وہ بہت تبدیل ہو گئی تھی، بال سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریاں تھیں، جسم دبلا ہو گیا تھا لیکن مجھے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح اس نے بھی نصف صدی بعد مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس نے پاس آتے ہوئے گرم جوشی سے پکارا۔ ''صبیح.... ڈیئر۔''

رومی اور نومی ہکا بکا رہ گئے تھے اور جب میں نے سلویا سے ہاتھ ملا کر اس کا ان سے تعارف کرایا تو ان کی حالت دیکھنے والی تھی۔ سلویا ان کی طرف متوجہ نہیں تھی وہ نہایت بے تکلفی سے مجھ پر تبصرہ کر رہی تھی کہ میں کتنا بدل گیا تھا۔ میں ہنسا۔ ''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ہاں، میں بھی بدل گئی ہوں۔'' وہ ہنسی۔ اس نے صرف ایک شولڈر بیگ اُٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس سے بیگ لے لیا اور ہم پارکنگ میں نکل آئے۔ راستے میں وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے یہاں سے جانے کے تین سال بعد شادی کر لی تھی۔ یہ شادی اس نے ایک مراکشی مسلمان احمد سے کی تھی اور وہ خود بھی مسلمان ہو گئی تھی۔

رومی نے چونک کر پوچھا۔ ''آپ مسلمان ہو گئی تھیں؟''

شاید رومی کا مطلب تھا کہ وہ مسلمان ہو گئی تھی تو اس کا اثر اس کے لباس پر کیوں نہیں آیا تھا۔ ''ہاں، لڑکی میں مسلمان ہوئی تھی منافق نہیں۔''

میں شرمندہ ہو گیا اس نے برسوں بعد شاید ہم پر طنز

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

کیا تھا لیکن اس کا چہرہ طنز سے پاک مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔ رومی بھی کھسیا گئی۔ سلویا نے اپنا نام نہیں تبدیل کیا تھا جیسے اس نے اپنا لباس تبدیل نہیں کیا تھا لیکن وہ ہم سے بہتر مسلمان تھی وہ کسی کو دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چار بچے تھے اور وہ چاروں حافظ قرآن تھے۔ اب اس کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تک جوان ہو گئے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں اسے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ وہ خوش ہوئی جیسے وہ اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ خوش تھی ایسے میں بھی مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ احمد دس سال پہلے مراکش میں ایک کار کے حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ ہم گھر پہنچے جہاں سب نہایت اشتیاق سے سلویا کا انتظار کر رہے تھے اور اسے دیکھ کر باقی سب کا ردِعمل بھی رومی اور نومی سے مختلف نہیں تھا۔ بہر حال، حیرت سے قطع نظر سب اس سے گرم جوشی سے ملے اور آؤ بھگت کی۔ میری دونوں بہویں اور لڑکیاں اس سے فوراً بے تکلف ہو گئی تھیں کیونکہ وہ ان سے زیادہ اچھی اردو بول رہی تھی۔ اس کے اعزاز میں اسپیشل ڈشز بنائی گئی تھیں اور اس نے کھانے کے دوران اعتراف کیا کہ وہ فرانس میں ان کھانوں کو ترس گئی تھی۔ وہ اب تک ہمارے روایتی کھانوں کا ذائقہ نہیں بھولی تھی۔ دوپہر میں اس نے آرام کیا اور شام کو گھر والوں کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہی۔ میں محفل میں موجود تھا لیکن سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

رات کے کھانے کے بعد جب سب آرام کرنے چلے گئے تو میں سلویا کو لے کر لان میں نکل آیا۔ موسم اچھا تھا تیز اور خنک ہوا چل رہی تھی جو کراچی کا خاص تحفہ ہے۔ ہم لان چیئرز پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر پرانی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے سلویا سے پوچھ لیا۔ ''اب سچ سچ بتا دو تمہیں اتنے عرصے بعد مجھ سے ملنے کا خیال کیسے آیا اور تم نے فون پر مرنے والی بات کیوں کی تھی؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ ''تم بہت چالاک آدمی ہو۔''

''نہیں میں بہت چالاک نہیں ہوں، لیکن تمہیں جانتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں تم سے نہیں چھپاؤں گی۔ مجھے برین ٹیومر ہے دوسرا اسٹیج ہے لیکن میں علاج نہیں کرا رہی۔ میں زندگی کے آخری لمحات اذیت ناک علاج کے دوران بے چارگی میں نہیں گزارنا چاہتی مجھے وہ موت آسان لگتی ہے جو اچانک آ جائے۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم علاج کراؤ گی....''

''نہیں پلیز .... میں بس تمہاری یہ بات نہیں مان سکتی۔''

میں نے سمجھ لیا وہ نہیں مانے گی۔ اس لیے دوبارہ کہا بھی نہیں، ہم بس اپنی باتیں کرتے رہے اُن دنوں کی باتیں جب وہ یہاں تھی۔ پھر باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ وہ تھک گئی تھی۔ میں نے اسے سونے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد قریبی بیلے کی جھاڑیوں کے ساتھ دبکی ہوئی رومی نکل آئی اور میرے زانوں پر سر رکھ کر رو دی تھی۔ میں بہت پہلے اسے دیکھ چکا تھا۔ میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے سر اُٹھا کر گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''دادا جان ایسا کیوں ہوا؟''

''قدرت کی مرضی.... ہم اس کے آگے بے بس ہیں۔''

''کاش .... کاش....'' وہ کہتے ہوئے چپ ہو گئی لیکن میں سمجھ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''دادا جان اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہ ہماری سمجھ کا قصور تھا کہ ہم گرینی کو سفید فام سمجھ رہے تھے جبکہ وہ سیاہ فام ہیں۔''

''اسی کی تو ساری اہمیت ہے میری بچی۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''اگر وہ سفید فام ہوتی تو اماں بی انکار نہ کرتیں۔ ان کے نزدیک صرف سیاہ فام ہونے سے نسل خراب ہو سکتی تھی۔ سلویا سیاہ فام نہیں ہے صرف اس کی ماں سیاہ فام تھی اس کا باپ ایک سفید فام تھا اسی وجہ سے وہ سرخی مائل رنگت کی تھی لیکن ہمارے لیے تو سیاہ فام ہی تھی۔''

''دادا جان آپ سلویا سے....''

''نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ وہ محبت نہیں ہے جو ملنے اور بچھڑنے سے مشروط ہوتی ہے۔ ہم اس عمر میں آ کر اپنے بچوں کو مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کریں گے۔ بے شک تم سلویا سے پوچھ لینا وہ بھی یہی جواب دے گی۔''

رومی تھکے قدموں سے اندر جانے لگی جیسے محبت کی یہ بازی میں نے نہیں اس نے ہاری ہو۔

اصولِ عشق

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
آداب ونیاز
عشق ناکام نمبر کا اشتہار دیکھا تو خیال آیا کہ میں اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھ دوں۔ میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے صرف نام مقام بدل دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ سجاد کی روح اور کاشف کو شرمندگی ہو۔ میں نے دوبار محبت چاہی۔ دونوں ہی بار ناکامی میرا مقدر ٹھہری۔ کیسے یہ آپ خود ملاحظہ کریں۔
شاہینہ
(کراچی)

عشق ناکام نمبر

یہ آج کی نہیں، کل کی نہیں، دو تین ماہ پہلے کی نہیں...... بلکہ سات مہینے پہلے کی بات ہے جب مجھے ٹنڈو آدم سے اطلاع ملی کہ میرے شوہر سجاد کا ایک ماہ بیمار رہنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر نہ تو مجھے گہرا صدمہ ہوا تھا اور نہ ہی میں روئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو کا قطرہ بھی نہیں نکلا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نہ تو میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے نفرت ہے اور نہ محبت...... میں نے اس طرح

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

سے اس کی موت کی خبر سنی تھی جیسے کسی پڑوسی یا محلے میں موت ہو گئی ہو۔

نہ تو میں کراچی جیسے شہر سے جا کر اس کی تجہیز و تدفین میں شرکت کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اس کی قل میں۔ میں نے وہاں اطلاع بھجوادی تھی کہ میں نہیں آ رہی ہوں۔ میں نے سجاد کی موت کی خبر رشتے داروں کو بھی نہیں دی تھی۔ میرے گھر والوں میں ایک بھائی تھا جو کینیڈا میں بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہ رہا تھا...... میری ایک بہن لندن میں جاب بھی کر رہی تھی اور شوہر اور بچوں کو بھی پال رہی تھی۔ وہ لوگ جانتے تھے میری محبت کی شادی بُری طرح ناکام ہو چکی ہے...... لیکن اس نے نہ تو مجھے طلاق دی تھی اور نہ میں نے خلع مانگی تھی۔ بس وہ ایک دن مجھ سے اتنا کہہ کر چلا گیا تھا کہ میں ٹنڈو آدم جا رہا ہوں، وہاں میرے دوست احباب اور میری دنیا ہے۔ میں اپنی موت تک وہیں زندگی گزاروں گا۔ اب مجھے کسی کو اطلاع دے کر کرنا بھی کیا تھا؟ کون تھا جو پرسا دیتا؟ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب کبھی کینیڈا یا لندن سے فون آئے گا تب میں انہیں رسمی طور پر بتادوں گی کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں۔

دس برس قبل وہ ٹنڈو آدم سے کراچی اپنا مستقبل بنانے آیا تھا والدین کی موت کے بعد آیا تھا، ورثہ میں اسے آبائی مکان اور زمین ملی تھی۔ جو کھیتی باڑی کی تھی۔ اس نے سندھ ہی میں گریجویشن کیا تھا۔ وہ صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ ذہین بھی تھا۔ خوبصورت، وجیہہ اور دراز قد۔ کسی عورت کے تصوراتی شہزادے کی طرح، وہ کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔

مجھے کراچی میں ورثے میں دو کمروں کا نہایت کشادہ، پرسکون فلیٹ ملا تھا۔ میرے بھائی اور بہن نے اپنا اپنا فلیٹ فروخت کر دیا تھا۔ میں نے اپنا فلیٹ اس لیے فروخت نہیں کیا تھا کہ مجھے اسی شہر میں رہنا تھا۔ وطن عزیز میں رہنا تھا۔ میری بہن اور میرے بھائی نے کہا تھا کہ میں ان کے پاس چلی آؤں۔ ”شاہینہ! اس ملک میں کیا رکھا ہے؛ کوئی مستقبل نہیں ہے، کوئی زندگی نہیں ہے۔“

میں نے ان سے کہا کہ ابو کو اس ملک سے بڑی محبت تھی۔ کہتے تھے کہ اس ملک کو بنانے کے لیے عظیم قربانیاں دی گئیں ہیں۔ کیا ان کو بھلا دیں اپنا وطن عزیز چھوڑ جائیں؟

کیا میں نے یہاں جو رہنے کا فیصلہ کیا تھا وہ غلط تھا یا صحیح؟ میں نہیں جانتی...... مجھے سجاد کے خیالات بھی بہت پسند تھے۔ وہ کہتا تھا کسی غیر ملک، غیر مذہب اور غیر قوم میں جا کر غلامی کرنا اسے بالکل پسند نہیں ہے۔ وہ امریکا اور یورپ جانا چاہتا تو جا سکتا تھا لیکن گیا نہیں تھا۔

جس روز اس کی موت کی خبر ملی تھی، اس رات میں دیر تک سو نہ سکی تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ آخر وہ میرا شوہر تھا لیکن مجھے رونا کیوں نہیں آ رہا تھا؟ اور میں خوشی بھی کیوں محسوس نہیں کر رہی تھی کہ آخر مجھے ساری زندگی کے لیے اس سے چھٹکارا مل گیا؟ اب میں ایک آزاد پنچھی ہوں۔ بیوہ ہو چکی ہوں، میں کسی بھی شخص کا ہاتھ تھام کر اپنا گھر بسا سکتی ہوں۔ ابھی تو میں نہ صرف نوجوان بلکہ بے حد پُرکشش بھی ہوں۔ کہ لوگ راہ چلتے مجھے ندیدی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں انجانے اور پراگندہ خوابوں کا عکس نظر آتا ہے۔

کوئی سات مہینے کے بعد آج اچانک اور غیر متوقع طور پر کالج کے پرنسپل غلام محمد جونیجو کا خط آیا۔ ان کے خط کے الفاظ مجھے سونے نہیں دے رہے تھے اور ایسا لگ رہا ہے کہ وہ میرے سامنے کھڑے کہہ رہے ہوں۔

”شاہینہ بیگم! وہ طویل عرصے تک بیمار رہے، میں جب کبھی ان کی عیادت کو جاتا تھا، وہ مجھ سے کہتے تھے کہ...... اس دنیا میں صرف تین چیزوں سے محبت رہی...... علم، وطن عزیز...... اور میری اہلیہ شاہینہ...... جو میرے من کی اتھاہ گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے، نقش ہے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے آپ کی ایک زبردست پینٹنگ بنائی۔ وہ بڑے اچھے اور ماہر مصور تھے۔ اس شہر کے بڑے بڑے مصور ان کی رائے اور رہنمائی کے لیے آتے تھے۔ انہوں نے جو آپ کی پینٹنگ بنائی تھی اسے دیوار پر اپنے بستر کے سامنے آویزاں کر دیا...... تاکہ سونے سے پہلے اور بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے آپ کو دیکھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ ہر وقت آپ کو ہی دیکھا کرتے اور مجھ سے یہ کہتے کہ غلام بھائی! یہ عشق جنون ہے، محبت کیا ہوتی ہے، جنون کیا ہوتا ہے...... یہ صرف محبت کی آہ میں جلنے والے...... فراق میں تڑپنے والے ہی جانتے ہیں۔

انہوں نے وفات سے قبل جو اشیا چھوڑی ہیں اس کے بارے میں وفات سے ایک دن قبل کہا تھا کہ شاہینہ کو بلا کر انہیں دے دی جائیں تاکہ میری روح کو سکون اور طمانیت مل سکے۔ ہم نے ان کی ساری چیزیں اکٹھی کر رکھی ہیں تاکہ آپ کو یہاں بلا کر آپ کے حوالے کر دی جائیں۔ جب آپ آئیں گی، ہم آپ کے اعزاز اور ان کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کریں گے۔ اس جلسے میں آپ کے مرحوم شوہر کی چھوٹی چھوٹی مگر یادگار چیزیں آپ کے حوالے کی جائیں گی۔ مرحوم کے طالب علم آپ کے انتظار میں ہیں۔ انہیں مایوس نہ کیجئے، اس لیے بھی کہ آپ کے شوہر ایک عظیم اور بلند مرتبہ انسان تھے۔“

اس سے پہلے جب پرنسپل غلام محمد کا خط تعزیت کا آیا تھا اور انہوں نے لکھا تھا کہ عدت کے بعد ضرور آئیں۔ لیکن میں کسی وجہ سے ٹنڈو آدم جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے پروگرام ٹالنے کی بڑی کوشش کی پرنسپل کو یقین دلانا چاہا کہ میں صحت کی خرابی کے باعث آ نہیں سکتی۔ دوسری بات یہ کہ میں نے کبھی کراچی سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اتنا طویل سفر اکیلے کیسے کر سکوں گی؟ مگر اب جو خط آیا میرے لیے کوئی حیلہ بہانہ نہ رہا۔ میں نے انہیں فون کر کے کہہ دیا کہ انشاء اللہ آؤں گی۔

رات میں نے بستر پر دراز ہونے کے بعد اپنے دل کو ٹٹولا۔ اپنے وجود میں جھانکا پھر میرے اندر کی سوئی ہوئی عورت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ ماضی حال بن گیا۔ سجاد عرصے سے بیمار تھا۔ اس نے مجھے دو تین مختصر سے خط لکھے تھے کہ ...... میں سخت بیمار ہوں، مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں...... ایک دن کے لیے، پورا دن نہ رہو، ایک گھنٹے کے لیے سہی۔

معلوم نہیں کیوں میں اتنی ظالم، سفاک اور بے رحم بن گئی تھی؟ میں نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا، نہ ہی میرا دل پسیجا۔ میں اس قدر کٹھور ہو جاؤں گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک برس پہلے کی بات ہے کہ وہ مجھ سے جھگڑا کر کے ٹنڈو آدم چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے یہی کہا تھا کہ اب وہ لوٹ کر کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی بات پوری کر دکھائی تھی۔ ضدی تھا، ہٹ کا پکا تھا۔ سجاد کا غصے سے دہکتا چہرہ آج بھی میری نظروں کے سامنے تھا۔ جب کبھی وہ کسی بات پر طیش میں آتا، اس کا چہرہ آتش فشاں بن جاتا۔ قابو میں نہ رہ پاتا...... اس کے چہرے کے نقوش بوڑھے آدمی جیسے ہو جاتے اور وہ اپنی عمر سے بڑا دکھائی دیتا۔ وہ برسوں کا مریض اور ناتواں دکھائی دیتا۔ پھر وہ ایک روز کسی اجنبی کی طرح چلا گیا تھا۔ جس دن وہ جا رہا تھا، وہ اور بوڑھا دکھائی دیا۔ گھر اور میری زندگی سے نکل جانے کی دھمکی وہ دیتا رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی سچ نہیں جانا تھا۔ اس لیے کہ وہ دو تین دن کسی دوست کے ہاں گزار کر واپس آ جاتا اور مجھ سے صلح کر لیتا۔ گلے شکوے دور ہو جاتے...... لیکن جب وہ آخری بار جانے لگا تو میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اسے جانے دیا۔ میں نے اسے اس لیے نہیں روکا کہ اس وقت میں خود غصے سے بھری ہوئی تھی۔

وہ مجھ سے رات دن جو کہتا رہتا تھا، وہ ناقابل برداشت تھا...... اگر وہ مار پیٹ کرتا تو میں برداشت کر لیتی لیکن اس نے طعنے دیے جس میں مجھے اپنی تذلیل اور ہتک بھی محسوس ہوتی۔ عورت سب کچھ سہ سکتی ہے۔ کتنا ہی بڑا زخم اور کیسی ہی ٹیسیں کیوں نہ ہوں وہ برداشت کر لیتی ہے لیکن شک برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ایک شکی مزاج شوہر تھا۔ شکی مزاج کے ساتھ نباہ کرنا انتہائی اذیت ناک اور کرب انگیز تھا...... وہ مجھے ہمیشہ میری پہلی محبت کا طعنہ دیتا تو ایسا لگتا میرے وجود پر جیسے کسی نے انگارے ڈال دیے ہوں، نشاط انگیز لمحات میں، میں ہمیشہ خود سپردگی، والہانہ پن اور گرم جوشی سے پیش آتی۔ کبھی کبھی تھکن اور سر میں درد محسوس کر کے بے دلی سے پیش آتی تو فوراً کہتا شاید تم اپنی زندگی میں پہلے آنے والے شخص کی یاد میں گم ہو...... حالانکہ یہ بات نہ ہوتی...... میں اس سے کہتی کہ تم جو قسم کہو کھانے کے لیے تیار ہوں، بات صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ جب کبھی اتفاق سے کھانے میں نمک زیادہ پڑ جائے، یا مزہ ٹھیک نہ ہو، جب میں رات کو اس کے کپڑے استری کر کے اور جوتوں کو پالش کر کے نہ رکھوں، جب میں کبھی دفتر سے اس کی واپسی پر جذباتی انداز سے استقبال نہ کروں یا بناؤ سنگار کر کے انتظار نہ کروں، ہر موقعے اور ہر خرابی کا اس کے نزدیک یہی سبب تھا کہ میں اپنی پہلی محبت کے خیالوں میں ڈوبی ہوتی ہوں۔

پہلی محبت...... پہلی محبت...... پہلی محبت۔

اس پہلی محبت کا ذکر سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ اس وقت میرا دل کرتا تھا کہ کاش! پہلی محبت والا میرے سامنے آ جائے، میں کچن سے چھری اُٹھا کر پوری قوت سے اس کے سینے میں گھونپ دوں۔ میں نے سجاد کو یقین دلانے کے لیے ہرگز اس پہلی محبت کو نہیں جھٹلایا۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ جس طرح اور بہت ساری لڑکیوں کی زندگی میں کوئی نہ کوئی پہلا مرد آتا ہے اسی طرح میری زندگی میں بھی ایک لڑکا آیا تھا۔ یہ میری نادان جوانی کی بھول تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے میں نے نوجوانی کی دہلیز اور شباب کی حدود میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اس وقت میری

www.paksociety.com

منگنی ہوئی تھی اور نہ شادی۔ میری زندگی میں رہا تھا۔ بس ایک سپنے کی طرح میری زندگی میں آیا تھا۔ سپنے کون نہیں دیکھتا؟ کسی کے سپنے پورے ہوجاتے ہیں یا سپنوں کی مالا ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ میرے سپنے بھی اجاڑ ہوگئے تھے۔ لیکن مجھے اس کا دکھ اور افسوس نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ محبت سے بہت سارے فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دو ایک مرتبہ من مانی کرنے دی۔ ایک بار وہ حد سے تجاوز کرنا چاہتا تھا۔ میں نے نا صرف جھڑک دیا بلکہ اس کے منہ پر تھپڑ بھی رسید کردیا۔ اس نے جبر سے کام لیا تو اسے دھکا دے کر چلی آئی تھی۔ اس کے باوجود دل کے کسی کونے میں اس کے لیے محبت محسوس کرتی رہی تھی۔ اس کے بہکنے میں قصور میرا اپنا بھی تو تھا۔ اس لیے کہ میں اس سے اس وقت ملنے جاتی تھی جب وہ گھر میں اکیلا ہوتا تھا۔ دوسرا یہ کہ میرا لباس جو اس قدر تنگ و چست ہوتا تھا، بے حجابی کی حد کو چھونے لگتا تھا۔ یوں بھی میرا بدن بھڑکیلا تھا، میں چہکتی تو وہ بہکنے پر آجاتا تھا۔ میں یہ بات بھول گئی تھی کہ مرد اور ناگ کی فطرت ایک سی ہوتی ہے کہ بس وہ ذرا سا موقع ملنے پر ڈس لیتا ہے۔ میں یہ لباس...... بلکہ ہر لڑکی اس لیے پہنتی ہے کہ اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ مرد اسے توجہ سے دیکھے اور اس کے حسن و شباب کو سراہے۔

سجاد جیسا شوہر نصیب سے ملتا ہے۔ بہت کم عورتوں کو ایسا خوبصورت اور محبت کرنے والا رفیق سفر ملتا ہے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے سجاد کو پسند ہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ چاہا تھا۔ اس کی جھولی میں اپنی تمام محبت ڈال دی تھی۔ اس لیے کہ اس کی جھولی خالی تھی۔ اور پھر اس کی زندگی میں ایک خلا تھا جسے میں نے اپنی محبت سے پر کردیا تھا۔ کیونکہ وہ محبت کا بھوکا تھا۔ اسے محبت نہیں ملی تھی۔ محبت کی بازی ہارنے کے باوجود میں نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردیا تھا جبکہ پہلی محبت میں ہارنے پر بھی عورت کے پاس بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اتنا کچھ رہ جاتا ہے کہ اس سے وہ اپنے شوہر کو مکمل پیار دے سکتی ہے۔

معلوم نہیں کس طرح اور کیسے سجاد کو کاشف کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا۔ میں نے اسے بارہا یقین دلایا کہ اس شخص نے شادی کرکے اپنا گھر بسا لیا ہے۔ پھر بھی اس نے اس بات کو ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ میرے بارہا یقین دلانے اور قسم کھانے کے باوجود وہ شک میں مبتلا رہا اور اسے وہم ہوگیا تھا کہ کاشف ابھی بھی میرے خوابوں میں آتا ہے۔ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ جب اس نے میرے قسم کھانے پر بھی یقین نہیں کیا تو ایک روز میں نے تنگ آکر ہذیانی لہجے میں کہہ دیا کہ ''ہاں...... ہاں...... وہ میرے خوابوں کا شہزادہ ہے...... میں روز اس کے خواب دیکھتی ہوں۔ میں اسے اپنے دل اور خوابوں سے کبھی نہیں نکال سکتی...... عورت کی پہلی محبت جب دل میں بس جاتی ہے تو اس کی جڑیں وجود میں اندر تک چلی جاتی ہیں۔''

یہ سن کر سجاد کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور اس کے کندھے جھکتے چلے گئے۔ اور پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب میں تمہاری زندگی میں نہیں آؤں گا۔ بس تم کاشف کے خوابوں میں کھوئی رہا کرو۔ اس کے اس غصے اور نفرت کی شاید وجہ یہ تھی کہ میں نے اس دن اسے وہ توجہ نہیں دی جس کی اسے خواہش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں آج بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر روتی اور پچھتاتی رہی تھی کہ میں نے کیوں نہیں اس کے جذبات کی فراوانی کا خیال رکھا؟ جب بھی میں اپنی ساری توجہ اور خود سپردگی سے پیش آئی تو وہ مجھے پہلی محبت کا طعنہ نہیں دیتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنی پہلی محبت کو بھول چکی ہوں۔

اس نے خواب گاہ کو نہایت توجہ سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ فرش پر بیش قیمت سرخ ایرانی قالین، ایک بہت بڑا سنگار میز جس میں پورا کمرا نظر آتا تھا۔ پھر اس نے روشنیوں کا خصوصی انتظام کیا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں آبنوسی لکڑی کے بیڈ لیمپ، ہر لیمپ کے شیڈ سے الگ الگ اور دھیمی دھیمی روشنی جو شعاعوں کی طرح بکھر جاتی تھی۔ خصوصی اور بڑا سا ڈبل بیڈ جس پر بیک وقت چار آدمی بہ آسانی سوسکتے تھے۔ بستر ایسا نرم و گداز اور ریشم جیسا جو پھولوں کی سیج کی محسوس ہوتا تھا۔ چھت پر روشنی کا جال، کمرے میں خصوصی ٹیوب لائٹس ان کی روشنی دودھیا چاندنی کا منجمد دریا۔ اس نے اس خواب گاہ کو پرتعیش اور شاہی خلوت گاہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میری تنہائی اور راتیں انتہائی اذیت ناک بن گئی تھیں۔ میں صرف اس کمرے میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جیسے اکیلی رہ گئی تھی۔ نیند میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کی آغوش میں ہوں...... اس کی محبت بھری باتیں نغموں کی طرح کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میں اس کی ضرورت محسوس کرنے لگی۔ اس کے بوسوں کی بوچھار محسوس ہوتی۔ میں کوئی بوڑھی تو نہیں تھی، جوان تھی اور جذبات کی

آگ میں جلنے لگی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اپنی پیاس کیسے بجھاؤں۔ کیا کاشف کو کسی دن بلالوں...... رات بھی روک لوں؟ لیکن میں اتنی دور جاکر اپنا وجود میلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے آپ کو آلودہ کرکے اپنی نظروں میں گرجاتی اور خدا کے حضور اس قابل نہ رہتی کہ سر اٹھا سکوں اور پھر میں نے راتوں کو کمرے کی تمام روشنیوں میں اپنے آپ کو تنقیدی نظروں اور ہر زاویے سے دیکھا کہ کہیں میں بے کشش تو نہیں ہوگئی ہوں؟ جسم کے خطوط اور عضو ڈھل کر اپنا حسن کھو چکے ہیں لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے اپنے جسم کا خیال رکھا ہوا تھا۔ پھر کیا بات ہے جو سجاد کو میرا حسن اور پرشباب گداز بدن یاد نہیں آتا اور تڑپاتا، میرا والہانہ پن، وارفتگی، فیاضی اور خود سپردگی، میں نے کبھی بھی اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا اور پھر اب اسے چاہیے کیا تھا، کیا میرا سحر اُتر گیا؟

ایک برس تک اس نے اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں اس کے بارے میں بالکل بے خبر رہی۔ بے فکر اور بے سہارا تھی۔ اس کے بارے میں کہیں نہ کہیں سے پتا چلاتی رہی، میں نے اس کی واپسی سے ناامید ہوکر ایک فرم میں ملازمت کرلی۔ اسے ساڑی بہت پسند تھی۔ میں اب بھی اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس کی پسند کا لباس پہنتی تھی۔ میرے پاس بینک میں خاصی بڑی رقم تھی۔ چھ سات برس ٹھاٹ سے گزر جاتے مگر مجھے اپنے آپ کو مصروف رکھنا تھا۔ اس لیے کہ کرب ناک تنہائی بہکا دیا کرتی تھی۔ ڈر تھا کہ کسی دن میں کاشف سے میل جول نہ کرلوں اور غلاظت کی دلدل میں نہ جا گروں۔

مجھے اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ میں اس کے مرنے سے پہلے اسے یہ کیوں یقین نہ دلاسکی کہ میں اسے کاشف سے زیادہ چاہتی ہوں؟

میں نے بس پر ریل گاڑی کو ترجیح دی تھی میں اس وقت ریل گاڑی کے سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں سفر کررہی تھی۔ میں یہ سب کچھ سوچتے سوچتے گہری نیند سوگئی تھی۔ ریل گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو میری آنکھ کھل گئی۔ پتا چلا کہ حیدرآباد کا اسٹیشن آگیا ہے۔ بیس منٹ تک گاڑی نہ چلی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کر قلی کو بلایا جو پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا ایک مسافر سے بات کررہا تھا۔ ٹرین کی روانگی کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ جب وہ مسافر سے بات کرچکا تو میں نے اسے بلاکر پوچھا کہ بات کیا ہے، ریل گاڑی یہاں کتنی دیر

خدارا ◉ خدارا
شوگر کے مریض
ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کردیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کردیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہوکر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبّی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کرلیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبّی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787
آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

رکتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے انجن میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوگئی ہے اسے درست کرنے میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ کوئی پسنجر یا میل ایکسپریس گاڑی ...... اس نے کہا کہ پسنجر جا چکی ہے اب جو گاڑی آئے گی وہ ٹنڈو آدم نہیں رکے گی۔ دوسری پسنجر تین گھنٹے بعد آئے گی۔ اس لیے انجن کے ٹھیک ہونے کا انتظار کریں۔

میں ابھی انہی خیالات میں گم تھی کہ عقب سے ایک خوشی سے بھرپور مردانہ آواز سنائی دی ''شاہینہ! شاہینہ ...... یہ تم ہو؟''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کاشف تھا۔ وہ میری طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوشی چھلک رہی تھی۔ میں بار بار شانے اور سینے سے پھسل جانے والے ساڑی کا پلو سنبھال کر اسے دیکھنے لگی۔

''شاہینہ! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں ...... تم اور حیدرآباد اسٹیشن پر۔ اکیلی ...... سجاد کہاں ہے؟''

''سنو ......'' میں نے کہا ''گاڑی ایک گھنٹا لیٹ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا، ہم کسی اچھے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پئیں۔''

''اچھا تو تم سجاد سے ملنے ٹنڈو آدم جا رہی ہو۔ میں نے ایک برس پہلے کسی سے سنا تھا کہ وہ ٹنڈو آدم میں پڑھا رہا ہے۔ عجیب احمق آدمی ہے۔ ...... کراچی میں کیا اسکولوں کی کمی ہے ...... خیر ...... چلو، باہر نکلو۔ اسٹیشن کے باہر ایک ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ ہے۔''

اسے دیکھ کر خوشی تو نہیں ہوئی تھی البتہ حیرانی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے ہال کے ایک کونے میں بیٹھے تھے، آمنے سامنے۔ میں نے سینڈوچز اور کافی کا آرڈر دیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔

''شاہینہ ...... تم روز بہ روز جوان اور پُرکشش ہوتی جا رہی ہو۔ سویٹ اور سیکسی ...... تمہیں کتنے عرصے بعد دیکھ رہا ہوں۔ ایسی دوشیزہ لگ رہی ہو جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ان دنوں سے بھی کم عمر جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی ...... لگتا ہے کہ سجاد نے تمہیں بھرپور خوشیاں دی ہیں کہ جس نے تمہیں اور حسین بنا دیا ہے۔''

وہ کسی نان اسٹاپ ٹرین کی طرح بولے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی باتیں سن کر درمیان میں قطع کلامی نہیں کی بلکہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ سفید شرٹ اور کالی پتلون میں ملبوس تھا۔ اس نے کالے رنگ کی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ وہ میڈیکل سیلز مین کی جاب کر رہا تھا۔ اس کیے ہاتھ میں میڈیکل بیگ تھا۔ اس کے چہرے پر چالیس برس کی عمر کی پختگی تھی۔ وہ عمر سے بڑا دکھائی دیا۔ اس کی وجاہت برقرار تھی۔ میری اس سے یہ ڈرامائی ملاقات ہوئی تھی۔ چونکہ مجھے ایک گھنٹا گزارنا تھا، میں چاہتی تو اس سے بے رخی اختیار کر سکتی تھی، میں نے سوچا کہ میں اس کی باتیں سنوں گی۔ اسے اپنے بارے میں بھی بتا دوں گی۔ آخر میں اس بات کو کہاں تک چھپا کر رکھوں گی؟

جب اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اسے سلگانے کی کوشش کی تو میں نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''کاشف ...... کوئی ایک برس ہوا، میں بیوہ ہو چکی ہوں۔''

''کیا ......؟'' وہ اس طرح اُچھل پڑا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا ''تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کسی نے بھی مجھے بتایا نہیں۔ نہ تم نے ...... اتنا بڑا سانحہ ......''

''یہ تم پہلے شخص ہو جسے میں بتا رہی ہوں۔ کسی کو بتا کر کرنا بھی کیا ہے؟ کیا کروں بتا کر، دنیا میں میرا ہے ہی کون؟''

''اب تم کہاں جا رہی ہو؟ بڑا صدمہ ہوا تمہارے بیوہ ہو جانے کا سن کر۔ تم جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔''

''میں ٹنڈو آدم جا رہی ہوں۔'' چونکہ ویٹر سینڈوچز لے کر آ گیا تھا اس لیے اسے اتنا ہی بتایا۔

''کیا تم نے دوسری شادی کر لی ہے؟ کیا تم اپنی سسرال جا رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے شادی نہیں کی۔'' میں نے جواب دیا ''میں ٹنڈو آدم جا رہی ہوں اس لیے کہ سجاد کے اعزاز میں کالج میں ایک جلسہ رکھا گیا ہے۔ مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی آخری سانس تک وہاں پڑھاتا رہا تھا۔ اس کے طالب علم اسے خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس کے پرنسپل کے بے حد اصرار پر میں جانے پر مجبور ہو گئی۔''

''وہ کس لیے، تمہیں کراچی میں چھوڑ کر ٹنڈو آدم چلا گیا۔'' کاشف نے کہا ''اتنا باصلاحیت ...... اس کے لیے وہاں کیا مستقبل تھا؟''

پھر میں نے اسے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا کہ پہلی محبت نے شک کا زہر گھول دیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اس کی محبت اور یادوں کے سہارے زندگی کاٹ رہی ہوں۔

''میں نے ایک روز تمہیں اور تمہاری حسین بیوی کو زیب النساء اسٹریٹ پر شاپنگ کرتے دیکھا تھا۔'' میں نے کہا ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب تمہاری شادی ہوئی تھی۔ میں دل میں سراہے بغیر نہ رہ سکی کہ کتنا حسین اور انمول جوڑا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہ تمہاری محبت کی شادی ہے۔ تمہاری یہ دوسری محبت بڑی خوشگوار اور حسین گزر رہی ہو گی؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میری پہلی محبت ناکام ہو گئی جس کا رنج اور قلق آج تک ہے۔'' وہ بڑے افسردہ لہجے میں کہنے لگا ''محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہوتی ہے۔ لیکن تم نے مجھ پر بھروسا نہیں کیا۔ تم نے میرے جذبات کو کچل دیا، محبت کو پامال کر دیا۔ تم جس بے حجابی کی حالت میں تھیں اس نے مجھے بہکا دیا تھا۔ کاش! تم نے مجھے جھڑک نہ دیا ہوتا۔ میرے منہ پر تھپڑ نہ رسید کیا ہوتا۔ کاش ...... اس وقت تم نے میرے جذبات کی قدر کی ہوتی، طوفان گزر جانے کے بعد میں تم سے شادی کی بات کرتا۔ ہم دونوں خوابناک زندگی گزار رہے ہوتے۔ کاش ...... ہم ایک سایہ تلے زندگی گزار رہے ہوتے۔''

''چلو جو نہیں ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اس حسین عورت کے ساتھ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ دوسری محبت اور دوسری لڑکی!'' میں نے کہا۔ ''خوش تو ہو ناں ......؟''

''خوش ...... دوسری محبت کی شادی ......'' کاشف کے چہرے پر کرب اُبھر آیا اور اس کا لہجہ بے حد افسردہ ہو گیا۔ وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگا ''میری شادی محبت کی تھی۔ وہ میری خوبصورتی اور وجاہت پر مرمٹی تھی۔ جب میں نے دو تین ملاقاتوں کے بعد اس کی طرف پیش قدمی کی تو اس نے نہ تو انکار کیا ...... نہ مزاحمت اور نہ میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ ہم طوفان کی زد میں آ گئے۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ پھر ایک دن اس نے بتایا کہ اس محبت کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔ پھر مجھے اس سے شادی کرنی پڑی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں اتنی جلدی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن شادی بہرحال اس سے کرنی تھی۔ میں ہر مہینے نو ہزار

ناکام عشق کی
مشہور داستانوں کے مرکزی کردار

عرب: لیلیٰ، مجنوں۔ قیس، لبنیٰ۔ وامق عذرا۔
فارس: شیریں، فرہاد۔
پنجاب: ہیر، رانجھا۔ سوہنی، مہنوال۔ سسی پنوں
سندھ: عمر، ماروی
دہلی: سلطان رضیہ، یعقوت
بنگالی: حسن بانو، امیر علی
انگریزی ادب: رومیو جیولیٹ

مرسلہ: فہد طیب، لاہور

عشق کا مارا سنگ تراش

قبل از اسلام ملک فارس میں ایک سنگ تراش رہا کرتا تھا۔ نام نامی اس کا فرہاد تھا۔ اس نے کسی طور جلوہ حسن شیریں دیکھ لیا اور سو جان سے فدا ہو گیا۔ شیریں بیوی تھی شہنشاہ وقت خسرو پرویز کی۔ اس نے شرط دیدار رکھی کہ فرہاد ایک نہر بنا دے جبکہ مشہور یہ ہے کہ فرہاد نے خود آتشِ عشق میں سوزاں ہو کر خیال کیا کہ شیریں کو دودھ پسند ہے اور دودھ والی بکریاں پہاڑ پر چرتی ہیں۔ دودھ لانے کے لیے شیریں کی کنیزوں کو کئی کوس دور جانا پڑتا ہے سو اس نے نہر تراش دی۔ لیکن جیسے ہی نہر تیار ہوئی خسرو کے غلاموں نے افوہ اُڑا دی کہ شیریں رات گئے گزر گئی۔ فرہاد نے تیشہ اُٹھایا اور سر پر مار کر اُدھوری محبت کا خاتمہ کر لیا۔

مرسلہ فاہا اشرف، لاہور

www.paksociety.com

روپے کمالیتا ہوں۔ سندھ کے اندرونی شہروں اور علاقوں میں جگہ جگہ بھٹکتا اور خوار ہوتا رہتا ہوں۔ ادویات فروخت کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ آدھی سے زیادہ آمدنی بیوی کو دینا پڑتی ہے۔ وہ یہ آمدنی اپنی ذات پر خرچ کرتی ہے۔ فضول خرچ اور بدمزاج ہوگئی ہے۔ گھر کے اخراجات مجھے پورے کرنا پڑتے ہیں۔ میں اس عورت سے بیزار ہوں۔ اب اس میں کوئی کشش نہیں رہی۔ موٹی اور بھدی بھی ہوگئی ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے لیکن سات بچوں کی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف بے رحم بلکہ خودغرض بھی ہے۔ وہ مجھے ایسا ہی سمجھتی ہے، ایک بستر پر ہوتے ہوئے بھی مجھے نہ تو قریب آنے دیتی ہے اور نہ چھونے۔ کبھی کبھی دو انسان جو ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، ایک دوسرے سے سخت نفرت کیوں کرنے لگتے ہیں؟ نفرت کرتے ہوئے بھی کس قدر بے بس نظر آتے ہیں۔ اب تو ہم ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں ہوسکتے۔ ساتھ رہے جانے سے زیادہ مشکل الگ ہوجانا ہوتا ہے۔ الگ ہوجانے کا احساس ہمارے لیے سخت اذیت ناک بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کبھی بھی الگ نہیں ہوسکیں گے۔ ہمیشہ کڑھتے رہیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں گے۔ اور ایک دوسرے پر برتن اور گھر کے استعمال کی چیزیں پھینکتے رہیں گے۔ اور پھر کبھی کبھی بے اختیار ہوکر ایک دوسرے کو پیار بھی کرتے رہیں گے۔ کتنی عجیب زندگی ہے شاہینہ! محبت کی شادی ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ تو ناکام محبت ہے۔ کاش! میں نے محبت کی شادی نہ کی ہوتی۔ اس نے جلد شادی کرنے کے لیے کہا تھا، وہ ماں بننے والی تھی۔ یہ جھوٹ تھا، کیا تمہیں میری دکھ بھری کہانی سن کر کچھ عجیب سا محسوس نہیں ہورہا ہے؟ تمہارے دل میں میرے لیے ہمدردی محسوس ہورہی ہے، اس ناکام محبت پر ترس آرہا ہے؟''

کاشف نے کتنا عجیب سا سوال کردیا تھا...... جس کے لیے وہ اتنی بڑی دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس ہمدردی کی بات سن کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے لفظ ہمدردی میرے سینے میں کسی خنجر کی طرح پیوست ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تو میں نے کالا چشمہ لگالیا۔ اتفاق سے صرف دو میزوں پر دو جوان جوڑے براجمان تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا جی ٹھہرا تو میں نے کاشف کو کچھ اور بھی بتایا تھا کہ...... میں اکیلی فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میرے پڑوسی اچھے ہیں۔ کبھی انہوں نے مجھے شک بھری نظروں سے نہیں دیکھا اور وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور پھر فلیٹ ایسا ہے کہ کسی کی آمدورفت کے بارے میں انہیں ہوا تک نہ لگے۔ اور پھر میں نے اسے جتادیا اور اس پر صاف کھل کر واضح کردیا کہ میں نے اپنے شوہر سے تم سے زیادہ محبت کی ہے لیکن میرے شوہر نے میری محبت کا احساس نہیں کیا...... ورنہ وہ اس دنیا سے اتنی جلدی رخصت نہ ہوتا۔ نہ جانے کیوں اسے میری محبت پر اور مجھ پر بے اعتمادی تھی؟

میں نے ویٹر سے کہا کہ کیا وہ کسی سے معلوم کراسکتا ہے کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی کتنی دیر ہے۔ میں نے اسے پچاس کا ایک نوٹ تھمادیا۔ اس نے آکر بتایا کہ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا لگے گا، پھر میں نے لنچ منگوالیا۔

''مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہورہا ہے کہ میرے باعث ایک شخص موت کی نیند سوگیا۔'' کاشف نے کہا ''حالانکہ میں نے صرف تم سے محبت کی تھی۔ اس محبت کی ناکامی کا پس منظر تم نے اسے کبھی بتایا تو نہیں تھا؟''

''نہیں۔'' میں سرخ سی ہوکر بولی ''عورت ایسے راز نہ تو شوہر کو بتاتی ہے اور نہ کسی سہیلی کو۔ تمہاری دست درازی تو میں نے بڑی حد تک برداشت کرلی تھی لیکن حد سے تجاوز کرنا میں ایک شریف لڑکی ہونے کے ناتے کیسے برداشت کرتی۔ اس لیے میں نے تم پر ہاتھ اُٹھادیا تھا۔ اگر تم پہلے کی طرح حد میں رہتے تو آج ہم دونوں ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہوتے۔''

''تم اس بات کا اعتراف کیوں نہیں کرتی ہو؟ میرے بہکنے کا سبب تمہاری بے حجابی تھی۔ تم نے اس روز وہ لباس پہن کر مجھ سے ملنے آتے وقت یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں بہک نہ جاؤں؟ اس لیے کہ میں مرد ہوں۔''

''اب چھوڑو، اس بات کو۔ اس میں غلطی ہم دونوں کی تھی۔ تمہاری دست درازیوں پر میں نے مزاحمت نہیں کی تو تم نے مجھے غلط سمجھ لیا کہ میں تمہاری توجہ کے لیے ایسا لباس پہن کر آئی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''شاہینہ...... سچے دل سے یہ بتاؤ کہ کیا آج بھی میں تمہارے دل کے کسی کونے میں بسا ہوا ہوں؟ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، پہلی سی محبت۔ فیض نے تو کہا تھا کہ پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ لیکن میں ایک بھکاری کی طرح تمہارے سامنے کھڑا اپنی خالی جھولی پھیلائے کہہ رہا ہوں کہ مجھے پہلی سی محبت دے دو۔ میری جھولی میں ڈال دو۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ہمارے سامنے کافی رکھے رکھے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں کچھ کہے بغیر بیٹھے رہے، جیسے گونگے ہوگئے ہوں۔ ہم دونوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا تھا۔ الفاظ کا خزانہ جیسے ہم لٹا کر بیٹھے تھے۔ وہ اپنی پہلی سی محبت مانگ رہا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دوں؟ دل کو ٹٹولا، میں سوچ ہی رہی تھی کہ ویٹر بل لے آیا۔ پھر وہ برتن سمیٹنے لگا تو میں اس رومانی جوڑے کو دیکھ رہی تھی جو چند لمحوں قبل آیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت کے چراغ روشن تھے لیکن ایسا محسوس ہورہا تھا، اس کے چہکنے اور باتوں کے انداز سے وہ ایک خالی برتن ہوکر رہ گئی ہے۔ مرد نے محبت کے نام پر اسے لوٹ لیا ہے۔ اگر انہوں نے شادی کر بھی لی تو کیا یہ محبت کامیاب رہے گی؟ میں نے اکثر دیکھا اور سنا تھا کہ یہ جوان جوڑے جو محبت کرتے ہیں اور لڑکی اپنا سب کچھ نچھاور کردیتی ہے تو پھر یہ محبت ناکام ہوجاتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح شادی ہوگئی تو زیادہ نہیں چلتی۔ باسی کڑھی میں اُبال آجاتا ہے۔

میرے دل میں اس کی سوئی محبت انگڑائی لینے لگی۔ وہ جو بھی تھا، جیسا بھی تھا میری پہلی محبت تھا۔ لیکن اب تو وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ مجھ سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک بھکاری کی طرح بھیک کے لیے ترس رہا تھا۔ میں جواب موزوں کررہی تھی کہ ویٹر دوبارہ کافی لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ اپنی پیالی تھام لی پھر وہ کہنے لگا۔

''شاہینہ جان! جان تمنا! میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری بدقسمتی کا دراصل میں ہی ذمے دار اور تمہارا مجرم ہوں۔ لیکن تمہی بتاؤ کہ میں اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میں حالات کے دلدل میں گردن تک دھنس چکا ہوں۔ میں اس سے نکلنا تو دور کی بات ہے، اس میں فرید دھنستا ہی چلا جاؤں گا، کیونکہ سامنے دلدل ہے۔ تنکے کا سہارا بھی نہیں ہے کہ نکل سکوں۔ لیکن اب مجھے تم ایک تنکے کی طرح محسوس ہورہی ہو، تم اس دلدل سے نکال سکتی ہو۔ میں نے کسی نہ کسی طرح خاصی رقم بینک میں جمع کی ہوئی ہے جس کے متعلق میری بیوی کو علم نہیں ہے۔ مجھے دو ایک سودوں میں بڑا اچھا کمیشن ملا تھا۔ میں وہ رقم تمہیں دینا چاہتا ہوں کہ کبھی تم مالی مشکلات میں نہ گھر جاؤ۔ تم چاہو تو میری محبت کی حفاظت میں آجاؤ۔ سرمایہ ہو تو زندگی میں پیر جمائے جاسکتے ہیں۔ کم سے کم آدمی کو کھڑے ہونے کا احساس تو پریشان نہیں کرے گا۔ میں اندرون سندھ کا ایک چکر ایک ہفتے میں مکمل کرلیتا ہوں۔ پھر میں تمہارے پاس دو ایک دن کے لیے آجاؤں گا۔ بیوی کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ میں سات دن یا بارہ دن باہر کیوں رہتا ہوں؟ اسے تو صرف پیسے سے غرض ہوتی ہے۔ تمہیں جب بھی میری ضرورت ہو ایک مس کال دے دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری مالی مدد کرتا رہوں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ صرف محبت کروں گا۔ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔ شادی ایک ایسا بندھن ہے جو کچے دھاگے سے بھی کمزور ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن محبت کا بندھن بہت مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ ہم میاں بیوی کی طرح محبت کی بھرپور زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسی محبت کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ کیا تمہیں یہ محبت کی نئی زندگی منظور ہے؟''

میں اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری خاموشی سے وہ کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت ویٹر نے آکر بتایا جسے میں نے پچاس کا نوٹ دیا تھا کہ گاڑی کا انجن ٹھیک ہے۔ وہ پندرہ منٹ بعد روانہ ہوجائے گی۔ بل میں خود ادا کرنا چاہتی تھی لیکن کاشف نے ادا کردیا پھر ہم اسٹیشن کی عمارت میں آگئے۔ کاشف کسی اور گاڑی سے نواب شاہ جارہا تھا۔ وہ گاڑی تک رخصت کرنے آیا تو کہتا رہا تھا۔ محبت...... شادی کے بندھن کا نام نہیں ہے، یہ اس سے بھی بلند ہے۔

جب گاڑی چل پڑی تو میں دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہی اور سوچتی رہی، کیا کروں؟ کیا میں پھر سے پہلی محبت سے رشتہ ناتا جوڑ کر اس کی محبوبہ بن جاؤں۔ گاڑی کی روانگی تک کھڑکی کے باہر کاشف سر جھکائے جواب کے انتظار میں کھڑا تھا۔ پھر خود ہی بولا ''ہاں شاہینہ! تم نے کیا سوچا کیا فیصلہ کیا؟ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ کیا تمہیں میری محبت پر اعتبار نہیں ہے؟ میں چونکہ بہت دکھی اور پریشان ہوں، محبت کا بھوکا ہوں اس لیے پہلے سے شدت سے چاہوں گا۔ میری محبت مثالی ہوگی۔''

لیکن اس پل کے ہزارویں حصے میں، میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ کیا میں ایک بیوہ کی طرح زندگی گزاروں؟ یا اس کی محبوبہ بن جاؤں؟ میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ کاشف بہت سارے تحفوں سمیت میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ لیکن دروازے پر کسی نام کی کوئی تختی نہیں ہے۔ یہ کسی کا گھر بھی نہیں ہے۔ اگرچہ اس گھر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

صرف میں ہی رہتی ہوں۔ پھر وہ اندر گھس آتا ہے۔ پھر وہ سارے تحفے ایک طرف پھینک کر مجھے اپنے بازوؤں میں بڑے جذباتی اور وارفتگی سے بھر لیتا ہے۔ پھر وہ میرے ساتھ دو تین دن رہتا ہے۔ پھر وہ سیمپل بیگ اُٹھا کر چل دیتا ہے۔ پھر جب وہ میرے ساتھ نہیں رہتا ہے تو پھر ایک گول مٹول اور حسین عورت جس کے حسن کا طلسم اس کے موٹے، بھدے ہونے سے اپنی کشش کھو چکا ہے، میری نظروں کے سامنے اپنے دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے کھڑی ہو جاتی ہے۔ بچے جب کسی چیز کی فرمائش کرتے ہیں، انہیں مار پڑتی ہے۔ لیکن کاشف کبھی اس کے سامنے نہیں آتا۔ کبھی کبھی وہ ایک طرف کھڑا اپنی بیوی کو گھورا کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی باتوں سے چڑ کر میرے پاس آ جاتا ہے۔ وہ تحائف دے کر یہ کہتا ہے کہ میں ایک عورت ہونے کے ناتے خوش ہو جایا کروں گی۔ اس پر بڑی فیاضی سے مہربان ہو جایا کروں گی۔ ہر آدمی اپنے تحفوں کے بدلے میں عورت کو اپنی ملکیت سمجھ لیتا ہے۔ ایک کھلونا...... وہ یہی سمجھے گا کہ میں اپنی ایک خواہش کے آگے کتنی بے بس ہوں، ہر عورت کو وہ ایسا ہی سمجھتا ہے۔ بہت ساری خوش نما اور قیمتی چیزوں کے عوض وہ اپنی ہر خواہش پوری کرنا چاہے گا۔ بالکل ایک کاروبار کی طرح۔

کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟ کیا میں اپنا وجود آلودہ، محبت اور روح...... نہاں خانے...... بستر، میں انکار کر دوں تو کیا وہ ناراض ہو جائے گا؟ یہ محبت جو میں بہت کچھ کھو کر پاؤں گی وہ ناکام ہو جائے گی۔ کیا میں اس کی داشتہ بن جاؤں؟ پھر مجھ میں اور داشتہ میں کیا فرق رہے گا؟ وہ شادی کر کے بھی تو اپنی بیوی کے علم میں لائے بغیر زندگی گزار سکتا ہے۔ میں غلاظت کے سمندر میں گر جاؤں...... میں کوئی یورپی عورت نہیں ہوں۔ اس ملک کی ہوں، مذہب سے گہرا تعلق ہے۔ مجھے بہت سے ایسے مل جائیں گے جو میرا ہاتھ تھام لیں گے۔ گھر بسا لیں گے۔ کیونکہ میں آج بھی حسین ہوں، پُرکشش اور جوان بھی ہوں۔

اچانک گاڑی نے چلنے کے لیے سیٹی بجا دی۔ پھر یک لخت میرے اندر کی کوئی سوئی ہوئی محبت ایک دم سے ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی۔ میرے اندر ایک بہت تیز قسم کی حرکت نے جنم لیا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ گاڑی رینگنے لگی تو وہ پلیٹ فارم پر چلنے لگا۔ میں بہت خاموش اور ثابت قدم تھی، اعصابی جنگ سے آزاد۔ یہ میرا جواب تھا کاشف کو، اس کے سوال کا۔

جب گاڑی ٹنڈو آدم کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو مجھے یقین نہیں آیا۔ نصف سے زیادہ پلیٹ فارم پر مجھے لینے اور استقبال کرنے کے لیے طلبا اور طالبات نہیں بلکہ پرنسپل...... لیکچررز اور پروفیسرز بھی آئے ہوئے تھے۔ ایسا لگا تھا کہ سارا کالج اُمڈ آیا ہو۔ کالج کی طرف جاتے ہوئے پرنسپل نے بڑی اپنائیت سے کہا ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر آپ ہماری استدعا قبول کر لیں تو سجاد مرحوم کی خالی سیٹ آپ کو دے دیں۔ نہ صرف تمام طالب علم اور عملہ بھی خوش ہو جائے گا اس لیے کہ آپ نہیں جانتیں کہ سجاد نے کتنی جلدی انہیں اپنا اسیر بنا لیا تھا۔''

کالج کے عقب میں جو بہت بڑا میدان تھا کرکٹ اور فٹ بال کے کھیل کے لیے مخصوص تھا۔ اتنا بڑا پنڈال تھا اور طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا۔ اتنا بڑا اسٹیج تھا کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بینر کے پاس بہت بڑا سجاد کا پورٹریٹ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس پورٹریٹ کو پہلی بار بڑے غور سے دیکھا۔ سجاد کی آنکھوں میں مجھے کبھی اتنا گہرا سمندر دکھائی نہیں دیا تھا۔ ''اور احساس کا ایک پُرسکون سمندر۔ طالب علم اس سے وہی کچھ پڑھنا چاہتے تھے جو وہ انہیں پڑھاتا رہا تھا۔ ایک دکھی اور ناکام محبت نے انہیں کیا پڑھایا ہوگا۔ آخر یہ لوگ اس سے اس قدر متاثر کیوں تھے؟ سجاد کوئی بڑا انسان نہیں تھا جیسا اس پورٹریٹ میں دکھائی دیتا تھا۔ بس ایک عام قسم کا انسان تھا۔ اندر سے ٹوٹا ہوا، باہر سے بھی یقیناً ٹوٹا ہوا۔ ممکن ہے کہ ٹوٹنے کے احساس ہی نے اسے ذہین بنا دیا ہو۔ اس قدر ذہین کہ چھوٹے بڑے سب ہی اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ کو یہ لوگ خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے اندر ایک اَن جانا سا خوف محسوس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس پورٹریٹ کا سایہ مجھ پر پڑ رہا ہے۔ اور پھر پتا چلا کہ اس نے اپنا مکان اور کھیت، کالج کے ان طالب علموں کے نام لکھ دیا جو تعلیمی اخراجات کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے میرے نام ایک خط چھوڑا تھا جو مجھے واپسی کے وقت دیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔

''شاہینہ!

''میں تمہارے نام اپنی ناکام محبت چھوڑے جا رہا ہوں۔ جو تمہیں ساری زندگی درد دیتی رہے گی۔

سجاد...... جس کی تم نہ ہو سکیں۔''

عشق ناکام نمبر

عشق کی انتہا

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
عشق ناکام کے لیے جتنی بھی آپ بیتیاں آپ تک پہنچی ہوں گی، یہ اُن سب سے الگ سچ بیانی ہے جو مجھے بھولتے نہیں بھولتی۔ امید ہے یہ مجھ بیتی آپ کو بھی پسند آئے گی۔

نیلوفر یاسمین
(راولپنڈی)

عشق ناکام نمبر

فلاں لڑکی کو فلاں لڑکے سے عشق ہو گیا، ایسی اطلاعات آپ تک بھی پہنچتی ہوں گی۔ یہ باتیں یعنی عورت اور مرد کے درمیان محبت کا ہو جانا ایک فطری بات ہے۔ اسی کو لوگ عشق کہہ دیتے ہیں مگر میرے نزدیک اسے محبت تو کہہ سکتے ہیں، عشق نہیں۔ کیونکہ عشق ایک اعلیٰ وارفع جذبہ ہے جو عورت اور مرد کے درمیان ہی واقع ہو یہ ضروری نہیں، جیسا کہ عشق کی ایک قسم کا میں نے مشاہدہ کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

اس دن میں اخبار دیکھ رہی تھی کہ میری نظر ایک اشتہار پر ٹھہر گئی۔

اشتہار یہ تھا کہ ایک گھر میں ایک خاتون کو ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو لکھنے پڑھنے کا کام کر سکے۔ میں ان دنوں بی اے کر کے گھر میں بور ہی ہو رہی تھی۔

ایم اے کا ارادہ تھا لیکن ابھی تک ایڈمیشن فارم وغیرہ نہیں آئے تھے۔ اسی لیے میں نے سوچا کیوں نہ یہ کام کر کے دیکھا جائے۔ اس طرح کچھ پیسا ہی آئے گا۔

میں نے اپنے گھر والوں سے ذکر کیا تو انہوں نے اجازت تو دے دی لیکن اس شرط پر کہ میں پہلے وہاں کا ماحول دیکھ لوں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں۔

میں اس پتے پر پہنچ گئی۔

وہ شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے کا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ خوبصورت بنا ہوا۔ میں نے گھنٹی بجائی تو گھنٹی کے جواب میں جس نے دروازہ کھولا میں اسے دیکھ کر کانپ کر رہ گئی تھی۔

وہ ایک عورت تھی۔ لیکن اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کا پورا چہرہ بُری طرح جھلسا ہوا تھا۔ سر کے بال تک اُڑے ہوئے تھے۔ بہت ہی بھیانک شکل تھی اس کی۔ اس کی آواز بھی بہت دہشت ناک سرسراتی ہوئی سی تھی۔ ''کیا بات ہے۔ کیوں آئی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میری زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ ''وہ۔ اس گھر سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس لیے آئی ہوں۔''

''ہوں۔'' اس نے ایک ہنکاری لی۔ ''سمجھ گئی۔ یہ آپا کا کام ہوگا۔ آؤ اندر آ جاؤ۔''

میں خوفزدہ سی اندر آ گئی۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ بہت سلیقے کا ڈرائنگ روم تھا۔ ہر چیز سے نفاست اور خوبصورتی کا اظہار ہو رہا تھا۔ سوائے اس عورت کے جو ایک بھیانک خواب کی طرح تھی۔

وہ عورت مجھے بٹھا کر کمرے سے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ایک دوسری عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک نارمل عورت تھی۔ یعنی اس کے چہرے پر اس قسم کا کوئی نشان وغیرہ نہیں تھا۔ لیکن خدا کی پناہ۔ جب اس نے اپنے ہاتھ آگے کیے تو ایک بار پھر میں لرز کر رہ گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جھلسے ہوئے تھے۔

نہ جانے یہ کیا معمّا تھا۔ ایک کا چہرہ جھلسا ہوا تھا دوسرے کے ہاتھ۔ مجھے اس گھر سے خوف محسوس ہونے لگا لیکن اب تو آ ہی گئی تھی۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح کچھ وقت گزارنا تھا۔

''اشتہار دیکھ کر آئی ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

''تم اردو لکھ لیتی ہو؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے ضرورت ہے۔'' اس نے اپنے جلسے ہوئے ہاتھ آگے کر دیئے۔ ''تم دیکھ سکتی ہو کہ میں ان جلسے ہاتھوں سے لکھ نہیں سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے میں بولتی رہوں گی اور تم لکھتی رہنا۔''

''جی ہاں۔ میں یہ کام بہ خوبی کر سکتی ہوں۔''

''تمہاری تنخواہ دس ہزار روپے ہوگی۔'' اس نے بتایا۔

دس ہزار ایک اچھی تنخواہ تھی۔ ورنہ اگر میں کسی اسکول وغیرہ میں جاب کرتی تو چار پانچ ہزار سے زیادہ کیا مل سکتا تھا۔ لیکن یہاں کا ماحول۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک عورت جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ پھر دوسری عورت۔ جس کے ہاتھ جلے ہوئے تھے اور مجھے اس عورت کا ایک طرح سے سیکریٹری بننا تھا۔

''بتاؤ۔ کیا کہتی ہو؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے میڈم۔ میں کل سے آ جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''میڈم نہیں۔ میرا نام دردانہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''دردانہ آغا۔ تمہیں اگر لکھنے پڑھنے کا شوق ہے تو تم نے میرے ناولز ضرور پڑھے ہوں گے۔''

''اوہ۔ کیوں نہیں۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''تو آپ ہیں دردانہ آغا۔''

''ہاں۔'' اس کے لہجے میں ہلکے سے تفاخر کے ساتھ تھوڑا سا دکھ بھی تھا۔ ''میں ہی دردانہ آغا ہوں، مشہور رائٹر۔ جس کے ہاتھ جھلسے ہوئے ہیں اور جو خود سے لکھ بھی نہیں سکتی۔''

''یہ حادثہ۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ نہ جانے وہ کیا خیال کرے۔ کہیں بُرا نہ مان جائے۔

''تو پھر تم کل دس بجے سے آ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

میں نے جب گھر آ کر یہ سب بتایا تو سب ہی حیران رہ گئے۔ ''بیٹا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسی پُراسرار جگہ پر

ملازمت مت کرو۔'' امی نے کہا۔

''کچھ نہیں امی۔ وہ ایک مشہور عورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ ہوا ہے۔ ویسے دونوں ہی نارمل ہیں۔''

''اور وہ دونوں ایک دوسرے کی کزن ہیں۔'' ابو نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ابھی اس سے پوچھا نہیں ہے۔''

''بہر حال، محتاط رہنا۔''

میں دوسری صبح دس بجے اس مکان میں پہنچ گئی۔ دروازہ اسی عورت نے کھولا جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک خاموش طبع عورت تھی۔ باتیں کرنا شاید پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے مجھے لاؤنج میں لے جا کر بٹھایا اور خود باہر چلی گئی۔

اس لاؤنج کی سجاوٹ بھی بہت خوبصورت تھی۔ ایک طرف کتابوں کا ریک تھا۔ اس ریک کے برابر میں ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر ایک بڑی سی فریم کی ہوئی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

وہ تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی تھی۔

میں نے ایسے پُرکشش چہرے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ کیا لڑکی تھی۔ کیا چہرہ تھا۔ انتہائی خوبصورت آنکھیں۔ ستواں ناک۔ کتابی چہرہ۔ غرضیکہ صحیح معنوں میں وہ تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی تھی۔

میں اس تصویر کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ لاؤنج میں کسی کی آمد کا احساس بھی نہیں ہو سکا۔

''کیا دیکھ رہی ہو۔'' آواز گونجی اور میں بُری طرح چونک اُٹھی۔ یہ وہی عورت تھی۔ جھلسے ہوئے چہرے والی۔ جو ایک ٹرے میں چائے لے کر آئی تھی۔

''چائے پیو۔ تمہاری باس آ رہی ہیں۔'' اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں کہا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔

''شکریہ۔''

وہ جانے لگی۔ پھر جاتے جاتے اچانک پلٹ کر میرے پاس آئی۔ ''جانتی ہو یہ تصویر کس کی ہے؟'' اس نے اشارہ کیا۔

''جی۔ جی نہیں۔ یہ میں نہیں جانتی۔'' میں نے کہا۔

''یہ میں ہوں۔'' اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جو مجھے بہت بھیانک محسوس ہوئی۔

وہ اتنا بتا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرے خدا۔ کیا یہ تصویر اس کی ہو سکتی تھی؟ کیا یہ ممکن تھا؟ اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو یہ کتنی بھیانک اور تلخ سچائی تھی کہ اتنی خوبصورت لڑکی کا یہ حال ہو گیا تھا۔ خدا جانے اس کا چہرہ کس طرح مسخ ہو گیا ہوگا۔ کیا سانحہ ہوا ہوگا؟

کچھ دیر بعد دردانہ آغا لاؤنج میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر احتراماً کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں رائٹنگ پیڈز اور پوائنٹر تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے اشارہ کیا۔ ''اور یہ سب سنبھالو۔ تمہارا کام شروع ہو رہا ہے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے قلم کاغذ سنبھال لیا تھا۔

''میں آج سے ایک نیا افسانہ شروع کر رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ ایک بہت عجیب کہانی ہے۔ اس میں تنہائی کا کرب بھی شامل ہے اور خود غرضی کی انتہا بھی ہے۔''

''جی ہاں۔ آپ بتائیں، میں لکھ رہی ہوں۔''

اس نے آہستہ آہستہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں لکھوانا شروع کر دیا۔ اس نے مجھے پیراگرافنگ بتائی۔ یہ بتایا کہ کس طرح جملہ ختم ہونے کے بعد دوسری لائن میں جملہ کہاں سے شروع کیا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں میرے جو تاثرات تھے۔ وہ ختم ہونے لگے تھے۔ اس کی آواز میں شفقت بھی تھی اور ایک ادیبہ کا علم بھی بول رہا تھا۔

اس نے ایک ایسی لڑکی کی کہانی لکھوائی تھی جو پہاڑوں کے درمیان ایک دلکش وادی میں رہا کرتی تھی۔ اس کا محبوب اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بظاہر تو یہ عام سی کہانی تھی لیکن اس نے بہت خوبصورت انداز دیا تھا۔ اس دن وہ کہانی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے اس کہانی کو اگلے دن کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں نے گھر آ کر بتایا کہ میں اس جگہ سے مطمئن ہوں۔ پھر جب یہ بتایا کہ جھلسے ہوئے چہرے والی اپنے زمانے میں بہت خوبصورت تھی تو سب کو یہ سن کر حیرت ہوئی۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ کہانی چونکہ طویل تھی۔ اس لیے دوسرے دن بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ البتہ تیسرے دن جب میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو اس دفعہ دردانہ آغا نے دروازہ کھولا۔ ''جاؤ۔ لاؤنج میں جا کر بیٹھ

www.paksociety.com

جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس کم بخت کا مزاج ٹھیک کر کے آتی ہوں۔''

وہ غصے میں معلوم ہوتی تھی اور اس نے یہ جملہ یقیناً اسی جھلسے ہوئے چہرے والی کے لیے کہا ہوگا۔ میں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی لاؤنج میں آ گئی۔ اب اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''اب بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کبھی کبھی بے وجہ ضد کرنے لگتی ہے۔''

''میڈم۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا یہ پوچھ سکتی ہوں کہ ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔''

''کیوں نہیں۔ وہ فرزانہ ہے۔ میری چھوٹی بہن۔'' دردانہ نے بتایا۔ ''میں نے اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی ہے۔''

''وہ تو بہت خوبصورت تھیں میڈم۔'' میں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر یہ کیا ہوا کہ۔''

''لڑکی۔'' اس کی آواز میں اچانک سختی آ گئی تھی۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہیں ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔''

''سوری میڈم۔'' میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''چلو۔ کام شروع کرو۔'' اس نے کہا۔

اس نے پھر لکھوانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ اسے سختی سے نہیں بولنا چاہئے تھا۔ اسی لیے وہ نرم لہجے میں بولی۔ ''فرزانہ کے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی تم اس بارے میں جان سکو لیکن ابھی نہیں۔ سمجھیں۔''

''یس میڈم۔''

اس نے پھر کہانی ڈکٹیٹ کروانی شروع کر دی۔ کہانی بہت خوبصورت جا رہی تھی۔ اس میں کئی موڑ تھے۔ کرداروں کی ہیئت بہت مضبوط تھی۔ احساس ہو رہا تھا کہ وہ واقعی ایک باکمال رائٹر ہے۔

وہ کہانی اسی دن ختم ہوگئی۔ جب میں جانے لگی تو اس نے کہا۔ ''سنو۔ میری عادت ہے کہ ہر کہانی کے خاتمے کے بعد میں ایک دن آرام کرتی ہوں۔ اب تم پرسوں آنا۔''

''ٹھیک ہے میڈم۔''

میں جب پرسوں صبح اس کے گھر پہنچی تو دروازہ کھولنے والی وہی اس کی بہن فرزانہ تھی۔ شاید وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی کیونکہ اس کے جلسے ہوئے ہونٹ اسی انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔

''آؤ۔ آ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''آج تمہاری باس آرام کر رہی ہیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔''

''اوہ۔ تو پھر میں چلتی ہوں۔''

''نہیں۔ اتنی جلدی کہاں جا رہی ہو۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آج ہی تو موقع ملا ہے کہ میں بھی تمہیں ایک کہانی بتا سکوں۔ ورنہ آپا موقع ہی کہاں دیتی ہیں۔''

مجھے ویسے بھی اتنی جلدی گھر واپس نہیں جانا تھا۔ پھر وہ جو کچھ مجھے بتانے والی تھی۔ وہ یقیناً کوئی دلچسپ بات ہوتی اسی لیے میں اس کے ساتھ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

''لڑکی۔ میں نے آج تک تمہارا نام نہیں معلوم کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نیلوفر۔'' میں نے اپنا نام بتایا۔

''نیلوفر۔ یہ کہانی جو میں تمہیں سنا رہی ہوں۔ تمہارے لکھنے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یاد رکھنے کے لیے ہے۔ تم صرف یاد رکھنا۔ ہوسکتا کہ کبھی نہ کبھی دُہرانے کی ضرورت پیش آ جائے۔''

''جی فرمائیں۔ میں سن رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کہانی دو بہنوں کی ہے۔'' اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں بتانا شروع کیا۔ ''دونوں نے ایک دوسرے سے بہت محبت کی کیونکہ پوری دنیا میں ان دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر زندہ رہتی تھیں۔ ایک بیمار ہوتی تو دوسری بھی بیمار پڑ جاتی۔ ایک خوش ہوتی تو دوسری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔ ایک کو کچھ ہوتا تو دوسری بے قرار ہو جاتی۔ دونوں ایک ساتھ گھر سے نکلا کرتیں اور ساتھ واپس آیا کرتیں۔ بہت سے لوگ دونوں کی محبت کو رشک سے دیکھا کرتے تھے۔ اب تم یہ کہو گی کہ یہ تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ بہنیں تو ایک دوسرے سے محبت کرتی ہی ہیں۔ یہ درست ہے لیکن ان دونوں کی محبت بے مثال تھی۔ عشق کی انتہا تھی، اس کا کسی اور سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''اگر آپ ایسا کہہ رہی ہیں تو پھر واقعی ایسی ہی محبت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی تھا۔'' اس کی سرسراتی ہوئی آواز اور تیز ہوگئی تھی۔ ''تم ایسا سمجھ لو کہ ایک بار دونوں کو ایک ہی آدمی سے محبت ہوگئی۔ محبت کیا۔ تم اسے پسند سمجھ لو۔ دونوں نے ایک ہی لڑکے کو پسند کر لیا۔ ہاں۔ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ چھوٹی

www.paksociety.com

بہن بہت خوبصورت تھی اور بڑی بس واجبی صورت کی تھی۔ یہ بھی خدا کی مصلحت سمجھ لو۔ اس کے باوجود چھوٹی کو نہ احساس برتری تھا اور نہ بڑی کو کم تری کا احساس تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے سراپا قربان ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ ایک آدمی دونوں کو پسند آ گیا۔''

''اس وقت تو دونوں کے لیے ایک امتحان ہوگیا ہوگا میڈم۔''

''ہاں۔ بہت بڑا امتحان۔ اس میں ایک دشواری یہ تھی کہ اگر کسی ایک کی طرف اس آدمی کا جھکاؤ سمجھ میں آ جاتا تو معاملہ بہت آسان تھا لیکن وہ کم بخت دونوں کے ساتھ ایک جیسا رویہ رکھتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی خاص مہربانی کس پر ہے۔ وہ اگر ایک طرف چھوٹی کے ساتھ آؤٹنگ پر جا رہا ہے تو دوسری طرف بڑی بھی اس کی مہربانیوں اور توجہ سے محروم نہیں ہے۔ اسی لیے دونوں بہنوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس پر مہربان ہے یا کس کو پسند کرتا ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی میڈم۔ یہ بات تو خود اس سے بھی معلوم ہوسکتی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ یہ مرحلہ تو آیا تھا لیکن اس سے پہلے دونوں بہنیں ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہوچکی تھیں۔'' اس نے بتایا۔

''میں نہیں سمجھی میڈم۔ یہ کس طرح ہوا ہوگا؟''

''دونوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اس آدمی کو چھوڑ رہی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''تاکہ دوسری اسے اپنا لے۔ لیکن دونوں ہی اس بات پر ضد کرتی رہی تھیں کہ میں نہیں۔ تم اسے اپناؤ گی۔''

ابھی اس کی کہانی جاری ہی تھی کہ اچانک دردانہ آغا کمرے میں داخل ہوگئیں۔ وہ واقعی بیمار معلوم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ایک شال لپیٹ رکھی تھی اور بری طرح کھانستی ہوئی کمرے میں آئی تھیں۔

ان کے آنے کے بعد کہانی کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

دردانہ آغا نے مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ یہ بتایا کہ وہ دو چار دنوں تک کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر میں اس سے اجازت لے کر ان گھر سے باہر آ گئی۔

کہانی دلچسپ تھی۔ دو بہنیں۔ ان میں سے ایک بہت خوبصورت اور دوسری نارمل صورت کی۔ پھر درمیان میں ایک ایسا آدمی آ جاتا ہے۔ جس کی توجہ دونوں کی طرف ہوتی

ٹوٹے دلوں کی شاعری

فیض، ساحر اور ابنِ انشا کی شاعری ہمیشہ میری دھڑکنوں میں رہی ہے۔ فیض کو ہمیشہ یہ کمال حاصل رہا کہ وہ جو بھی کہتے دل میں اُتر جاتا تھا کیونکہ تینوں ہی ٹوٹے ہوئے دلوں کی پکار کی لے گنگناتے ہیں۔ میں کئی ایسے لوگوں سے واقف ہوں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر انہیں فیض کا پورا کلام زبانی یاد تھا۔ ساحر میں بھی فیض والی بات تھی یعنی دل میں اُتر جانے والی، کچھ تنگ نظر نقاد کہتے ہیں کہ اگر اردو شاعری میں فیض نہ ہوتے تو ساحر لدھیانوی بھی نہ ہوتے۔ دراصل یہ بات ابراہیم جلیس نے پھیلائی تھی مگر مذاق میں۔ جب ساحر اور جلیس کی آپس کی تکرار بڑھ جاتی تو وہ یہ بات کہتے تھے مگر چند لمحوں بعد وہی جلیس سب سے زیادہ ساحر کی تعریف کر رہے ہوتے تھے۔ ساحر نے جو نظم پرچھائیاں لکھی، یہ ادب میں سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اس کا پورا رنگ ہویدا ہے۔ حیدرآباد (دکن) کے ایک مشاعرے میں ساحر نے یہ نظم پڑھی تھی۔ یہ نظم اتنی طویل تھی کہ ساحر لگاتار ایک گھنٹے تک سناتا اور داد وصول کرتا رہا۔ بعد میں مجھے سجاد ظہیر نے اس نظم کے حوالے سے ایک ستائشی خط بھیجا کہ تمہارے دوست نے یہ نظم سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا ہے۔

اقتباس: حمید اختر

مرسلہ: راحیل نواز، جھنگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کو بے تاب ہیں۔ آگے نہیں معلوم کہ کیا ہوا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ یہ کہانی ان ہی دونوں کی تھی۔ دونوں ایک مکان میں رہنے والی۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک۔ ایک خوبصورت دوسری کم صورت۔ یہاں تک تو یہ کہانی ان دونوں ہی کی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ یہ بھی کسی نہ کسی دن معلوم ہو ہی جاتا۔

دو دنوں کے بعد وہاں پہنچی تو دردانہ آغا کی طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی۔ وہ اب کہانی لکھوانے کے موڈ میں تھیں۔ لیکن جب میں نے قلم کاغذ سنبھال کر ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا۔ ''کیا خیال ہے میں اس کہانی کو آگے بڑھا دوں۔''

''کس کہانی کو میڈم۔''

''وہی جو اس دن فرزانہ تمہیں سنا رہی تھی۔ میں نے دروازے کے پیچھے سے وہ سب کچھ سن لیا تھا جو وہ تمہیں بتا رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو اب یہ کہانی میں اس کے انجام تک پہنچاتی ہوں۔''

میں ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''پریشان مت ہو۔'' وہ مسکرا دیں۔ ''تمہیں شاید یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ یہ ہماری اپنی کہانی ہے۔ یعنی ہم دونوں بہنوں کی۔''

''جی ہاں میڈم۔ یہ اندازہ ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو اب میں وہاں سے شروع کرتی ہوں۔ جہاں اس نے ختم کی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک شخص آ گیا تھا۔ جس کی توجہ ہم دونوں پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ اسی لیے میں نے ایک دن اس سے دریافت کیا۔ ''خالد۔ میں جانتی ہوں کہ تم صرف میرا دل رکھنے کے لیے میری طرف توجہ دیتے ہو کیونکہ میں فرزانہ کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہوں جبکہ فرزانہ مجھ سے کہیں بہتر ہے۔''

''نہیں دردانہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک دوراہے پر آ کر کھڑا ہو چکا ہوں۔ میری نظر میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں میں خوبیاں ہیں۔ تم میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو فرزانہ میں نہیں ہیں اور اس میں چند باتیں ایسی ہیں جو تم میں نہیں ہیں۔ اسی لیے میں کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔''

''چلو۔ اب میں تمہیں ایک آفر دیتی ہوں۔ تم فرزانہ سے شادی کر لو کیونکہ میری عمر تو نکلتی جا رہی ہے لیکن وہ ابھی نوجوان ہے۔ ابھی اس میں امنگیں ہیں۔ وہ ابھی آگے چل کر بہت کچھ دیکھے گی۔ اس کے سامنے خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی پڑی ہے۔ تم اسے اپنا لو۔''

''دردانہ۔ کیا تم یہ کھلے دل سے کہہ رہی ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ بالکل کھلے دل سے۔'' میں نے کہا ''لیکن ایک شرط کے ساتھ۔''

''وہ شرط کیا ہوگی؟''

''وہ شرط یہ ہے کہ شادی کے بعد تم بھی یہیں اس مکان میں ہمارے ساتھ رہو گے تاکہ فرزانہ میری نظروں کے سامنے رہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں دردانہ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میرا اپنا گھر ہے۔ پوری فیملی ہے۔ میں کسی بھی حال میں اپنے خاندان کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر تم ہم دونوں کو بھول جاؤ۔''

''یہ بھی نہیں ہو سکتا۔'' خالد نے کہا۔ ''مجھے تم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے اور وہ بھی جلد سے جلد کیونکہ والدین مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو۔ شرط یہی ہوگی۔'' میں نے اسے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

دو دنوں کے بعد اس نے مجھ سے کہا ''دردانہ۔ میں نے اب جا کر اپنا مائنڈ بنا لیا ہے اور میں شادی کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہوں۔''

''کس سے؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''تمہاری بہن فرزانہ سے۔'' اس نے بتایا ''میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے وہی مناسب رہے گی اور میں اس سلسلے میں فرزانہ سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ بھی تیار ہے۔''

''چلو۔ تم دونوں کو بہت مبارک ہو۔'' میں نے کہا۔

''لیکن وہ شرط برقرار رہے گی۔ چاہے تمہاری شادی فرزانہ سے ہو یا مجھ سے۔''

''لیکن فرزانہ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہ کیا کہہ رہی ہے۔''

''وہ میرے ساتھ رہنے کو تیار ہے۔ وہ یہاں سے رخصت ہو کر میرے گھر چلی آئے گی۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہوگی۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم چاہو تو اس سے معلوم کر سکتی ہو۔''

نیلوفر! میں اپنی محبت کے زعم میں تھی۔ اس محبت پر یقین تھا مجھے جو محبت میں نے فرزانہ سے کی تھی۔ میں نے اس کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ والدین کی موت کے بعد ماں بن کر پرورش کی تھی اس کی۔ وہ میرے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن مجھے اس وقت شدید حیرت دکھ ہوا جب اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''ہاں آپا۔ میں نے خالد کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہوں گی۔''

''فرزانہ۔ کیا تو مجھے چھوڑ دے گی؟''

''ظاہر ہے آپا۔ میں کہاں تک شادی کیے بغیر تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اب تمہارا رشتہ تو آنے سے رہا۔ تو میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کیوں برباد کروں؟ مجھے جانے دو آپا۔ تم یہ مت خیال کر لینا کہ ہماری محبت میں کمی آ جائے گی۔ نہیں آپا۔ تمہاری محبت اپنی جگہ اور شادی کی زندگی اپنی جگہ۔''

''بس نیلوفر! میں تو ٹوٹ کر رہ گئی۔ کیا فائدہ ہوا تھا مجھے ایسی محبت کا۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی۔ وہ میں بتا نہیں سکتی۔ مجھے اپنی پوری زندگی اکارت محسوس ہونے لگی تھی۔

غم اور غصے کی ایسی شدید حالت تھی کہ بس کچھ مت پوچھو۔ کیا کرنا چاہئے تھا مجھے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جو مجھے کچوکے لگائے جا رہا تھا۔ میں سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ کسی بھی قیمت پر میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔''

اس وقت دردانہ آغا ہولے ہولے کانپنے لگی تھی۔ شاید ماضی اسے یاد آ رہا تھا۔ یا اس کے اندر کے احساس نے اس کے وجود میں آگ لگا دی تھی۔

کہانی اب واقعی فیصلہ کن اور دلچسپ موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اب صرف یہ معلوم ہونا تھا کہ دردانہ نے شادی کس طرح روکی ہوگی۔

میں ایسی ہزاروں کہانیاں سن چکی تھی۔ رقابت کا جذبہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے اور جب سے محبت کا کھیل شروع ہوا ہے۔ تب سے اب تک نہ جانے کتنے لوگ اس جذبہ رقابت کی بھینٹ چڑھ چکے

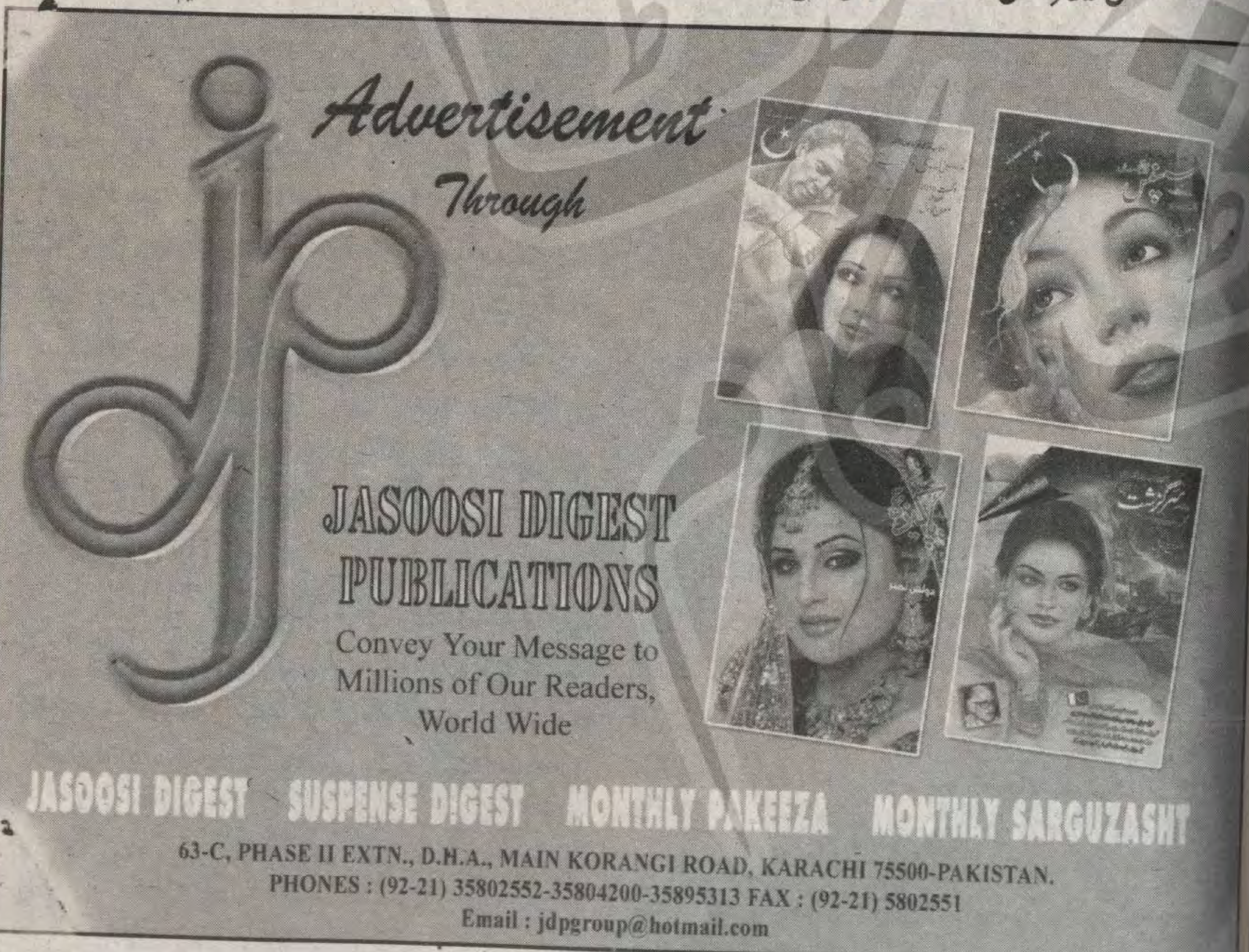

www.paksociety.com

ہیں۔ نہ جانے کتنی کہانیاں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔ نہ جانے کتنی فلمیں بن چکی ہوں گی؟"

کچھ دیر بعد جب اس کی حالت سنبھلی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ "میں نے فرزانہ کی شادی نہیں ہونے دی۔ میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی اسی لیے میں نے۔ میں نے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔"

"کیا؟" میں اُچھل پڑی۔ "میڈم۔ آ۔ آپ نے اس کے چہرے کو بگاڑا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے۔" وہ اب آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ "میں نے اس کے ساتھ ایسا کیا ہے کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ میں اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ تم ہی بتاؤ میں اور کس طرح روکتی؟"

"میرے خدا! آپ نے اپنی بہن کے اتنے خوبصورت چہرے کا ایسا حال کر دیا۔"

"ہاں۔" وہ روئے جا رہی تھی۔ "خود میں نے اس کی زندگی برباد کر دی۔ جس کو میں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے ایسا سلوک کیا جانتی ہو کیوں؟"

"ظاہر ہے میڈم۔ رقابت چیز ہی ایسی ہے۔" میں نے کہا۔

"رقابت نہیں بے وقوف۔ عشق کی انتہا۔ میں اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی اسی لیے میں نے اس کا چہرہ ہی بگاڑ دیا کہ وہ کسی طرف بھی نہ جائے۔ کوئی بھی اس سے شادی کرنے کا نہیں سوچے اور ایسا ہی ہوا۔ جب اس کا چہرہ مسخ ہوا تو خالد نے شادی سے معذرت کر لی اور وہ میرے ساتھ رہنے کے لیے مجبور ہو گئی مگر فرزانہ کو اس کا زیادہ افسوس نہیں ہے کیونکہ وہ خود بھی مجھ سے دور ہونا نہیں چاہتی۔ وہ تو وقتی جذبہ تھا کہ وہ خالد کی باتوں میں آ گئی۔"

"افسوس ہے میڈم آپ پر۔" میرے لہجے میں بے پناہ تلخی آ گئی تھی۔ "آپ کو اتنا خطرناک عمل کرنے کے بعد پشیمانی بھی نہیں ہوئی۔"

"پشیمانی۔" وہ ہنس پڑی۔ بہت ہی تلخ ہنسی تھی اس کی۔ "یہ دیکھ رہی ہو۔" اس نے اپنے دونوں جھلسے ہوئے ہاتھ میرے سامنے کر دیئے۔ "یہ وہی پشیمانی ہے۔ فرزانہ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے بعد میں نے خود اپنے آپ کو سزا دی۔ خود اپنے دونوں ہاتھوں پر تیزاب گرا کر انہیں ناکارہ بنا دیا۔ اب اس سے بڑی پشیمانی اور اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے۔"

دونوں بہنوں کی المناک کہانی کا انجام سامنے آ چکا تھا۔ کتنا بھیانک اور وحشت زدہ انجام تھا۔ یہ عورت کتنی جنونی تھی۔ کتنی پاگل تھی۔ اب وہ ہنس رہی تھی۔ اس ہنسی میں دکھ بھی تھا۔ اس کے آنسو بھی بہے جا رہے تھے۔

میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔

ایسا لگا جیسے اس کے جھلسے ہوئے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ آہستہ آہستہ۔ نہ جانے ایسا خیال کیوں آ گیا تھا کہ اس عورت نے اپنی بہن کے چہرے کو اس لیے برباد کیا تھا کہ بہن شادی ہو کر کہیں دور نہ چلی جائے پھر یہ بھی تو ممکن تھا کہ اگر میں اس کی جاب چھوڑ دیتی تو یہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتی۔ ایسی عورتوں کا کیا بھروسہ۔ یہ پاگل قسم کی عورتیں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔

مجھے اس وقت اتنا خوف محسوس ہوا کہ میں کچھ کہے بغیر اُٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس مکان سے باہر آ گئی۔ میں نے اس کی آوازیں سنیں۔ وہ مجھے بلا رہی تھی۔ پکار رہی تھی لیکن میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ میں بس دوڑتی چلی گئی۔

میں نے گھر آ کر بتا دیا کہ میں نے وہ جاب چھوڑ دی ہے تو کسی نے اس پر افسوس کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک میری وہ جاب ویسے بھی اس قابل نہیں تھی کہ میں اسے جاری رکھتی۔

میں دوبارہ مڑ کر وہاں نہیں گئی۔

پھر ایک دن (شاید چار مہینوں کے بعد) ان دونوں بہنوں کا انجام سامنے آ گیا۔ کہانی اب جا کر اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔

اخبار میں مشہور رائٹر دردانہ آغا اور اس کی بہن کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ محلّے والوں نے دونوں کی لاشیں گھر سے باہر نکالی تھیں۔

اس مکان سے اُٹھنے والی بدبو نے محلّے والوں کو پریشان کر دیا تھا۔ جب پولیس کی مدد سے مکان کا تالا توڑا گیا تو پتا چلا کہ دونوں مر چکی ہیں اور ان کی لاشیں کئی دن پُرانی ہیں اور دونوں کس طرح مریں؟ شاید یہ راز کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ مگر مجھے اندازہ ہے کہ اس کے پیچھے یہی بات ہو گی کہ ان میں سے کسی کو اپنی موت کے قریب ہونے کا مغالطہ ہو گیا ہو گا یا پھر دو میں سے کسی ایک نے الگ ہونے کی کوشش کی ہو گی جس سے دوسری کو اپنے جذبہ عشق کی ناکامی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو گا۔

پیاسا عشق

محترم معراج رسول

السلام علیکم!

میں سرگزشت کا بہت پُرانا قاری ہوں لیکن پہلی بار کوئی تحریر بھیج رہا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ سرگزشت میں عشقِ ناکام کا اشتہار دیکھا۔ سوچا کہ میں بھی اپنی سوانح حیات لکھ دوں۔ چونکیں نہیں، کہنے کو یہ میری ایک ناکام عشق کی داستان ہے لیکن اسی پر میری زندگی تمام ہے کیونکہ اب تک میں اسی زخم کو سہلا رہا ہوں، تنہا غمِ زندگی کا بوجھ اٹھا رہا ہوں۔

احمد رضا

(راولپنڈی)

عشق ناکام نمبر

آسمان گھرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور پانی کے شور نے عجیب سماں باندھ دیا ہے۔ میں اپنے کاٹیج کے برآمدے میں کرسی ڈالے سامنے ڈھلوان کی طرف نظریں جمائے بیٹھا ہوں۔ تیز بارش نے سامنے کا منظر دھندلا دیا ہے۔ اس کے باوجود میری نظریں ڈھلوان سے آنے والی پگڈنڈی پر جمی ہوئی ہیں جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ میں نے اپنے دل کو

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کم بخت مانتا ہی نہیں۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے، جو بچھڑ گیا، سو بچھڑ گیا۔ میری محبت بھی اسی نشیب میں کہیں گم ہوگئی تھی۔ لاکھ ڈھونڈنے پر بھی اس کا سراغ نہیں ملا لیکن شاید میں غلط کہہ گیا۔ وہ گم نہیں ہوئی تھی بلکہ میں نے خود ہی محبت کی لاش کو اپنے ہاتھوں دفنایا تھا۔ پھر یہ انتظار کیسا؟ میں کیوں آس کی ڈور تھامے بیٹھا ہوں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اب نہیں آئے گی، یہ آنکھیں اس کا راستہ دیکھ رہی ہیں۔

ساون کا موسم مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دن میری زندگی بھی پیاسا ساون بن کر رہ جائے گی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک جائے گا، گھٹائیں جھوم جھوم کر آئیں گی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل میں امنگ اور ترنگ پیدا کریں گے لیکن میرے من کی کھیتی کبھی سیراب نہیں ہوگی۔ یہ بادل بن برسے گزر جائیں گے اور میں آسمان کی طرف خالی نظروں سے دیکھتا رہ جاؤں گا۔

وہ بھی ایسا ہی رومان پرور دن تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گھٹائیں امڈ امڈ کر آرہی تھیں۔ لگتا تھا کہ سورج نکلا ہی نہیں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے فضا کو معطر بنادیا تھا۔ موسم کے تیور دیکھ کر میں نے کام پر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں نے ملازم سے کہہ کر ناشتا وہیں منگوالیا اور موسم کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس لمحے دل میں شدت سے تنہائی کا احساس ابھرا۔ میں سوچنے لگا کہ کاش ان حسین ساعتوں میں کوئی میرے ساتھ ہوتا تو موسم کا لطف دوبالا ہوجاتا گو کہ میں نے کوئی دعا نہیں مانگی لیکن شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اسی لیے میری خواہش بہت جلد پوری ہوگئی۔

ابھی میں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس پہاڑی علاقے میں بارش کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر چیز نکھری نکھری اور دھلی دھلی سی نظر آتی ہے۔ بارش تو میرے شہر میں بھی ہوتی ہے لیکن وہاں کا منظر انتہائی بیزار کن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ذرا سی بارش کے بعد سڑکوں اور گلیوں میں پانی کا جمع ہونا، جگہ جگہ کیچڑ اور گندگی کے ڈھیر، بارش کے بعد حبس اور مچھروں کی یلغار۔ میں اسی لیے اس موسم میں چھٹیاں گزارنے اس پہاڑی علاقے کا رُخ کرتا ہوں۔ ابا جان کے پاس اس علاقے میں جنگل کی کٹائی کا ٹھیکا ہے۔ اس لیے میں نگرانی کی غرض سے ایک چکر سائٹ کا بھی لگا لیتا ہوں۔ اس طرح ابا جان بھی خوش ہوجاتے ہیں کہ میں نوکری کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کام میں بھی دلچسپی لے رہا ہوں۔ مجھے اس پہاڑی علاقے میں چھٹیاں گزارنے کا ایک معقول بہانہ مل جاتا ہے اور میری رومان پرور طبیعت کی تسکین بھی ہوجاتی ہے۔

تیز بارش کی وجہ سے سامنے کا منظر بالکل دھندلا گیا تھا اور قریب کی چیزیں بھی صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔ موسم کی رنگینی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک بجلی زور سے کڑکی اور زوردار روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ پھر میری آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ وہ کوئی انسانی وجود تھا جو اس تیز بارش سے بچنے کے لیے گرتا پڑتا کاٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ بہت زیادہ چڑھائی ہونے کی وجہ سے اسے آگے بڑھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ تقریباً نڈھال ہوچکا تھا۔

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاٹیج کا گیٹ کھولا اور تیز تیز قدموں سے ڈھلواں پگڈنڈی پر نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچنے پر دیکھا کہ وہ ایک لڑکی تھی اور تھکن کی وجہ سے تقریباً نیم بے ہوش ہوچکی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی چکرا کر نیچے گر جائے گی۔ میں نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ میں اسے بہ مشکل تمام کاٹیج تک لے کر آیا اور برآمدے میں پڑی کرسی پر بٹھادیا۔ وہ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی پھر چونکتے ہوئے بولی ”میں یہاں کیسے آگئی اور آپ کون ہیں؟“

میں نے ملازم کو آواز دے کر گرم دودھ لانے کے لیے کہا اور بولا ”آپ بارش میں بُری طرح بھیگ گئی تھیں اور اس سے بچنے کے لیے اسی کاٹیج کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی اور میں آپ کو سہارا دے کر یہاں لے آیا۔ اب رہا یہ سوال کہ میں کون ہوں تو پہلے آپ اپنے حواس قابو میں کرلیں پھر سب کچھ بتادوں گا۔“

وہ متشکرانہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے اسے ایک تولیا لا کر دیا اور بولا ”آپ بہت بُری طرح بھیگ گئی ہیں۔ اپنا چہرہ اور بال خشک کرلیجیے، ورنہ بیمار پڑ جائیں گی۔“

اس نے شکریہ کہہ کر مجھ سے تولیا لے لیا۔ حالانکہ اس کا لباس بھی پوری طرح بھیگ چکا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ گیلے

کپڑے اس کے لیے نقصان دہ ہوسکتے ہیں۔ میں کچھ سوچ کر اٹھا اور الماری سے اپنا ایک جوڑا نکال لایا۔ میں نے وہ کپڑے اس کی طرف بڑھائے اور بولا ”آپ کو لباس تبدیل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ اس لیے زنانہ کپڑوں کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ فی الحال، انہی سے کام چلائیے۔ جب آپ کے کپڑے سوکھ جائیں تو دوبارہ لباس تبدیل کرلیجیے گا۔“

اس نے فکرمندی سے باہر کی جانب دیکھا اور بولی ”رہنے دیجیے، اس کی ضرورت نہیں۔ بارش ذرا سی کم ہوجائے تو میں چلی جاؤں گی۔“

”فی الحال، بارش تھمنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ نہ جانے آپ کو کتنی دیر یہاں رکنا پڑ جائے۔ یہ کپڑے آپ کے سائز کے تو نہیں ہیں لیکن فوری طور پر اس گیلے لباس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ جب تک یہ سوکھ نہیں جاتے، آپ کو یہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننا ہوں گے۔“

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور مجھے یوں لگا کہ بہت سارے جلترنگ ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔ تب میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین تھی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، گلابی ہونٹ اور خوبصورت، متناسب جسم۔ بارش میں بھیگنے کے بعد تو اس کا حسن دو آتشہ ہوگیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کرکے رہ گیا۔

ملازم نے اس کے سامنے گرم دودھ کا گلاس رکھا تو وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی ”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“

”آپ بہت تھک گئی ہیں۔ اسے پینے سے جسم میں توانائی آجائے گی۔ یہ دودھ پینے کے بعد آپ لباس تبدیل کرلیں پھر میں آپ کی تواضع گرم گرم کافی سے کروں گا۔“

”شاید میں زیادہ دیر نہ رک سکوں۔“ اس نے فکرمندی سے کہا ”ممی پاپا پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”بارش کے تھم جانے تک تو آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ جیسے ہی بارش کا زور کم ہوگا، میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں، نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔“ وہ جلدی سے بولی ”میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ مجھے ان راستوں کا پتا ہے۔“

”اچھا، اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”پہلے آپ دودھ پی کر لباس تبدیل کرلیں۔“

اس نے دودھ کے گلاس کی جانب یوں دیکھا جیسے اس میں بے ہوشی کی دوا ملادی گئی ہو پھر ہچکچاتے ہوئے گلاس ختم کیا اور کپڑے تبدیل کرنے کاٹیج میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کا حلیہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ کرتے کی آستینیں اس نے فولڈ کرلی تھیں لیکن لمبائی گھٹنوں سے بھی نیچے آرہی تھی لیکن ان کپڑوں میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اس لمحے میرے دل میں شدت سے یہ آرزو ابھری کہ کاش یہ بارش کبھی نہ تھمے۔ وہ یونہی میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔

میں نے ملازم سے کافی لانے کے لیے کہا۔ اس وقت تک میں نے ناشتا نہیں کیا تھا، لہٰذا وہ کافی کے ساتھ توس، انڈے اور مکھن وغیرہ بھی لے آیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ ناشتے میں شریک ہونے کی پیش کش کی تو وہ بولی۔

”شکریہ! میں گھر سے ناشتا کرکے آئی ہوں۔“

میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے صرف ایک سلائس لیا اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

”مجھے گھر سے نکلے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔ وہاں سب لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”آپ رہتی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا ”آپ فون کرکے گھر والوں کو مطلع کرسکتی ہیں۔“

”ہماری رہائش تو اسلام آباد میں ہے۔ ہم لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہوئے ہیں اور ہمارا قیام ریسٹ ہاؤس میں ہے۔ ٹیلی فون تو ہے لیکن مجھے وہاں کا نمبر معلوم نہیں۔ کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ لگتا ہے کہ بارش کا زور ٹوٹ رہا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولی لیکن میں اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے اس کا یہ اضطراب دیکھا نہ گیا اور میں نے اس کا دھیان بٹانے کی خاطر کہا ”ہم لوگ اتنی دیر سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ابھی تک ہمارا تعارف بھی نہیں ہوا۔ کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟“

”کیا یہ بہت ضروری ہے؟“ اس نے تیکھے انداز میں کہا۔

”جی ہاں، بہت ضروری ہے۔ مجھے بھی تو معلوم ہونا

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہیے کہ جس خوبصورت مہمان سے مخاطب ہوں، وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کیا کرتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی ''آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ میرا نام فرحانہ ہے، فرحانہ شعیب۔ میرے والد ریٹائرڈ فوجی افسر ہیں۔ ایک بڑا بھائی محسن ہے جو ڈاکٹر بننے کے بعد اب ملک سے باہر جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ میں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور فی الحال فرصت کے مزے لوٹ رہی ہوں۔ اب اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔''

''مجھے احمد رضا کہتے ہیں۔ والدین کا اکلوتا ہوں۔ ایم بی اے کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کر رہا ہوں۔ والد صاحب کاروباری آدمی ہیں۔ یہاں جنگل میں ہمارا لکڑیاں کاٹنے کا ٹھیکا چل رہا ہے۔ اس لیے مہینے میں دو تین مرتبہ اس کی نگرانی کے لیے مجھے یہاں آنا پڑتا ہے۔ یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ خاص کر برسات کے موسم میں تو یہاں کا حسن کچھ اور نکھر جاتا ہے اس لیے میں ہمیشہ یہیں پر چھٹیاں گزارتا ہوں۔''

''آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

''جی نہیں، ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچتا۔ حالانکہ اس سلسلے میں مجھ پر گھر والوں کی جانب سے کافی دباؤ ہے۔ امی تو صبح شام میرے لیے لڑکیاں دیکھتی رہتی ہیں۔ خدا جانے ان کی تلاش کب ختم ہوگی؟''

''جب آپ چاہیں گے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں چونکتے ہوئے بولا۔

''دیکھیں نا...... ابھی آپ نے خود ہی کہا ہے کہ کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جسے جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچتے۔ گویا یہ فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے پھر اپنی امی کو کیوں دوڑا رہے ہیں؟''

میں تھوڑا سا گڑبڑا گیا۔ اس کے اس جملے کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے جھینپ مٹاتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ لڑکی کے انتخاب میں ہم سب کی پسند شامل ہو۔''

''اچھی بات ہے۔ شادی کے معاملے میں والدین کی مرضی اور پسند کو ترجیح دینا چاہیے۔ ان کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ ویسے آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ کب تک اس طرح اکیلے بیٹھ کر موسم کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔''

میں نے غور سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے کوئی انگوٹھی نظر نہیں آئی۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اس کی منگنی یا رشتہ تو طے نہیں ہوا لیکن پہلی ملاقات میں اس طرح کا سوال پوچھنا مناسب نہ تھا۔ بارش رک گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے دوبارہ ملنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

میں گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی ''میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے، کپڑے سوکھ گئے ہوں گے۔ میں چینج کر کے ابھی آتی ہوں۔''

وہ لباس تبدیل کر کے آئی تو پہلے سے زیادہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ میں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی اور بولی ''آپ کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ! اب چلتی ہوں۔''

''ذرا ٹھہریں۔'' میں اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا ''بارش کی وجہ سے راستے میں جگہ جگہ کیچڑ اور پھسلن ہوگی۔ آپ کے لیے چلنا دشوار ہوگا۔ کچھ پتا نہیں کہ کب بارش دوبارہ شروع ہو جائے؟ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں پورچ میں کھڑی ہوئی جیپ کی طرف بڑھا۔ وہ چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ وہ میرے ساتھ جیپ میں بیٹھے یا نہیں پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی ''اگر بارش کا ڈر نہ ہوتا تو میں کبھی آپ کی پیشکش قبول نہ کرتی۔ امی کہتی ہیں کہ اجنبیوں پر اتنی جلد بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ دو چار ملاقاتوں میں یہ اجنبیت بھی دور ہو جائے گی۔''

''آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مزید ملاقاتیں بھی ہوں گی؟''

''جب تک میں اور آپ یہاں ہیں۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

چند منٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ فرحانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کے والدین پریشانی کے عالم میں ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر کھڑے ہوئے تھے جبکہ بھائی باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ میں نے جیسے

ہی جیپ روکی۔ فرحانہ نے چھلانگ لگائی اور دوڑتی ہوئی اپنی امی سے لپٹ گئی۔ وہ بڑے جوش کے عالم میں انہیں کچھ بتا رہی تھی۔ اس دوران اس نے دو تین بار میری جانب اشارہ بھی کیا پھر وہ سب چلتے ہوئے میری طرف آئے۔

میں نے ان کے لہجے میں خاصی رعونت محسوس کی۔ ریٹائر ہونے کے باوجود ان کے انداز میں رعب اور طنطنہ نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی متانت سے جواب دیا ''مجھے احمد رضا کہتے ہیں۔''

''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ینگ مین!'' انہوں نے اس طرح کہا جیسے مجھ پر احسان جتا رہے ہوں۔ فرحانہ کا بھائی پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ مجھے خاصا مغرور لگ رہا تھا۔ میں نے بھی اسے اہمیت نہیں دی۔

فرحانہ کی ممی نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولیں ''فرحانہ نے بتایا ہے کہ آج آپ نے اس کی بہت مدد کی۔ اس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔''

''جی نہیں، آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے؟''

''آپ لوگ یہیں کھڑے کھڑے سب باتیں کر لیں گے۔'' فرحانہ بولی ''چلیں ...... اندر بیٹھتے ہیں۔''

''مجھے تو اجازت دیجیے۔ اس وقت بارش رکی ہوئی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر کچھ ضروری کام نمٹا لوں۔''

''نہیں بھئی، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کو کم از کم ایک چائے کی پیالی تو ہمارے ساتھ پینا ہی ہوگی۔''

سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی فرحانہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ کوئی ایسی صورت بن جائے جس سے میرے اور فرحانہ کے دوبارہ ملنے کا امکان روشن ہوسکے۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ چائے کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ شعیب صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خاصی خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے پاس کافی زمین تھی جس کی آمدنی پر وہ عیش کر رہے تھے۔ انہوں نے میری ملازمت اور بزنس کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کیے۔ جیسے میں ان کا ہونے والا داماد ہوں اور بردکھوے کے لیے آیا ہوں۔ کچھ دیر بعد جب میں نے ان سے اجازت طلب کی تو ان کی بیگم نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ میں اوپر سے انکار کرتا رہا لیکن دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ فرحانہ سے دوبارہ ملنے کا موقع اتنی جلدی مل گیا۔

وہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ میں جیپ میں بیٹھنے لگا تو بولی ''ڈیڈی وقت کے بہت پابند ہیں۔ ہمارے یہاں رات کا کھانا آٹھ بجے کھایا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ دیر نہ ہونے پائے۔''

میرے بس میں ہوتا تو وہاں سے جاتا ہی نہیں۔ وہ میرے حواسوں پر تیزی سے چھاتی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی میری زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں لیکن ایسی کیفیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے برسوں کی تلاش ختم ہوگئی ہو، وہ میری زندگی کا خوش گوار ترین دن تھا۔ ساون تو ہر سال ہی آتا ہے لیکن اس برس کے ساون نے تو میری زندگی ہی بدل دی تھی۔ یہ کیسی برسات تھی جس نے میری پیاسی روح کو اس طرح سیراب کیا کہ عمر بھر کی تشنگی ختم ہوگئی۔ یقیناً مجھے فرحانہ سے محبت ہوگئی تھی۔

اور اب اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاید پہلی نظر کی محبت اسی کو کہتے ہیں لیکن کیا وہ بھی میری محبت کا جواب محبت سے دے گی۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میری اس سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور میں نے سڑک پر چلتے ہوئے کسی آوارہ لڑکے کی طرح اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ انتہائی گھٹیا اور سطحی سوچ تھی۔ میں ایک تعلیم یافتہ اور میچورڈ شخص تھا اور میرے لیے کسی شریف و معزز گھرانے کی لڑکی کے بارے میں اس طرح سوچنا مناسب نہ تھا، لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس وقت تک اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہوگا جب تک فرحانہ کی جانب سے کوئی مثبت رَدِّعمل سامنے نہ آجائے۔

شام کو میں نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا اور پوری سج دھج کے ساتھ درِ محبوب کی جانب چل دیا۔ وہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہوئے شعیب صاحب پُرجوش انداز میں بولے ''ویری گڈ! مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو وقت کے پابند ہوں۔''

''ذرہ نوازی ہے آپ کی۔'' میں نے انکساری سے جواب دیا ''میں وقت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے ہر کام وقت پر کرتا ہوں۔ اس طرح زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے چھوٹی سی عمر میں ہی اس راز کو پالیا۔ کاش ہمارے بیٹے کی سمجھ میں بھی یہ بات آجائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

اسے معلوم تھا کہ تم ڈنر پر آنے والے ہو۔ اس کے باوجود ابھی تک نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں وقت ضائع کرتا پھرتا ہے؟''

''آپ تو خوامخواہ اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔'' بیگم شعیب مصنوعی خفگی سے بولیں ''ہوسکتا ہے کسی کام میں پھنس گیا ہو۔ بس آنے ہی والا ہوگا۔''

''بس رہنے دو۔ میں خوب جانتا ہوں اس کے کاموں کو۔''

اس نوک جھونک سے میں نے اندازہ لگالیا کہ شعیب صاحب اپنے بیٹے سے خوش نہیں تھے۔ خیر مجھے اس سے کیا، میری نظریں تو فرحانہ کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں وہ بارش میں بھیگنے سے بیمار تو نہیں ہوگئی۔ ابھی میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہلکے پیازی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی گوکہ اس نے بننے سنورنے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا لیکن ہلکے سے میک اپ میں بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر کھانا لگنے کا اعلان ہوا۔ شعیب صاحب کی بیگم نے خاص اہتمام کررکھا تھا۔ میں نے کھانے کی تعریف کی تو وہ بولیں ''اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ سب فرحانہ نے کیا ہے۔ اسے کوکنگ سے خاص دلچسپی ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ڈش بناتی رہتی ہے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری بیٹی ہرفن مولا ہے۔'' شعیب صاحب فخریہ انداز میں بولے ''کوکنگ کے علاوہ بھی یہ بہت کچھ کرتی ہے لیکن میں اس کے گھومنے پھرنے کے شوق سے بہت تنگ ہوں۔ صبح سویرے اُٹھ کر سیر کے لیے نکل جاتی ہے اور گھنٹوں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔''

''ڈیڈی! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں فارغ نہیں بیٹھ سکتی اور ویسے بھی یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ یہاں کے نظارے دیکھ کر دل نہیں بھرتا۔ ویسے بھی ہم یہاں گھر میں بیٹھنے کے لیے تو نہیں آئے۔''

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ باتوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو گیارہ بج رہے تھے۔ وہاں سے اٹھنے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مزید رکنے کا بھی کوئی جواز نہ تھا، لہٰذا میں نے اجازت چاہی۔ شعیب صاحب کی بیگم بولیں ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کبھی کبھی چکر لگالیا کرو۔ اچھا ہے، ذرا رونق رہے گی۔''

جی میں آیا کہہ دوں کہ اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو میں روزانہ آنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ کس کم بخت کا دل نہ چاہے گا کہ وہ فرحانہ جیسی خوبصورت اور ہنس مکھ لڑکی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت نہ گزارے لیکن ایسی بات دل میں تو سوچی جاسکتی تھی لیکن زبان سے ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ بس اتنا ہی کہہ سکا ''جی بالکل، ضرور آؤں گا۔''

فرحانہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ اس وقت بھی آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کہ بس تھوڑی ہی دیر میں بارش شروع ہونے والی ہے۔ فریحہ نے موسم کے تیور دیکھے تو بولی ''اگر بارش ہوگئی تو آپ کے لیے جیپ چلانا مشکل ہوجائے گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ رات کو یہیں رک جائیں۔''

''میرے لیے یہ موسم اجنبی نہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''ویسے بھی یہ راستے جانے پہچانے ہیں۔ مجھے ان پر جیپ چلانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ آپ اندر جائیں، میں بھی چلتا ہوں۔''

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں۔ وہ جانے کے لیے مڑی پھر اس نے دو تین بار پلٹ کر مجھے دیکھا۔ میرے لیے اب وہاں کھڑا رہنا دشوار تھا۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی اور جیپ میں سوار ہوگیا۔

وہ میری زندگی کی یادگار رات تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوسکا۔ فرحانہ ایک لمحے کے لیے بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ امی کو ٹیلی فون کرکے بتادوں کہ ان کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔ میں نے ان کی بہو ڈھونڈلی ہے لیکن عقل نے سمجھایا کہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ فرحانہ سے میری ملاقات کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میں اس کے بارے میں ایسی باتیں سوچ رہا تھا گوکہ اس کی آنکھوں نے بہت کچھ کہہ دیا تھا لیکن میری نظریں دھوکا بھی کھاسکتی ہیں۔ جب تک وہ زبان سے میری محبت کا اقرار نہ کرلیتی، اس وقت تک میں اس سلسلے میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے صبح میری طبیعت بوجھل تھی

لہٰذا میں نے کام پر جانے کا ارادہ ملتوی کرکے گھر پر ہی آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور برآمدے میں کرسی ڈال کر چائے پینے بیٹھ گیا۔ بارش رک چکی تھی اور فضا بھی نکھری نکھری محسوس ہورہی تھی۔ اس وقت بھی میں فرحانہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ کاش وہ اس سہانے موسم میں ایک بار پھر گھومتی ہوئی اس طرف چلی آئے۔ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ میری نظریں پگڈنڈی کی جانب گئیں۔ وہ خراماں خراماں میرے کاٹیج کی طرف آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے استقبال کے لیے گیٹ کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی ''خدا کا شکر ہے کہ راستے میں بارش نہیں ہوئی، ورنہ میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں آج بھی کل والا سین نہ ہوجائے۔''

میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور کہا ''آپ کو واقعی اس موسم میں گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بارش کسی وقت بھی شروع ہوسکتی ہے۔''

''کیا کروں، مجھ سے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا اور اتنے حسین موسم سے لطف اندوز نہ ہونا تو بدذوقی کی علامت ہے۔''

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ موٹی موٹی بوندیں پڑنا شروع ہوگئیں۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی ''اب مزہ آئے گا۔ یہاں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔''

میں نے اس کے لیے چائے منگوائی۔ اس روز وہ دیر تک میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والی باتوں کا ذخیرہ تھا۔ میں محویت کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی بیٹھی باتیں کرتی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ تھوڑی دیر بعد بارش رک گئی تو وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''اب چلتی ہوں۔ دوبارہ بارش شروع ہوگئی تو نکلنا مشکل ہوجائے گا۔''

میں اسے گیٹ تک چھوڑنے آیا تو وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی ''شام کو آرہے ہیں نا۔ میں ایک بہت ہی خاص ڈش بناؤں گی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ قدر کھو دیتا ہے یہ روز کا آنا جانا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ''جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح

1694ء میں پیدا ہونے والے والٹیر کو آزادخیالی کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ آزادخیالی کی تجوید کے باعث بار بار ملک بدر ہوتا رہا پابند سلاسل ٹھہرایا گیا۔ پہلی بار وہ 1717ء میں جیل گیا۔ رہائی کے بعد 1718ء میں اس نے اپنا مشہور ''ایڈیٹ'' تحریر کیا جس نے راتوں رات اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ 1723ء میں اس نے مذہبی آزادخیالی کی حمایت میں نظم لکھی۔ یہ نظم شائع ہونے سے قبل مقبول ہوگئی تھی۔ حکومتِ فرانس نے فوری ایکشن لیا اور حکم نامہ جاری کردیا کہ یہ نظم فرانس میں شائع نہیں ہوسکتی۔ اسے ملک بدر بھی کردیا گیا۔ 1727ء کو وہ وطن لوٹا تو اس کی ملاقات مادام شاتلے سے ہوئی۔ پندرہ سال تک وہ اس کے محل میں رہا مگر درمیان کی دوری برقرار رہی۔ اس دوران اس نے بے شمار مقالے، افسانے، ڈرامے، نظمیں، ناول اور طنزیہ مضامین لکھے۔ مادام شاتلے کے بعد وہ کسی دوسری عورت کے قریب نہیں گیا۔ اس کا ناول کینڈیڈ (Candid) بہت مشہور اور بے شمار زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ 1778ء میں وہ فوت ہوا۔ کہتے ہیں مادام شاتلے کا غم اسے لے ڈوبا۔

اقتباس: عجائبات دنیا از خورشید اقبال

مرسلہ: ندیم فرحت، کراچی

میرے دل میں آپ کی قدر بڑھ جائے گی اور میں سمجھوں گی کہ آپ نے میرا مان رکھ لیا۔''

''آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی کہ اب میں انتظار نہیں کرسکتا۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا ''میں ضرور آؤں گا۔''

میں شام کو دوبارہ ریسٹ ہاؤس چلا گیا۔ سوچ رہا تھا کہ دوبارہ آمد کا کوئی معقول جواز ڈھونڈ لوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایسا لگا کہ وہ سب لوگ میرا ہی انتظار کررہے تھے۔ میری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ فرحانہ کی ممی بڑی شفقت سے پیش آئیں اور بولیں ''اچھا ہوا تم خود ہی آگئے' ورنہ میں کسی کو بھیج کر تمہیں بلالیتی۔ آج فریحہ نے نرگسی کوفتے بنائے ہیں۔ یہ اس کی پسندیدہ ڈش ہے۔ امید

www.paksociety.com

ہے کہ یہ ڈش تمہیں بھی پسند آئے گی۔''

وہ ایک جوان لڑکی کی ماں تھیں۔ ہر اچھے لڑکے کو دیکھ کر ان کے دل میں امیدوں کے چراغ روشن ہو رہے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں بھی ایسا ہی سوچ رہی ہوں لیکن میں اتنی جلدی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میں ان کی محبت اور خلوص کو غلط رنگ دے رہا ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ فرحانہ کی منگنی ہو چکی ہو یا وہ اپنے خاندان میں کسی سے منسوب ہو۔ ایسی لڑکیوں کے لیے رشتوں کی کیا کمی۔

کھانے کے بعد حسب معمول کافی کا دور چلا۔ باتیں ہوئیں، شعیب صاحب اور ان کی بیگم مجھ سے اس طرح کرید کرید کر سوالات کر رہے تھے جیسے میرے پورے خاندان کی ہسٹری کھنگالنا چاہ رہے ہوں۔ سوال جواب کا سیشن ختم ہونے پر وہ دونوں خاصے مطمئن نظر آئے اور ان سے زیادہ اطمینان مجھے تھا کہ انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ واپسی پر ایک بار پھر فرحانہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی اور بولی۔

''آپ نے تو ممی اور پاپا پر جادو کر دیا ہے، ورنہ وہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے۔''

''ان کی محبت ہے، ورنہ میں اس قابل کہاں؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی ''مجھے تو ان دو دنوں میں ہی اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔''

''زبانی تعریف سے کام نہیں چلے گا، وعدہ کریں کہ آپ کل صبح بھی آئیں گی۔''

''اگر آپ نہ کہتے تب بھی میں ضرور آتی۔ مجھے آپ سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔''

ان دو ملاقاتوں کے بعد حجاب نکل گیا اور ہم روزانہ ہی ملنے لگے۔ وہ صبح کے وقت واک کے بہانے میرے پاس آجاتی اور گھنٹوں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ بارش بھی تقریباً روزانہ ہی ہو رہی تھی۔ اس طرح اسے میرے پاس بیٹھنے کا بہانہ مل جاتا۔ شام کے وقت کبھی کبھی میں ان کے ریسٹ ہاؤس چلا جاتا۔ وہ سب لوگ مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے اور یوں لگتا جیسے انہوں نے مجھے اپنے گھر کے فرد کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ فرحانہ بہت تیزی سے میرے قریب آرہی تھی۔ اس کے ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھ چکی ہے۔ بس میری طرف سے اظہار ہونا باقی تھا۔ اس کے بعد ہمارے ملن کی راہ آسان ہو جاتی۔

پندرہ دن ایسے گزر گئے کہ پتا بھی نہیں چلا۔ چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اور وہ لوگ واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ میں بھی ایک دو دن بعد روانہ ہونے والا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسلام آباد جاتے ہی امی کو ان کے گھر رشتہ کی بات کرنے کے لیے بھیجوں گا لیکن اس سے پہلے فرحانہ کی مرضی جاننا ضروری تھا اور میں اس کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اچانک ہی ایک دھماکا ہوا اور میری محبت کا تاج محل لمحوں میں زمیں بوس ہو گیا۔

اس رات میں فرحانہ کے گھر سے واپس لوٹا تو ملازم نے بتایا کہ امی کا دو تین بار فون آچکا ہے اور انہوں نے تاکید کی ہے کہ جیسے ہی گھر آؤں، انہیں فون کرلوں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ میری غیر موجودگی میں وہ کیا گل کھلا چکا ہے، میں سوچ ہی رہا تھا کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد امی سے بات کروں گا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف امی ہی تھیں اور کافی غصے میں معلوم ہو رہی تھیں۔

''کہاں غائب رہتے ہو؟ شام سے چار مرتبہ فون کر چکی ہوں لیکن تمہارا کوئی پتا ہی نہیں؟ سیر و تفریح میں اتنے مگن ہو گئے ہو کہ گھر والوں کی یاد بھی نہیں آئی۔ آج کتنے دن ہو گئے ہیں، تمہارا ایک فون بھی نہیں آیا۔''

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ان کا شکوہ بجا تھا۔ واقعی فرحانہ کے چکر میں سب کو بھلا بیٹھا لیکن امی کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ اس لیے جھوٹ کا سہارا لیا ''بس امی! مصروفیت زیادہ رہی۔ آج کل کٹائی کا سیزن چل رہا ہے، وہیں دیر ہو جاتی ہے۔''

''میں خوب جانتی ہوں تمہاری مصروفیت کو۔'' امی کے لہجے میں تیزی تھی ''اور یہ فرحانہ کون ہے جس کے ساتھ تم آج کل گھومتے پھر رہے ہو؟ فضلو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

اس لمحے مجھے ملازم پر بہت غصہ آیا۔ جی چاہا کہ اس کا سر توڑ دوں۔ اسے کیا ضرورت تھی امی کو یہ سب کچھ بتانے کی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے امی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

www.paksociety.com

"وہ میرے جاننے والے ہیں۔ فرحانہ انہی کی بیٹی ہے۔ فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ واپس آ کر آپ سے بات کروں گا۔"

"مجھے ضرورت بھی نہیں ہے کچھ جاننے کی۔" امی کا لہجہ تلخ تھا "میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ رشیدہ آپا کی لڑکی نازلی سے تمہارا رشتہ طے پا گیا ہے اور اس اتوار کو تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔ لہٰذا تم سب کچھ چھوڑ کر فوراً واپس آ جاؤ۔"

"مگر امی......!" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی اور بولیں "اگر مگر کچھ نہیں۔ جو کہا جا رہا ہے وہی کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اس کام میں تاخیر مناسب نہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ اب کہنے سننے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ امی کے فیصلے اٹل ہوتے تھے۔ وہ خالہ رشیدہ کو زبان دے چکی تھیں۔ اب اس سے پھرنا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ ویسے بھی میں نے یہ اختیار انہیں دے رکھا تھا۔ اب کیسے انکار کر دیتا اور میرے پاس انکار کی وجہ کیا ہوتی؟ یہی کہ میں فرحانہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جبکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے یا نہیں؟ ہاں اگر میں نے اس کی مرضی معلوم کر کے امی کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔

اس رات خوب بارش ہوئی۔ اتنا پانی برسا کہ طوفان آ گیا۔ رات بھر میرے آنسو بہتے رہے۔ رات بھر آسمان روتا رہا۔ بھری برسات میں میرے پیار کی ابتدا ہوئی تھی اور اسی ساون نے میرے پیار کو بھی نگل لیا۔

میں نے صبح صبح اپنا سامان باندھا اور گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں، فرحانہ کے آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ آ گئی، میرا سامان بندھا دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی "کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں، دفتر میں ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ مجھے فوراً جانا ہے۔" میں نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لگتا ہے آپ رات بھر سوئے نہیں۔ کچھ پریشان لگ رہے ہیں، سچ سچ بتائیں، کیا بات ہے؟"

"کہہ تو دیا کوئی بات نہیں۔" میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا "ایک ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ کو میری قسم، بتائیں نا...... کیا بات ہے؟"

اس نے مجھے قسم دے دی تھی۔ اس لیے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔"

"میں جانتی ہوں، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میری منگنی ہو چکی ہے، اپنے تایا زاد سے۔"

"اوہ!" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "میں بلاوجہ ہی خوش گماں ہو گیا تھا۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اگر میری منگنی نہیں ہوئی ہوتی تو آپ میرے لیے دنیا کے بہترین مرد تھے۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ اپنے پیار کی خاطر دو خاندانوں کی خوشیوں کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ میں اتنی خودغرض نہیں ہوں۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب جانے لگی تو اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید وہ توقع کر رہی تھی کہ میں اسے دلاسا دوں گا۔ اس کا حوصلہ بڑھاؤں گا یا اسے بغاوت پر اُکساؤں گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں تو خود مصلحتوں کی زنجیر سے بندھ چکا تھا۔ کیسے ظاہر کرتا کہ اس کا انکار سننے سے پہلے ہی میرے پَر کٹ چکے تھے۔ جس طرح وہ اپنے گھر والوں کو دکھ نہیں دے سکتی تھی، اسی طرح میں بھی اپنی ماں کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے دونوں ہی مجبور تھے۔

وہ چلی گئی۔ اس کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔ امی نے میرے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا تھا وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ باہمت نکلی اور اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ قیامت ٹوٹی نہ آسمان گرا۔ بس اتنا ہوا کہ امی اور رشیدہ خالہ کے تعلقات خراب ہو گئے لیکن میرے پاس تو یہ راستہ بھی نہ تھا۔ اگر امی کی پسند ٹھکراتا تب بھی فرحانہ مجھے نہ ملتی۔

ہر سال ساون آتا ہے۔ بارشیں ہوتی ہیں۔ لوگ ساون کے گیت گاتے ہیں۔ میں نے شادی نہیں کی۔ فرحانہ کے جانے کے بعد میں نے دل کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا۔ اب چاہے کتنا بھی مینہ برسے، میرے من کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ میرا ساون ہمیشہ پیاسا ہی رہے گا۔

عشق نامکمل

معزز ومکرم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
عشق ناکام نمبر کا اشتہار دیکھا۔ خوشی ہوئی کہ میں بھی اپنے ایک ناکام عشق کی داستان رقم کر سکتا ہوں۔ میں بچپن میں جس لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا اس نے کس آسانی سے مجھے آئینہ دکھا دیا ہے۔

خرم وجاہت
(فیصل آباد)

عشق ناکام نمبر

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ وہ لڑکی سات سمندر پار سے آنے والی تھی۔ میرے چاچا کی بیٹی۔ جس نے امریکا میں آنکھ کھولی۔ وہیں تعلیم حاصل کی اور وہاں کے ماحول میں رچ بس کر وطن واپس آ رہی تھی۔ وہ میری منگیتر بھی تھی۔ منگیتر اس لحاظ سے کہ ہمارے والدین نے اس کی پیدائش سے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اس کی شادی مجھ سے ہوگی۔ اس وقت میں صرف پانچ برس کا تھا۔

www.paksociety.com

اور بچپن ہی سے میرے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہونے والا ہے جو زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہتا ہے۔

میرے گھر میں اس کے بچپن کی تصویریں بھی تھیں۔ تتلیوں کی طرح رنگے برنگے لباسوں میں اُڑتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی۔ جس کی ہر تصویر غضب کی ہوتی تھی۔

چونکہ شروع ہی سے یہ بتایا گیا تھا کہ دیکھو نیلی تمہاری ہم سفر ہے۔ اسی لئے میں نے کسی اور کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ گرچہ کالج اور یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیاں میری دوست بنی تھیں لیکن میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں کسی اور کے لئے ہوں۔ لہٰذا مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر اور اس کی کہانیاں سن سن کر مجھے اس سے پیار سا ہوگیا تھا۔ وہ ایسی ہے۔ ویسی ہے۔ اتنی اسمارٹ ہے۔ اتنی ذہین ہے۔ اتنی کیوٹ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرا تو خیر امریکا جانا نہیں ہوسکا تھا لیکن جو لوگ اسے وہاں دیکھ کر آتے وہ اس کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہتے تھے اور میں خوش ہوتا رہتا۔

ہمارے درمیان فون پر بھی باتیں ہوا کرتیں۔ اس کی باتیں بھی ذہانت سے بھرپور تھیں۔ وہ جب انگلش لہجے میں اردو بولا کرتی تو کانوں میں رس سا گھلنے لگتا۔

وہ امریکا میں ایم بی اے کررہی تھی اور اس کا مستقبل میرے مقابلے میں یقیناً شاندار اور محفوظ تھا۔ پھر وہ دن میرے لئے انتہائی افسوس اور پریشانی کا تھا جب میرا ایک دوست امریکا سے واپس آیا تھا۔ وہ نیلی سے مل کر آیا تھا۔

بلکہ خود میں نے اس کے ہاتھ سے نیلی کو کچھ تحفے بھجوائے تھے۔ اس نے واپس آکر نیلی کے بارے میں بتایا تھا۔ ”خرم۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کا خیال چھوڑ دو۔ تمہارے لئے پاکستان میں بھی بہت لڑکیاں ہیں۔“

”کیوں بھائی۔ اس میں کیا خرابی ہوگئی؟“

”وہ بہت ایڈوانس لڑکی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی ڈریسنگ ہی ایسی ہوتی ہے کہ دیکھ کر شرم آتی ہے۔“ یہ سب سن کر مجھے شرم بھی آئی اور شدید شاک بھی لگا تھا۔

”خرم۔ میں نے بہت ہمت کرکے تمہیں اس کے بارے میں بتایا ہے۔“ دوست نے کہا۔ ”کیونکہ وہ تمہاری کزن بھی ہے۔“

مجھے ایسا دکھ ہوا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوں۔ وہ میرے ساتھ رہتی ہو اور ہمارے درمیان پیار کا بہت گہرا رشتہ ہو۔

میں نے اس رات فون پر نیلی سے بات کی۔ ”نیلی کیا میرے دوست سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟“

”ہاں۔ ہاں۔ وہ آیا تھا میرے پاس۔ تمہارے تحفے لے کر۔ شکریہ تمہارا۔“

”لیکن اس نے جو مجھے باتیں بتائی ہیں۔ وہ سب سن کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ نو۔ اس نے کیا کیا بتا دیا۔“

میں نے جھجکتے جھجکتے وہ سب کچھ دُہرا دیا جو میں نے اپنے دوست سے سنا تھا۔ یہ سب سن کر وہ بہت دیر تک ہنستی رہی تھی۔ ”کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کیا تم نے مجھے پاکستان کے کسی گاؤں کی کوئی لڑکی سمجھ رکھا ہے؟ یہاں تو یہ سب کرنا پڑتا ہے کیونکہ میرا تعلق اسی ماحول سے ہے۔“

”نیلی۔ اپنی قدریں بھی تو کوئی چیز ہوتی ہیں۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بہرحال، میں اس طرح کی ہوں اور اسی طرح رہوں گی۔ اب تمہاری مرضی کہ تم میرے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟“

”مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے۔ میں نے تو بچپن ہی سے تمہارے خواب دیکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر میں جیسی ہوں۔ اسی طرح مجھے قبول کرنا ہوگا۔“

گھر کے لوگ بھی یہ سن کر نیلی سے بددل ہوگئے تھے لیکن میرے جنونِ عشق میں کمی نہیں آئی تھی۔ میں اس کو ہر حال میں اپنانا چاہتا تھا کیونکہ میرے خوابوں اور خیالوں میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

پھر دو چار مہینوں کے بعد یہ خبر سننے کو ملی کہ نیلی کچھ دنوں کے لئے پاکستان آرہی ہے اور اس کی آمد کا واضح مقصد یہ تھا کہ وہ مجھ سے مل کر مجھے دیکھ لے۔ مجھے جان لے۔

پورا گھر سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کے لئے ایک کمرا جلدی جلدی سیٹ کیا گیا۔ جس میں وہاں کے معیار کے مطابق چیزیں سجا دی گئیں۔ سب سے زیادہ پریشانی امی کو تھی کیونکہ نیلی کے بارے میں سب کچھ سن رکھا تھا۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹا۔ تم نے اس لڑکی کے

بارے میں بہت کچھ سن لیا ہوگا۔ تم نے کیوں اپنے آپ کو اس سے وابستہ کررکھا ہے؟“

”امی۔ نیلی میری کمزوری اور مجبوری بن گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس کے علاوہ کسی اور لڑکی کا سوچنا بھی نہیں چاہتا۔“

”پتا نہیں کیا ہوگیا ہے تم کو۔ خود سوچو۔ جب وہ آزاد اور بے باک لڑکی یہاں آئے گی تو محلے والے کیا سوچیں گے؟“

”سوچنے دیں امی۔“ میں نے کہا۔ ”میری کوشش ہوگی کہ میں اسے سمجھا سکوں۔“

”بہت مشکل ہے بیٹا۔ جو زندگی بھر ایسی رہی ہو، اس پر تمہارے سمجھانے کا کیا اثر ہوگا؟“

دوسری طرف میرے امریکا سے آئے ہوئے دوست شہاب نے کہا۔ ”خرم۔ میں اس لڑکی کا ٹائپ سمجھ چکا ہوں۔ اس کو ہینڈل کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ تم اس کی کسی بات پر اعتراض نہ کرو۔“

”تو پھر کیا کروں؟“

”ایک حد تک اس کا ساتھ دو۔ مثال کے طور پر وہ لازمی ڈانس پارٹیز میں جاتی ہوگی۔ تو یہاں بھی اچھی پارٹیز ہوا کرتی ہیں۔ اس کو ساتھ لے جایا کرو۔“

”یار۔ یہ سب تو میں نے کبھی نہیں کیا۔“

”اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ سب کرنا ہوگا۔“ اس نے بتایا۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ تم نے اس کا کمرا کس طرح سیٹ کیا ہے؟“

”جس طرح کے کمرے ہوتے ہیں۔“

”تم مشہور پاپ سنگرز اور فنکاروں کے پوسٹرز لگاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اس کے کمرے کو امریکن اسٹائل کا کمرا بنا دو۔“

”یعنی جیسا وہ کہے۔ ویسا کروں۔“

”ہاں۔ اگر تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ سب کرنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی مجبوری کے تحت تم سے شادی کرے گی کیونکہ یہ رشتہ ہوچکا ہے اور یہ اس کی بڑی بات ہے کہ اس نے ابھی تک انکار نہیں کیا۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے رشتوں کی تو کوئی کمی نہیں ہوگی۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

شہاب کے کہنے کے مطابق میں نے پورے کمرے میں پوسٹرز چپکا دیے۔ اچھا خاصا کسی سنگر کا کمرا بن کر رہ گیا تھا۔ پھر نیلی کے آنے کی تاریخ بھی آگئی۔

ائرپورٹ جانے کے لئے امی تیار نہیں ہورہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ائرپورٹ پر تماشا نہیں بنیں گی۔ بڑی مشکلوں سے انہیں منا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ہم نے نیلی کے نام کا کارڈ اُٹھا رکھا تھا کیونکہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ہم ہر جینز اور پینٹ والی لڑکی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے لیکن وہ کارڈ پر نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

پھر ایک لڑکی ہمارے پاس آکر رک گئی۔

اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ آپ لوگوں نے شاید مجھے نہیں پہچانا؟ میں نیلی ہوں۔“

اب سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تو بہت سلیقے کے لباس میں تھی۔ شلوار قمیص اور ایک خوبصورت سا اسکارف بندھا ہوا۔

میرا دل اسے دیکھ کر دھڑک اُٹھا تھا۔ بچپن کے خوابوں کی تعبیر سامنے آگئی تھی۔ اس کے نام بتاتے ہی اس کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے تھے۔

سب سے پہلے امی نے اسے گلے لگالیا تھا۔ پھر ابو نے اور جب میرے تعارف کے بعد وہ میری طرف آئی تو میں نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کردیا۔

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔

بہرحال، ہم سب بہت خوشی خوشی اسے ائرپورٹ سے گھر لے آئے۔ وہ راستے بھر باتیں کرتی رہی تھی۔ وہی لہجہ۔ وہی انداز۔ وہی امریکن لہجے میں خوبصورت اردو۔ جو اس کی زبان سے بہت بھلی لگ رہی تھی۔

گھر پہنچ کر جب اسے اس کے کمرے میں بھیجا گیا تو وہ جلدی سے باہر آگئی۔ ”مائی گاڈ۔ یہ تم نے میرے کمرے کو کیا بنا دیا ہے؟“ اس نے یہ سوال مجھ سے کیا تھا۔

”تمہاری پسند کے مطابق سجانے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔

”لیکن میری پسند اتنی گھٹیا تو نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پلیز۔ یہ سب پوسٹرز کمرے سے ہٹالیں۔“

امی اور ابو اس کی بات سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ پھر ہم نے جلدی جلدی اس کے کمرے کو صاف کیا۔ اس کے بعد وہ نہانے چلی گئی۔

www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

ثریا اور دیو آنند کی پسندیدگی نے آہستہ آہستہ محبت کا روپ اختیار کرلیا۔ گھر والوں کی کڑی پابندیوں کے باوجود ثریا دیو آنند کے قریب تر ہوگئی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان تھا۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے تین بڑوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان کی فلمی دنیا میں یوں تو اس وقت انتہائی خوبصورت اور مایہ ناز ہیروئنیں موجود تھیں مگر فلم انڈسٹری پر اور لوگوں کے دلوں پر حکومت صرف تین مرد اداکاروں کی تھی اور یہ مثلث انڈین فلم انڈسٹری کے لیے باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی ہیروئنوں کے مقابلے میں بھی ان تین ہیروز کو فوقیت دی جاتی تھی۔ اسکرین اور پبلسٹی میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا جاتا تھا۔ وہ سب سے بڑے باکس آفس اسٹار تھے۔ ان کے نام پر لوگ کشاں کشاں سینما گھروں میں آجاتے تھے۔ پہلے فلم ساز ان کا انتخاب کرتے تھے اور پھر ان کی مرضی اور منظوری سے ان کی ہیروئن چنا کرتے تھے۔ یہ تین اداکار، دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند تھے۔ ان کی فلمیں کامیاب ہوں یا ناکام، ان کے چاہنے والوں کی تعداد کم نہ ہوتی تھی اور عام طور پر ان کی فلمیں ہٹ ہی رہتی تھیں۔ دلیپ کمار ان تینوں میں سب سے بلند اور اہم مقام کا مالک تھا۔ اس کے بعد راج کپور اور دیو آنند کا نمبر آتا تھا۔ راج کپور اداکار کے ساتھ ساتھ فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھا اور درحقیقت وہ اداکار سے بڑا فلم ساز اور اس سے بھی برتر ہدایت کار تھا۔ اسی طرح دیو آنند بھی فلم سازوں کی صف میں شامل ہوگیا تھا مگر دلیپ کمار نے اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں پالا تھا۔ وہ محض ایکٹر تھا۔ خالص اداکار، اس کی اداکاری، ہنرمندی اور مقبولیت سب پر بھاری تھی مگر ثریا کے لیے دیو آنند کی ذات میں زیادہ کشش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راج کپور ایک مخصوص اسکول سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے متلون مزاج، شوباز اور بناوٹی سمجھا جاتا تھا۔ دلیپ کمار ان سب سے بلند تر تھا اور اسے کسی بھی لڑکی یا عورت کی جانب پیش قدمی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑی بڑی ہیروئنیں اس کے ساتھ کام کرنے کی حسرت دل میں لیے بیٹھی تھیں اور اس کے ایک اشارے کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ ان دونوں کے مقابلے میں دیو آنند ایک تنہائی پسند، کم گو اور تحمل آمیز شخص تھا۔ اس کے ساتھ آئے دن ہیروئنوں کے اسکینڈل بھی منسوب نہیں کیے جاتے تھے۔ اس کی بہت سی خوبیاں ثریا کے دل کو بھا گئیں۔ ثریا اور دیو آنند کی جوڑی بھی مشہور ہوگئی تھی اس لیے ثریا نے دیو آنند کی جانب التفات زیادہ کردیا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وعدے وعید کی نوبت آگئی۔

دیو آنند نے بھی ثریا کو پسند کیا اور اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ اس نے ثریا کو یقین دلایا کہ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرکے رہے گا۔ چاہے اسے مذہب ہی کیوں نہ تبدیل کرنا پڑے۔ مشکل یہ تھی کہ دیو آنند کے گھر والے رشتے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ گھر والوں کی دبی دبی سی مخالفت دیو آنند کے لیے بے معنی اور بے اثر تھی۔ وہ ان کی مرضی کے خلاف بھی شادی کرسکتا تھا جیسا کہ اس کے دوسرے بھائیوں نے بھی کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ایک بھائی نے اپنی سگی بھانجی سے شادی کرلی تھی۔ اگر دیو آنند ثریا سے شادی کرنے پر تل جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہوسکتی تھی۔

ثریا نے بھی دیو آنند سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم سے میری شادی نہ ہوئی تو پھر کسی اور سے بھی نہیں ہوگی۔ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گی اور تمام عمر کنواری رہوں گی۔ ثریا کے گھر والوں کو دیو آنند کے ہندو ہونے پر اعتراض تھا لیکن دیو آنند، ثریا کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ مگر ثریا کے گھر والوں کو ثریا کی شادی پر ہی اعتراض تھا۔ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ گھر والے بھلا کس طرح اسے کسی اور کی جھولی میں ڈال دیتے۔

اگر ثریا جرأت سے کام لیتی تو دیو آنند کی بیوی بن سکتی تھی مگر مسلسل بندشوں نے اس سے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی طاقت چھین لی تھی۔ وہ دیو آنند کے کہنے پر اپنے گھر والوں کو نہیں چھوڑ سکی تو دیو آنند نے مایوسی کے عالم میں کلپنا کارتک سے شادی کرلی۔ اس طرح ثریا اور دیو آنند کی محبت ناکامی کی قبر میں جاسوئی۔

اقتباس: اوج ثریا از آشنا۔ مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

رات کے کھانے پر اس کے لئے انگلش کھانے بنائے گئے تھے لیکن اس نے مقامی کھانے پسند کئے اور مزے لے لے کر کھاتی رہی۔ وہ ہر طرح خود کو ایک مشرقی لڑکی ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

دوسرے دن اس نے اپنے سامان کھولے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہت سی چیزیں لے کر آئی تھی اور یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ اس کا معیار بھی بہت اچھا تھا۔

اس دن مجھے اس سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ شاید گھر والوں نے جان بوجھ کر یہ موقع فراہم کیا تھا تاکہ ہم اچھی طرح ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوجائیں۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں ایک ایسی لڑکی ہوں جس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو احساس ہو رہا ہے مجھے۔“

”بہت مشکلوں سے کوئی میرے معیار پر پورا اُترتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ خود امریکا ہی میں نہ جانے کتنے اسٹیٹس کی سیر کرتی رہی ہوں۔ اس کے علاوہ ابو کے ساتھ اور کئی ملک بھی دیکھ چکی ہوں۔“

”معیار کیا ہے تمہارا۔ تم کیسا انسان چاہتی ہو۔“

”جو عام انداز کا نہ ہو۔“ اس نے کہا۔ ”جو دوسروں سے مختلف ہو۔ میں نہیں جانتی کہ تم میں یہ کوالٹی ہے یا نہیں۔“

”تم اپنے فیصلے کرنے میں حق بجانب ہو۔ لیکن میرا معاملہ دوسرا ہے۔“

”اوہ۔ اور تمہارا معاملہ کیا ہے؟“

”میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف تمہارے خواب دیکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارے علاوہ کسی کو نہیں جانتا اور نہ ہی کسی کو جاننے کی خواہش ہے۔“

”مرضی ہے تمہاری۔ ویسے میں یہ بتادوں کہ میں تمہارے لئے آسان نہیں رہوں گی۔“

”اس کی پروا بھی نہیں ہے مجھے۔ میں تو صرف تمہیں خوش رکھنا چاہتا ہوں۔“

شہاب سے ایک بار پھر میں نے میٹنگ کی۔ میں نے جب اسے یہ بتایا کہ نیلی کس طرح مکمل ڈریس میں اور اسکارف باندھ کر آئی ہے اور کس طرح اس نے اپنے کمرے سے سارے پوسٹرز نکال پھینکے ہیں تو وہ ہنس پڑا۔

”خدا کی پناہ۔ ان لڑکیوں کو سمجھنا کتنا مشکل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میری یہ بات لکھ لو کہ وہ تمہارے گھر والوں کی نگاہوں میں اپنا امپریشن ڈال رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔“

www.paksociety.com

”اتنا میں بھی جانتا ہوں لیکن اسے اس مخصوص خول سے کیسے باہر لایا جائے؟“

”بہت آسان ہے۔ آج ہی اتفاق سے ایک ڈانس پارٹی ہے۔ اس کو ساتھ لے چلو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ دومنٹ میں پوری پارٹی پر چھا جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر تم کارڈ لا کر دے دو۔“

کارڈز تو اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔ میں احتیاطاً لیتا ہوا آیا ہوں۔“

شہاب نے دو کارڈز میرے حوالے کردیے۔ شام کے وقت میں نے نیلی سے کہا۔ ”نیلی۔ رات کو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہاں کسی کو پتا نہ چلے۔“

”خیریت تو ہے۔ کہاں لے جانے کا ارادہ ہے؟“

”ایک ڈانس پارٹی ہے۔“

”کیا۔“ اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ”یہاں بھی یہ سب ہوتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہم کسی سے کم تو نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”خرم صاحب۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم خود بتاؤ۔ میں نے اپنی زندگی میں جس قسم کی پارٹیز اٹینڈ کی ہیں۔ کیا ان کا کوئی جواب تمہارے یہاں ہوسکتا ہے؟“

”شاید نہیں۔“

”میرے کمرے میں جس قسم کے پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ تم ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔“ اس نے کہا۔ ”خرم۔ بات یہ ہے کہ میں مغرب کو اس کے سارے رنگوں میں دیکھ چکی ہوں اور یہ احساس ہوگیا ہے کہ وہاں سوائے بے سکونی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے آپ کو مکمل بدل لیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ میں تو بے سکونی سے سکون کی طرف آرہی ہوں اور تم اس زندگی کی طرف جارہے ہو جس میں سوائے غلاظت کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”نیلی۔“ میں نے خوش ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں خود اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو تمہاری خوشی کی خاطر یہ سب کررہا تھا۔“

”تو پھر یہ جان لو کہ اب میری خوشی ان باتوں میں نہیں رہی۔“ اس نے کہا۔ ”لعنت بھیجو ایسی باتوں پر۔ ان میں سوائے فرسٹریشن کے اور کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔“

”نیلی۔ تو پھر میں یہ سمجھوں کہ تم بالکل ویسی ہی لڑکی ہو۔ جیسی امی نے سوچ رکھی ہوگی۔“

”ظاہر ہے۔“ تم مجھے تو دیکھ ہی رہے ہوگے۔ میں

تمہارے سامنے ہوں۔ تم چاہے جو بھی سمجھ لو۔“

”چلو۔ اب یہ بتا دو کہ میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بہت اچھے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”بہت مہذب۔ سلجھے ہوئے لیکن افسوس کہ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔“

”وہ کیوں؟“ مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔

”وہ اس لئے کہ دنیا کی ہر عورت کو ایک مرد کی خواہش ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ایسا مرد جو اپنے فیصلوں کے لئے بیوی کا محتاج نہ ہو بلکہ بیوی کو اپنے فیصلوں کا پابند کر سکے۔ لیکن تم میں یہ کوالٹی نہیں ہے۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔“

”اس طرح کہ تم نے میرے بارے میں یہ سنا ہوگا کہ میں بہت آزاد خیال ہوں۔ کلب جاتی ہوں۔ ڈانس کرتی ہوں۔ اسی لئے تم نے میری خوشی کے لئے میرے کمرے میں پوسٹرز سجا دیے۔ میرے لئے ڈانس پارٹی کے کارڈز لے آئے۔ اگر تمہیں یہ پتا چلتا کہ میں شراب پیتی ہوں تو شاید تم اس کا بھی بندوبست کر دیتے۔“

میں اس کی باتیں سنتا رہ گیا تھا۔

”تم میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں تھی کہ تم مجھے اپنے کلچر کے مطابق ڈھال سکو۔ اسی لئے خود میرے کلچر میں ڈھل جانے کی کوشش کرنے لگے اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ تم میں وہ بات ہرگز نہیں ہے جو اپنا فیصلہ منوانے والے شخص میں ہوا کرتی ہے۔ تمہارا ہی ایک محاورہ ہے جورو کا غلام، ہو سکتا ہے کہ دوسری عورتیں جورو کا غلام پال کر خوشی محسوس کرتی ہوں، لیکن مجھے جورو کا غلام نہیں چاہئے۔ میری بات سمجھ گئے نا۔“

”نیلی۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں لیکن میں آہستہ آہستہ تمہیں اپنے راستے پر لانا چاہتا تھا۔ یہ میری حکمت عملی تھی۔“

”اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ حکمت عملی اور حقیقت میں فرق نہ محسوس کر سکوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم پوری طرح میرے inflance میں تھے۔ اسی لئے تم نے یہ حرکتیں کی تھیں۔“

”چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ تم نے میرے لئے کیا سوچا ہے؟“

”یہی کہہ چکی ہوں کہ تم اچھے دوست تو بن سکتے ہو۔ اچھے لائف پارٹنر نہیں۔ اسی لئے میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”تمہاری مرضی ہے نیلی۔“ میں نے شکست خوردہ انداز میں اپنی گردن جھکا لی۔

وہ کچھ دن رہنے کے بعد واپس چلی گئی۔ میرے اور اس کے درمیان پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ وہ خواب کی طرح تھی اور خواب ہی کی طرح آ کر گزر بھی گئی۔

پھر پتا چلا کہ اس نے امریکا ہی میں اپنی پسند کے کسی نوجوان سے شادی کر لی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اس کے بنائے ہوئے معیار کے مطابق رہا ہو۔

پھر خبر ملی کہ نیلی نے وہی رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا ہے۔ جو وہاں کے ماحول کا مزاج ہے۔ شوہر کے ساتھ وہ پارٹیز وغیرہ میں جانے لگی ہے۔ اور اس کی ڈریسنگ بھی اسی انداز کی ہو گئی ہے۔

میں یہ سب سن سن کر اندر ہی اندر سلگنے لگتا تھا۔ آخر یہ سب کرنا ہی تھا تو پھر میرے سامنے پارسا بننے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک دن اتفاق سے اس کا فون آ گیا۔ اس نے ہماری خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔ یہ فون میں نے ہی ریسیو کیا تھا۔ ”مبارک ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے چہرے سے نقاب اُتر ہی گئی۔“

”کیسی نقاب۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہی کہ شادی کے بعد تم وہی سب کرنے لگی ہو۔ جس کے خلاف یہاں لیکچر دے گئی تھیں۔“

”اوہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”یہ تو ہے لیکن میں پھر وہی بات کہوں گی کہ میرا شوہر ایک مکمل مرد ہے۔ وہ جورو کا غلام نہیں ہے۔ اس نے اپنی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ سے میرے لئے جو چاہا مجھے اس کے لئے مجبور ہو جانا پڑا۔ خرم صاحب۔ تم نے عورت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ عورت پانی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے جس برتن میں چاہو انڈیل دو۔ وہ اس کی طرح ہو جائے گی لیکن شرط یہی ہے کہ برتن میں ڈالنے والے ہاتھوں میں اتنی صلاحیت ہو۔“

نیلی سے یہ میری آخری بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر اس سے بات نہیں ہو سکی اور خود میں نے شادی نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ میرے گھر والوں نے بچپن ہی سے میرے ذہن کو نیلی کا اسیر بنا دیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے ہاتھوں میں اتنی صلاحیت نہیں تھی۔ کہ میں حاکمیت برت سکتا اس لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو گیا۔ ہے ناں میرے عشق ناکام کی یہ کہانی کچھ انوکھی کچھ جدا جدا سی۔

معراجِ عشق

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت!
حکم ہوا کہ عشق ناکام کی کہانی تلاش کروں۔ کئی کہانیاں ذہن کے دریچے سے جھانکنے لگیں مگر وہ سب شوبزنس کے لوگوں کی ہیں جہاں عشق و عاشقی کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ایک کھیل سمجھا جاتا ہے کیونکہ شوبز کی دنیا میں سب ”ننھا“ نہیں ہیں۔ خیر...... ایک ذرا منفرد انداز کی کہانی لایا ہوں شاید قارئین کو پسند آجائے۔

ارشد علی
(کراچی)

عشق ناکام نمبر

مجھ سے کہا گیا کہ میں عشق ناکام کی کہانیاں لکھوں۔

یعنی ان مشہور لوگوں کے عشق کی داستان بیان کروں جو اپنے اپنے عشق میں ناکام ہوئے لیکن بہت نام کمایا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں پوری دنیا جانتی ہے۔ ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کی ناکامی پر شاعری ہوئی ہے۔ ان پر فلمیں بنائی گئی ہیں۔ مثلاً ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا،

www.paksociety.com

شریں فرہاد وغیرہ وغیرہ۔
لیکن ان کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا عشق ان مشہور لوگوں کے عشق سے کسی طور کم نہیں تھا بلکہ انہوں نے ایسی ایسی قربانیاں دیں کہ ان کی کہانیاں سن کر یہ یقین آجاتا ہے کہ یہ کم بخت عشق جو نہ کر دکھائے وہ کم ہے۔

میں ایسے ہی ایک آدمی کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ یہ داستان سچی اس لیے ہے کہ میں خود اس کا گواہ ہوں۔ یہ پوری کہانی میرے سامنے ترتیب پائی ہے۔

فرہاد ایک لااُبالی سا نوجوان تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت سے بہت پہلے بعض باتوں کا ادراک ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے والدین کو شاید یہ ادراک ہو گیا ہوگا کہ اس نوجوان کو آگے چل کر فرہاد جیسا بننا ہے اس لیے اس کا نام ہی انہوں نے فرہاد رکھ دیا تھا۔

اس کا مزاج بہ قول شخصے لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ خوبصورتی سے اسے پیار تھا۔ وہ خود بھی انتہائی خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے انتہا نفیس طبیعت کا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتا، سلیقے سے کاڑھی ہوئی مانگ، صاف ستھرے ہاتھ اور پاؤں۔ اور ہر وقت خوشبوؤں میں بسا ہوا۔

فرہاد ایسا نوجوان تھا جس کے ساتھ چلتے ہوئے، جس سے باتیں کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں میں ایک خاص کشش ہوا کرتی ہے۔ وہ بڑی آسانی سے کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

فرہاد بھی ایسا ہی تھا۔ اور کوئی تعجب نہیں تھا کہ محلّے کی یا اس کے خاندان کی لڑکیاں اس پر مرتی ہوں، لیکن اس نے کبھی اپنے عشق کی داستان مجھے نہیں سنائی تھی۔

جبکہ اس کے برعکس ایسے ویسے لوگ ایسی کہانیاں سنا سنا کر بور کرتے رہتے ''یار! آج فلاں نے لفٹ دی۔ آج فلاں میرے ساتھ ہوٹل تک گئی۔ آج فلاں نے محبت بھرا خط لکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن فرہاد نے اس قسم کی کبھی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ وہ دوسروں کی ایسی باتیں سن کر صرف مسکرایا کرتا۔

میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی بلکہ بے تکلفی تھی۔ وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کیا کرتا لیکن عشق وغیرہ کی داستان میں نے اس سے کبھی نہیں سنی تھی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا ''یار، تمہارا نام تو فرہاد ہے لیکن تم بغیر شیریں کے گھومتے رہتے ہو۔ یہ تو کوئی مناسب بات نہیں ہے۔''

''آصف بھائی! کس نے کہا کہ میری کوئی شیریں نہیں ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا ''میری بھی شیریں ہے اور میں اس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔''

''اوہو...... کون ہے وہ شیریں؟''

''وہ میری انا ہے۔ میری وہ محبت ہے جو میں اپنے آپ سے کرتا ہوں۔'' اس نے کہا ''انسان کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے آپ سے عشق کرنا سیکھ لے۔ اپنے آپ کو سنوارے، تراشے۔ اپنے آپ پر اپنا قیمتی وقت صرف کرے۔ اور جب یہ احساس ہو جائے کہ اس نے اپنے آپ کو کسی حد تک مکمل کر لیا ہے تو پھر اِدھر اُدھر دیکھے۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوتا ہے وہ سوائے فرسٹریشن کے اور کچھ نہیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں ایسی فرسٹریشن کا شکار نہیں ہوں۔''

''یار، تمہارا فلسفہ ہے تو بہت اچھا...... لیکن انسان مکمل کہاں ہوتا ہے؟ وہ تو آخر تک نامکمل ہی رہتا ہے۔''

''یہ بھی درست ہے۔'' اس نے گردن ہلائی ''اور یہی کمی اسے آگے اور آگے اور آگے لے جاتی رہتی ہے۔ وہ پھر کہیں رکتا نہیں ہے۔''

''اگر تمہارے فلسفے پر عمل کیا جائے تو پھر دنیا کا کوئی انسان بھی عشق نہ کرے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہ کرے۔ لیکن عشق صرف کامیاب لوگوں کا حق ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا ''اگر وہ کامیاب ہو چکا ہے تو پھر اسے ضرور عشق کر لینا چاہیے کیونکہ اس کے بعد وہ واقعی مکمل ہو جائے گا۔''

تو ایسا تھا وہ نوجوان۔ اور ایسے تھے اس کے خیالات۔

وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد کسی سرکاری محکمے میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے دو اور بڑے بھائی تھے جو اپنی تعلیم مکمل کر کے اچھی ملازمتیں کر رہے تھے۔

ایک بہن تھی جو کسی اچھے خاندان میں بیاہ کر اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔

اس کا پس منظر اس لیے بتانا ضروری تھا کہ اس کے ماحول اور اس کے گھر کو سمجھے بغیر اس کہانی کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

یعنی وہ ہر طرح ایک روشن خیال گھرانے کا ایسا بانکا فرد تھا جس کو ابھی تک کوئی لڑکی متاثر نہیں کر پائی تھی اور وہ خود بھی ان جھنجٹوں سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔

ہماری اس سے تقریباً روزانہ ہی شام کے وقت ملاقات ہوا کرتی۔ ہمارے محلّے ہی میں ایک صاف ستھرا ہوٹل تھا جہاں ہم ہر شام کو بیٹھ جایا کرتے اور دنیا بھر کی باتیں ہوا کرتیں۔

ادب سے لے کر سیاست اور محبت سے لے کر مذاہب تک۔ ہم چار دوستوں کا ایک حلقہ تھا۔ میں یعنی آصف جمال، منور حسن، سلیم اور فرہاد۔

ہم میں سے ہر ایک کو زندگی کے خوبصورت پہلوؤں سے عشق تھا۔ ہم یوٹوپیا کے خواب دیکھا کرتے اور غم دوراں کو غم جاناں میں شامل کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک شام وہ ہوٹل نہیں آسکا تھا۔

ہم بہت دیر تک اس کا انتظار کر کے اٹھنے ہی والے تھے کہ وہ آگیا۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ مختلف ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ہم نے اس پر اس وقت دھیان دیا جب وہ کچھ کھویا کھویا سا محسوس ہونے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ باتیں تو ہم سے کر رہا ہے لیکن اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔

''کیا بات ہے پیارے! آج کہاں کھوئے ہوئے ہو؟'' منور نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جھینپی سی مسکراہٹ تھی ''کہیں نہیں، مجھے کہاں کھونا ہے؟ میں تو تم لوگوں کے آس پاس ہی ہوں۔''

اس نے اپنے طور پر اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کچھ دال میں کالا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک شام جب میں اور وہ ایک جگہ بیٹھے تھے تو میں نے اس سے پوچھ لیا ''میرے یار! اب تو صاف صاف بتا دے، میں تجھ میں ایک تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ آخر کیا ہوا ہے تیرے ساتھ؟''

بڑی مشکلوں سے اس نے بتا دیا ''آصف بھائی، مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔''

''یہ بات ہوئی نا۔'' میں لہک اُٹھا ''میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہے۔ اب یہ بھی بتا دو، کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟''

''اس کا نام کاجل ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کاجل۔ خوبصورت نام ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور وہ خود بھی خوبصورت ہے۔'' فرہاد نے کہا ''اب میں یہ نہیں جانتا کہ اوروں کے نزدیک خوبصورتی کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک خوبصورت وہ ہے جو آپ کو

خدارا ◉ خدارا

شوگر کے مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور ناکارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبۂ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد دیسی طبّی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدارا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوا لیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبّی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0308-6627979
0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی طرف کھینچ لے، جس میں آپ کشش محسوس کریں۔"

"تمہاری یہ تعریف تو بالکل صحیح ہے۔" میں نے کہا "لیکن اب یہ بتاؤ کہ تمہارا فلسفہ کیا ہوا؟ تم تو اس جذبے کے قائل ہی نہیں تھے، دور بھاگتے تھے، کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے، اب کس طرح یہ سب ہوگیا؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔" اس نے کہا "تم ٹھیک کہتے تھے بھائی! اس جذبے میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ اپنی طرف کھینچ کر مجبور کردیا کرتا ہے، جس طرح میں مجبور ہوگیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس لمحے میں کیا تاثیر تھی جو لمحہ مجھے اس کے پاس اس طرح اُڑا کر لے گیا جیسے سوکھے پتے کو ہوا اُڑا کر لے جاتی ہے۔"

"اور وہ رہتی کہاں ہے؟ کیا جغرافیہ ہے اس کا؟"

"یہ مت پوچھو۔" اس نے ایک گہری سانس لی "میں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دن میں صرف تم ہی کو بتادوں کیونکہ دوسرے میرے اس جذبے اور اس مجبوری کو سمجھ نہیں پائیں گے۔"

میں اس سے پوچھتا رہا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ابھی اپنی اس محبت کو راز ہی رکھنا چاہتا ہے۔

اب وہ اکثر شام کو غائب رہنے لگا تھا۔ کہاں جاتا تھا؟ کیا کرتا تھا؟ یہ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا لیکن جب بھی ملتا اس میں ایک تبدیلی محسوس ہوا کرتی۔

ویسے تو بہت غیر محسوس سی تبدیلی تھی لیکن میری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ کچھ ضرور تھا جو آہستہ آہستہ بدلتا جارہا تھا۔

ایک شام میں گھر واپس آنے کے لیے رکشا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا کہ پتا چلا کہ شہر میں اچانک کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے اور ٹرانسپورٹ نہیں مل سکتی۔

عجیب پریشانی تھی۔ اب اتنی دور گھر پیدل بھی نہیں جاسکتا تھا۔ کیا شہر ہے، کیا حالات ہوتے جارہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں کچھ سے کچھ ہوجاتا تھا۔

میں ابھی یہی سب سوچ رہا تھا کہ گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فائرنگ کہیں قریب ہی ہورہی تھی۔ میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو اپنی جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

اسی وقت اچانک ایک ٹیکسی میرے پاس آکر رک گئی۔ اس میں پہلے سے دو آدمی بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کوئی نیک انسان تھا کہ اس بے چارے نے مجھے پریشان کھڑا دیکھ کر ٹیکسی روک لی تھی۔

"کس طرف جانا ہے صاحب!" ٹیکسی والے نے دریافت کیا۔

"بھائی، مجھے گلشن کی طرف جانا ہے۔" میں نے بتایا "بہت بُری طرح پھنس گیا ہوں۔"

"آؤ، جلدی سے بیٹھ جاؤ۔ ان دونوں کو تین ہٹی اُتار کے کسی طرح تمہیں گلشن پہنچادوں گا۔"

اس وقت کسی قسم کے سوال جواب کا موقع ہی نہیں تھا۔ میں جلدی سے پچھلی سیٹ پر ایک آدمی کے برابر بیٹھ گیا۔ جبکہ دوسرا آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اس وقت میں نے غور کیا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ دونوں ہیجڑے تھے۔ دونوں نے بہت خوبصورت اور بھڑک دار لباس پہن رکھا تھا۔ دونوں کے چہرے میک اَپ زدہ تھے۔ بہر حال وہ جو بھی ہوں، اس وقت وہ سب مجھے اس لیے اچھے لگ رہے تھے کہ ان کی وجہ سے میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا ہوا گھر کی طرف جارہا تھا۔

"ہائے بابو صاحب! اتنے ہنگامے میں گھر سے کیوں نکل آئے؟" ایک نے تالیاں بجاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہنگامہ تو اچانک ہوا ہے۔" میں نے بتایا "میں جس وقت نکلا تھا، اس وقت تو کچھ نہیں تھا۔"

"ہاں، یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آگ لگے کم بختوں کو۔" آگے والے نے کہا "ذرا ذرا سی بات پر طوفان کھڑا کردیتے ہیں۔ انسانی زندگی کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ جس کو چاہا مار کر چلے گئے۔"

ٹیکسی والا بہت ہوشیاری سے ہنگاموں والے مقامات سے بچاتا ہوا ٹیکسی نکال لے جارہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم تین ہٹی پہنچ گئے۔

پُل کے نیچے ایک کچی آبادی تھی، ان دونوں کا قیام اسی آبادی میں تھا اور جب ہم یہاں پہنچے ہیں تو پتا چلا کہ آگے کے حالات اور خطرناک ہوچکے ہیں۔

جگہ جگہ ہنگامے ہورہے تھے، گولیاں چل رہی تھیں۔ اس وقت ٹیکسی والے نے بھی آگے جانے سے انکار کردیا تھا "نہیں بھائی جان! اب میں یہیں سے واپس ہوجاؤں گا۔ مجھے آگے نہیں جانا۔"

"لیکن میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں؟" میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ اس وقت ان میں سے ایک ہیجڑے نے کہا "ارے بابو! کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہو، آج رات یہیں ہمارے ساتھ رہ جاؤ۔ حالات ٹھیک ہوجائیں تو گھر چلے جانا۔"

ان کی پیشکش تو اچھی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ہیجڑوں کے گھر میں ایک رات کیسے گزار سکتا تھا؟ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا "آئے ہائے! اب اتنا سوچ بچار کس لیے۔ جان بچانا فرض ہے، جان بچالو۔ اور ہم تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔ ایک رات کے لیے مہمان رکھیں گے، صبح اُٹھ کر چلے جانا۔"

اس نے ایسی بات کردی تھی کہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کی پیشکش قبول کرلی جائے اور ویسے بھی راستہ تو تھا نہیں۔ میں جاتا تو کہاں جاتا؟

ان ہی دونوں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور وہ چلا گیا۔ پھر وہ مجھے ایک چھوٹے سے گھر میں لے آئے۔ یہ ایک کچا مکان تھا جس میں ایک بڑا سا آنگن تھا اور اس آنگن میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔

اس تخت پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

گھر میں روشنی ہورہی تھی۔ میں تخت پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس نے بہت سلیقے کا لباس پہن رکھا تھا۔

دبلی پتلی، گوری اور بہت خوبصورت۔ دلوں میں اُتر جانے والی آنکھیں۔

میں تو اسے لڑکی ہی سمجھا تھا لیکن جب اس نے تالیاں بجا کر بات کی تو سمجھ میں آگیا کہ وہ بھی ہیجڑا ہی تھا "ائے ہائے، یہ تم لوگ کس مہمان کو لے آئے ہو؟"

"کاجل۔ یہ بے چارے بہت پریشان ہورہے تھے۔" ایک نے بتایا "ہم اسی لیے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ آگے ہنگامے ہورہے ہیں نا۔"

"اوہو، پھر تو یہ ایک رات کے مہمان ہوئے نا۔" کاجل نے کہا "ان کی خوب خاطر کرنا۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔ میں تو چلی اپنے پیا کے پاس۔"

کاجل تخت سے اُتر کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ بہت ہی حیران کردینے والا ماحول تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے پیا کے پاس جارہی ہے، خدا جانے کون تھا اس کا پیا؟

جو مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، انہوں نے میرے سامنے کھانا لاکر رکھ دیا تھا۔ مجھے ہچکچاتے دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا "بابو، بے فکر ہوکر کھالو۔ یہ بہت حلال کی کمائی کا کھانا ہے۔"

میرے ہم جماعت سر شاہ محمد سلیمان کے ایک بھائی شاہ محمد سلمان تھے۔ میری طرح وہ بھی ریاضی میں دو سال فیل ہوچکے تھے اور ناکامی کے ہاتھوں عاجز تھے۔ وہ کلکتہ جانا چاہتے تھے مگر سر سلیمان اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ بھی میری طرح سرپھرے تھے۔ ہم لوگ جولائی 1919ء میں کلکتہ پہنچ گئے۔ عبداللطیف لین میں ٹھہرے۔ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا سو ٹیوشن کی تلاش شروع ہوئی۔ سنا کہ ایک انسپکٹرس گرلز اسکول اردو پڑھنا چاہتی ہیں۔ کئی میل پیدل چل کر ان کے گھر پہنچا کہ پیروں میں چھالے پڑگئے۔ دستک دیا تو پتا چلا کہ میم صاحبہ کہیں گئی ہوئی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ حواس جاتے رہے۔ میں نے نوکر سے کہا کہ گھر میں کوئی اور ہے تو اسے بلاؤ۔ ایک دوشیزہ باہر آئی۔ ایسی قبول صورت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے سوال کرنے پر میں نے کہا کہ میم صاحب نے اردو پڑھنے کے لیے مجھے بلایا ہے۔ اس کے طرزِ گفتگو نے حیرت میں اضافہ کردیا۔ کلکتہ میں کسی بنگالی عورت کا شستہ اردو بولنا غیر معمولی بات تھی۔ وہ کچھ کہے جارہی تھی اور میں کھویا کھویا سا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب چپ ہونے کے قریب ہوتی تو میں پھر کچھ پوچھ لیتا اور وہ پھر الفاظ کے پھول برسانے لگتی۔ میں نے بالآخر دریافت کیا کہ آپ یہاں رہ کر اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہیں؟ کچھ مسکرا کر جواب دیا کہ میں اپنی خالہ کے ساتھ لکھنو میں کافی عرصہ رہی ہوں۔ وہاں کا اثر میری زبان پر رہا ہے۔ ایک پیالی چائے کے بعد مجھے رخصت ہونا پڑا مگر فضا کا اثر تھا کہ اب تکان محسوس ہوتی تھی نہ آبلہ پائی۔ جب تک وہاں رہا درشن کی پیاس بجھانے جاتا رہا مگر حوصلہ نہ ہوا کہ لب وا ہوجاتے۔

اقتباس: سوانح ڈاکٹر اعجاز حسین

مرسلہ: تہمینہ اظہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے بھی اب تھوڑا مذاق سوجھ گیا تھا۔ انسان کی یہی فطرت ہوتی ہے، ذرا سی راحت ملے تو پھر اس کے اندر کا سنجیدہ اور غیر سنجیدہ انسان جاگ اُٹھتا ہے۔

''ایک بات بتاؤ۔'' میں نے پوچھا ''تم لوگ تو ناچ گا کر پیسے کماتے ہو۔ پھر یہ رزق حلال کہاں سے ہوا؟''

''نہیں بابو! ہمارے یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔'' دوسرے نے بتایا ''ہم کاجل کی سہاگنیں ہیں۔ ہم سب مزدوری کرتی ہیں۔ کاجل بہت بڑی کاریگر ہے۔ اتنی بڑی مستری ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ بڑی بڑی عمارتیں بناتی ہیں اور ہم دونوں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔''

''پھر تو یہ بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا ''اور یہ پیا کون ہے؟ جس کے پاس تمہاری کاجل گئی ہوئی ہے؟''

''ہائے ہائے، اب کیا سب کچھ ایک ہی سانس میں پوچھ لوگے؟'' ایک نے کہا۔

''پھر بھی۔ اپنے تجسس کے لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''پریم لتا۔'' ایک نے دوسرے سے کہا ''بابو جی کو اپنی کاجل کے پیا جی سے ملوا دو، ورنہ بے چارے کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ بے کل ہوتا رہے گا۔''

پریم لتا نے میرا ہاتھ تھام لیا ''آؤ میرے ساتھ لیکن کچھ بولنا نہیں۔ چپ چاپ دیکھتے رہنا۔''

وہ مجھے اس کوٹھری کی پشت پر لے آیا جس کوٹھری میں کاجل گیا ہوا تھا۔ پیچھے کی طرف ایک کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

پریم لتا نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لوں۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا اور لرز کر رہ گیا۔

اس کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی جائے نماز بچھی ہوئی تھی اور کاجل سجدے میں گرا ہوا تھا۔ پورے کمرے میں اللہ ہو، اللہ ہو کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

کاجل سجدے میں گرا ہوا ورد کیے جا رہا تھا اور اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا جیسے کلیجا پھٹ کر باہر آ جائے گا۔

میرے خدا! یہ کیا تھا، کیا تھی یہ کاجل! پریم لتا نے مجھے اشارہ کیا کہ میں وہاں سے ہٹ جاؤں۔ میں اس کے ساتھ آنگن میں آ گیا۔

اس وقت میری کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ مجھ سے کچھ کہا نہیں جا رہا تھا۔

میں نے وہ رات ایک کرب میں گزاری تھی۔ میرے خدا کاجل کا کیا رتبہ تھا؟ کون تھا وہ......؟ وہ محبت اور عبادت کے کس درجے پر تھا۔

میں رات بھر یہی سب سوچتا رہا تھا۔

دوسری صبح ایک اور حیرت میرے انتظار میں تھی۔ شاید مجھے نیند دیر سے آئی تھی اسی لیے میں بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔

میرا بستر اسی آنگن کے تخت پر بچھا دیا گیا تھا۔

اور جب آنکھ کھلی تو میرا دوست فرہاد میرے سامنے کھڑا تھا۔ شاید مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی ہوگی جتنی حیرت اسے ہو رہی تھی۔

''آصف بھائی، تم یہاں کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تو یہاں ایک مجبوری کی حالت میں آیا ہوں۔'' میں نے بتایا ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں تو یہاں آتا رہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں؟''

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مجھے عشق ہو گیا ہے اور جس سے عشق ہوا ہے، اس کا نام کاجل ہے اور شاید اس سے تمہاری ملاقات بھی ہو چکی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی ''تمہاری کاجل سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ اگر میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ نہیں دیکھا ہوتا تو شاید تم کو لعنت ملامت کرتا...... لیکن سب کچھ دیکھنے کے بعد دل چاہ رہا ہے کہ تم کو اس عشق کی مبارک باد دوں۔ بشرطیکہ تم نے کاجل کو اپنی منزل سمجھ لیا ہو اور تمہارا عشق سچا ہو۔''

''آصف بھائی، اب اس سے زیادہ سچائی اور کیا ہوگی کہ میں بس اسی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔''

اسی دوران کاجل بھی کمرے سے باہر آ گیا۔

اس وقت اس کا حسن دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کی یہ دمک اس کے اندر کی روشنی کی وجہ سے ہے۔ وہ روشنی جو اس کی روح کی پاکیزگی کی کہانی سنا رہی تھی۔

اس کو دیکھ کر میں نے اپنی گردن عقیدت سے جھکا لی تھی۔

''مہمان، رات میں تم آرام سے تو سوئے تھے نا؟'' کاجل نے پوچھا۔

''جی ہاں، بہت آرام اور سکون سے سویا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مہمان! اپنے اس دوست سے کہو کہ میرا پیچھا نہ کیا کرے۔'' کاجل نے کہا ''اس نے ایک گنہگار میں ایسی کون سی بات دیکھ لی کہ اپنا ہوش گنوا بیٹھا ہے؟ کاجل کے پاس ہے کیا، صرف چند دکھاوے کے سجدے ہی تو ہیں۔''

''میں نے اپنی منزل آپ ہی کو بنا لیا ہے۔'' فرہاد لرزتی ہوئی آواز میں بولا ''یہ میرا عشق ہے اور عشق میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔''

''بہت مشکل ہے۔'' کاجل نے اپنی گردن ہلائی ''عشق کا مطلب سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے محبوب کے رنگ میں رنگ جانا۔ کیا تو میرے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کے لیے تیار ہے؟''

''ہاں، ہر لمحے، ہر وقت۔'' فرہاد نے کہا ''میں نے کچھ سوچ کر ہی اس راہ پر قدم رکھا ہے۔''

''تو پھر ہو جا ہماری طرح۔''

''یہ سمجھیں کہ ہو گیا ہوں۔''

یہ سب کچھ چونکہ میرے سامنے ہوا تھا اسی لیے میں ایسے انوکھے عشق کا گواہ ہوں۔ کہاں فرہاد جیسا بانکا سجیلا نوجوان اور کہاں کاجل۔ ایک مخنث ...... لیکن نہیں، وہ تو کچھ اور تھا، کسی اور دنیا کی مخلوق۔ نہ جانے وہ کتنے نام نہاد پیروں، فقیروں اور علمائے سو پر بھاری تھا۔ نہ جانے وہ کس منزل کا راہی تھا۔ نہ جانے وہ اپنے سجدوں میں کتنی لذت محسوس کرتا ہوگا؟

خدا کے نزدیک اس کا رتبہ کتنا بلند ہوگا اور وہ کوئی عام انسان نہیں تھا اور فرہاد...... اس کا عشق بھی کوئی عام عشق نہیں تھا۔

نہ جانے کاجل نے کس کیفیت میں اس پر نگاہ ڈالی ہوگی کہ اس کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ میں بہت ہی حیرت انگیز تجربات لے کر اس مکان سے واپس آیا تھا۔

فرہاد وہیں رہ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بعد میں آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ بعد میں بھی نہیں آیا۔ اس کے گھر والے، رشتے دار، دوست سب اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔

میں نے اس کے گھر والوں بلکہ کسی کو بھی اس مکان، کاجل اور فرہاد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نہ جانے کیوں؟ اس میں میرے کسی ارادے کا دخل نہیں تھا۔ بس میری زبان پر جیسے مہر سی لگ گئی تھی۔

ایک شام میں اکیلا کسی کو بتائے بغیر تین ہٹی کے اس مکان کی طرف چلا گیا جہاں میں نے کاجل اور اس کے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ساتھیوں کو دیکھا تھا اور جہاں آخری بار فرہاد سے ملاقات ہوئی تھی۔

لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

پتا چلا کہ وہ لوگ بہت پہلے مکان خالی کر کے جا چکے ہیں۔ کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس کے بعد فرہاد کا کوئی پتا نہیں چلا۔

اور بہت دنوں کے بعد شاید چار پانچ برسوں کے بعد فرہاد مجھے مل گیا۔

شہر سے بہت دور، ایک چھوٹی سی آبادی میں جہاں میں اپنے کسی دوست کے ساتھ اس کے کسی رشتے دار کے پاس گیا ہوا تھا۔

فرہاد مجھے اسی محلّے میں ملا تھا۔

اب وہ کچھ اور ہو چکا تھا۔ خوبصورت تو وہ پہلے سے تھا لیکن اب اس کے زنانہ رنگ روپ نے اسے اور حسین کر دیا تھا۔

وہ ایک ٹھیلا لیے سبزیاں فروخت کر رہا تھا۔

بالکل وہی انداز، جو خواجہ سراؤں کا ہوا کرتا ہے۔ تالیاں بجا بجا کر۔ اس نے عورتوں والے پھولدار کپڑے پہن رکھے تھے۔

فرہاد کو اس روپ میں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ اس بانکے سجیلے نوجوان کا کیا حشر ہوا تھا۔ میں اس کے پاس نہیں گیا۔ دور سے دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو جائے گا۔ میں اس کی شرمندگی کے خیال سے اس کے پاس نہیں گیا۔

پھر میں نے ایک حیرت انگیز بات دیکھی۔ گرچہ وہاں اور بھی سبزی والے تھے لیکن سب سے زیادہ رش اسی کے پاس ہو رہا تھا۔

مرد، عورتیں اس کے ٹھیلے کے پاس آ کر اسے ادب سے سلام کرتے اور اس سے خریداری کر کے آگے چلے جاتے۔

میں نے چائے دینے والے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا ’’بھائی، ایک بات تو بتاؤ، یہ بندہ جو سبزیاں بیچ رہا ہے، یہ کون ہے؟‘‘

’’اس کا نام کاجل ہے صاحب!‘‘ اس نے بتایا۔

’’کاجل!‘‘ میں چونک گیا تھا ’’اس کا نام کاجل ہے؟‘‘

’’جی صاحب! یہ پہلے جس کے ساتھ رہتا تھا، اصل میں اس کا نام کاجل تھا لیکن اس کے گزر جانے کے بعد اب خود اس نے اپنا نام کاجل رکھ لیا ہے۔‘‘

’’تو کیا یہ اسی علاقے میں رہتا ہے؟‘‘

’’جی صاحب! اور اس پورے علاقے میں یہ کاجل صاحب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔‘‘

’’کمال ہے بھائی!‘‘

’’بابو صاحب، آپ اس کے سامنے والی حالت پر نہ جائیں، یہ اس دور کا ولی ہے۔ ایسا اللہ والا آدمی شاید پورے ملک میں کوئی اور نہیں ملے گا۔ اس نے نہ جانے کتنوں کی دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ نہ جانے کتنے بدمعاش، غنڈے اور موالی اس کی وجہ سے سیدھے راستے پر آ گئے ہیں۔‘‘

میں حیرت، فخر اور عجیب قسم کے احساسات کے ساتھ اس شخص کی باتیں سن رہا تھا جو یہ بتا رہا تھا کہ پورا علاقہ کاجل صاحب سے عقیدت رکھتا ہے۔

اور یہ کاجل صاحب کون تھے؟

کل کا فرہاد۔ جس نے کبھی کسی لڑکی سے عشق نہیں کیا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اس قسم کا عشق اسے اپنے معیار سے کم تر معلوم ہوتا ہے۔

اور اس کا معیار کیا تھا اس ایک ہیجڑے نے اسے آسمان تک پہنچا دیا۔ اس نے فرہاد کو کاجل بنا دیا۔ یہ فنا فی الشیخ کی کہانی ہے۔ نہ جانے کس روپ میں کیسے لوگ ہوتے ہیں؟

کاجل ایک مخنث تھا لیکن اس نے فرہاد کی زندگی بدل دی۔ اسے اپنے آپ میں جذب کر کے اپنے ہی جیسا بنا دیا۔ اس کے عشق کو ناکام بنا کر اپنا رنگ چڑھا دیا کیونکہ کاجل نے اپنے خدا سے عشق کیا تھا، فرہاد نے کاجل سے......

پھر کاجل درمیان سے ہٹ گیا اور فرہاد اپنے اللہ کا ہو کر رہ گیا۔

عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا یہ سفر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس دن میں نے فرہاد سے ملاقات نہیں کی، لیکن اس کے بعد جب میں اس سے ملنے پہنچا تو محلّے والوں نے بتایا کہ وہ لوگ تو یہاں سے جا چکے ہیں۔ کہاں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔

عشق ناکام نمبر کے لیے یہ کہانی کسی مشہور آدمی کی کہانی نہیں ہے لیکن یہ عشق کی کہانی ضرور ہے۔ عشق جو معجزے دکھاتا ہے اور نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔

کاش! ہم میں بھی عشق کرنے کا سلیقہ آ سکے۔

تقدیسِ عشق

جناب مدیراعلیٰ

تسلیمات!

میں کہانی کار نہیں ہوں لیکن پڑھتی ضرور ہوں۔ سرگزشت مجھے اتنا عزیز ہے جتنا مجھے اپنے بچے۔ میرے بچے کہتے ہیں ’’مما، آپ اس رسالے کے لیے اتنی کنشس کیوں ہیں کہ داغ دھبے نہ لگیں، وقت پر خرید لاؤ۔‘‘ تب میں کہتی ہوں کہ اس میں سبق ہے، دوسروں کی زندگی سے، حالات سے انسان کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ جو کردار سرگزشت ادا کر رہا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ اب جب میں نے عشقِ ناکام نمبر کا اشتہار دیکھا تو سوچا کہ اپنی زندگی کا ایک باب رقم کردوں کہ کسی نے مجھ سے بھی عشق کیا تھا اور اس کا عشق ناکام ٹھہرا۔ اس روداد مین سبق ہے اسی لیے لکھ رہی ہوں لیکن نام مقام بدل دیا ہے۔ میرا اصل نام نہ لکھیں۔ کہانی پر جو نام ہے وہی چھاپیں۔

شاہین اظہر

(کراچی)

میں شام کے وقت صحن میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ میں پانی بند کر کے گیٹ تک آئی۔ ’’کون ہے؟‘‘

’’امی میں ہوں۔‘‘ باہر سے ماہ جبیں کی آواز آئی، وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو صورت سے اور بھی پریشان نظر آئی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ جلدی سے اندر آئی تھی۔

’’کیا ہوا ماہ جبیں، خیریت تو ہے؟‘‘

www.paksociety.com

وہ روہانسی ہوگئی۔ ”امی تین دن سے کچھ لفنگے میرا پیچھا کررہے ہیں۔ وہ سینٹر کے باہر موجود ہوتے ہیں اور جب میں باہر آتی ہوں تو میرے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آوازیں کستے ہیں اور بہت....“ وہ بولتے بولتے رو دی تھی۔ میں اسے اندر لے آئی، بٹھا کر پانی پلایا۔ ماہ جبیں بی کام کررہی تھی۔ اسی لیے اسے کوچنگ کی ضرورت پڑی تھی۔ اظہر نے اسے ایک مقامی اچھے کوچنگ سینٹر میں داخل کرا دیا تھا۔ ماہ جبیں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن میٹرک میں بیماری کی وجہ سے اتنے اچھے نمبر نہیں بنے تھے۔ اس لیے اس نے بددل ہوکر ایف ایس سی کے بجائے کامرس لے لیا۔ اب وہ ایم بی اے کرنا چاہتی تھی۔ ماہ جبیں ہماری اکلوتی اولاد ہے اس لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنا ہم میاں بیوی کے لیے فرض ہوجاتا تھا۔ جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے اسے سمجھایا۔

”بیٹا یہ تو ایک عام مسئلہ بن گیا ہے، جو لڑکی تعلیم یا جاب کے لیے باہر نکلتی ہے اسے اس قسم کی باتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ توجہ مت دو، وہ کچھ دن بعد خود پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

”امی مجھے بہت ڈر لگتا ہے اور بے عزتی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اب تو لوگ بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ لفنگے گلی کے کونے تک آتے ہیں۔“

”اچھا کل میں تمہارے سینٹر آؤں گی اور پھر دیکھوں گی۔“

اس کے چہرے پر اطمینان دکھائی دیا تھا۔ ”یہ ٹھیک ہے امی آپ ایک دو دن میرے ساتھ آجائیں تو ہوسکتا ہے وہ پھر تنگ نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے لیکن اپنے پاپا سے ذکر مت کرنا وہ پریشان ہوجائیں گے۔“

”ٹھیک ہے امی۔“ ماہ جبیں بیگ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ اظہر کو بتانے سے میں نے اس لیے منع کیا کہ وہ بہت سیدھے مزاج کے آدمی ہیں۔ ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہیں۔ صبح دفتر جاتے ہیں اور شام کو گھر آکر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کا لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم ہے بلکہ وہ لوگوں سے ملتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کا شرمیلا پن ہے۔ وہ مسائل کا سامنا نہیں کرسکتے۔ اگر کوئی شخص ان کے سامنے کھڑا ہو تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے یا ہتھیار ڈال دیں گے۔ مقابلہ کرنا ان کی سرشت ہی نہیں ہے۔ میں اسے بزدلی نہیں کہہ سکتی کیونکہ بزدل آدمی محنت سے بھی جی چراتا ہے اور اظہر بلا کے محنتی ہیں۔ ایک زمانے میں جب ہم اپنا گھر بنارہے تھے تو وہ دفتر کے بعد ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے تھے اور صبح سات بجے کے نکلے رات بارہ بجے گھر آتے تھے۔ مسلسل پانچ سال ان کا یہی معمول رہا تھا۔ مجھ سے اور ماہ جبیں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ہمارے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ کسی کا سامنا نہ کرپانا ان کی کمزوری ہے تو میں نے اسے مسئلہ نہیں بنایا جب بھی کوئی ایسا مسئلہ ہوتا ہے تو میں انہیں آگے کرنے کی بجائے خود اس کا سامنا کرتی ہوں۔ اسی لیے میں نے ماہ جبیں کو منع کردیا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے لیکن اندر ہی اندر اس بات پر کڑھتے رہتے۔

اگلے دن میں جب ماہ جبیں کے سینٹر سے آنے کا وقت ہوا تو میں خود چلی گئی۔ سینٹر ہمارے علاقے میں پیدل مسافت پر تھا۔ ماہ جبیں کالج سے سیدھی وہیں چلی جاتی تھی۔ وہاں اس کی دو گھنٹے کی کلاسیں ہوتی تھیں اور چار بجے وہ سینٹر سے نکل جاتی تھی سوا چار بجے تک گھر میں ہوتی۔ میں سینٹر کے سامنے پہنچی تو وہ لفنگے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ ماہ جبیں کی چھٹی چار بجے ہوتی ہے اور وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کررہے تھے۔ میں دروازے پر موجود رہی۔ ماہ جبیں باہر آئی تو میں نے اسے آواز دی۔

”بیٹے یہاں آؤ۔“

وہ پریشان تھی لیکن مجھے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی۔ ”امی آپ نے دیکھا وہ لوگ موجود ہیں۔“

”تم فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے تو وہ تین لفنگے پیچھے پیچھے تھے۔ تینوں نوجوان تھے ان کی عمریں شاید بیس بائیس برس تھی۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر چلتے ہوئے بہ ظاہر آپس میں بات کررہے تھے۔ ان کی گفتگو میں بے ہودگی اور فحش گوئی بہت زیادہ تھی اور ظاہر ہے وہ یہ سب ہمیں سنارہے تھے۔ ماہ جبیں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کی گرفت سے لگ رہا تھا وہ اندر سے ٹینس ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی بے ہودہ گوئی سن کر کوئی لڑکی نارمل نہیں رہ سکتی ہے جبکہ اسے معلوم ہو کہ یہ سب اسے سنانے کے لیے کہا جارہا ہے۔ وہ لفنگے گلی کے سرے تک ہمارے پیچھے آئے تھے۔ ماہ جبیں گھر میں داخل ہوئی تو پھر روہانسی ہورہی تھی۔

”دیکھا امی آپ نے.... میں چار دن سے ان کی یہی بکواس سن رہی ہوں۔“

”تو فکر مت کر ماہ جبیں سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”جلد یہ لفنگے تیرا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

ماہ جبیں چینج کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے لاؤنج میں رکھا فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا جو کہیں لکھا نہیں ہے لیکن مجھے یوں ازبر ہے جیسے اپنی تاریخ پیدائش یاد ہے۔ تیسری بیل پر کسی نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

لہجہ بھاری اور جانا پہچانا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ ”اکبر....؟“

”شاہین.... تم شاہین ہو ناں؟“

”تم نے پہچان لیا؟“

”ہاں میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟“ وہ چند لمحے کے لیے جذباتی ہوگیا لیکن پھر خود پر قابو پالیا۔ ”معاف کرنا.... تم سناؤ خیریت ہے ناں؟“

”خیریت نہیں ہے کچھ مسئلہ ہے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ وہ سنجیدہ ہوگیا۔ ”کوئی تمہیں پریشان کررہا ہے؟“

”مجھے نہیں میری بیٹی کو۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔

”تم نے مجھے بتادیا اب بے فکر ہوجاؤ۔“

میں نے سچ مچ اطمینان محسوس کیا تھا۔ ”جب میں نے نمبر ملایا تو ڈر رہی تھی کہ کہیں تم نے نمبر نہ بدل لیا ہو یا یہ نمبر بند نہ ہو۔ بیس سال بعد میں نے یہ نمبر ملایا ہے۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”ہاں وقت گزر گیا ہے، لیکن یہ نمبر تمہیں ہمیشہ آن ملے گا۔ میں نے اب تک چار جگہیں بدلی ہیں لیکن یہ نمبر اپنے پاس رکھا۔ جب یہ بند ملے تو سمجھ لینا کہ میں اس دنیا....“

”خدا نہ کرے۔“ میں نے تڑپ کر کہا اور پھر اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”تم اب بھی ویسے ہی ظالم ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”بدمعاش جو ٹھہرا.... اب تم بے فکر ہوجاؤ۔“

میں نے ریسیور رکھا تو ماہ جبیں کپڑے بدل کر آگئی اس نے پوچھا۔ ”امی ابو کو کال کررہی تھیں؟“

”نہیں بیٹا.... اور میں نے منع کیا تھا اپنے پاپا کو کچھ نہیں بتانا ہے۔“

”جی امی میں نے پاپا کو کچھ نہیں بتایا ہے۔“

”بس بے فکر ہوجاؤ اب وہ بدمعاش تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔“ میں نے یقین سے کہا تو ماہ جبیں مطمئن نظر آنے لگی۔ اسے مجھ پر اعتماد تھا۔ بچپن سے اب تک اس کے باہر کے سارے کام میں کرتی آئی تھی۔ باہر کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا وہ مجھ سے کہتی تھی اور میں اسے حل کردیتی تھی۔ اس لیے اسے اطمینان تھا کہ میں یہ مسئلہ حل کردوں گی۔ اس دوران میں اظہر دفتر سے آگئے اور ماہ جبیں ان کے ساتھ لگ گئی۔ نو دس سال کی عمر سے اس نے اظہر کی بہت ساری ذمے داریاں خود لے لی تھیں۔ جیسے ان کے کپڑے پریس کرنا، جب وہ دفتر سے آتے تو ان کی چیزیں باتھ روم میں رکھتی۔ ان کو پانی اور چائے بنا کر پیش کرتی تھی۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے کام جو پہلے میں کرتی تھی اب ماہ جبیں کرتی تھی۔ میں رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ اکبر نے مجھ سے بے فکر ہونے کو کہا تھا اور میں سچ مچ بے فکر ہوگئی تھی مجھے معلوم تھا کہ کام کردے گا۔

رات سونے سے پہلے میں حسب معمول ماہ جبیں کے کمرے میں آئی اور اسے پیار کیا تو اس سے سرگوشی میں کہا۔ ”امی وہ لوگ اب مجھے تنگ نہیں کریں گے نا؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”وہ اب نظر اٹھا کر بھی تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے تم پورے اطمینان سے سینٹر جاؤ۔“

ماہ جبیں خوش ہوگئی اس نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ یہ ہوگا کیسے؟ اسے مجھ پر اعتماد تھا۔ میں کمرے میں آئی تو اظہر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ہم گیارہ بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ انہوں نے ٹی وی بند کیا اور میری طرف دیکھا۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا.... تم کل سے چپ چپ ہو؟“

”نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں مسکرائی۔ ”ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی مسئلہ ہو اور آپ سے متعلق ہو تو میں آپ کو نہ بتاؤں۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے پھر اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

ہم شاہ فیصل کالونی میں رہتے تھے جو اس زمانے میں ڈرگ کالونی کہلاتی تھی۔ ان دنوں میں کالج میں تھی اور میرا کالج صدر میں تھا روزانہ مجھے بس سے جانا اور آنا پڑتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس وقت شاہراہ فیصل کے ساتھ صرف جھاڑیاں اور ویرانہ تھا اور آج جیسی رونق نہیں تھی۔ کالج جاتے وقت تو ابو ساتھ ہوتے تھے۔ وہ خود ایک کالج میں پروفیسر تھے لیکن واپسی پر مجھے اکیلے آنا پڑتا تھا۔ بس سے اتر کر کوئی فرلانگ بھر راستہ سنسان ویران جھاڑیوں کے درمیان طے کرنا پڑتا تھا۔ پھر ریلوے لائن کراس کرنے کے بعد آبادی شروع ہوتی تھی۔ یہ ویرانہ ڈرتے ڈرتے طے کرتی تھی اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ بس سے اتر کر کسی دوسری لڑکی یا عورت کا انتظار کرتی جو اسی طرف جانے والی ہو تو اس کے ساتھ جاتی تھی۔

عجیب بات ہے ہم لڑکیوں کو اس زمانے میں ویرانوں سے ڈر لگتا تھا حالانکہ مجھے کبھی اس راستے سے گزرتے ہوئے کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جب کسی آدمی نے پیچھا کیا ہو یا چھیڑا ہو۔ پھر بھی ہم ویرانوں سے ڈرتے تھے اور آبادی کے درمیان سے گزرتے ہوئے خود کو محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔ حالانکہ بدمعاش اور غنڈے لوگ آبادیوں میں پائے جاتے تھے لیکن اس وقت لڑکیوں پر آوازیں کسنے اور ان کا پیچھا کرنے کا رواج اتنا کھلا ڈلا نہیں تھا۔ لڑکے اس قسم کے کام ڈرتے ہوئے کرتے تھے۔ جہاں کوئی لڑکی یا کسی شخص نے ان کو برا بھلا کہا وہ بھاگ جانے میں عافیت سمجھتے تھے۔ اس لیے ہم لڑکیاں آبادی میں خود کو محفوظ سمجھتی تھیں۔ اب رواج شاید الٹ گیا ہے اور لڑکیاں اور عورتیں خود کو آبادیوں میں زیادہ غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔

یہ بہت گرمیوں کے دن تھے۔ میں بس اسٹاپ پر اُتری تو دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ گرمی اتنی شدت کی تھی کہ میں زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکی اور گھر کی طرف چل پڑی۔ گرمی کی وجہ سے راستہ زیادہ ہی سنسان تھا اور جو اکا دکا لوگ نظر آتے تھے اب وہ بھی غائب تھے۔ میں تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جا رہی تھی۔ اچانک کسی نے نزدیکی جھاڑیوں سے کہا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“

میں نے خوفزدہ ہو کر جھاڑیوں کی طرف دیکھا وہاں کوئی تھا لیکن واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ قدم تیز کر دیے۔ لیکن جھاڑیوں میں موجود شخص کہیں زیادہ تیز رفتار نکلا وہ جھپٹ کر باہر آیا اور اس نے مجھے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے میں چلاتی اس نے ایک ہاتھ سے میرا منہ بھی بند کر دیا تھا۔ میں تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی لیکن خود کو چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ مجھے پکڑنے والا کہیں طاقتور اور وحشی قسم کا شخص تھا۔ وہ بہ آسانی مجھے گھسیٹ کر جھاڑیوں میں لے گیا۔

ابھی ایک منٹ پہلے تک اس خطرے کا گمان بھی نہیں تھا اور اب میں خوف سے مرنے والی ہو گئی تھی یہ سوچ کر کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس شخص کے عزائم واضح تھے جس کی میں نے صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ صرف اس کی آواز سنی تھی۔ اس نے مجھے لا کر زمین پر پٹخ دیا اور میری چادر میرے منہ پر لپیٹ دی۔ مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ مجھ میں ہاتھ ہلانے کی سکت بھی نہیں تھی، اسے کہاں سے روکتی بس دل میں اللہ سے فریاد کر سکتی تھی کہ وہ مجھے اس درندے سے بچائے۔

جب کوئی امید باقی نہیں رہی تھی تو اللہ نے یہ فریاد سن لی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس شخص کا بوجھ مجھ پر سے اُٹھ گیا ہے۔ پھر اس کے غرانے اور گالیاں دینے کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے منہ سے چادر ہٹائی تو دیکھا کچھ فاصلے پر دو افراد آپس میں گتھم گتھا تھے۔ وہ وحشیوں کی طرح لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو آزادانہ گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنی چادر اُٹھائی اور جھاڑیوں سے باہر آئی جہاں میرا کالج بیگ اور پرس پڑا تھا۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اٹھائیں اور یوں ریلوے لائن کی طرف بھاگی جیسے میرے پیچھے سارے زمانے کی بلائیں ہوں۔ میں اتنی بدحواس تھی کہ اپنے محسن کی صورت بھی نہیں دیکھ سکی تھی جس نے عین موقع پر آ کر مجھے بے آبرو ہونے سے بچا لیا تھا۔ ریل لائن پار کرنے کے بعد آبادی نظر آئی تو مجھے اپنے حلیے کا خیال آیا میں نے جلدی سے اپنے کپڑے جھاڑے اور چادر کو صحیح طرح سے اوڑھا۔ اپنا چہرہ صاف کیا اور آگے چل پڑی۔

گھر پہنچ کر میں نارمل رہی تھی لیکن رات کو مجھے دہشت سے بخار چڑھ گیا اور اگلے روز جب میں نے کالج جانے سے انکار کیا تو امی کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”لڑکی کیا ہوا ہے تجھے کل سے بولائی ہوئی ہے اور اب کالج جانے سے انکار کر رہی ہے؟“

اتفاق سے میرے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن دونوں گھر سے جا چکے تھے۔ ابو پہلے ہی کالج جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ میرے بڑے بھائی مشین ٹول فیکٹری میں جاب کرتے تھے اور چھوٹی بہن ابھی اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ یہ اسکول کالونی میں تھا اور اسے بسوں میں سفر کے عذاب سے نہیں گزرنا پڑتا تھا۔ تنہائی پا کر میں پھوٹ پڑی اور امی کو سب بتا دیا۔ امی تو سکتے میں رہ گئی تھیں پھر انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر ڈھیروں پیار کیا اور سب سے پہلے اٹھ کر شکرانے کے نفل پڑھے کہ اللہ نے مجھے کتنی بڑی ذلت سے بچا لیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”تو فکر مت کر شام کو تیرے ابو آتے ہیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔“

مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ ”آپ ابو کو سب بتا دیں گی۔“

”پاگل ہوئی ہے ایسی باتیں کسی کو نہیں بتاتے ہیں۔ بس تو نے مجھے بتا دیا ہے یہ کافی اب بھول جا تیرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ آئندہ یہ واقعہ زبان پر مت لانا۔“

”تب آپ ابو سے کیا کہیں گی؟“

”یہی کہ تجھے آتے ہوئے غنڈے چھیڑتے ہیں اور اب تو اکیلے آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

امی نے ابو سے بات کی اور انہوں نے یہ کیا کہ مجھے کالج آنے جانے کے لیے وین لگوا دی۔ اس زمانے میں وین میں آنے جانے کا رواج بہت کم تھا اس طرح صرف بچے اسکول آتے جاتے تھے۔ لڑکیاں اور لڑکے کالج بسوں میں جاتے تھے۔ مگر ابو نے میری خاطر وین لگوا دی۔ اب میں آرام سے بنا کسی خوف صبح گھر سے وین میں بیٹھتی تھی اور وین ہی واپسی میں مجھے گھر کے سامنے اُتارتی تھی۔ کچھ مہینوں بعد میں اس واقعے کو سچ مچ فراموش کر چکی تھی۔ بی اے کا پہلا سال مکمل ہوا اور میں فائنل ائر میں آ گئی۔ چھٹیوں کے بعد دوبارہ کالج جانا شروع کیا۔ بسوں کے چکر سے جان چھوٹی تو آنے جانے میں وقت بھی کم لگتا تھا۔ وین جلدی پہنچا دیتی تھی اور جلدی واپس بھی لے آتی تھی۔

لیکن ایک دن کالج سے نکلی تو خلاف توقع وین غائب تھی۔ میرے ساتھ تقریباً دس بارہ لڑکیاں اسی وین میں آتی جاتی تھیں وہ بھی حیران پریشان رہ گئیں۔ پہلے بھی ایک دو بار ایسا ہو چکا تھا کہ کالج کی چھٹی ہو گئی اور وین والا کسی قدر دیر سے آیا تھا۔ چھوٹی موٹی خرابی کی وجہ سے تاخیر ہو جاتی تھی۔ لیکن اس روز آدھے گھنٹے بعد بھی وین نہیں آئی تو ہم لڑکیوں نے بس سے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ سفر کے دوران تو مجھے خیال نہیں آیا لیکن جب بس اسٹاپ پر اُتری اور وہاں حسب معمول ویرانی دیکھی تو مہینوں پہلے کا واقعہ خوف بن کر میرے رگ و پے میں سمانے لگا۔ اکیلے جانے کے خیال سے ہی قدم من بھر کے ہو گئے تھے اور میں بس اسٹاپ سے آگے جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کیا کروں کہ کالونی کی طرف سے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔

اس نے شلوار قمیص پر اجرک لے رکھی تھی۔ سر کے لمبے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کئی دن کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ جوان اور مناسب نقوش کا آدمی تھا لیکن اپنے حلیے اور انداز سے بدمعاش لگ رہا تھا۔ میرا دل جو پہلے ہی دوگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا اس وقت جیسے اُچھل کر حلق میں آنے کو تیار ہو گیا۔ اس وقت تو میری حالت اور خراب ہو گئی جب وہ بالکل میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سخت اور بڑے ہاتھ بتا رہے تھے کہ وہ سخت کوش آدمی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ مجھے وہ شخص یاد آنے لگا جس نے جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پر حملہ کیا تھا میں نے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن جب اس شخص کو دیکھا تو نہ جانے کیوں مجھے اسی شخص کا خیال آنے لگا۔ اچانک اس شخص نے کہا۔

”آپ یہاں کیوں کھڑی ہے گھر جاؤ؟“

میں اُچھل پڑی تھی۔ میں نے بدحواسی سے کہا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا... مجھے کہاں جانا ہے؟“

”میں آپ کا نام بی جانتا اور یہ بھی جانتا کہ آپ کہاں رہتا ہے، اس وقت میں صرف آپ کی خاطر یہاں آیا ہے۔“

”ہم.... میری خاطر.... کیوں؟“ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ سرحد کے علاقے کا ہے۔

”آپ کو ان جھاڑیوں والے راستے سے ڈر لگتی ہے۔ آپ کے ساتھ یہاں ایک واقعہ ہوئی ہے۔“

مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گی۔ اب مجھے شک نہیں رہا کہ یہ وہی شخص ہے۔ میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”تم وہی آدمی ہو نا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟“

”نہیں میں وہ ہے جس نے اس شخص سے بچایا۔ میں وقت پر آ گیا اور تمہیں چھڑا لیا۔ کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا؟“

”نہیں اور میں نے تمہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔“

”اس کے بعد تم وین سے آنے جانے لگا۔ میں روز دیکھتی۔ تمارا وین ریل لائن سے گزرتا ہے آج وین نہیں آیا تو ام سمجھا کہ شاید وین خراب ہو گیا اور اب آپ کو بس سے آنا ہے اس لیے ام یہاں آ گیا۔“

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تت.... تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"ام روز صبح آپ کو وین میں جاتے دیکھتا، آج بھی جاتے دیکھا لیکن جب آپس واپس نہیں آیا تو ام کو فکر ہوا اور ام یہاں آگیا۔"

مجھے اس وقت بھی یقین تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پر دست درازی کی تھی اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ کوئی اور آجائے یا کوئی بس آجائے تو میں یہاں سے نکل جاؤں ۔ اس نے میری صورت سے خوف بھانپ لیا تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈرنا نہیں ام کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اور تم شاید سمجھ رہی ام نے ہی تم پر حملہ کیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ تم پر حملہ کرنے والا اسٹیشن پر چنے کی ریڑھی لگا رہا ہے۔ ام نے اس کا ٹانگ توڑ دیا، اب وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"پتا نہیں.... ام بہت عرصے سے آپ کو یہاں سے گزرتے دیکھتا ہے۔ دو سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ جب ام نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو آپ ڈرا ہوا لگا۔ تب سے ام کو ہمدردی ہوگئی اور ام تمہارے علم میں لائے بغیر ان جھاڑیوں میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اگر ام سامنے تمہارے ساتھ آتا جاتا تو تم ڈر جاتا اور ام پر بالکل اعتبار نہیں کرتا کہ ام تمہارا حفاظت کے لیے تمہارے ساتھ ہے۔ اس لیے ام چھپ کر تمہارے ساتھ ہوتا اور اسی وجہ سے ام بر وقت تمہاری مدد کے لیے پہنچ گیا۔ تمہاری طرح اس بدمعاش کو بھی علم نہیں تھا کہ ام جھاڑیوں میں ہوتا ہے۔"

وہ صورت سے اور حلیے سے خود بدمعاش نظر آرہا تھا لیکن اس کا لہجہ نہایت نرم تھا اور وہ بہت شریفانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس وقت تک میرا خوف کم ہونے لگا تھا اور پھر میری مخصوص نسوانی حس نے بتایا کہ وہ میرے لیے غلط عزائم نہیں رکھتا ہے۔ میں نے کہا۔ "تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ آپ کا خوف کم ہو جائے اور آپ یہاں کھڑے رہنے کی بجائے اپنے گھر جاؤ۔ ام اسی جگہ کھڑا ہے اور جب تک آپ ریل لائن تک نہیں پہنچ جاتا ام اسی جگہ رہوں گا۔ بے شک آپ دیکھتی رہنا۔"

اس کی بات سے میں نے ہمت پکڑی اور پہلے ہچکچاتے ہوئے سست قدموں سے اور پھر جب نصف راستہ طے کرلیا تو تیز قدموں سے آبادی کی طرف جانے لگی۔ میں نے کئی بار مڑ کر دیکھا تو اسے اسی جگہ پایا حتیٰ کہ میں ریل لائن تک پہنچ گئی تب بھی وہ اسی جگہ کھڑا تھا۔ میں گھر پہنچی تو امی پریشان تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وین والا نہیں آیا تھا اور مجھے بس میں آنا پڑا۔ لیکن میں نے امی سے اس شخص کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ میں امی سے کوئی بات چھپاتی نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیا بات تھی جو میں نے یہ بات نہیں بتائی۔ اس واقعے کے دو دن بعد میں اتوار والے دن امی اور میری چھوٹی بہن ماہین کے ساتھ ملیر کالونی جانے کے لیے نکلی وہاں میری خالہ کا گھر ہے۔ اس زمانے میں لوکل ٹرین باقاعدگی سے چلتی تھی اس لیے ہم خالہ کے گھر لوکل ٹرین سے جاتے تھے۔

اسٹیشن پر آکر میں نے چنے بیچنے والے آدمی کو دیکھا تو مجھے اس شخص کی بات یاد آگئی کہ جس شخص نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہ اسٹیشن پر چنے کی ریڑھی لگاتا تھا اور اس نے اس شخص کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ اب وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہے۔ میں نے دیکھا سچ مچ وہ بیساکھی کے ساتھ تھا اور اس کے چہرے پر بھی زخموں کے کئی نشانات تھے۔ اس کی ایک آنکھ پر چوٹ تھی۔ سیاہ رنگت اور چہرے سے وہ خبیث لگ رہا تھا۔ وہ جس طرح آتی جاتی عورتوں کو گھور رہا تھا اس سے اس کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے یقین آگیا کہ اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں بس اسٹاپ پر ملنے والے شخص پر بے جا شک کر رہی تھی۔

پہلے سال میرا انگریزی کا پیپر رہ گیا تھا۔ بخار کی وجہ سے میں جا نہیں سکی تھی اس سال مجھے انگریزی کے دو پرچے بھی دینے تھے اور میری تیاری اتنی اچھی نہیں تھی اس لیے میں نے کالونی میں رہنے والی ایک ٹیچر سے انگریزی... پڑھنا شروع کردی۔ میں شام چار بجے جاتی تھی اور چھ بجے واپس گھر آتی تھی۔ ٹیچر کا گھر کچھ ہی دور تھا اس لیے میں اکیلی پیدل چلی جاتی تھی۔ واپسی میں کبھی بھائی دفتر سے آتے ہوئے مجھے لیتے آتے یا وہ لیٹ ہو جاتے تو میں خود واپس آجاتی تھی۔ یہ اکتوبر کے دن تھے اور امتحان قریب آگئے تھے اس لیے میں زیادہ دیر تک پڑھتی تھی اور اکثر مجھے گھر آتے آتے رات ہو جاتی تھی۔ ایک دن میں ٹیوشن سے نکلی اور گھر کی طرف جا رہی تھی کہ مجھے لگا کہ کوئی شخص میرے پیچھے ہے وہ پاس نہیں تھا بلکہ اتنی دور سے احتیاط سے

پیچھا کر رہا تھا کہ کئی بار مڑ کے دیکھنے کے باوجود میں اسے دیکھ نہیں سکی تھی پھر بھی اس کی ایک دو جھلک جو دکھائی دیں ان سے مجھے لگا یہ وہی شخص تھا جو اس دن مجھے بس اسٹاپ پر ملا تھا۔

اس کے بعد یہ اکثر ہونے لگا جب میں ٹیوشن پڑھ کر دیر سے نکلتی تو کوئی میرا پیچھا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے جھنجلا کر اسے پکڑنے کا فیصلہ کیا اور جب ٹیوشن سے واپسی پر اس شخص کو پیچھے پایا تو ایک تاریک بغلی گلی میں پہنچ کر میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اب کوئی بالکل پاس آئے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ نمودار ہوا اور اس نے آگے دیکھا لیکن ظاہر میں اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اب وہ روشنی میں تھا اور میں نے اسے واضح پہچان لیا تھا، یہ وہی لمبے بالوں والا شخص تھا۔ اس وقت بھی اس نے اجرک اوڑھ رکھی تھی۔ ابھی وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ میں بغلی گلی سے نکلی اور اس کے پاس آکر بولی۔ "تو یہ تم ہو؟"

اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ "آپ.... کہاں چلا گیا تھا؟"

"اس گلی میں تمہیں پکڑنے کے لیے.... آخر تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟" مجھے غصہ آگیا تھا۔

"آپ کا حفاظت کے لیے۔"

"تمہیں میری حفاظت سے کیا دلچسپی ہے؟"

"کیا یہ بات جاننا آپ کے لیے ضروری ہے؟" وہ ٹھہرے انداز میں بولا۔ اس کے انداز پر میں گھبرا گئی۔

"نہیں.... لیکن تمہارا اس طرح میرے پیچھے آنا میری بدنامی کی وجہ بن سکتا ہے۔"

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "خدا کا قسم، اگر اکبر خان کو شبہ بھی ہوجائے کہ اس کی وجہ سے آپ کا بدنامی ہو رہا ہے تو وہ یہ علاقہ ہی چھوڑ جائے گا۔"

تو اس کا نام اکبر خان تھا، میں نے کہا۔ "تم جو کر رہے ہو وہ لوگوں کی نظر سے چھپا نہیں رہے گا۔ میں مانتی ہوں کہ تم میرے خیال سے یہ سب کرتے ہو لیکن پلیز اس طرح مجھے مشکل ہوگی۔"

اس نے سوچا اور پھر کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے لیکن ام تم پر نظر ضرور رکھے گا۔ اس طرح کہ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "اگر تم میرے آس پاس رہے تو مجھے اور پھر دوسرے لوگوں کو ضرور پتا چل جائے گا۔"

اس نے شانے اُچکائے اور پلٹ کر واپس چلا گیا۔ ویسے بھی اس جگہ سے میرا گھر زیادہ دور نہیں تھی۔ میں گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ کیوں میری حفاظت کے لیے اتنا فکرمند ہے؟ اس کا میرے ذہن میں ایک ہی جواب آرہا تھا لیکن میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے پریشانی ہونے لگی تھی۔ اگر یہ بات میرے گھر والوں کے علم میں آجاتی تو وہ کیا سوچیں گے؟ میرے ابو، امی اور ایاز بھائی مجھ پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ ایک دن میں ٹیوشن سے ایاز بھائی کے ساتھ واپس آرہی تھی تو بازار والی گلی سے گزرتے ہوئے اکبر خان کو کچھ افراد کے ساتھ لڑتے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا اور اس کے سامنے تین تھے لیکن اکیلا ہی سب پر بھاری دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ کون ہے؟"

"بدمعاش ہے۔" ایاز بھائی بدمزگی سے بولے۔ "آئے دن اس کے کسی نہ کسی سے جھگڑے ہوتے ہیں۔ چند مہینے پہلے ایک اور نامی گرامی بدمعاش کی کسی بات پر ٹانگ توڑ دی تھی اب وہ اسٹیشن پر چنے کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیساکھی کے بغیر چل بھی نہیں سکتا تو بدمعاشی کہاں سے کرے گا؟"

گویا اکبر خان نے سچ مچ اس بدمعاش کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ بات جان کر مجھے بہت مسرت ہوئی تھی۔ یہ کام اس نے میری خاطر کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ سچ مچ مجھے نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھا اور جب میں ٹیوشن سے واپس آتی تھی تو وہ میرے آس پاس ہوتا تھا۔ پھر میرے پیپرز شروع ہوگئے اور ٹیوشن جانا بند کر دیا۔ پیپرز کے بعد گھر سے باہر جانا بھی بند ہو جاتا۔ اس لیے اکبر خان کے نظر آنے یا اس سے سرِ راہ ملاقات کا امکان بھی باقی نہ رہتا۔ جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو مجھے تعجب ہوا تھا کہ میں کیوں اس سے ملنے کے بارے میں سوچ رہی تھی؟ پیپرز شروع ہوئے تو میں سب بھول کر ان کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اس سے کچھ دن پہلے میں نے ایک رات امی کو ابو سے کہتے سنا۔ "اب شاہین ماشاءاللہ اکیس کی ہو جائے گی اس لیے اس کی شادی کا سوچیں۔"

"سوچنا کیا ہے کوئی اچھا رشتہ آئے تو چھان پھٹک کر شادی کردو لیکن شاہین کی رضامندی لازمی لے لینا۔"

www.paksociety.com

''ظاہر ہے اس سے بھی پوچھوں گی اصل میں تو یہ ہماری بچی کی خوشی ہوگی۔ اس کی مرضی کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں؟''

امی کی بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ ویسے میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا اور عام لڑکیوں کی طرح میں نے اس معاملے کو ماں باپ پر چھوڑ رکھا تھا۔ وہ میرے لیے مجھ سے زیادہ بہتر سوچ سکتے تھے۔ پیپرز کے بعد میں کچھ دن آرام کرتی رہی۔ سردیاں شروع ہوگئی تھیں۔ ایک دن امی نے کہا۔ ''چل شاہین کچھ سردیوں کے کپڑے لے آتے ہیں۔''

مارکیٹ ہمارے علاقے میں تھی جہاں سے ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ اگلے دن میں اور امی مارکیٹ گئے۔ پیدل مسافت تھی اس لیے ہم نے رکشا ٹیکسی نہیں کی تھی۔ جب ہم جانے لگے تو میں نے دیکھا کہ امی کا چہرہ کچھ عنابی سا ہو رہا ہے میں نے امی سے پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

کچھ عرصے سے ان کو انجائنا کا درد اٹھتا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق یہ ابھی آغاز تھا اور وہ باقاعدگی سے دوا کھائیں تو بیماری ٹھیک ہو جائے گی۔ امی نے کہا۔ ''کچھ نہیں ہے میں ٹھیک ہوں۔''

ہم مارکیٹ تک گئے اور ایک دکان پر کپڑا دیکھ رہے تھے کہ اچانک امی اسٹول سے بیٹھے بیٹھے نیچے گر گئیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ میں بوکھلا کر ان کی طرف جھپٹی ان کو سیدھا کیا تو ان کا چہرہ بہت زیادہ عنابی ہو رہا تھا اور سانس بھی بے ترتیب تھی۔ انہیں واضح طور پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ میں رونے لگی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ اچانک میں نے اکبر خان کو آتے دیکھا اور میں نے بے ساختہ اسے آواز دی۔ وہ چونکا اور پھر تیزی سے ہماری طرف آیا۔ اس دوران میں نے کسی طرح امی کو دکان میں لٹا دیا تھا۔ اکبر خان نے امی کو دیکھا۔ ''کیا ہوا ہے انہیں؟''

دکان والے اور دوسرے لوگ اکبر خان سے خائف نظر آرہے تھے۔ اس کے آتے ہی وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ میں نے بتایا کہ امی کو کیا مسئلہ ہے تو اکبر خان نے فوراً ایک ٹیکسی روکی اور پھر میری مدد سے امی کو اس کی پچھلی سیٹ پر منتقل کیا۔ میں امی کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اکبر خان نے ان کا پرس اٹھا کر مجھے دیا جو دکان پر رہ گیا تھا اور پھر ٹیکسی کے آگے والی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیور کو فوراً جناح اسپتال کے کارڈیو چلنے کو کہا۔ امی کی حالت کی وجہ سے ڈرائیور نے بھی تیزی سے ٹیکسی دوڑائی اور بیس منٹ بعد ہم کارڈیو میں تھے۔ امی کو فوری طور پر اندر لے جایا گیا اور ڈاکٹر ان کی جان بچانے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ اکبر خان مجھے تسلی دینے لگا۔ ''آپ فکر مت کرو آپ کا امی ٹھیک ہو جائے گا۔''

مجھے ابو کا خیال آیا اور میں نے اکبر خان سے کہا۔ ''میرے ابو کو اطلاع دینی ہے۔''

''آپ نمبر بتاؤ، ام کہیں سے کال کر کے آتا ہے۔'' میں نے اسے نمبر دیا اور وہ چلا گیا۔ میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اکبر خان آگیا اور اس نے بروقت عمل کیا، ورنہ میں تو اب تک امی کو لے کر رو رہی ہوتی۔ دس منٹ بعد اکبر خان آگیا اس نے کہا۔ ''ام نے آپ کا ابو کو بتا دیا، وہ آتی ہے۔''

اس کے کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ امی کی طبیعت بہتر ہو رہی ہے، انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا لیکن بر وقت اسپتال لانے سے انہیں بچا لیا گیا۔ اگر اسپتال لانے میں دس پندرہ منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو امی کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ ان کو پڑنے والا پہلا دورہ ہی بہت شدید تھا اور یہ علاج کی طرف سے بے پروائی کا نتیجہ تھا۔ ابو کے پاس بائیک تھی وہ جلد کارڈیو پہنچ گئے اور جب انہیں صورتِ حال کا پتا چلا تو وہ اکبر خان کے بہت شکر گزار ہوئے تھے جس نے ایک اجنبی ہوتے ہوئے بھی اتنی مدد کی تھی۔ ابو کے سامنے میں اور اکبر خان اجنبی بن گئے تھے۔ ابو کے آنے کے بعد اکبر خان ان سے اجازت لے کر چلا گیا اور اس نے غیر ضروری طور پر رکنے کی کوشش نہیں کی۔ ابو نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ ''ایک بدمعاش میں بھی انسانیت ہو سکتی ہے۔''

ایاز بھائی بھی حیران ہوئے تھے کہ اکبر نے ہماری اتنی مدد کی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''کاش کہ وہ بدمعاش نہ ہوتا تو میں اس کے گھر جا کر اس کا شکریہ ادا کرتا۔''

''اگر وہ بدمعاش ہے تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا تو ابو نے بھی تائید کی۔

''ہاں بھئی اس کا شکریہ تو ادا کرنا ہے۔ آج تمہاری امی کی جان اسی کی وجہ سے بچی ہے۔''

امی دو دن کارڈیو میں داخل رہی تھیں پھر ڈاکٹروں نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ان دو دنوں میں آدھی رہ گئی تھیں، اس ہارٹ اٹیک نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا

تھا۔ انہیں مکمل آرام، پرہیزی غذا، مخصوص ورزشیں اور دواؤں کا مستقل تجویز کیا تھا، ورنہ دوسرا دورہ جان لیوا ہو سکتا تھا۔ اب گھر اور امی کی تمام ذمے داریاں میں نے سنبھال لی تھیں۔ ماہین اس سال کالج میں داخل ہوئی تھی۔ اس لیے وہ کالج سے آکر ہی گھر کی تھوڑی بہت ذمے داریاں پوری کر سکتی تھی۔ بہر حال مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ امی نے بچپن سے مجھے ہر کام کی تربیت دی تھی اور تعلیم کے دوران بھی میں بہت سارے کام کرتی تھی۔ صبح سے شام تک سارے کام کرنا اور پھر امی کی دیکھ بھال کرنا اور ان کی غذا اور دوا کا خیال رکھنا۔ مجھے مشکل سے کوئی لمحہ فارغ ملتا تھا کہ جب میں کچھ سوچ سکوں۔ مگر جب بھی ذرا فارغ ہوتی مجھے پہلا خیال اکبر خان کا آتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ابو یا ایاز بھائی نے اس کے پاس جا کر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ مجھے ان سے پوچھتے ہوئے جھجک آرہی تھی۔

امی کو اکبر خان کے بارے میں پتا چلا تو وہ بھی حیران ہوئی تھیں انہوں نے کہا۔ ''یہ بدمعاشوں نے خدمت خلق کب سے شروع کر دی؟''

''امی، وہ بدمعاش ہے لیکن اس میں ان لوگوں سے زیادہ انسانیت ہے جو آپ کی حالت دیکھ کر بھی کچھ نہیں کر رہے تھے۔ وہ تو اکبر خان نیکی کا فرشتہ بن کر وہاں آگیا۔''

میری بات میں شاید اکبر خان کے لیے کچھ زیادہ ہی حمایت یا جوش آگیا تھا۔ امی نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں تھا۔ مستقل علاج، آرام اور پرہیزی غذا سے ان کی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک مہینے بعد ان کی حالت تقریباً پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ ایک دن امی نے پھر مارکیٹ جانے اور کپڑے لینے کو کہا۔ ابو گھر میں تھے وہ انہیں بائیک پر مارکیٹ لے گئے۔ امی اسی دکان پر گئی تھیں جہاں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور واپسی میں وہ چپ چپ سی تھیں۔ رات کو میں کچن کی صفائی کر رہی تھی کہ امی وہاں آئیں۔ ''شاہین ایک بات بتا؟''

''جی امی؟'' میں نے سنک دھوتے ہوئے کہا۔

''جب مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا تو اکبر خان وہاں خود آیا تھا یا تو نے اسے آواز دے کر بلایا تھا؟''

میں ہل کر رہ گئی۔ اکبر خان کو میں نے بلایا تھا۔ امی تو بے ہوش تھیں یہ بات یقیناً انہیں دکان والے نے بتائی ہو گی۔ میں امی سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی اس لیے اقرار کر لیا۔ ''میں نے آواز دے کر بلایا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے تو اسے جانتی تھی۔''

''جی امی۔'' میں نے سر جھکا کر کہا اور پھر انہیں شروع سے اب تک کی ساری بات بتا دی۔ امی خاموشی سے سنتی رہی تھیں۔ جب میں چپ ہوئی تب بھی انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''امی آپ ناراض ہیں مجھ سے۔''

''نہیں بیٹا۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تیرا اس معاملے میں کیا قصور ہے لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ابھی تک تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے جس سے بات دوسروں تک پہنچے لیکن اگر اس نے ایسا کوئی کام کیا تو لوگوں میں ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔''

''امی میں جانتی ہوں وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا۔'' میں نے جھجک کر کہا۔ ''اب تک اس نے ثابت بھی کیا ہے جب میں نے اسے پیچھے آنے سے منع کیا تو اس کے بعد وہ دوبارہ میرے پیچھے نہیں آیا۔ اس دن بھی وہ اتفاق سے مارکیٹ سے گزر رہا تھا۔''

''ہاں ہو سکتا ہے لیکن بیٹا اس دکان دار نے جس طرح بتایا کہ تم نے آواز دے کر اسے بلایا تھا تو میں تو پانی پانی ہو گئی تھی۔ شکر ہے تمہارے ابو دکان سے باہر ایک جاننے والے سے بات کر رہے تھے۔ پھر اس قسم کے معاملات چھپتے نہیں ہیں۔''

میں امی کی پریشانی سمجھ رہی تھی اور خود بھی یہی سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو اسے پھیلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے امی سے کہا۔ ''آپ میری طرف سے اطمینان رکھیں مجھے آپ کی اور ابو کی عزت ہر چیز سے بڑھ کر پیاری ہے۔''

''تجھ پر تو مجھے پورا اعتماد ہے۔'' امی نے پیار سے

شمارہ جولائی 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: جال ...... نجمہ...... (دینہ جہلم)

☆ دوم: گرگٹ...... نفیس فعال...... (کراچی)

☆ سوم: بساط زیست......نائلہ...... (شکارپور)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

www.paksociety.com

کہا۔ ''بس اکبر خان کی طرف سے پریشانی ہے۔ اللہ کرے وہ حد سے نہ گزرے۔ ورنہ ہم شریف لوگ کسی بدمعاش کا مقابلہ کہاں کرسکتے ہیں۔''

اکبر خان بدمعاش تھا، میں نے جس سے سنا اس نے اسے بدمعاش ہی قرار دیا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کے لیے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس دن کے بعد سے امی نے یہ ذکر نہیں کیا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ابھی تک اکبر خان نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جو ہمارے لیے مسئلہ بنتی تو اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ امی نے اپنی بیماری کے باوجود میرے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کردیا۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے امی کی فکر تھی۔ ماہین ابھی پڑھ رہی تھی اور گھر کی ذمے داری امی پر آجاتی جبکہ ان کی بیماری اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن میں امی کو منع بھی نہیں کرسکتی تھی کہ وہ نہ جانے میرے منع کرنے کو کن معنوں میں لیں۔ انہوں نے سب سے میرے رشتے کے لیے کہنا شروع کردیا تھا۔ ابو پہلے ہی ان کو اجازت دے چکے تھے۔

گزشتہ چند مہینوں میں امی کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہوگئی تھی لیکن میں جانتی تھی ابھی وہ گھر کی ذمے داریاں پہلے کی طرح نہیں اُٹھا سکتی تھیں۔ میری خواہش تھی کہ میرے شادی ہونے تک امی ایاز بھائی کی دلہن بھی لے آئیں تاکہ گھر کے کام ویسے ہی چلتے رہیں پھر کچھ وقت گزرتا تو ماہین بھی کاموں میں حصہ لے سکتی تھی۔ ابھی تو اسے چھوٹی ہونے کی وجہ سے چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ ایک دن ابو دفتر سے ذرا دیر سے آئے اور وہ کچھ پریشان بھی لگ رہے تھے۔ وہ امی کو لے کر کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کرکے ان سے نہ جانے کیا بات کرتے رہے؟ جب باہر آئے تو امی بھی پریشان تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کیا بات ہوگئی ہے۔ امی کی تازہ رپورٹس بھی ٹھیک آئی تھیں۔ میں نے امی سے پوچھا تو وہ ٹال گئیں۔ رات کو ایاز بھائی دیر سے آئے تو ابو نے انہیں بھی کمرے میں بلالیا۔ کچھ دیر بعد کمرے سے ان کی آواز بلند ہونے لگی، وہ کہہ رہے تھے۔

''وہ غنڈا بدمعاش ہوگا لیکن اس کی جرأت کیسے ہوئی آپ سے ایسی بات کرنے کی؟''

ابو ایاز بھائی کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل دھڑک اُٹھا تھا۔ کیا ابو کا کسی سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر امی سے بات کی تو انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اکبر خان نے آج دفتر سے آتے ہوئے تمہارے ابو کو روک لیا۔''

میری سانس رک گئی۔ ''اکبر خان نے .... لیکن کیوں؟''

''وہ ہم سے تمہارا رشتہ چاہ رہا ہے۔'' امی بولیں۔ ''تمہارے ابو سے یہ بات کرتے ہوئے اسے ذرا خیال نہیں آیا کہ وہ خود کیا ہے اور زمانہ اسے کیا سمجھتا ہے۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''تو امی آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہیں، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر اکبر خان مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی خواہش ہے میں نے تو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔''

امی کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ''میں جانتی ہوں میری بچی.... لیکن ہم مشکل میں تو پڑ گئے ہیں۔''

''ابو سے کہیں وہ اکبر خان کو صاف انکار کردیں۔''

''اس نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ انکار کا بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اس نے تمہارے ابو سے کہا کہ وہ تمہاری شادی اس سے کریں یا نہ کریں یہ ان کی مرضی ہے لیکن تمہاری شادی کہیں اور نہیں ہوگی۔''

میں حیران رہ گئی۔ ''یہ کہا ہے اس نے؟''

''ہاں صاف دھمکی دی ہے۔''

''ابو نے اس سے کیا کہا؟''

''انہوں نے اس سے کہا کہ اول تو یہ کسی لڑکی کا رشتہ مانگنے کا کوئی شریفانہ طریقہ نہیں ہے، دوسرے ہر آدمی اپنی بیٹی کی شادی کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے رشتے دھمکیاں دے کر نہیں کرائے جاتے۔''

''ابو نے ٹھیک کہا۔''

''مجھے ڈر ایاز کی طرف سے ہے، وہ جوان ہے اور اس کا خون بھی گرم ہے کہیں وہ اکبر سے لڑ نہ پڑے۔''

میں خوف زدہ ہوگئی تھی۔ میں نے اکبر خان کو لڑتے دیکھا تھا اور میرا بھائی ایک عام شریف آدمی تھا جس کا لڑائی بھڑائی سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ابو امی نے ان کی تربیت ہی اس طرح کی تھی۔ ''امی آپ بھائی کو روکیں .... لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا.... بس ابو اور آپ چپ کر جائیں.... وہ خود سمجھ جائے گا۔''

امی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میری بچی اس قسم کے

حربوں سے عام لوگ سمجھتے ہیں، وہ عام آدمی نہیں ہے۔''

میں سمجھ رہی تھی امی اسے بدمعاش قرار دے رہی تھیں اور غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ ابو نے نہ جانے کیسے سمجھا بجھا کر بھائی کو ٹھنڈا کیا، ورنہ وہ بہت غصے میں آگئے تھے۔ اگلے دن جب ابو اور بھائی دفتر چلے گئے۔ ماہین کالج گئی تھی۔ میں کچن میں کام کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون لاؤنج میں رکھا تھا۔ امی ناشتے کے بعد باہر صحن میں واک کر رہی تھیں میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

''شاہین!'' دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز آئی تو میں چونک گئی۔

''کون ہیں آپ؟''

''ام اکبر ہے۔''

میرا دل ایک لمحے کو رکا تھا میں نے کھڑکی سے باہر واک کرتی امی کو دیکھا۔ ''تم.... کیوں فون کیا ہے؟''

''ام آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔''

''لیکن میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' مجھے غصہ آگیا۔ ''تم نے میرے ابو کو راستے میں روک کر اس طرح سے بات کی۔''

''امارا بات سنو۔ ام نے ان سے کہا کہ ام آپ کے گھر آنا چاہتا ہے لیکن انہوں نے کہا کہ جو بات کرنا ہے یہیں کرلو۔ ام نے کرلی۔''

''تم نے انہیں دھمکی دی کہ میری شادی کہیں اور نہیں ہونے دو گے؟''

''ہاں یہ ام نے ان سے بولا اور اسی سے اندازہ کرلو ام آپ کے معاملے میں کتنا مجبور اے۔''

''تم کہاں سے مجبور ہوگئے، مجبور تو ہم جیسے شریف لوگ ہوتے ہیں۔'' میں نے طنز کیا۔

''آپ ام کو بدمعاش کہہ رہا ہے۔''

''تو اور کیا کہوں اکبر! میری شادی کا فیصلہ میرے ماں باپ کریں گے اور وہ جہاں کہیں گے میں سر جھکا دوں گی۔ مہربانی کرکے اب یہاں فون مت کرنا۔''

''شاہین میری بات....'' اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے فون رکھ دیا اور پھر کریڈل سے ہٹا دیا تاکہ وہ دوبارہ ملائے تو اسے انگیج ملے۔ شکر ہے امی اس دوران میں باہر ہی رہی تھیں اور انہیں اس کال کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس زمانے میں فون بہت کم گھروں میں ہوتا تھا لیکن ابو پروفیسر تھے اس لیے ہمیں فون مل گیا تھا۔ اسی دن میں نے امی سے کہا۔ ''آپ ابو سے کہیں اگر اکبر خان دوبارہ آپ سے بات کرے تو آپ اسے صاف منع کردیں اور کہہ دیں کہ میں کسی صورت اس سے شادی نہیں کروں گی۔''

''تیرے ابو اسے پہلے ہی منع کرچکے ہیں۔'' امی نے کہا۔

''تب اس نے کچھ کہا تو نہیں۔''

''وہی دھمکی دی ہے کہ تیری شادی کہیں اور نہیں ہونے دے گا۔'' امی پریشانی سے بولیں۔

''آپ فکر نہ کریں وہ کچھ نہیں کرسکے گا۔ بس ایسے ہی دھمکی دے رہا ہے۔'' میں نے امی کو تسلی دی۔ حالانکہ میں خود پریشان ہوگئی تھی۔ اکبر خان ضدی آدمی تھا۔ وہ آسانی سے ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنی دھمکی پر عمل

SOLE DISTRIBUTOR
of U. A. E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama,Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher , Exporter , Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

www.paksociety.com

شروع کر دیا۔ امی کی کوشش سے میرے لیے کچھ رشتے آئے تھے ان میں سے ایک امی ابو کو مناسب لگا تو انہوں نے لڑکے والوں کو بلا لیا۔ وہ آئے اور مجھے پسند بھی کر گئے لیکن اس کے بعد ان کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔ کچھ عرصے بعد امی نے معلوم کرایا تو انہوں نے جواب دیا کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے ہمارے ہاں رشتہ نہیں کر سکتے ہیں۔ امی افسوس کر کے رہ گئیں کیونکہ انہیں رشتہ بہت پسند آیا تھا۔ پھر ایک رشتہ اور آیا لڑکا سعودی عرب میں ملازم تھا۔ اس کے گھر والے بھی مجھے پسند کر کے گئے بلکہ لڑکے کی والدہ نے تو جاتے ہوئے کہہ دیا کہ لڑکی بس ان کی ہے اور وہ جلد رسم کرنے آئیں گے مگر جانے کے بعد وہ بھی چپ کر گئے۔ جب کئی ہفتے بعد بھی انہوں نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تو امی نے انہیں فون کیا۔

''بہن کیا بات ہے آپ نے دوبارہ رابطہ ہی نہیں کیا؟''

''رابطہ کیا کریں۔'' خاتون تلخ لہجے میں بولی۔ ''جبکہ آپ کی بیٹی کو پہلے ہی کوئی بدمعاش پسند کرتا ہے اور ہمیں دھمکیاں دیتا ہے۔ نہ بہن ایسا رشتہ نہیں چاہیے ہمیں۔''

بات واضح تھی دونوں رشتوں کو اکبر خان نے مداخلت کر کے بھگا دیا تھا۔ اس روز امی رو پڑی تھیں۔ ''اب کیا عزت رہ گئی ہے ہماری دوسروں کی نظروں میں؟''

میں قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔ امی ابو کی نظروں سے چھپتی پھر رہی تھی حالانکہ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا لیکن یہ سب ہو تو میری وجہ سے رہا تھا۔ ایاز بھائی البتہ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔ شاید وہ مجھے قصور وار سمجھتے تھے یا شاید شرم آتی تھی۔ ماہین کو بھی صورت حال کا پتا تھا، اس نے کئی بار اس موضوع پر مجھ سے بات کی کہ اکبر خان ایسا کیوں چاہ رہا ہے؟ میں نے ہر بار یہی کہا کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ گھٹا ہوا اور مایوس سا۔ کوئی کسی سے بات کم کرتا تھا اور زیادہ تر سب گم صم سے رہتے تھے۔ ابو کالج سے آتے اور اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ایاز بھائی آتے ہی دیر سے تھے۔ میں کام کرتی اور پھر اپنے کمرے میں آجاتی۔ جب رات کو سب سو جاتے تو تکیے میں منہ چھپا کر گھٹ گھٹ کر روتی تھی۔ اس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتی تھی۔ اگر میں جان دے کر اپنے گھر والوں کو اس مشکل سے نکال سکتی تو میں اس کے لیے بھی تیار تھی۔

امی کی طبیعت اس پریشانی کی وجہ سے دوبارہ بگڑنے لگی تھی۔ اکثر انہیں انجائنا کا درد اُٹھتا تھا۔ وہ دوا اور معمولات میں ناغہ کرنے لگی تھیں۔ واک اور سونے جاگنے کی پابندی چھوڑ دی تھی۔ کھانا بھی برائے نام کھاتی تھیں۔ میں کوشش کرتی تھی لیکن ان کو سنبھال نہیں پاتی تھی۔ بس انہیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھی۔ ابو الگ گم صم سے ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے دو زندہ مردے ہوں جو حرکت کرتے ہوں، سانس لیتے اور کھاتے پیتے ہوں، باقی ان میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہے تھے۔ ماہین بہت شوخ اور ہنسنے بولنے والی لڑکی تھی لیکن گھر کے ماحول نے اسے بھی چپ کرا دیا تھا۔ ایک رات امی کو پھر انجائنا کا درد ہوا اس بار دورہ شدید تھا اس لیے ابو اور بھائی انہیں لے کر اسپتال کی طرف بھاگے۔ وہاں فوری علاج سے ان کی حالت سنبھل گئی تھی لیکن ڈاکٹروں نے وارننگ دے دی کہ اگر ان کا مسئلہ اسی طرح خراب رہا تو اگلا دورہ جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔ میں اور ماہین گھر میں روتے اور امی کی صحت کے لیے دعا کرتے رہے تھے۔ صبح ابو نے آ کر ان کی حالت بتائی تو ہمیں ذرا سکون ملا لیکن ساتھ ہی ڈاکٹروں کی وارننگ نے پریشان کر دیا تھا۔ اگلے دن امی گھر آ گئی تھیں اور انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا گیا تھا۔ اس رات جب امی اور سب گھر والے سو گئے تھے تب بھی میں جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا اور سو گئی۔

اگلی صبح میں نے امی کا برقع پہنا۔ ماہین کی پیپرز سے پہلے کی چھٹیاں ہو گئی تھیں اس لیے وہ گھر پر موجود تھی۔ مجھے برقع پہنتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہی ہیں؟''

میں چادر لے کر باہر جاتی تھی پہلی بار برقع پہنا تھا۔ ''ماہین میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں امی کو مت بتانا اگر وہ میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دینا کہ نہا رہی ہوں۔''

ماہین فکر مند تھی لیکن میں اسے بتائے بغیر باہر آ گئی۔ میں نے برقع کی نقاب بھی لگا لی تھی اور اب مجھے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ میں نے راستے میں دکان سے ایک چیز لی اور اس ہوٹل تک آئی جو اکبر خان کا مخصوص ٹھکانا تھا۔ میں ہمت کر کے ہوٹل میں آئی اور کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی سے اکبر خان کے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ اکبر خان کے نام پر چونکا۔ ''اس سے آپ کو کیا کام ہے؟''

''بھائی ایک کام ہے اگر آپ کو اکبر خان کا پتا معلوم ہے تو بتا دیں۔''

اس نے ایک بیرے کو بلایا۔ ''یہ بی بی اکبر خان سے ملنا چاہتی ہے اس کے گھر کا سمجھا دو۔''

''آؤ بی بی۔'' بیرے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''سمجھاتا کیا ہوں، پہنچا کر آجاتا ہوں۔''

اس کے لہجے پر میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ اکبر خان جیسے آدمی سے کوئی شریف عورت تو ملنے آ نہیں سکتی۔ بہر حال وہ مجھے کالونی کی ایک گندی سی گلی میں لے کر آیا جہاں چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ وہاں کچرے کے ڈھیر تھے اور اس ڈھیر پر کتے بلیوں کے ساتھ غریبوں کے بچے بھی موجود تھے۔ وہ چیزیں چن چن کر کھا رہے تھے۔ میں اسی جگہ پلی بڑھی تھی لیکن میں نے آج تک یہ گلی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا بدبو اتنی شدید تھی۔ بیرا مجھے ایک کوٹھری نما مکان تک لایا اور اس کا دروازہ بجایا۔ اندر سے اکبر خان کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''خان جی دروازہ کھولو تمہاری مہمان آئی ہے۔''

اکبر خان نے دروازہ کھولا اور میری طرف دیکھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اکبر خان، میں ہوں۔''

وہ چونکا اور اس نے بیرے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تو ....اور سن....اگر ام نے کسی اور کے منہ سے کچھ سنا تو تیری گردن مروڑ دے گا، سمجھا نا؟''

بیرے نے خوف زدہ انداز میں سر ہلایا اور وہاں سے تقریباً بھاگ گیا۔ اس کے جانے کے بعد اکبر خان نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کیوں آیا ہے؟''

''تم نے مجبور کیا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔''

''اگر ایک بدمعاش پر اعتبار ہے تو اندر آ جاؤ۔''

میں اندر آ گئی، یہ چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں ایک طرف چارپائی تھی اور ایک ٹرنک پر میلے کپڑے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے کہیں سے ایک کرسی برآمد کر کے میرے لیے رکھی۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

''اکبر خان ....میں فیصلہ کرنے آئی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیسا فیصلہ؟''

''میرے ماں باپ شریف لوگ ہیں وہ تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، ان میں ذلت اُٹھانے کی سکت بھی نہیں ہے....''

''ام نے ایسا کچھ....''

''میری بات سنو....تم نے جو کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کل امی کو دوبارہ ہارٹ اٹیک ہوا اور ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے اگلا اٹیک جان لیوا ہوگا۔ میرا بھائی اور میرے ابو اب مجھ سے نظر ملا کر بات نہیں کرتے ہیں کہ وہ ایک بدمعاش سے میری حفاظت نہیں کر سکے۔''

اکبر خان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے شیشے کا ایک گلاس اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ''ام نے کب آپ کو بے عزت کیا ہے ام نے تو ہمیشہ آپ کا حفاظت کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں اور تمہاری احسان مند ہوں لیکن اس کے صلے میں تم نے میرے باپ کو سرِ راہ روک کر رشتہ چاہا اور پھر انکار پر دھمکی دی اور پھر اپنی دھمکی پر عمل بھی کیا۔ جو رشتے ڈر کر لوٹ گئے وہ دس دوسرے لوگوں کو بتائیں گے کہ اس لڑکی کا تو کسی بدمعاش سے چکر ہے۔ رفتہ رفتہ بات ہمارے سارے جاننے والوں میں پھیل جائے گی اور تم بتاؤ کہ پھر ہماری کیا عزت ہوگی؟''

''ام آپ کو کسی اور کا ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔'' اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ پہلے ہی سمجھ گیا ہوگا کہ ام آپ کو پسند کرتا ہے لیکن آج میں ام آپ کو بتاتا ہے کہ ام آپ سے محبت کرتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے تم مجھے زبردستی حاصل کرنا چاہو۔''

''ام اس معاملے میں مجبور ہے۔ آپ کا رشتہ دینا یا نہ دینا آپ کے ماں باپ کا اختیار میں ہے لیکن ام کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ امارا بس کا بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تب ایک کام میرے بس میں ہے۔'' میں نے اسے لفافے سے ڈی ڈی ٹی کی بوتل نکال کر دکھائی جو میں نے ابھی دکان سے لی تھی۔ ''میں یہ پی لیتی ہوں میرے ماں باپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا کچھ دن رو دھو کر صبر کر لیں گے اور تمہاری ضد بھی پوری ہو جائے گی میں کسی کی نہیں ہوں گی۔''

''نہیں۔'' اس نے اضطراب سے کہا اور مجھ سے بوتل چھین لی۔ ''آپ ایسا نہیں کرے گا۔''

''اکبر، اگر تم بوتل چھین کر سمجھ رہے کہ میں ایسا نہیں کروں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ایسی بوتلیں ہر پرچون کی دکان پر ملتی ہیں۔ کیا تم وہ سب بھی حاصل کر لو گے اور صرف

WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈی ڈی ٹی ہی نہیں ہے بہت ساری طریقے ہیں اپنی جان لینے کے۔تم نے میرے لیے عزت سے جینے کا راستہ نہیں چھوڑا ہے لیکن میں عزت سے مرتو سکتی ہوں۔"

اکبر خان کا چہرہ ایسے ٹوٹنے لگا جیسے پتھر کا مجسمہ ٹوٹتا ہے۔اس پتھریلے چہرے کے نیچے سے ایک شکست خوردہ انسان کا چہرہ نکلا تھا۔ اس نے ایک آتشیں سانس لی اور بولا۔"ٹھیک ہے اگر آپ چاہتا ہے کہ اکبر خان اپنا یہ ضد چھوڑ دے تو وہ چھوڑ دے گا۔" وہ گرنے کے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔"بچپن سے اکبر خان نے صرف محرومیاں دیکھا۔ماں باپ پتا نہیں کہاں گیا؟ کچھ دن رشتے داروں کے ہاں ٹھوکریں کھاتا رہا پھر جب خود سے زندہ رہنے کا ہمت آیا تو گلیوں میں نکل آیا تب سے دنیا سے اپنا رزق اور اپنا حق کے لیے لڑ رہا ہے کیونکہ مانگنے سے صرف بھیک ملتا ہے۔کوئی رشتہ نہیں پایا، کسی کا محبت نہیں پایا پھر آپ کو دیکھا تو لگا جیسے آپ امارے لیے ہے۔ام پاگل اپنا دل کا خیال کو سچ سمجھ بیٹھا۔آپ سے محبت کرنے لگا اور یہ سوچ لیا کہ آپ بھی ام سے محبت کرتا ہے لیکن...."اس نے رک کر ایک اور گہری سانس لی۔"یہ امارا خوش فہمی تھا۔"

میں رو رہی تھی، اکبر خان کا اعتراف قطرہ قطرہ کر کے میرے دل پر گر رہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔"ٹھیک ہے جیسا آپ چاہے گا ویسا ہی ہوگا، اکبر خان اپنا دل مار دے گا۔پھر یہ دل کبھی کسی کے لیے زندہ نہیں ہوگا، پہلے بھی زندہ نہیں تھا بس آپ کے واسطے زندہ ہوا تھا۔"

"پلیز ایسی باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔

"شاہین آپ نے اکبر خان سے وہ منوا لیا جو اس سے موت کا فرشتہ بھی نہیں منوا سکتا تھا لیکن ایک بات سے آپ ام کو نہیں روکے گا۔"

"کون سی بات سے؟"

"جب تک شادی نہیں ہو جاتی آپ کا حفاظت میرا ذمے ہے، اس کا بعد ام فکر نہیں کرے گا۔"

میں نے اپنے آنسو صاف کیے۔"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔"

"اب آپ جاؤ....اور فکر مت کرو، ام آج ہی آپ کا والد سے معافی مانگ لے گا اور آیندہ کے لیے وعدہ کر لے گا۔آپ کا خوشی، امارا خوشی ہے۔"

لیکن میری خوشی کیا تھی، یہ مجھے گھر آ کر پتا چلا۔میری خوشی اکبر خان تھا، میں اس کے دل سے اپنی محبت نکالنے گئی تھی لیکن الٹا اس کی محبت دل میں بسا کر لے آئی۔میں جانتی تھی، میں کبھی اس کی نہیں ہو سکتی تھی۔امی ابو اس رشتے پر قیامت تک راضی نہیں ہوتے۔اس کے باوجود میں اس سے محبت کر بیٹھی تھی اور تب میں نے جانا کسی سے محبت کرنا یا نہ کرنا آدمی کے اپنے اختیار میں کہاں ہوتا ہے، یہ تو وہ آگ ہے جو خود لگتی ہے اور خود ہی جلتی ہے۔اسے نہ کوئی لگا سکتا ہے اور نہ بجھا سکتا ہے۔اس شام ابو آئے تو ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اکبر خان نے ان سے بات کر لی ہے۔وہ امی کو کمرے میں لے گئے اور یہ "خوشخبری" ان کو بھی سنا دی۔ امی کے چہرے پر اتنی تیزی سے رونق آئی تھی کہ مجھے اپنی محبت کی نارسائی کا ذرا بھی دکھ باقی نہیں رہا۔ماں باپ کی خوشی میرے لیے دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔پھر امی فکر مند ہو گئیں۔"اب تو کوئی رشتہ بھی نہیں ہے جو دو لوٹ کر گئے تو اس کے بعد کوئی آیا ہی نہیں۔"

"رشتہ ہے ایاز کی ماں....میرے ایک کولیگ ہیں، ان کا بیٹا ہے، ابھی حال میں کسی فرم میں اکاؤنٹنٹ لگا ہے۔خاندان بہت اچھا ہے وہ مجھ سے کئی مہینے سے کہہ رہے ہیں لیکن میں ٹال رہا تھا۔"

"بس تو اب جلدی سے کہہ دیں، میں اپنی زندگی میں اپنی بچی کو اس کے گھر کا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

یوں اظہر کا رشتہ آیا اور چند مہینوں بعد میں رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئی۔شادی سے چند دن پہلے مجھے اکبر خان کی کال آئی۔ اس نے مجھے شادی کی مبارک دی اور پھر اپنا فون نمبر بتایا۔"اسے نوٹ کر لو، زندگی میں کبھی کسی وقت امارا ضرورت ہو تو بس مجھے ایک کال کر دینا۔"

میں نے وہ نمبر کہیں نہیں لکھا تھا، اپنے دل پر نوٹ کر لیا تھا۔

☆☆☆

آج برسوں بعد اس نمبر کی ضرورت پڑی اور میں نے اسے ملایا تو اکبر خان مل گیا۔اس نے اپنے وعدے کی لاج نبھائی تھی۔میں اسے کہہ کر مطمئن ہو گئی تھی۔مجھے یقین تھا کہ اکبر خان مسئلہ حل کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔اگلے دن جب ماہ جبیں شام کو سینٹر سے آئی تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔اس نے آتے ہی پرجوش انداز میں کہا۔"امی، آپ نے ٹھیک کہا تھا، آج وہ لفنگے وہاں نہیں تھے۔"

"اب وہ کبھی آئیں گے بھی نہیں۔" میں نے یقین سے کہا۔

www.paksociety.com